ظہورِ پاکستان
چودھری محمد علی

****

از

چودھری محمد علی

مترجمہ ——— بشیر احمد ارشد

مکتبہ کارواں۔ کچہری روڈ لاہور

ناشر : چودھری عبدالحمید، ایم۔ اے

مطبع : کارواں پریس۔ لاہور

کتابت : یوسف نگینہ۔ نذیر احمد صدیقی

قیمت : پچیس روپے

اپنے بھائی
ڈاکٹر علی احمد
کی یاد میں :

جنھوں نے یہ کتاب لکھنے کے لیے مجھ سے اصرار کیا، لیکن اس کی تکمیل سے پہلے اللہ تعالیٰ کے جوارِ رحمت میں چلے گئے۔

پیش لفظ

یہ کتاب بنیادی طور پر ۱۹۴۶ء تا ۱۹۴۰ء کے دور کے واقعات کے بارے میں ہے — یہ دور برطانوی ہند کی تقسیم سے فوراً پہلے اور بعد کا ہے جب ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو دو آزاد و خود مختار مملکتیں پاکستان اور ہندوستان کی تشکیل عمل میں آئی۔ تمہیدی ابواب میں اس تاریخی منظر کی تفصیل بیان کی گئی ہے، جس میں یہ واقعات رونما ہوئے۔ علاوہ ازیں ان معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی قوتوں کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے، جن کی وجہ سے ان واقعات نے تشکیل پائی۔ کتاب کا آخری حصہ ان مشکل اور کٹھن مسائل کے بارے میں ہے، جن کا نوزائیدہ مملکت پاکستان کو سامنا کرنا پڑا۔ ان میں سے بعض مسائل ابھی تک موجود ہیں۔ اور میں نے بعض مقامات پر ۱۹۴۰ء کے بعد بھی ان کے متعلق صورتِ حال میں تبدیلیوں کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

۱۹۴۶ء کے اوائل سے تحریکِ پاکستان کے رہنماؤں سے میرا گہرا واسطہ رہا، اور پھر مجھے ان اہم اور یادگار واقعات میں عملی حصہ لینے کا موقع بھی ملا، جنہوں نے ظہورِ پاکستان کی راہ ہموار کی تھی، اس لیے ماضی میں دوست احباب یہ کہتے رہے ہیں کہ میں ان کے بارے میں لکھوں۔ ۱۹۴۶ء میں میں حکومتِ ہند میں جنگ اور رسد کے مالیاتی مشیر کے طور پر کام کر رہا تھا جب اکتوبر ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کے نمائندے ہند کی عبوری حکومت میں شامل ہوئے اور لیاقت علی خان وزیرِ خزانہ بنے، تو مسلم لیگی رہنماؤں کے ساتھ میرے روابط اور گہرے ہو گئے۔ تقسیم کے نازک ایام میں میں سٹیئرنگ کمیٹی کے دو ارکان میں سے ایک تھا، یہ کمیٹی اس تقسیم کونسل کے سامنے جوابدہ تھی، جسے تقسیم کے بہت اہم مسائل سے عہدہ برآ ہونا تھا۔ میرا دوسرا ساتھی انڈین سول سروس کا ایچ۔ ایم پٹیل تھا۔ وہ ہندوستان کا نمائندہ تھا جبکہ میں پاکستان کی نمائندگی کر رہا تھا۔ تقسیم کونسل کا صدر وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن تھا اور ہندوستان کی طرف سے سردار ولبھ بھائی پٹیل اور راجندر پرشاد اس کے ارکان

تھے پاکستان کی طرف سے قائداعظم محمد علی جناح اور لیاقت علی خاں تھے۔ قیام پاکستان کے بعد مجھے حکومت پاکستان کا سیکرٹری جنرل مقرر کیا گیا، اور میرے سپرد ساری وزارتوں کے کام میں ربط وہم آہنگی پیدا کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ میں کابینہ کا سیکرٹری بھی تھا۔

اس طرح مجھے ایک بہت نازک دور میں دنیا کے اس حصہ میں تاریخ کے عمل کو دیکھنے کا غیر معمولی موقع ملا۔ اگرچہ جو واقعات یہاں بیان کیے گئے ہیں ان میں سے اکثر میرے ذاتی تجربہ و مشاہدہ میں تھے، تاہم میں نے جہاں کہیں بھی ممکن تھا، اپنے بیان کی تائید میں دوسرے ذرائع سے بیشتر دستاویزی شہادتوں کا حوالہ دیا ہے۔ خاص طور پر جہاں کہیں بھی، یہاں بیان شدہ واقعہ کی روداد ہندوستانی اور برطانوی مؤرخین سے مختلف ہے، میں نے احتیاط کے طور پر ان کتابوں کے حوالے دیے ہیں، جن پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ ان میں متعلقہ ہندوستانی اور برطانوی شخصیات کے خلاف تعصب سے کام لیا گیا ہے۔ اس کی ایک مثال "مشن ود ماؤنٹ بیٹن" سے ملتی ہے۔ اس کا مصنف ایلن کیمپبل جانسن اس زمانہ میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا پریس اتاشی تھا، جب وہ وائسرائے تھا۔ کیمپبل جانسن پرستش کی حد تک ماؤنٹ بیٹن کا مداح تھا، اور یہ بات قدرتی ہے کہ وہ اسے بہترین انداز میں پیش کرتا ہے۔ یا پھر پیارے لال کی کتاب "مہاتما گاندھی ــــ آخری دور" ہے۔ وہ گاندھی کا عقیدت مند، پیروکار اور سیکرٹری تھا۔ زیر مطالعہ دور میں فرقہ وارانہ فسادات کو بہت اہمیت حاصل تھی، میں نے عام طور پر ان کے بارے میں ہندوستانی منظر کے غیر جانبدار انگریز مبصرین کی لکھی ہوئی رپورٹوں پر انحصار کیا ہے۔ میں یہ ذکر اس لیے نہیں کر رہا کہ اس کتاب کے مندرجات کے متعلق میری ذمہ داری کا بار کم ہو جائے، بلکہ میرا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ میں نے جہاں تک بھی انسانی بس کا تعلق ہے، حقیقت پر مبنی روداد پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ میں نے لاتعلقی کی رفعتوں پر بیٹھ کر لکھا ہے تو مجھ سے سچ نہ بولنے کا قصور سرزد ہوگا۔ میں نے اپنے نزدیک سچ کہہ کر ہی قلم بند کیا ہے لیکن مجھے اس امر کا پورا احساس ہے کہ یہ صداقت کا صرف وہ رُخ ہے جسے میں دیکھ سکا ہوں۔

مندرجات

۱۔ تاریخی پس منظر ۹

۲۔ قرارداد پاکستان ۴۹

۳۔ کابینہ مشن پلان ۷۲

۴۔ عبوری حکومت ۱۱۱

۵۔ غریب آدمی کا بجٹ ۱۳۵

۶۔ مونٹ بیٹن کا مشن ۱۴۷

۷۔ منصوبۂ تقسیم کی تشکیل ۱۶۵

۸۔ تقسیم کا منصوبہ ۱۸۹

۹۔ تقسیم کے مسائل ۲۰۲

۱۰۔ ریڈکلف کا ایوارڈ ۲۵۱

۱۱۔ ریاستوں کا الحاق ۲۷۱

۱۲۔ پاکستان منصۂ شہود پر ۲۸۶

۱۳۔ قتل عام اور بحالی مہاجرین ۳۰۴

۱۴۔ جوناگڑھ، حیدرآباد اور کشمیر ۳۳۱

۱۵۔ طاس سندھ کا تنازعہ آب ۳۴۵

۱۶۔ نئی مملکت کے اقتصادی اور مالی مسائل ۳۹۳

۱۷۔ نئی مملکت کے انتظامی اور سیاسی مسائل ۴۱۹

اشارات ۴۵۴

اشاریہ

نقشوں کی فہرست

۱- ہند — تقسیم اختیارات سے پہلے

۲- بنگال — تقسیم کے بعد

۳- پنجاب — تقسیم کے بعد

۴- پاکستان

۵- جموں و کشمیر

قائداعظم

باب ۱

تاریخی پس منظر

مسلم اور ہندو تمدنوں میں جو مڈ بھیڑ بارہ سو برس پہلے شروع ہوئی تھی۔ اس نے دونوں قوموں پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ ان کا اختلاط ہزاروں مقامات پر ہوا ہے جنگ کے میدانوں میں، روحانی بلندیوں پر اور دنیاوی کاروبار کی پستیوں میں۔ دونوں تمدنوں نے ایک دُوسرے سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوئے ہیں، اور ایک دوسرے میں نفوذ کیا ہے۔ ان کی بولیوں کے امتزاج سے نئی اور وسیع زبانوں نے جنم لیا ہے۔ موسیقی، شاعری، مصوری، فنِ تعمیر، لباس کے اسلوب اور زندگی کے طور طریقوں میں ایک دوسرے پر اپنا اثر چھوڑا ہے۔ بایں ہمہ دونوں قومیں، ایک دوسرے سے اتنی ممیز رہی ہیں کہ ان کا اختلاف ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔ دونوں تمدن باہم دگر خلط ملط تو ہوئے، لیکن آپس میں کبھی ضم نہ ہوئے۔ ہندو اور مسلمان گھرانے نسلوں تک ہمسایوں کی طرح ایک ہی جگہ بستے رہے ہوں لیکن ایک سرسری نگاہ بھی دونوں قوموں کے افراد میں تمیز کر سکتی ہے۔ لباس، خوراک، ظروفِ خانہ داری، طرزِ رہائش، اندازِ گفتگو، سلام و دُعا کے الفاظ، نشست و برخاست، اِشارے

اور کھانے الغرض ان کی ہر بات ایک دوسرے سے مختلف ہے اور اپنے ورثہ کی آئینہ دار یہ خارجی اختلافات اندرونی مغائرت کا پرتو ہیں۔ جو امتیازی فرق ہندوؤں اور مسلمانوں کی سماجی تنظیم اور کائناتی تصورمیں ہے وہ نوعِ انسانی کے گوناگوں معاشرتی گروہوں میں شاید ہی اور کہیں اتنا نمایاں ہو۔

ہندو معاشرہ وسعت پذیر نہیں، اس کا جامد طبقاتی ڈھانچہ ہزاروں ذاتوں میں منقسم ہے ذات پات کے نظام کی یوں تعریف کی گئی ہے کہ "اس کے تحت معاشرہ متعدد خودکفیل اور مکمل طور پر علحدہ وحدتوں یعنی ذاتوں میں منقسم ہوتا ہے اور اُن ذاتوں کے باہمی تعلقات مذہب کی رُو سے بفرقِ مراتب متعین ہوتے ہیں"۔ لہٰذا زندگی بھر کے لیے ایک شخص کے مقام و مرتبہ کا تعین اس کی اعلیٰ یا ادنیٰ ذات میں پیدائش سے کیا جاتا ہے۔ اور اعلیٰ یا ادنیٰ پیدائش کا تعین پہلے جنم کا کرم یا کردار کرتا ہے۔ "ذات پات کی نگہداشت دھرم کے مترادف ہے یعنی مذہبی رسوم کی پابندی یا سماجی اور اخلاقی ضابطے"[۲] شدید سے شدید سماجی ناانصافی کو بھی قانونِ عالم کی کارفرمائی سے منسوب کیا جاتا ہے جس کی تلافی آیندہ جنموں میں صدیوں بعد جاکر ہوگی چونکہ آیندہ جنم جانوروں کے روپ میں بھی ہو سکتا ہے۔ اس اعتقاد نے حیوانی زندگی کو بھی تقدس بخشا ہے لیکن طبقاتی اصول کا یہاں بھی اطلاق ہوتا ہے جانوروں میں گائے اسی طرح مقدس ہے جس طرح انسانوں میں برہمن۔

عام لوگ جو سماجی زندگی کے گورکھ دھندے میں الجھے رہتے ہیں، اُن میں اپنی ذات پات کے لیے شدید وفاداری کا جذبہ فروغ پاجاتا ہے۔ یہی جذبہ ان کی خوراک، تعلیم و تربیت، شادی بیاہ، پیشہ و ذریعہ معاش اور دوسرے سماجی تعلقات کو منضبط کرتا ہے۔ زندگی کے ابتدائی مراحل سے ہی وہ رسم و رواج کی پابندیوں اور توہمات کے ایک پیچیدہ نظام کے تحت زندگی بسر کرنے کے اس طرح عادی ہوجاتے ہیں کہ ان کی ساری ذہنی توانائی لامحالہ اسی مصرف کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ چونکہ کسی شخص کے پیشے کا دارومدار اس کی ذات پات پر ہوتا ہے، اور لین دین کے باعث مختلف پیشوں میں ایک دوسرے سے معاشی روابط استوار ہوتے ہیں، یہ ہزاروں ذاتیں ایک زندہ وحدت میں مدغم ہو جاتی ہیں اور یہی بہ حیثیت مجموعی ہندو سماج ہے۔ ایسا سماج صرف اسی صورت میں انسانوں سے مکمل وفاداری کا تقاضا کرسکتا ہے، جب انفرادی

نے پیدائش سے ہی اس میں پرورش پائی ہو' اور باہمی تعلقات کے ان پیچیدہ طریقوں کو قبول کرنا ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکا ہو۔ یہ نظام کبھی ایک عالمی نظریہ یا نظمِ عقائد کے طور پر کسی غیر کے لیے کسی طرح باعثِ کشش نہیں بن سکتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ غیر ہندو کے مقام و مرتبہ کا تعین بھی اُس کی پیدائش سے ہو جاتا ہے۔ ہندو سماج کے دائرہ سے باہر پیدا ہونے والا حقیقی معنوں میں ایک اچھوت ہوتا ہے۔ اس لیے یہ بات کسی صورت باعثِ حیرت نہیں کہ ہندو مت میں غیروں کو جذب کرنے کی کوئی خاص کوشش روا نہیں رکھی جاتی۔ باہر والے اس کے مابعد الطبیعاتی افکار کی موشگافیوں سے' اس کے نفسیاتی تجزیہ و تحلیل کی باریکیوں سے' اور جیسا کہ یوگ کے مختلف طریقوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس میں نظامِ اعصابِ انسانی کے انتہائی امکانات کی تلاش و جستجو سے متاثر و مسحور ہو سکتے ہیں۔ لیکن وہ کبھی ہندو سماج سے یگانگت محسوس نہیں کر سکتے۔

اسلام' اس کے برعکس انسانی فکر و عمل کا ایک بالکل مختلف پہلو پیش کرتا ہے۔ اسلام کی دعوت رنگ، نسل، قبیلہ اور زبان کے کسی فرق و امتیاز کے بغیر ساری نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ اسلام سب بنی آدم کو ایک خدائے حی القیوم کی اطاعت کرنے کی دعوت دیتا ہے جو ہر شے کا خالق اور سارے جہانوں کا پروردگار ہے' جس کے سامنے ہر فردِ بشر مرد ہو یا عورت اپنے اعمال کے لیے جوابدہ ہے۔ توحید اور انسانی اخوت خدا کے پیغمبروں کی تعلیمات کا لُبِّ لباب ہیں تاکہ سب لوگ صداقت اور عدل و انصاف کی فضا میں اپنی زندگی بسر کریں۔ پیدائش سے کسی کو خاص مقام و مرتبہ یا حقوق و مراعات حاصل نہیں ہو جاتے۔ رُوئے زمین پر عادلانہ معاشرتی نظام قائم کرنے کے لیے پُوری جد و جہد کرنا اور ضرورت پڑے تو جان و مال بھی قربان کر دینا مسلمانوں پر فرض ہے۔ اسلام میں صحیح العقیدہ اور صالح العمل ہونے پر مسلسل زور دیا گیا ہے۔ اگر لوگ جہالت اور گناہ میں زندگی بسر کرتے ہیں' تو وہ ماضی میں کسی مفروضہ پہلے جنم کو قصوروار قرار نہیں دے سکتے۔ بلکہ انھیں اس دنیا میں بھی اور اگلے جہان میں بھی اس کی ذمہ داری خود قبول کرنی ہوگی۔

کائناتی نظریہ اور سماجی تنظیم کے اصولوں میں ان اختلافات کو تاریخی تجربہ کے تضادنے اور تقویت پہنچائی۔ برِصغیر ہند میں مسلمان پے درپے فاتحین کی صورت میں آئے

اس سلسلہ کا آغاز ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم کے سندھ پر حملہ سے ہُوا۔ ۱۲۰۶ء میں قطب الدین ایبک نے دہلی میں سلطنت قائم کی لیکن اس کے بعد بھی ان حملوں کا سلسلہ جاری رہا اور مسلمانوں کے حلقۂ اقتدار میں توسیع ہوتی رہی، حتیٰ کہ مسلمانوں کو برصغیر کے طول و عرض میں مکمل غلبہ حاصل ہو گیا۔ لازماً مسلمانوں اور ہندوؤں نے اس تاریخی عمل کو بالکل متضاد پہلوؤں سے دیکھا۔ مسلمان جن بادشاہوں اور فاتحوں پر فخر کرتے تھے۔ ہندو اپنے دلوں کی گہرائیوں میں ان سے خوف اور دہشت محسوس کرتے تھے۔ جن ہندوؤں نے حکومت کے خلاف تلوار اُٹھائی وہ مسلمانوں کے نزدیک باغی تھے، اور ہندوؤں کی نظر میں محبِّ وطن۔

جب انگریز یہاں نمودار ہُوئے تو اُنھوں نے بھانپ لیا کہ اُن کا مفاد اس اختلاف کو مزید ہوا دینے میں مضمر ہے۔ چنانچہ تاریخِ ہند کو نئے انداز میں پیش کرنے کی دیدہ دانستہ کوشش کی گئی تاکہ مسلمان حکمرانوں کو ستمگر اور ظالم دکھایا جائے، مقصود یہ تھا کہ آبادی کی اکثریت جو ہندوؤں پر مشتمل ہے وہ اس طرح برطانوی راج کی خوبیوں اور برکات کی زیادہ آسانی سے معترف ہو جائے گی[۳]۔

ہند میں مسلمان فاتح افواج کے ساتھ یا ان کے جَلو میں آئے تھے، انھوں نے ہند میں ہی سکونت اختیار کر لی۔ مسلمانوں کے ہند میں آباد ہو جانے سے اور ساتھ ہی ساتھ ہندوؤں کے قبولِ اسلام سے ہند کی آبادی میں ایک تدریجی تبدیلی رونما ہُوئی۔ تا آنکہ کل آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ۲۵ فی صد ہو گیا۔ برِصغیر کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہو گئی، لیکن وسطی اور جنوبی حصّوں کی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ۱۵ سے ۵ فیصد تک تھا۔ ہند میں اشاعتِ اسلام مسلم حکمرانوں کی مرہونِ منّت نہ تھی۔ جدید دور کا ایک برطانوی مؤرّخ لکھتا ہے :۔ "مسلم حکمرانوں کے ساتھ ہندو عہدیداروں نے ابتدائی ایّام سے ہی جو تعاون کیا، اور ہندو راجاؤں کے ساتھ اُن کے جو تعلقات و روابط تھے اس بات کی بیّن شہادت ہیں کہ تبدیلیٔ مذہب جبر و تشدد سے نہیں ہُوئی کیونکہ ہند جیسے ملک میں اگر ایسا مسلسل عمل ہوتا تو پھر یہاں خوف اور دہشت کا دور دورہ رہتا۔ لیکن تاریخ سے ایسے حالات کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ جبر سے بھی مذہب تبدیل ہُوا، لیکن بہت ہی

شاذ و نادر تھا۔ بھارتی جمہوریہ کے پہلے صدر راجندر پرشاد کا بیان ہے کہ "مسلم فاتحوں کا طرز عمل بہ حیثیت مجموعی رواداری کا آئینہ دار تھا۔ ہند میں جس قدر اسلام کی اشاعت ہوئی وہ مسلم اہل علم وفضل اور صوفیائے کرام کی تبلیغی مساعی اور عملی مثال کی بدولت ہوئی۔ ان اصحاب نے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کیے اور صداقت کی روشنی پھیلانے کی کوشش میں لاتعداد مشکلات اور خطرات کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔

مسلمانوں کا تعلق زندگی کے ہر شعبہ اور پیشہ سے تھا۔ وہ حاکم اور منتظم بھی تھے اور سپاہی، استاد، زمیندار، کسان، ہنرمند اور تاجر بھی۔ وہ شہروں میں بھی آباد تھے اور دیہات میں بھی رہتے تھے۔ مسلم دورِ حکومت میں یہ ایک فطری بات تھی کہ فوجی، دیوانی اور عدالتی نظم و نسق میں اُن کا تناسب غالب ہوتا۔ لیکن نظم و نسق کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا، جس میں ہندوؤں کی نمائندگی نہ تھی۔ مالیات کے محکمے کی باگ ڈور خاص طور پر ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ ہندو فوجی خدمات بھی سرانجام دیتے تھے، اور ایسی فوجوں کے بھی سپہ سالار ہندو ہوتے تھے، جن کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ جاگیردار امرا کے طبقے میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔ کئی ایسی ہندو ریاستیں بھی تھیں، جن پر حاکمیت اعلیٰ مسلم سلطنت کو حاصل تھی۔ شہروں میں بعض محلوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی تھی اور بعض محلوں میں ہندوؤں کی۔ لیکن اکثر و بیشتر ہندو اور مسلمان گھرانے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔

اس کے باوجود دونوں قوموں میں کشمکش اور تصادم کے بنیادی اسباب ناپید نہ ہوئے۔ مسلمانوں کے آنے کے بعد ہندوؤں نے اپنی ذات پات اور چھوت چھات کی پابندیوں کو اور بھی سخت کر دیا تاکہ مسلمانوں سے ان کے تعلق کا دائرہ کم سے کم تر ہو جائے۔ یہ ایک غیر شعوری دفاعی حربہ تھا، جس نے صدیوں تک مسلم حکمرانی کے دور میں اُن کا سماجی ڈھانچہ جوں کا توں محفوظ رکھا۔ کھانے کی جس شے کو مسلمان کا ہاتھ چھو جاتا، وہ بھرشٹ ہو جاتی۔ دونوں قوموں میں باہمی شادی بیاہ کا بھی دربارِ اکبری کے ایک بہت مختصر دور کے سوا کوئی رواج نہ ہوا۔ کھانے پینے کی عادات بھی باہمی میل ملاپ میں سدِ راہ تھیں۔ ایک قوم سبزی خور تھی، جبکہ دوسری نہیں تھی۔ لیکن سب سے بڑی رکاوٹ ذات پات کا نظام تھا۔ "ذات" ایک آہنی پردہ تھا

یہ ذات پات کا نظام ہی تھا، جس نے دونوں قوموں کو ہمیشہ منقسم اور علحدہ رکھا۔"[۶]

لیکن ہندو اپنی سماجی تنظیم کے دائرے میں محصور رہ کر بھی مسلم ثقافت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ہندو مت کے اندر ہی متعدد ایسی تحریکیں اُبھریں، جنھوں نے توحید کا پرچار کیا اور نجات حاصل کرنے کے لیے اخلاص اور اعمالِ حسنہ کی تلقین کی۔ ان میں سے کئی تحریکوں نے تمام ادیان کی وحدت پر زور دیا، بالخصوص ہندو مت کی خالص شکل اور اسلام میں، اور سب لوگوں کو پریم کے راستہ پر گامزن ہونے کی دعوت دی۔ مسلم امرا کی بود و باش کا جو رنگ ڈھنگ تھا، اس کی وسیع پیمانہ پر تقلید کی گئی۔ اور اس کا ہندو رسم و رواج اور اخلاق و آداب پر اثر پڑا۔ ادھر ہند میں بنے ہوئے عمدہ اور نفیس پارچات مسلمان زیب تن کرنے لگے۔ مسلمان جو فنون ایران سے لے کر آئے تھے، ہندو مصوری اور فن نے اُن پر اثر ڈالا۔ ایسے ہی باہمی اثر کا عمل موسیقی اور شاعری میں بھی ہوا۔ صدیوں کے میل ملاپ نے آہستہ آہستہ اُردو کے ارتقا کی راہ ہموار کر دی۔ جو بالائی ہند کے شہروں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان تھی۔ اس کی ترکیب اور اساسی الفاظ ہندی تھے۔ لیکن فارسی اور عربی الفاظ سے آراستہ پیراستہ ہو کر یہ زبان وسعتِ بیان اور حسن و لطافت کا ایک نیا موزوں ذریعہ بن گئی۔

اسلام اور ہندو مت کے چیدہ چیدہ پہلوؤں کے اختلاط کی فقط ایک سوچی سمجھی کوشش ہوئی جب مغل شہنشاہ اکبر نے اپنے سیاسی اور خاندانی اغراض کے پیشِ نظر ایک خود ساختہ دینِ الٰہی قائم کیا۔ لیکن اس کوشش پر بدبختی سایہ فگن تھی۔ اکبر کی موت کے ساتھ ہی یہ منصوبہ نہ صرف ختم ہو گیا بلکہ اس کا شدید ردِ عمل ہوا۔ جو آخری عظیم مغل شہنشاہ اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں اوجِ کمال تک پہنچ گیا۔ لیکن معاشرہ کے اُونچے طبقے عیش و عشرت کے دلدادہ اور اخلاقی انحطاط کا شکار ہو چکے تھے، اورنگ زیب کی انتھک محنت، قوتِ عمل اور سخت کوش سادگی بھی اس تنزل کو نہ روک سکی۔ وادیٔ گنگا کی نرم و سبک ہوا اور ضعف پرور فضا نے ان کے قویٰ مضمحل کر دیے تھے اور ان کے ذہنوں اور جسموں کی توانائی کا رس نچوڑ لیا تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے کچھ عرصہ ہی بعد مغل سلطنت کی عظیم الشان

عمارت شکستہ ہو کر زمین بوس ہونے لگی۔ دُور افتادہ صوبوں کے گورنر عملاً خود مختار بن بیٹھے وہ مرکزی حکومت کی صرف زبانی اطاعت کا دم بھرتے تھے۔ مرکزی حکومت اتنی کمزور و ناتواں ہو چکی تھی کہ وہ اُن کی گرفت نہیں کر سکتی تھی۔ مرہٹوں کی تاخت و تاراج نے سلطنت کے وسیع حصّوں میں تراج کی کیفیت پیدا کر دی۔

انتشار و انحطاط کے اس منظر میں ایک تیسرا فریق نمودار ہوا۔ ڈیڑھ صدی تک انگریزوں کی یہ حیثیت رہی تھی کہ وہ مغل شہنشاہوں اور اُن کے صوبیداروں کے سامنے بڑی لجاجت سے درخواستیں پیش کیا کرتے تھے۔ لیکن اٹھارھویں صدی کے وسط میں حالات ان کے لیے سازگار ہو گئے، اور اگلے ایک سو برس تک وہ اپنے سابق سرپرستوں کی سلطنت کے استحصال میں سرگرم رہے۔ اس جدوجہد میں انگریزوں نے موقع شناسی، طاقت اور فریب کاری کے وہ تمام حربے استعمال کیے، جنھیں وہ ہند کے ساتھ اپنی تجارت میں پوری کامیابی سے آزما چکے تھے۔ تجارت کے ذریعے ہندوؤں کے ساتھ انگریزوں کے دیرینہ تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ مسلمانوں کے خلاف جدوجہد میں وہ ان کے فطری حلیف بن گئے۔ جب انگریزوں کو آخرِ کار فتح حاصل ہو گئی تو انھوں نے مسلمانوں کو اور زیادہ کچلنے کے لیے اپنے اختیار و اقتدار کو پوری طرح استعمال کیا

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی جو انگریزوں کے خلاف ایک عام بغاوت تھی، اس کا حشر ناکامی و بربادی پر ہُوا۔ سلطنتِ مغلیہ کا چراغ گُل ہو گیا اور سارے برِّ صغیر پر برطانوی راج مسلّط ہو گیا۔ مسلمانوں کے اعلیٰ اور متوسط طبقات تباہ ہو گئے، لیکن بے اطمینانی کے انگارے بدستور سلگتے رہے۔ سر ولیم ہنٹر نے ۱۸۷۱ء میں لکھا: "ہند کے مسلمان اب بھی اور سالہا سال سے برطانوی اقتدار کے لیے ایک مستقل خطرہ بنے ہُوئے ہیں۔ کسی نہ کسی وجہ سے وہ ہمارے نظام سے علٰحدہ اور دور رہے ہیں اور جن تبدیلیوں کے سامنے موقع شناس ہندوؤں نے بڑی خوشدلی سے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے، مسلمان انھیں شدید ظلم قرار دیتے ہیں"۔[۵]

بے اطمینانی کی کئی وجوہ تھیں۔ جنگِ پلاسی ۱۷۵۷ء کے بعد سے انیسویں صدی کے آخر تک جو بھی قدم اُٹھایا گیا وہ عملاً مسلمانوں کے لیے بد سے بدتر حالات پر منتج ہُوا۔ انتظامیہ، عدلیہ اور فوج میں تمام اعلیٰ مناصب صرف انگریزوں کے لیے مخصوص ہو گئے

——اپنی حکومت کے دورِ عروج میں مسلمانوں کو تفوق ضرور حاصل تھا، لیکن انھوں نے انگریزوں کی طرح انتظامیہ میں اپنی اجارہ داری قائم نہیں کی تھی۔ مسلمانوں کی معاشرتی اور معاشی حالت کا انحصار سرکاری ملازمت پر تھا۔ اس سے محروم ہوکر نہ وہ معاشرہ میں بلند پایہ رہ سکے اور نہ ہی معاش کے ذریعے اُن کی دسترس میں رہے۔ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں بھی ہندو کثیر تعداد میں انتظامیہ کے ماتحت عہدوں پر فائز رہے تھے، اب وہ اُن تمام عہدوں کو پُر کرنے لگے جو انگریزوں نے ہندوستانیوں کے لیے خالی چھوڑ دئے تھے۔ جیسا کہ ایک ہندو مصنّف نے لکھا ہے: "ہندو نہایت مسرت کے ساتھ سرکاری ملازمت میں دھڑا دھڑ شامل ہونے لگے، اور انھوں نے انگریزوں کو اپنا بہت بڑا محسن تسلیم کیا"۔۹ ذات پات کے عادی ہندو کے لیے غیروں سے امتیازی سلوک ویسا ہی فطری عمل ہے جیسا کہ ہوا میں سانس لینا۔ برطانوی نوآبادیاتی نظام اور ہندو تعصب کے دو پاٹوں کے درمیان مسلمان پس کر رہ گئے۔ بقول سر ولیم ہنٹر "بات فقط اتنی نہیں کہ زندگی کی دوڑ میں مسلمانوں کو ہندوؤں کے مقابلے میں برابر کا موقع ملنا چاہیے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کم از کم بنگال میں تو اُن کی قسمت میں کوئی موقع ہی نہیں رہا۔ الغرض مسلمان بڑی شاندار روایات کی مالک قوم ہیں لیکن معاش کے سارے راستے ان پر مسدود ہیں۔"۱۰

مسلم حکومت کے دَور میں سرکاری دفتری زبان فارسی تھی۔ برطانیہ نے اس میں کوئی تبدیلی نہ کی تا آنکہ میکالے نے اپنی مشہور "تعلیمی یادداشت لکھی جس کا مقصد" ایسے افراد کا طبقہ پیدا کرنا ہے، جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوں گے، لیکن ذوق، فکر و نظر، اخلاق اور حکمت و دانش میں انگریز ہوں گے" اس پالیسی کے زیرِ عمل ۱۸۳۵ء میں یہ اعلان کر دیا گیا۔ کہ اب اعلیٰ عدالتوں میں فارسی کی جگہ سرکاری زبان انگریزی ہوگی۔ ہندوؤں کے لیے یہ ایک غیرملکی زبان کی جگہ دوسری غیرملکی زبان کی تبدیلی تھی، اور انھوں نے بلا تامّل انگریزی کو اختیار کر لیا۔ مسلمانوں کے لیے یہ فیصلہ بڑے دور رس نتائج کا حامل تھا۔ بہتوں نے خیال کیا کہ یہ مسلمانوں کی ثقافت کو ختم کرنے اور ان کے مذہب کو آلودہ کرنے کی دانستہ کوشش ہے۔ چنانچہ وہ انگریزی زبان سے علیحدہ اور دُور دُور رہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۸۱ — ۱۸۸۰ء میں انگریزی

ہائی سکولوں میں جہاں ۳۶۶۸۶ ہندو زیرِ تعلیم تھے، وہاں ان سکولوں کے مسلم طلبہ کی تعداد صرف ۳۶۳ تھی۔[۱۱]

مسلمانوں کے دورِ حکومت میں صدیوں تک اسلامی قانون کی عملداری تھی۔ اگرچہ شخصی قانون کے معاملات میں ہر فرقہ پر اپنی اپنی قانونی دفعات کا اطلاق ہوتا تھا۔ لیکن اس کی جگہ بتدریج مغرب کے قانونی اداروں نے لے لی اور ضابطہ دیوانی و فوجداری ہند اور ضابطہ تعزیراتِ ہند نافذ ہو گئے۔ اس کا بھی زیادہ تر اثر مسلمانوں نے ہی محسوس کیا۔ نقصِ قانون میں بھی اور عدالتی ملازمتوں میں بھی۔ مسلمانوں کی بربادی میں جو کسر باقی رہ گئی تھی اسے گویا پورا کرنے کے لیے انگریزوں نے جاگیروں پر نظرِ ثانی شروع کر دی جو مسلم حکمرانی کے دور میں عطا کی گئی تھیں۔ یہی سلوک مسلمانوں کے خیراتی اور تعلیمی اوقاف سے بھی روا رکھا گیا۔ اس نظرِ ثانی کے بعد وسیع پیمانہ پر ضبطیوں کا جو سلسلہ شروع ہوا، اس سے حکومت کی آمدنی تو بلاشبہ بڑھ گئی لیکن پرانے رؤسا مفلوک الحال ہو گئے، اسلامی تعلیم کا گلا گھونٹ دیا گیا اور متوسط طبقہ کے لوگ تو کوڑی کوڑی کے محتاج ہو گئے۔ نہ تو مسلمانوں کی خودداری انھیں اجازت دیتی تھی کہ وہ فاتحین کے ساتھ تعاون کریں اور نہ وہ زمانے کے نئے حالات کا ساتھ دینے کو تیار تھے۔ ان کے تلخ تجربات و مشاہدات بھی ایک حقیقت پسندانہ جائزہ لینے میں مانع تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ جذباتی طور پر ماضی میں اس قدر کھوئے ہوئے تھے کہ مستقبل کے بارے میں مناسب تدبیر کرنے سے قاصر تھے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کے سانحہ کے بعد وہ حسرت و یاس کی تصویر بن کر رہ گئے۔

مسلمانوں کے برعکس ہندو ہر میدان میں آگے بڑھ رہے تھے۔ ۱۷۹۳ء میں بنگال کے بندوبستِ دوامی نے انھیں بڑے بڑے زمینداروں کے مقام پر فائز کر دیا۔ اور اب نیا طبقۂ اُمرا انہی پر مشتمل تھا۔ مسلم حکمرانی کے دور میں تجارت پہلے ہی ان کے ہاتھوں میں تھی، چونکہ انھوں نے بڑے ذوق و شوق سے انگریزی تعلیم بھی حاصل کر لی، اس لیے وکالت، انجنیئرنگ، ڈاکٹری، تعلیم و تدریس اور صحافت میں ان کے لیے نئی نئی راہیں کھلنے لگیں۔ جو نیا متوسط طبقہ اُبھرا، وہ کم و بیش تمام تر ہندوؤں پر مشتمل تھا اور انگریزوں کے تحت

ہند کا جو نقشہ بن رہا تھا اُس کی قیادت یہی متوسط طبقہ سنبھال رہا تھا۔ ۱۸۷۸ء میں ۵۷ مسلمانوں کے مقابلہ میں ۳۱۵۵ ہندو گریجویٹ اور اس سے اعلیٰ ڈگریوں کے مالک تھے۔[۲۱] انگریزوں کے سیاسی افکار و نظریات کے زیرِ اثر قوم پرستی ایک روز افزوں اور طاقتور قوت کی حیثیت سے اُبھری اور اس نے بھی ہندوؤں کے سماجی استحکام میں بڑا حصہ لیا۔

ہند میں اپنی زندگی کے اس تاریک ترین لمحہ میں مسلم قوم نے سر سید احمد خاں ایسے عظیم پیکرِ جراٴت رہنما کو پیدا کیا۔ انھوں نے خداداد بصیرت سے بھانپ لیا کہ مسلمان کس قدر پستی میں گر چکے ہیں اور انھیں اُبھرنے کے لیے کس قدر کٹھن اور طویل راستہ طے کرنا ہے۔ ان کی دانست میں پہلا ضروری قدم انگریزوں اور مسلمانوں میں باہمی اعتماد کی فضا پیدا کرنا تھا۔ کیونکہ اس کے بغیر مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی جو بھی تدبیر کی جاتی وہ ایک طرف حکمرانوں کی مخالفت کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی، اور دوسری طرف عوامی غلط فہمیوں کے سمندر میں ڈوب جاتی۔ ان کے خیال میں دوسرا اہم اقدام تعلیمی نظام کی اصلاح تھا تاکہ مسلمان جدید علوم سے آراستہ ہو کر اس نئے ہند میں اپنی صحیح اور جائز حیثیت حاصل کر سکیں۔ غرض سر سیّد کا دوگونہ پروگرام تھا۔ جدید تعلیم اور حکومت سے تعاون۔ اگرچہ قدامت پسند عناصر نے ان کی شدید مخالفت کی، لیکن ان کے قدم متزلزل نہ ہوئے۔ انھوں نے ترقیٔ علم کے لیے ایک سائنٹیفک سوسائٹی کی بنا ڈالی، اسکول قائم کیے اور ایک مؤقر رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ اردو ادب کو وسعت دی اور نئے اسالیبِ بیان سے آشنا کیا، کتبِ تاریخ کی ترتیب و تدوین کی اور مسلمانوں کے لیے مفید قانون سازی کو بھی فروغ دیا۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کے مقام پر محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام تھا۔ وہ ایک یونیورسٹی قائم کرنے کے آرزومند تھے۔ لیکن ان کی یہ تمنا ان کے انتقال کے بیس سال بعد پوری ہوئی، جب کالج نے ترقی کے مراحل طے کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کر لی۔ علی گڑھ کالج محض تعلیمی ادارہ نہیں تھا، یہ ایک وسیع تحریک کا مظہر تھا جس سے مسلمانوں کی زندگی کا ہر پہلو سماجی، معاشی، سیاسی، ادبی اور مذہبی متاثر ہو رہا تھا۔ عوام تک اصلاح کا پیغام پہنچانے

کے لیے سرسید نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کو منظم کیا، جس کے اجلاس ملک کے مختلف حصّوں میں ہوتے رہتے تھے۔ ان اجتماعات نے سب سے بڑی خدمت جو سرانجام دی، وہ یہ تھی کہ مسلمان جوشِ عمل اور اپنی مدد آپ کے عزم و جذبہ سے سرشار ہونے لگے، حتیٰ کہ جن قدامت پرست علماء نے سرسید کو ملحد قرار دے کر ان کی مذمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی، وہ بھی ان کی عظمت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے۔ سرسید کے افکار و نظریات اور رفقائے شامل نے امید اور خود اعتمادی کا چراغ از سرِ نو روشن کیا۔ تنظیم اور امدادِ باہمی سے کام کرنے کی نئی راہوں کی نشاندہی کی، اور جدید علوم اور معاشی ترقی کا دروازہ کھول دیا۔

سرسید نے اگرچہ اپنی ساری زندگی مسلمانوں کی اخلاقی اور مادّی ترقی کے لیے جدوجہد میں بسر کر دی تھی، لیکن وہ مذہبی تعصّب اور تنگ نظری کے بندھنوں میں کبھی اسیر نہیں ہوئے تھے۔ ان کے ہندو احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا، اور وہ ہندو سماجی کارکنوں سے گہرے اشتراک کے ساتھ کام کرتے تھے۔ علی گڑھ کالج کے دروازے نہ صرف ہندو طلبہ پر کھلے تھے، بلکہ اس کے اساتذہ میں بھی ہندو موجود تھے۔ لیکن ایک مدبّر سیاستدان کی حیثیت سے، وہ نہ ہندوؤں کی قومی خصلتوں کو نظرانداز کر سکتے تھے، اور نہ اس بنیادی تفاوت سے چشم پوشی کر سکتے تھے، جو تعلیم اور معاشی طاقت و اثر کے معاملے میں دونوں قوموں میں پائی جاتی تھی۔ انھیں خوب معلوم تھا کہ تعلیم میں ہندو مسلمانوں سے پچاس برس آگے ہیں اور سرکاری ملازمت، تجارت اور دوسرے پیشوں کے معاملے میں تو اس سے بھی زیادہ سبقت حاصل کر چکے ہیں۔ جب ۱۸۶۷ء میں ہندوؤں نے دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی ہندی کو اُردو کی جگہ دلانے کے لیے ایجی ٹیشن شروع کی (حالانکہ اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ ورثہ تھی) تو سرسید نے پہلی مرتبہ اس حقیقت کا واضح طور پر اعتراف کیا کہ دونوں قومیں یک جہتی کے ساتھ اکٹھی نہیں رہ سکتیں۔ اس مرحلہ پر انھوں نے یہ پیش گوئی کی ”مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، بڑھتا نظر آتا ہے۔“[۱۳]

۱۸۸۵ء میں ایک ریٹائرڈ انگریز افسر ایلن آکٹیوین ہیوم کی تحریک پر اور وائسرائے لارڈ ڈفرن کی زیر رہنمائی انڈین نیشنل کانگرس معرضِ وجود میں آئی۔ بعد میں کانگرس ہند میں سب سے زیادہ طاقتور سیاسی جماعت بن گئی، لیکن ابتداً اس کے قیام میں صرف یہ مقصد کارفرما تھا کہ ایک ایسا ادارہ میسر ہو جائے، جس کے ذریعہ "ہند کے سیاستدانوں کو سال میں ایک مرتبہ مل بیٹھنے اور حکومت کو یہ بتانے کا موقع مل جائے کہ انتظامیہ کے کن شعبوں میں کیا خامیاں ہیں، اور ان کی کس طرح اصلاح کی جا سکتی ہے"[۱۸] سرسید نے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ کانگرس میں شمولیت اختیار نہ کریں۔ اور کافی عرصہ تک مسلمان بہ حیثیت مجموعی ان کے مشورہ پر کاربند بھی رہے۔ سرسید کی یہ رائے اس بنا پر نہیں تھی کہ وہ برطانوی حکومت کے متعلق کانگرس کے نظریات سے کوئی اختلاف رکھتے تھے، کیونکہ اس زمانہ میں تو کانگرس بھی کسی شرط و استثنا کے بغیر برطانوی تاج سے مکمل اور غیر متزلزل وفاداری کو ہی اس ادارہ کی اساس قرار دینے پر اصرار کرتی تھی۔[۱۸] نہ ہی سرسید کا مشورہ اس وجہ سے تھا کہ وہ جمہوریت کے خلاف تھے۔ اپنے ایک انگریز دوست کے نام خط میں سرسید نے لکھا تھا: "میرا مذہب یعنی اسلام جس پر مجھے پورا اور پکا یقین ہے وہ بھی ریڈیکل اصولوں کو سکھلاتا ہے اور شخصی گورنمنٹ سے موافق نہیں اور نہ لمیٹڈ مانرکی کو مانتا ہے بلکہ موروثی حکومت ناپسند کرتا ہے ایک پریزیڈنٹ جس کو لوگ منتخب کریں اس کو اسلام پسند کرتا ہے اور اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ دولت ایک جگہ اکٹھی رہے۔"[۱۹]

سرسید کی مخالفت کے دو اسباب تھے۔ پہلے سبب کا تعلق انڈین نیشنل کانگرس کی تشکیل اور کردار سے تھا، یہ بڑی حد تک ایک ہندو ادارہ تھی۔ تعلیم میں، سیاسی شعور میں اور دولت میں ہندو اتنی سبقت لے گئے تھے کہ لامحالہ وہ کانگرس پر حاوی تھے اور کانگرس کی معرفت ایسے مطالبات پیش کر سکتے تھے جو ان کے فائدے میں ہوتے۔ لیکن ضروری نہیں تھا کہ وہ مسلمانوں کے لیے بھی مفید ہوتے۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ یہاں مستقبل قریب میں خود مختار پارلیمنٹ کا قیام عمل میں آسکتا ہے۔ اس وقت منتہائے مقصود صرف اتنا تھا کہ برطانوی حکومت کے وضع کردہ ڈھانچے کے اندر پالیسی

اور انتظامیہ میں اہلِ وطن کا دائرہ اختیار رفتہ رفتہ بڑھتا چلا جائے۔ کانگرس کے بنیادی مطالبات یہی تھے کہ اعلیٰ ملازمتوں میں بتدریج ہندوستانیوں کا تناسب بڑھایا جائے اور نمایندہ اداروں میں توسیع عمل میں لائی جائے۔ انتظامیہ کے اعلیٰ مناصب پر ہندوستانیوں کے تقرر کا عملاً مطلب یہ تھا کہ اعلیٰ مناصب ہندوؤں کی دسترس میں آجائیں، کیونکہ جہاں تک انگریزی تعلیم کا تعلق تھا، مسلمان پس ماندہ ہونے کے باعث اپنا جائز حقہ، حصہ پانے سے قاصر تھے۔ سرسید نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کو کچھ عرصہ کے لیے اپنی ساری توجہ تعلیم اور معاشی بحالی پر مرکوز کر دینی چاہیے۔ سیاسی ایجی ٹیشن نہ صرف ان کی توجہ ان تعمیری کاموں سے پھیر دے گی، بلکہ انگریزوں کے عدمِ اعتماد اور شک و شبہ کو بھی دوبارہ زندہ کر دے گی۔

جو لوگ مشرق کی زرعی معیشت سے واقف نہیں۔ انھیں سرکاری ملازمتوں سے یہ وابستگی بہت عجیب نظر آئے گی۔ لیکن آج بھی کسان، زمیندار اور تجارت پیشہ لوگ ذاتی تجربہ کی بنا پر جانتے ہیں کہ لطف و نوازش سے بہرہ ور کرنے، حق رسی میں سدِ راہ بننے، مصیبت کا پہاڑ کھڑا کرنے اور پریشانی کا سامان پیدا کرنے میں انتظامیہ بہت زیادہ طاقت و اختیار کی مالک ہے۔ حکومت کو جو مالیہ ادا کرنا پڑتا ہے، وہ پیداوار کا ایک معتدبہ حصہ ہوتا ہے، اور اگر خشک سالی، بے موسمی بارش یا ژالہ باری سے فصلوں کو نقصان پہنچ جائے، تو مالیہ کا بار ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ جہاں نہروں سے آبپاشی کا نظام موجود ہے، وہاں آب رسانی کے بڑے افسر تو گویا خدائی کے اختیارات رکھتے ہیں۔ زمین یا پانی پر تنازعات یا گاؤں میں دوسرے جھگڑے طویل مقدمہ بازی تک نوبت پہنچا سکتے ہیں، جن کے باعث فریقین پولیس اور ماتحت عدالتوں کے لیے بہت آسان شکار بن کر رہ جاتے ہیں۔ جہاں معیشت جامد اور غیر متحرک ہو اور آبادی میں اضافہ ہو رہا ہو، وہاں نئی پود کے لیے معاشی مواقع بہت محدود ہوتے ہیں اور اگر ایک نیا تعلیم یافتہ طبقہ اُبھر رہا ہو، تو اس کے سامنے عملاً کوئی بھی مواقع نہیں ہوتے، سوائے ان کے جو سرکاری ملازمت پیش کرتی ہے۔

سرسید کی طرف سے مخالفت کی دوسری وجہ وہ معاشرتی اور سیاسی مشکلات تھیں جو ہند کے مخصوص حالات میں نمایندہ حکومت سے پیدا ہو سکتی تھیں اور جنھیں سرسید نے

پوری طرح بھانپ لیا تھا۔ وائسرائے لارڈ رپن کے زمانہ میں جب ہند میں نمایندہ اداروں کے قیام کا آغاز ہوا تو ان اداروں کے اصولاً حامی و مؤید ہونے کے باوجود سر سیّد نے انتباہ کی آواز بلند کی۔ ۱۸۸۳ء میں قانون ساز کونسل میں تقریر کرتے ہوئے اُنھوں نے کہا:—

"انگلستان سے ریپریزنٹیٹو انسٹی ٹیوشنوں کا اصول مستعار لینے میں ان سوشل اور پولیٹیکل معاملات کا یاد رکھنا ضروری ہے جن کے لحاظ سے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان امتیاز پایا جاتا ہے۔ ہندوستان فی نفسہٖ ایک برّاعظم ہے اور اس میں مختلف اقوام و مختلف مذاہب کے آدمی بڑی کثرت سے رہتے ہیں۔ مذہبی دستورات کی سختی نے اب تک ہمسایوں کو بھی ایک دوسرے سے جُدا رکھا ہے۔ ذات کا قاعدہ بہت شدّومد کے ساتھ جاری ہے۔ قوم اور مذہب کے متحد ہونے سے تمام انگریز ایک قوم ہو گئے ہیں۔ لیکن ایک ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے جہاں ذات کے اختلافات اب تک موجود ہیں جہاں مختلف قومیں خلط ملط نہیں ہوئی ہیں، جہاں مذہبی اختلافات اب تک زور پر ہیں اور جہاں تعلیم نے اپنے جدید معنی کے لحاظ سے باشندوں کے تمام فرقوں میں ایک مساوی مناسبت کے ساتھ ترقی نہیں کی۔ مجھ کو یقین کامل ہے کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کی کونسلوں میں مختلف مطالب کی حمایت کی غرض سے الیکشن کے خالص اور سادہ اصول کے جاری کرنے سے بہ نسبت محض تمدّنی خیالات کے زیادہ تر بڑی بڑی خرابیاں پیدا ہوں گی۔ بڑی قوم چھوٹی قوم کے مطالب پر بالکل غالب آوے گی اور جاہل آدمی گورنمنٹ کو اس قسم کی تدابیر کے جاری کرنے کا جوابدہ سمجھیں گے جن کے باعث سے قوم اور مذہب کے اختلافات بہ نسبت سابق کے اور بھی سخت ہو جائیں گے"۔[۱۶]

جب تک اقتدار کی باگ ڈور انگریزوں کے ہاتھ میں رہی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں نزاعات کا دائرہ ثقافتی اور معاشرتی معاملات تک محدود رہا، لیکن نمایندہ اداروں کے آغاز کے ساتھ ہی سیاسی نوعیت کے سوالات توجّہ کا مرکز بننے لگے۔ سیاسی اختیار کا

تدریجی انتقال کئی قسم کے جھگڑے اپنے جلو میں لایا، جن کی وجہ سے دبے ہوئے خدشات منظرِ عام پر آگئے۔ اس انتقالِ اقتدار سے دونوں قوموں میں تعاون کے نئے مواقع بھی سامنے آئے، لیکن اس کی وجہ سے کشمکش کے کئی نئے محاذ بھی کھل گئے۔ اگر دونوں قومیں آبادی، دولت، تعلیم اور اثر و رسوخ میں یکساں ہوتیں، تو اس مسئلہ کے حل کی تلاش آسان ہو جاتی۔ وجہ کچھ بھی ہو، حقیقت یہی تھی کہ معاشرتی اور معاشی جدوجہد کے ہر میدان میں مسلمانوں سے ہندو بہت آگے جا چکے تھے، اور ہندو اس برتری کو اپنا پیدائشی حق سمجھنے لگے تھے، ان کی نگاہ میں یہ تفوق ان کی اعلیٰ تعلیم، سماجی حیثیت اور دولت کا جائز نتیجہ تھا۔ وہ نہ صرف اپنی فوقیت کو برقرار رکھنے پر مصر تھے بلکہ سیاسی طاقت کے ذریعہ اپنی اس حالت کو اور بہتر بنانے کے خواہاں تھے۔ اس طرح جمہوریت کے امکانات نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشمکش کو شدید تر بنا دیا۔ جمہوریت میں اکثریت کی حکومت ہوتی ہے، لیکن اکثریت اگر مستقل اور موروثی ہو، اور اعلیٰ تعلیم، دولت اور سرکاری اثر و رسوخ سے لیس ہو، اخبارات بھی اس کی دسترس میں ہوں، اس کے پاس سیاسی تنظیم کے لیے صلاحیت واستعداد اور روپیہ پیسہ کی بھی کمی نہ ہو، تو ایسی حالت میں اقلیت کے لیے ثانوی حیثیت ہمیشہ کے لیے نوشتۂ تقدیر بن کر رہ جاتی ہے۔

اس صدی کے پہلے عشرہ میں وہ منزلِ مقصود اجاگر ہونے لگی، جس کی سمت ہند رواں دواں تھا۔ اس سے پہلے ہند اور انگلستان میں آزادی پسند آوازیں گاہے گاہے ضرور بلند ہوتی تھیں کہ ہند کو بالآخر اپنی حکومت قائم کرنے کا حق مل جائے گا، لیکن وہ دن جب انگلستان کی تولیت ختم ہو جائے گی حدِ نگاہ سے دور تھا۔ مغرب کی بالادستی اور برتری کا طلسم ۱۹۰۵ء میں روس پر جاپان کی فتح نے توڑ دیا۔ ترکی اور ایران میں مطلق العنان حکومتیں ٹوٹ رہی تھیں۔ ایشیا بہت طویل نیند سے بیدار ہونے لگا تھا۔

۱۹۰۹ء کی منٹو مارلے اصلاحات میں انتخابات کا اصول تسلیم کر لیا گیا، لیکن مرکزی مجلس قانون ساز اور بنگال کے سوا دوسری صوبائی مجالس قانون ساز میں منتخب ارکان کے مقابلے میں نامزد ارکان کی اکثریت برقرار رکھی گئی۔ بنگال میں منتخب ارکان کو تھوڑی سی

اکثریت حاصل تھی۔ انتخابات مسلمانوں اور غیر مسلموں کی جداگانہ نیابت کے اصول پر ہوئے تھے۔

جداگانہ انتخابات کا مطالبہ آغا خان کی قیادت میں ایک مسلم وفد نے ۱۹۰۶ء میں وائسرائے لارڈ منٹو سے کیا تھا۔ وائسرائے کو جو سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ اس میں وفد نے یہ بات واضح کی تھی کہ :۔

"۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہند کے مسلمانوں کی تعداد چھ کروڑ بیس لاکھ سے زاید ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ ملک معظم کی قلمرو ہند کی کل آبادی کے پانچویں اور چوتھے حصہ کے بین بین ہیں۔ کسی بھی نظامِ انتخاب میں خواہ وہ وسیع ہو یا محدود' جس قوم کی تعداد روس کے سوا درجہ اوّل کے دوسرے ہر یورپی ملک کی کُل آبادی سے زیادہ ہے۔ وہ اس مطالبے میں حق بجانب ہے کہ اسے مملکت میں ایک اہم عنصر تسلیم کیا جائے۔"

اس وفد نے مسلمانوں کی نمایندگی کے سلسلہ میں یہ مطالبہ کیا کہ :۔

"ان کی نمایندگی فقط آبادی کی نسبت سے ہی نہیں ہونی چاہیے بلکہ ان کی سیاسی اہمیت اور دفاع سلطنت میں ان کی خدمات کے اعتبار سے بھی ہونی چاہیے۔ موجودہ صورت میں یہ بات ناممکن ہے کہ کبھی کسی مسلمان کا نام حکومت کی منظوری کے لیے پیش کیا جائے۔ اِلّا یہ کہ تمام اہم معاملات میں وہ اکثریت کا ہمنوا ہو۔" ۱۹؎

وایسرائے نے وفد کے نظریات سے ہمدردی ظاہر کی' اور اس خیال کا اظہار کیا کہ "ہند میں کوئی بھی انتخابی نمایندگی لازماً شر انگیز ناکامی پر منتج ہو گی۔ جس کا مقصد مختلف فرقوں کے معتقدات اور روایات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے۔ انفرادی حق رائے دہی عطا کرنا ہو۔" ۱۹؎

۱۹۰۶ء کے اواخر میں مسلمانوں کے سیاسی اور دوسرے حقوق کی حفاظت کے لیے ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ مسلمان رہنماؤں کے اس تاریخی اجلاس کے لیے دعوت نامے ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ خاں نے جاری کیے تھے۔ آغا خان

کو لیگ کا صدر منتخب کیا گیا۔ ماضی میں دوسری مسلم جماعتیں قائم کی گئی تھیں، لیکن ان سابق تنظیموں کے مقابلہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کو بدرجہا زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی، اور وقت گزرنے کے ساتھ اسے ہند میں مسلمانوں کی نمایندہ سیاسی جماعت تسلیم کر لیا گیا۔

جداگانہ انتخابات کی تجویز نے ہندوؤں کو مخالفت پر ابھارا۔ ۱۹۰۹ء میں کانگرس نے "مذہب کی بنیاد پر جداگانہ انتخابات کے قیام پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا" اور آیندہ سالوں میں بھی وہ اپنے اس اعتراض کا اعادہ کرتی رہی[۲۰]۔ مخلوط بمقابلہ جداگانہ انتخابات ہند کی سیاسیات کا ایک اہم مسئلہ بن گیا۔ حقِ نیابت محدود تھا۔ اور چونکہ دولت اور تعلیم میں ہندو مسلمانوں سے بہت آگے تھے۔ رائے دہندگان میں ہندوؤں کی اکثریت اور بھی فزوں ہو گئی تھی۔ لوکل سیلف گورنمنٹ کے تجربہ نے واضح کر دیا تھا کہ مسلمانوں کے خدشات مبنی بر حقیقت تھے۔ مخلوط انتخاب میں مسلمانوں کے لیے نشستیں محفوظ کرنے کے باوجود صرف وہی مسلمان کامیاب ہو سکتے تھے، جن کی "قوم پرستی" ہندو ووٹروں کے نزدیک شک و شبہ سے بالاتر تھی "فرقہ پرستی" کا معمولی شائبہ بھی ایک مسلمان کی کامیابی کے امکانات کو غارت کر سکتا تھا۔ اس ضمن میں "فرقہ پرستی" سے مراد ہر وہ کوشش تھی جو پسماندہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کی جائے۔

اونچی اعلیٰ ذاتوں کے ہندو مشترکہ نیابت کے حق میں تھے، لیکن نیچ ذاتوں کے دبے ہوئے ہندوؤں کا مفاد جداگانہ نیابت میں ہی تھا۔ اسی طرح ان کے حقیقی نمایندے مجلس قانون ساز میں پہنچ سکتے تھے اور اپنی بات سنا اور منوا سکتے تھے۔ مخلوط انتخاب میں اعلیٰ ذاتوں کے ہندوؤں کے مقابلہ میں ان کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن یہ بیچارے اچھوت معاشرتی طور پر بے انتہا دبے ہوئے تھے، اس لیے برطانوی حکومت نے ان کی حق برآری کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔

معدودے چند ایسے مسلمان لیڈر بھی تھے، بالخصوص محمد علی جناح، جو اپنے سیاسی معتقدات کے تحت مخلوط انتخابات کے حامی تھے۔ گوپال کرشن گوکھلے، جو کانگرس کے اندر اعتدال پسندوں کا لیڈر تھا، جناح اس کے سرگرم نائب تھے۔ اعتدال پسند حضرات سماجی اصلاحات اور بتدریج آئینی ترقی میں یقین رکھتے تھے اور فرقہ بندی سے بالاتر

قوم پرستی کے متمنی تھے۔ کانگریس کے اندر انتہا پسندوں جن کا لیڈر بال گنگا دھر تلک تھا اور اعتدال پسندوں میں کشمکش رہتی تھی۔ تلک سوراج کا علمبردار تھا، اور اس کے حصول کے لیے برطانوی حکومت کے خلاف مسلسل ایجی ٹیشن ضروری سمجھتا تھا۔ وہ سیواجی کی عظمت کے گن گاتا تھا، جس نے اورنگ زیب کے خلاف جنگیں لڑی تھیں اور ہندوؤں کو جارحانہ وطنیت پر اُبھارتا تھا۔ انداز ہائے فکر اور حکمتِ عملی میں یہ اختلاف کئی برسوں تک مختلف صورتوں میں جاری رہا۔ اس کشمکش میں متقابل شخصیتیں تو بدلتی رہیں، لیکن اختلاف کی نوعیت کم و بیش وہی رہی۔ اعتدال پسند گروہ تعلیم یافتہ طبقہ کی معقولیت پسندی اور ذہن سے اپیل کرتا تھا، جبکہ انتہا پسند عوام کے جذبات اور دلوں پر دستک دیتے تھے۔

ایک مرحلہ ایسا بھی تھا جب اس مسئلے نے فیصلہ کن صورت اختیار نہیں کی تھی اور کئی ہندو اور مسلمان یہ خیال کرنے لگے تھے کہ مشترکہ قومیت تشکیل پذیر ہونے لگی ہے۔ لیکن جب عوامی تحریکوں کا دَور دورہ ہوا تو خالصتہً ہندو محرکاتِ عمل کا زیادہ سہارا لیا جانے لگا۔ اور اس طرح مشترکہ قومیت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد بھی ہندی قومیت کا ظاہری پیراہن غیر مذہبی اور غیر فرقہ وارانہ تھا، لیکن اس کی باطنی رُوح ہندو امنگوں کی آئینہ دار تھی۔ اگرچہ اس کی اپیل کے مخاطب، بلا لحاظ مذہب تمام شہری ہوتے تھے، لیکن جب کبھی مفادات میں تصادم کی نوبت آتی، ہندو مقاصد کو ہی فوقیت حاصل ہوتی۔

اس رجحان کی ایک ابتدائی لیکن بہت نمایاں مثال وہ متشددانہ ایجی ٹیشن ہے جس کا مقصد تقسیمِ بنگال کو منسوخ کرانا تھا۔ وہ شروع تو بنگال سے ہُوئی تھی۔ .... لیکن ہند کے دوسرے حصّے بھی اُس کی لپیٹ میں آ گئے۔ ۱۹۰۵ء میں وائسرائے لارڈ کرزن نے صوبہ بنگال کی سرحدوں کا از سرِ نو تعین کیا۔ اس اقدام کی زیادہ تر وجہ انتظامی مصلحتیں تھیں۔ بنگال کی آبادی سات کروڑ اسی لاکھ تھی اور یہ ایک بہت ہی بے ڈھب صوبہ تھا۔ کرزن نے اس صوبے کو تقسیم کر دیا، اور اس کے مشرقی حصّہ کو آسام میں شامل کر کے مشرقی بنگال اور آسام پر مشتمل ایک نیا صوبہ قائم کر دیا۔

اس نئے صوبے کی بیشتر آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ بنگالی ہندوؤں کی ساری ٹھاٹ باٹ مشرقی بنگال کے مسلمان کاشتکاروں کے گاڑھے پسینہ کی کمائی کی بدولت تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس نئے صوبے کے قیام کو اپنے ثقافتی، معاشی اور سیاسی غلبہ و تسلط کے لیے خطرہ قرار دیا اور اس کے خلاف اظہار احتجاج کے لیے جلسوں اور جلوسوں کا اہتمام کیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ برطانوی مصنوعات کے مقاطعہ اور سودیشی کپڑے کی سرپرستی کی تحریک شروع کر دی گئی۔ خلافِ قانون اور متشددانہ کارروائیوں کا آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑا تک اور دوسرے کانگرسی لیڈروں نے بنگالی ہندوؤں کی اس شکایت کی ہم نوائی شروع کردی، اور اسے کُل ہند مسئلہ بنا دیا۔ مسلمان جو تعلیم، سیاسی شعور، اور نشر و اشاعت کے جدید ذرایع سے استفادہ میں بہت ہی پس ماندہ تھے۔ کوئی ایسی تنظیم نہ رکھتے تھے جو اس تحریک کا مؤثر مقابلہ کرسکے۔ برطانوی حکومت نے ہندوؤں کے ایجی ٹیشن کے سامنے گھٹنے ٹیک دئے، اور ۱۹۱۱ء میں صوبے کی وہ تنظیم نو کالعدم قرار دے دی گئی، جو ۱۹۰۵ء میں کی گئی تھی۔ اور مشرقی بنگال کے مسلمان دوبارہ ہندوؤں کی محکومی میں چلے گئے۔ اس طرح ایک بڑی "قومی" فتح حاصل کر لی گئی۔

چند سال بعد جب پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی، تو ملک کی اکثریت نے انگریزوں کا پورا ساتھ دیا۔ ریاستی حکمران وفاداری کے مظاہروں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی دوڑ میں شامل ہوگئے۔ جنگ کے میدانوں میں ہند کے دس لاکھ سپاہی پہنچ گئے، اور جنگی مساعی کے فنڈوں میں بڑے خطیر اور فراخدلانہ عطیات دئے گئے۔ اگرچہ جنگ کے آخری دور میں، قیمتوں میں اضافہ کے رجحان اور فوجی بھرتی میں جبر سے کام لینے کے باعث بے چینی کے اثرات بھی ظاہر ہونے لگے۔

جنگ کے زمانہ میں مسلم لیگ اور کانگرس میں مفاہمت کا منظر بھی دیکھنے میں آیا۔ یہ زیادہ تر جناح کی مساعی کی بدولت تھا۔ جنھیں ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کے طور پر خراج تحسین پیش کیا جاتا تھا، ۱۹۱۶ء میں کانگرس اور لیگ دونوں کے سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہوئے اور ان میں آئینی اصلاحات کے ایک منصوبہ پر سمجھوتہ ہوگیا۔ یہ سمجھوتہ میثاق لکھنؤ کے نام سے

مشہور ہُوا۔ اِس سمجھوتے میں مسلمانوں کے لیے جداگانہ حقِ انتخاب کو تسلیم کرلیا گیا۔ صوبائی خود مختاری کا اہتمام کیا گیا۔ یہ بھی طے ہُوا کہ مرکزی اور صوبائی مجالسِ قانون ساز کے ۸۰ فیصد ارکان منتخب ہوں گے اور بعض شرائط کے تحت انتظامیہ مجلسِ قانون ساز کے سامنے جوابدہ ہوگی۔ یہ تحفظ قبول کیا گیا کہ جس مسوّدہ قانون یا قرار داد کا اطلاق کسی ایک فرقہ پر ہوگا، اگر اس فرقے کے تین چوتھائی ارکان اس کے مخالف ہوں گے، تو اسے منظور کرنے کے لیے کارروائی نہیں کی جائے گی۔ اس سمجھوتے میں مرکزی حکومت میں مسلم منتخب ارکان کا تناسب ۳۳ ۱/۳ فی صد مقرر کیا گیا۔ پنجاب اور بنگال میں، جہاں مسلمان اکثریت میں تھے، ان کی نمایندگی کا تناسب علی الترتیب ۵۰ اور ۴۰ فیصد قرار دیا گیا۔ بمبئی، صوبجاتِ متحدہ، بہار، وسطی صوبجات اور مدراس میں مسلمانوں کے لیے نمایندگی کا تناسب علی الترتیب ۳۳ ۱/۳، ۳۰، ۲۵، ۱۵، اور ۱۵ مقرر کیا گیا۔ پنجاب اور بنگال کو ان کی مسلم اکثریت کے استحقاق سے کم نمایندگی دی گئی۔ البتہ دوسرے صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے، انھیں آبادی میں تناسب سے زیادہ نمایندگی دی گئی۔ مسلم اہلِ قلم نے اس سمجھوتے پر اکثر و بیشتر یہ اعتراض کیا ہے کہ مسلمان جن صوبوں میں اقلیت میں تھے، وہاں آبادی کے تناسب سے قدرے زیادہ نمایندگی مل جانے سے ان کے لیے کوئی خاص فرق نہ پڑا، لیکن پنجاب اور بنگال میں وہ اپنی اکثریت سے محروم ہوگئے۔ اس منصوبے کی بہرحال یہ بڑی خوبی تھی کہ آئینی مسائل پر ایک ایسا سمجھوتہ ہوگیا، جس پر ہندو اور مسلمان دونوں قومیں متفق تھیں۔

جنگوں میں تیزی سے تغیر و تبدل ہوتے ہیں۔ برطانوی حکومت نے بھی اہلِ ہند کی امنگوں کو مناسب پذیرائی بخشنا ضروری سمجھا اور ۲۰ ر اگست ۱۹۱۷ء کو وزیرِ مملکت برائے ہند ایڈون مانٹیگ نے دار العوام میں برطانوی پالیسی کے بارے میں ایک باقاعدہ اعلان کیا۔ اس اعلان کا کلیدی جملہ یہ تھا: "ملکِ معظم کی حکومت کی پالیسی، جس سے حکومتِ ہند کو پورا پورا اتفاق ہے، یہ ہے کہ انتظامیہ کے ہر شعبے میں اہلِ ہند کی شمولیت بڑھتی چلی جائے، اور خود مختار اداروں کو یوں بتدریج فروغ دیا جائے کہ

برطانوی سلطنت کا جزوِ لاینفک رہتے ہوئے ہند میں ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کا مقصد ارتقائی طور پر حاصل ہو جائے۔"

۱۹۱۸ء کے وسط میں مانٹیگ اور وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ نے مشترکہ طور پر ہند کی آئینی اصلاحات پر ایک رپورٹ شایع کی، جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء کی اساس بنی۔ اس ایکٹ کے زیرِ عمل صوبوں میں دو عملی نظام کے تحت قانون ساز کونسلیں قائم کی گئیں۔ اس کی صورت یہ تھی کہ "ضابطہ اور امن عامہ" سے متعلق تمام امور کے انتظام میں ایگزیکٹو کونسلر گورنر کے سامنے جواب دہ تھے۔ اور قومی تعمیر و ترقی کے محکموں، مثلاً تعلیم اور زراعت کے وزرا قانون ساز کونسلوں کے سامنے جوابدہ تھے۔ لیکن پیشتر اس کے کہ ان آئینی اصلاحات پر عمل درآمد کیا جاتا، سارے برِصغیر کو ایک انتہائی شدید سیاسی طوفان سے دوچار ہونا پڑا، اس طوفان نے بعد کے سارے واقعات پر اپنا نقش چھوڑا۔

جس چنگاری سے چاروں سو آگ بھڑک اٹھی، وہ ۱۹۱۹ء میں منظور ہونے والے امتناعی قانون تھے، جو رولٹ قوانین کے نام سے مشہور ہیں۔ ان قوانین کے تحت حکومت کو گرفتاری اور سماعت بلا جیوری کے مستبدانہ اختیارات دیے گئے تھے۔ قدرتی طور پر ان کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ ملک کے ہر حصے میں احتجاجی جلسے ہوئے۔ امرتسر کے جلیانوالہ باغ کے ایک ایسے ہی جلسہ میں جنرل ڈایر نے خون کی ندیاں بہا دیں۔ چند منٹوں کے اندر ۳۷۹ افراد ہلاک اور ۱۲۰۰ سے زائد زخمی کر دیے گئے۔ غیر سرکاری اندازوں کے مطابق ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔ مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ اور لا تعداد صورتوں میں شہریوں کی تحقیر و تذلیل کی گئی۔ ڈایر کا مقصد طاقت کے ظالمانہ مظاہرے سے لوگوں کو دہشت زدہ کرنا تھا۔ لیکن نتیجہ عین برعکس نکلا۔ بے سمجھے سوچے وہ برطانوی راج کے خلاف نفرت اور بیزاری کا شدید جذبہ ابھارنے کا موجب بن گیا۔

بایں ہمہ، دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں کانگرس کا جو اجلاس ہوا، اس میں اگرچہ مانٹیگ چیمسفورڈ اصلاحات کو "ناکافی، غیر تسلی بخش اور مایوس کن" قرار دیا گیا، لیکن ان پر عمل درآمد کے لیے آمادگی بھی ظاہر کی گئی۔ حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن غالباً پرانے خطوط

پر جاری رہتی، اور کوئی انقلابی رُخ اختیار نہ کرتی، اگر جذبات کو ایک بین الاقوامی واقعہ ہوا نہ دیتا اور سیاسی حکمتِ عملی کا ایک اعلیٰ ماہر باگ ڈور اپنے ہاتھ میں نہ لیتا۔ یہ بین الاقوامی واقعہ معاہدہ سیورے تھا، جس کی سخت شرائط سے واضح ہوگیا کہ فاتح اتحادی سلطنتِ عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرنا چاہتے بلکہ وہ ترکوں کے اپنے وطن کو تباہ و برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں نے اِس معاہدے کو مغربی مسیحیت کی طرف سے اسلام کی سیاسی طاقت کو، جس کا مظہر خلافتِ عثمانیہ تھی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فنا کر دینے کی سوچی سمجھی تدبیر قرار دیا۔ علی برادران — مولانا محمد علی اور شوکت علی؛ ابوالکلام آزاد اور دوسرے مذہبی رہنماؤں کی فعال قیادت نے مسلم عوام کے گہرے اضطراب کو دہکتے ہوئے جذبات کے انگارے بنا دیا۔ اس زمانہ کے ہیجان کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ خلافت سے متعلق برطانوی پالیسی کے خلاف اظہارِ احتجاج کے لیے اٹھارہ ہزار سے زاید مسلمان اپنے آبائی گھر بار چھوڑ کر افغانستان کو ہجرت کر گئے۔

وہ سیاسی مدبر، جس نے ان حالات کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ موہن داس کرم چند گاندھی تھا۔ اس نے اپنی عملی زندگی کا بیشتر حصہ جنوبی افریقہ میں گزارا تھا، جہاں اس نے نسلی امتیاز کے خلاف ستیا گرہ (جس کے لفظی معنی صداقت کی راہ میں استقامت ہیں) اور اہنسا یعنی عدم تشدد کے ہتھیاروں سے جنگ لڑی تھی۔ اِس طریقِ کار کا لبِ لباب ہے، برائی سے عدم تعاون بغیر تشدد کے اور بغیر اس کے کہ نفرت کا خیال تک دل میں جاگزیں ہو۔ اس طریقِ کار سے جنوبی افریقہ میں کچھ کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ گاندھی ۱۹۱۵ء میں ہند میں واپس آیا۔ اس زمانہ میں وہ گوکھلے کا پیروکار تھا، اور کسی لحاظ سے بھی انتہا پسند نہ تھا۔ اُس نے پہلی جنگِ عظیم میں برطانیہ کی جنگی مساعی کی پُوری حمایت کی، اور کچھ عرصے کے لیے فوج میں بھرتی کے لیے ایجنٹ کے طور پر بھی کام کیا۔ اگرچہ اُس نے ۱۹۱۹ء کے رولٹ قوانین کے خلاف ہڑتالیں کرانے میں بہت نمایاں حصہ لیا لیکن اس سال کے آخر میں امرتسر میں کانگرس کا جو اجلاس ہُوا، اس میں مانٹیگ چیمسفورڈ اصلاحات کو منظور کر لینے کی پُرزور وکالت کی۔ البتہ انگریزوں کے ساتھ غیر مشروط تعاون کے سلسلہ میں یہ اُس کا آخری اقدام تھا۔

ہندو لیڈروں میں صرف گاندھی ہی وہ صاحب بصیرت شخص تھا جس نے محسوس کیا کہ اگر تحریکِ خلافت سے مسلم عوام میں پیدا شدہ بے پایاں توانائی کو سوراج کی حمایت کے لیے استعمال کیا جاسکے تو بیک جنبش ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو عظیم فرقوں میں اتحاد معرضِ وجود میں آجائے گا، اور پرانی آئینی جدوجہد کو ایک انقلابی نوعیت کی عوامی تحریک میں تبدیل کیا جاسکے گا۔ تحریکِ خلافت کے مقاصد میں مسلمان کامیاب ہوتے ہیں یا نہیں؛ آزادیٔ ہند کے لیے یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ گاندھی کے نزدیک بنیادی اہمیت اس بات کو تھی کہ اس تحریک کو کس کام کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے؟ چنانچہ اس نے تمام اہلِ ہند کی طرف سے مسلم مطالبات کی پُرزور تائید کی، اور آزادیٔ ہند اور بحالیٔ خلافت کے دوگونہ مقاصد کے حصول کے لیے ایک لائحۂ عمل کا خاکہ پیش کیا۔

منصوبہ یہ تھا کہ برطانوی اداروں اور مصنوعات کے مکمل مقاطعہ سے حکومت کو معطل کردیا جائے۔ اہلِ وطن سرکاری ملازمتوں سے دستبردار ہوجائیں، خطابات واپس کردیں، عدالتوں کا رُخ نہ کریں۔ سکولوں اور کالجوں کو چھوڑ دیں اور مانٹیگ چیمسفورڈ اصلاحات کے تحت جو انتخابات ہونے والے تھے، ان میں کوئی حصہ نہ لیں۔ اور یہ سب کچھ پُرامن طریقے سے ہو۔ عدم تشدد اس پروگرام کا لازمی حصہ تھا۔ گاندھی کے نزدیک یہ بات بمنزلہ ایمان و عقیدہ تھی، دوسرے اسے مصلحت کا تقاضا قرار دیتے تھے، لیکن سب نے ہی اسے قبول کرلیا۔ گاندھی نے لوگوں کو یقین دلایا کہ "شیطانی حکومت سے عدم تعاون" کا جو پروگرام اس نے مرتب کیا ہے، اگر اس پر متحدہ طور پر، نظم و ضبط کے تحت اور تشدد کے بغیر عمل درآمد کیا گیا، تو انھیں ایک سال کے اندر ہی سوراج مل جائے گا۔ گاندھی کی جوگیانہ شخصیت ہندو عوام کے مذہبی جذبات کے لیے مسحورکن کشش رکھتی تھی۔ اس نے فقیری کی لنگوٹی پہن لی، اور نہ صرف مہاتما کے لقب سے اسے شہرت حاصل ہوگئی، بلکہ بطور مہاتما اس کی کم و بیش پرستش بھی کی جانے لگی۔ اس لبادہ میں، اور اس نام کے ساتھ وہ اپنی زندگی کے آئندہ اٹھائیس برس کانگرس کی سیاسی تنظیم کا مسلّم الثبوت مختار و مالک بنا رہا۔ مسلمانوں میں تو اس سے پہلے ہی ہند کے طول و عرض میں قائم شدہ خلافت کمیٹیوں نے جوش و خروش کی آگ لگا رکھی تھی۔

کانگرس نے گاندھی کی رہنمائی میں اس پروگرام کو کلکتہ کے خاص اجلاس میں منظور کیا، اور پھر چند ماہ بعد دسمبر ۱۹۲۰ء میں اپنے ناگپور کے اجلاس میں اس کی دوبارہ توثیق کر دی۔ اس آخری موقعے پر اس پروگرام کے خلاف صرف ایک آواز بلند کی گئی — یہ جناح تھے — جنھیں اپنے دل کی بات برملا کہنے میں کوئی باک نہیں تھا۔ انھوں نے کہا کہ گاندھی کے طور طریقے تباہ کن انتشار کی منزل کی طرف لے جائیں گے۔

گاندھی نے جس ڈرامائی انداز میں تحریکِ خلافت کی حمایت کی اور سوراج کے لیے ہندو مسلم اتحاد کو بطور اولیں اور ناگزیر شرط کے پیش کیا۔ اس سے متاثر ہو کر ہندوؤں اور مسلمانوں کی دونوں قوموں نے مدت مدید کی دشمنیوں اور شکوک و شبہات کو بھلا دیا۔ علی برادران کی جرأت مندانہ اور سرگرم قیادت نے اتحاد کے پیغام کو ملک کے گوشے گوشے میں پھیلا دیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں محبت اور اخوت کے رقت انگیز مناظر دیکھے گئے۔ عام لوگ سوراج کے خیال اور جذبے سے سرشار ہو گئے۔ انگریز جواب تک بالاتر مخلوق سمجھے جاتے تھے، وہ پاپی اور غاصب قرار دیے جانے لگے، اور برطانوی راج کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں۔ لوگوں کے دلوں سے فوج، پولیس اور حکومت کے دوسرے جابرانہ ساز و سامان کی ہیبت نکل گئی، اور ہزاروں لوگ ہنستے کھیلتے جیلوں میں چلے گئے۔ ہر غیر ملکی چیز مسترد کر دی گئی، غیر ملکی کپڑے کے الاؤ جلا کر مسرت کا اظہار کیا گیا، کھدر یعنی ہاتھوں سے کاتے ہوئے سوت کا کھردرا کپڑا معاشرہ کے انتہائی مغرب زدہ طبقہ کا بھی لباس بن گیا۔ چرخا آزادیٔ ہند کا مظہر قرار پایا۔ گاندھی خود بھی ہر روز چرخے پر سوت کاتتا تھا۔ لنکاشائر کی ملوں کے لیے اس تحریک کے نتائج کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھے۔ ایک بات جو پوری طرح واضح نہ تھی تاہم مبنی برحقیقت تھی، وہ یہ تھی کہ کھدر کی بہت محدود و بہم رسانی کے باعث ملک میں کپڑے کی ملوں کو بہت فائدہ پہنچا اور مالکانِ مل کی طرف سے جو زیادہ تر ہندو تھے، خطیر چندوں نے کانگرس کے لیے ٹھوس مالی بنیاد قائم کر دی۔

مسلمان اس جد و جہد میں پیش پیش تھے، انھوں نے اس پروگرام کے ہر حصے پر مذہبی جوش و اخلاص سے عمل درآمد کیا۔ علماء نے یہ فتویٰ صادر کیا کہ انگریزی حکومت کی سول اور فوجی دونوں قسم کی ملازمت اسلام کے نزدیک ناجائز اور ممنوع ہے۔ حکومت کے منظور شدہ تعلیمی اداروں سے مقاطعہ کرنے کے لیے علی برادران نے علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی کا محاصرہ کر لیا۔ انھیں یونیورسٹی کو بند کرانے میں تو کامیابی حاصل نہ ہوئی، لیکن کافی تعداد میں اساتذہ اور طلبہ نے علیحدگی اختیار کر کے ایک متقابل مسلم نیشنل یونیورسٹی

کی بنیاد رکھ دی، جسے بعد میں دہلی میں منتقل کر دیا گیا، اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ بنارس میں ہندو یونیورسٹی، جس کا نگران سناتن دھرمی ہندو لیڈر پنڈت مالویہ تھا، ایسی آزمائش سے دوچار نہ ہوئی۔

نومبر ۱۹۲۰ء میں مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز کے جو انتخابات ہوئے، کانگرس نے ان کا مقاطعہ کیا۔ لیکن ایک تہائی رائے دہندگان نے ان میں حصہ لیا۔ پنجاب میں سر فضل حسین کی قیادت میں یونینسٹ پارٹی اور مدراس میں غیر برہمنوں کی جسٹس پارٹی نے مستحکم وزارتیں بنالیں۔ انتظامیہ کا شیرازہ بکھرنے کی توقع پوری نہ ہوئی، کیونکہ بہت کم سرکاری ملازمین نے استعفے دیے۔ لیکن ۱۹۲۱ء کے دوران میں بھی یہ تحریک پورے زور سے جاری رہی، اور اس سال جب پرنس آف ویلز نے دورہ کیا، تو اس کا بھی مقاطعہ کیا گیا۔ حکومت اور عوام کے درمیان کشیدگی بڑھتی چلی گئی۔

۵ فروری ۱۹۲۲ء کو ضلع فرخ آباد۔ یو پی کے ایک گاؤں چوری چورا میں پولیس اور ایک جلوس کے درمیان تصادم ہوا۔ ہجوم نے تھانے کو نذر آتش کر دیا اور پولیس کے بائیس سپاہی زندہ جلا دیے۔ نظم وضبط کا یوں درہم برہم ہوجانا ہرگز باعث حیرت نہیں۔ تعجب انگیز بات تو یہ ہے کہ اتنے طویل عرصے کے لیے نظم وضبط کس طرح برقرار رہا۔ تشدد کے اس مظاہرے سے گاندھی کو اس قدر صدمہ ہوا، کہ اس نے فی الفور تحریک بند کرنے کا اعلان کر دیا، اور اعتراف کیا کہ "ابھی تک ہند میں وہ پر امن اور صداقت پرستانہ ماحول پیدا نہیں ہوا، جو عام نافرمانی کا جواز پیش کر سکتا۔" [۲۲] اس یک لخت کایا پلٹ نے عوام اور لیڈروں میں بڑی پریشانی اور مایوسی پیدا کر دی۔ عوام کا خیال یہ تھا کہ چوری چورا کے اس سانحہ کے باوجود اگر تحریک کو جاری رکھا جاتا، تو برطانوی حکومت کو بڑی حد تک قومی مطالبات ماننے پڑتے۔ علی برادران اور بہت سے دوسرے لیڈر قبل ازیں گرفتار کیے جا چکے تھے۔ اب گاندھی کے خلاف بھی بغاوت پر اکسانے کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا، اور اسے چھ سال کی سزائے قید دی گئی۔ تحریک کے بے نظمی کا شکار ہونے، اور لیڈروں کے جیلوں میں بند ہوجانے کے بعد کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے

مسلمانوں پر اس کا ردعمل سب سے زیادہ اور بہت ہی شدید ہوا۔ ان کا احساس یہ تھا کہ جب وہ فتح وکامرانی سے ہمکنار ہونے ہی والے تھے کہ ان سے غداری کی گئی۔ لیکن ابھی انہوں نے اس سے بھی شدید تر صدموں کا منہ دیکھنا تھا۔ جس خلافت کے لیے انہوں نے اس قدر والہانہ جدوجہد

کی تھی، اس پر ضرب کاری دشمنوں کے ہاتھوں سے نہیں، بلکہ ایک مسلم ہیرو مصطفےٰ کمال اتاترک کے ہاتھوں سے لگنے والی تھی۔ اتاترک کی قیادت میں ترکوں نے ایک جدید قوم کی حیثیت سے از سرِ نو سفر کا عزم کیا، اور خلافت کے بارے سبکدوش ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ ترکوں کے لیے یہ اقدام خواہ کس قدر منطقی کیوں نہ ہو، ہند کے مسلمانوں پر اس سے سکتہ طاری ہوگیا۔ پچھلے کئی برسوں سے جو قربانیاں انہوں نے دی تھیں اور جو خون اور آنسو بہائے تھے سب کے سب یکسر اکارت نظر آنے لگے۔ وہ گویا ایک پیکرِ موہوم کے پیچھے دوڑتے رہے تھے وہ ارفع جذبات کے پروں سے اونچے اڑتے رہے اور اب دھڑام سے زمین پر آگرے۔

ہندوؤں میں کھوکھلے مقصد کے تعاقب میں سرگرم رہنے کا ایسا کوئی احساس نہ تھا۔ گاندھی کی گرفتاری سے انہیں ضرور دھچکا لگا، لیکن اس جدوجہد سے ہندو لیڈروں اور ہندو عوام میں سیاسی تنظیم اور منضبط جرأت مندی کی قوت و اثر کا ایک نیا اعتماد پیدا ہوا۔ آزادی تو حاصل نہیں ہو سکی تھی، لیکن ان کے نزدیک وہ وقت دُور نہ تھا جب وہ پورے برِصغیر کے آقا و مالک ہوں گے۔

گاندھی اور دوسرے بیشتر لیڈر ۱۹۲۴ء تک رہا کر دیے گئے۔ لیکن جیلوں سے باہر جس دنیا میں انہوں نے قدم رکھے، وہ بالکل مختلف تھی۔ انقلابی جدوجہد کی ولولہ انگیزی اور ہندو مسلم اتحاد کی ہمہ گیر روح افسانۂ ماضی بن چکی تھی۔ لوگ پھر اپنے روایتی اور محدود دائرہ ہائے فکر و نظر کے گرفتار ہو چکے تھے۔ پرانے نزاعات پھر ابھر آئے تھے۔ بعض ہندو لیڈروں نے مسلمانوں کو ہندو بنانے کی تحریک شروع کر دی۔ جو ایک نئی تلخی کا سبب بنی۔ پنجاب میں سر فضل حسین کے اس حکم نے کہ بعض گورنمنٹ کالجوں اور صوبہ کی سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے لیے ۴۰ فیصد نشستیں مخصوص کر دی جائیں، ہندو اخبارات میں غیظ و غضب کا طوفان برپا کر دیا۔ اگلے چند برسوں میں کئی مقامات پر ہندو مسلم فسادات ہوئے۔ ملک کی سیاسی فضا عام طور پر بے حسی کا شکار ہوگئی۔ گاندھی اپنے آشرم میں گوشہ نشین ہوگیا اور اپنا سارا وقت چرکھا کاتنے یا سماجی اصلاح کے مسائل پر صرف کرنے لگا۔

کانگرس کی صفوں میں اس بات پر اختلاف رائے پیدا ہوگیا کہ فوری طور پر کیا تدابیر اختیار کی جائیں؟ "تبدیلی کے مخالف" اس بات پر مُصر تھے کہ مجالس قانون ساز کا مقاطعہ جاری رکھا جائے، دوسرا گروپ، جس کو سوراجیہ پارٹی کے نام سے سی۔ آر۔ داس اور موتی لال نہرو نے منظم

کیا۔ اس بات کا حامی تھا کہ انتخابات میں حصہ لے کر مجالس قانون ساز میں داخل ہونا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی بات منوالی۔ سی آر داس قوم کے لیے ایک بلند پایہ لیڈر ثابت ہوا۔ وہ بہت ہی دانشمند اور عالی ظرف انسان تھا۔ ہندوؤں میں وہ تنہا لیڈر تھا، جو مسلمانوں کو ان صوبوں میں سیاسی اختیار دینے کا حامی تھا، جہاں وہ آبادی میں اکثریت کے باعث اس کے مستحق تھے۔ اس کی تجویز یہ تھی کہ بنگال میں مسلمانوں کو صوبائی کونسل میں اپنی آبادی کی بنیاد پر جداگانہ نیابت کا حق ملنا چاہیے۔ اور انہیں ۵۵ فیصد سرکاری ملازمتیں بھی ملنی چاہئیں۔ اس تجویز نے میثاقِ بنگال کی صورت اختیار کی، جسے ۱۹۲۳ء میں بنگال کی سوراجیہ پارٹی نے منظور کر لیا، لیکن اگلے ہی سال کانگرس نے اسے مسترد کر دیا ۱۹۲۵ء کے موسمِ گرما میں سی آر داس کی وفات سے وہ واحد ہندو لیڈر منظرِ عام سے غائب ہو گیا، جس پر مسلمان پوری طرح اعتماد کرتے تھے۔ ہندو لیڈر شپ کو اس کے بعد کبھی اتنی بلندی نصیب نہ ہو سکی۔

نومبر ۱۹۲۶ء میں برطانوی حکومت نے سرجان سائمن کی صدارت میں ایک کمیشن قائم کیا۔ جس کا مقصد ہند کی آیندہ آئینی ترقی کے بارے میں رپورٹ پیش کرنا تھا۔ اس کمیشن میں چونکہ ایک بھی ہندوستانی رکن نہ تھا، اس لیے کانگرس نے اس کا مقاطعہ کیا۔ اور محمد علی جناح کی قیادت میں مسلم لیگ کے ایک حصے نے بھی اس کمیشن کا مقاطعہ کیا۔ البتہ مسلم لیگ کے ایک دوسرے حصے نے، جس کے رہنما سر محمد شفیع تھے، کمیشن سے تعاون کیا۔ تاہم مسلمان اور ہندو لیڈروں نے یہ محسوس کیا کہ محض مقاطعہ کافی نہیں بلکہ کوئی مثبت اور تعمیری قدم اٹھانا بھی ضروری ہے۔ فروری ۱۹۲۸ء میں ایک کل جماعتی کانفرنس منعقد کی گئی، جسے آئینِ ہند کے اصولوں کے تعین کا فرض سونپا گیا۔ اس کمیٹی کا صدر سوراجیہ پارٹی کا لیڈر موتی لال نہرو تھا۔

اس کمیٹی کی رپورٹ جو نہرو رپورٹ کے نام سے موسوم ہوئی، اس میں خود مختار مستعمرات (ڈومینین) کے آئین کے نمونے پر پوری ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا گیا۔ کمیٹی نے شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان کے لیے مکمل صوبائی مرتبہ اور سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے ایک نئے صوبے کے قیام کی سفارش کی۔ یہ مسلم نقطۂ نظر سے رعایت تھی۔ دوسری طرف کمیٹی نے جداگانہ انتخابات کی جگہ مشترکہ انتخابات کی تجویز اس تحفظ کے ساتھ پیش کی کہ اقلیت کے لیے آبادی کے تناسب سے نشستیں محفوظ ہوں گی اور اقلیت کو مزید نشستوں کے لیے بھی انتخابات میں حصہ لینے کا حق

حاصل ہوگا۔ لیکن پنجاب اور بنگال میں کسی بھی فرقہ کے لیے نشستیں محفوظ نہیں ہوں گی۔ اس کا لازماً نتیجہ یہ نکلتا کہ ان دونوں صوبوں میں مسلم اکثریت اقلیت میں تبدیل ہو کر رہ جاتی۔ بالغ رائے دہی کی منزل ابھی بہت دور تھی اور جائیداد اور تعلیم پر مبنی محدود رائے دہی کی اساس پر مسلم ووٹوں کی تعداد ان دونوں صوبوں میں ان کی آبادی کے تناسب سے بہت کم رہ جاتی (پنجاب اور بنگال میں مسلم آبادی کا تناسب علی الترتیب ۵۰ اور ۵۵ فیصد تھا) ہندوؤں کو نہ صرف دولت اور سیاسی تنظیم میں فوقیت حاصل تھی، بلکہ انتظامیہ میں ان کے غلبے کی وجہ سے ان کا پلڑا اور بھی بھاری ہو جاتا۔ کمیٹی نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ مرکزی حکومت جس میں ہندوؤں کی مستقل اکثریت تھی۔ صوبوں پر مانٹیگ چیمسفورڈ اصلاحات کے مطابق اپنا تسلط قائم رکھے گی۔ مزید براں باقی ماندہ اختیارات جو صراحتاً صوبوں یا مرکز کو تفویض نہ کیے گئے ہوں وہ بھی مرکزی حکومت کو دیے جائیں گے۔

دسمبر ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ پر غور و خوض کرنے کے لیے کلکتہ میں ایک کل جماعتی قومی کنونشن منعقد ہوئی۔ اس میں محمد علی جناح نے تین اہم ترامیم پیش کیں:

(۱) مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمائندگی دی جائے۔

(۲) دس سال تک پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو آبادی کی اساس پر نمائندگی دی جائے اور

(۳) باقی ماندہ اختیارات مرکزی حکومت کو نہ دیے جائیں بلکہ صوبوں کو تفویض کیے جائیں۔

ڈاکٹر بی آر امبیدکر نے لکھا ہے "ان ترامیم سے واضح ہوتا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں خلیج بہت زیادہ وسیع نہ تھی۔ تاہم اس خلیج کو پاٹنے کی کوئی خواہش موجود نہ تھی"[۲۳] یہ تینوں ترامیم ہندو اکثریت کی ووٹ سے مسترد کر دی گئیں۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معدودے چند نام نہاد قوم پرستوں کے سوا باقی سارے مسلمان نہرو رپورٹ کی مخالفت میں متحد ہو گئے۔ جنوری ۱۹۲۹ء میں آغا خان کی صدارت میں ایک کل جماعتی مسلم کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس نے جداگانہ انتخابات کو برقرار رکھنے کا مطالبہ کیا۔ اسی زمانے میں جناح نے چودہ نکات مرتب کیے، ان سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی رائے عامہ کیا تھی۔ یہ چودہ نکات حسب ذیل تھے:

۱۔ مستقبل کا آئین وفاقی نوعیت کا ہونا چاہیے، اور باقی ماندہ اختیارات صوبوں کو تفویض

کرنے چاہئیں۔

۲۔ تمام صوبوں کو یکساں نوعیت کی خودمختاری عطا کی جائے۔

۳۔ ملک کی تمام قانون ساز مجالس اور دوسرے منتخب اداروں کی تشکیل ہر صوبہ میں اقلیتوں کو مناسب اور موثر نمائندگی دینے کے اصول پر کی جائے، لیکن کسی بھی صوبے میں اکثریت کو اقلیت یا برابری میں تبدیل نہ کیا جائے۔

۴۔ مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی نمائندگی ایک تہائی سے کم نہ ہو۔

۵۔ فرقہ وارانہ گروپوں کے لیے نمائندگی جداگانہ انتخاب کی بنا پر جاری رہے، تاہم ہر فرقہ کو اس امر کا اختیار ہو کہ آگے چل کر کسی بھی وقت وہ مشترکہ انتخابات کے حق میں اپنی علیحدہ نیابت سے دستبردار ہو جائے۔

۶۔ اگر کسی وقت علاقائی تقسیم نو کی ضرورت محسوس کی گئی، تو وہ کسی صورت پنجاب، بنگال اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کی مسلم اکثریت پر اثر انداز نہیں ہو گی۔

۷۔ تمام فرقوں کو پوری مذہبی آزادی، یعنی عقیدہ و عبادت اور ان کی تعمیل، تبلیغ، اجتماع اور تعلیم کی آزادی کی ضمانت حاصل ہو۔

۸۔ کسی قانون ساز مجلس یا کسی منتخب ادارہ میں کوئی ایسا مسودہ قانون یا قرارداد منظور نہ کیا جائے، اگر اس ادارہ کے کسی بھی فرقہ کے تین چوتھائی ارکان اس بنیاد پر اس کی مخالفت کریں کہ وہ مسودہ قانون یا قرارداد ان کے فرقہ کے مفادات کے لیے مُضر ہے۔ یا بصورت دیگر کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے، جو ایسے معاملات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے قابل عمل اور مفید معلوم ہو۔

۹۔ سندھ کو بمبئی پریذیڈنسی سے علیحدہ کر دیا جائے۔

۱۰۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان میں بھی دوسرے صوبوں کی طرح اصلاحات نافذ کی جائیں۔

۱۱۔ آئین میں یہ دفعہ ہونی چاہیے کہ اہلیت کے تقاضے ملحوظ رکھتے ہوئے تمام سرکاری اور خودمختار اداروں میں مسلمانوں کو اپنے دوسرے ہم وطنوں کے ساتھ مناسب حصہ دیا جائے۔

۱۲۔ مسلم ثقافت کے تحفظ اور مسلم تعلیم، زبان، مذہب اور شخصی قوانین کے تحفظ اور فروغ کے لیے آئین میں مناسب اہتمام کیا جائے۔ مسلم خیراتی اداروں کے تحفظ کے ساتھ ہی ساتھ حکومت اور خود مختار اداروں کی طرف سے ان کے لیے کما حقہٗ امدادی عطیات کا بھی اہتمام کیا جائے۔

۱۳۔ مرکز یا صوبوں میں کم از کم ایک تہائی مسلم وزیروں کے بغیر کوئی کابینہ نہ بنائی جائے۔

۱۴۔ مرکزی مجلس قانون ساز وفاقِ ہند کی تاسیس کنندہ ریاستوں کی تائید کے بغیر آئین میں کوئی ترمیم کرنے کی مجاز نہ ہو۔

ماضی پر تبصرہ کرتے ہوئے ہر صاحب فکر ہندو حیرت زدہ ہوگا کہ اس قدر معقول اور معتدل مطالبات بھی ہندو لیڈروں نے مسترد کر دیے تھے۔

اکتوبر ۱۹۲۹ء میں وائسرائے لارڈ اِروِن نے لیبر گورنمنٹ سے جو اس وقت برطانیہ میں برسرِ اقتدار تھی، مشورہ کرنے کے بعد ایک دُہرا اعلان کیا۔ جس کے پہلے حصہ کا تعلق آئین سے تھا۔ اس نے کہا "مجھے ملکِ معظم کی حکومت نے پوری وضاحت سے یہ اعلان کرنے کا مجاز قرار دیا ہے کہ ان کی رائے میں ۱۹۱۷ء کے اعلان میں یہ بات مضمر ہے کہ ہند کی آئینی ترقی کا قدرتی نتیجہ درجۂ ڈومینین کا حصول ہے۔" دوسرے حصہ میں ایک گول میز کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا گیا، جس میں برطانوی ہند اور ریاستوں کے نمائندوں کے ساتھ حکومتِ برطانیہ تبادلۂ خیالات کرے گی "جس کا مقصد آئینی تجاویز پر زیادہ سے زیادہ حد تک اتفاق رائے کا حصول ہوگا۔" اس اعلان پر عام اطمینان ظاہر کیا گیا، کیونکہ اس میں نہ صرف نصب العین کی نشاندہی کر دی گئی تھی بلکہ اس کے حصول کا طریقِ کار بھی متعین کر دیا گیا تھا۔

اقتدار تو اہل ہند کے ہاتھ میں منتقل کیا جاتا تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ ان میں سے کن کو یہ اقتدار حاصل ہوگا؟ درحقیقت دو سوال تھے جو باہم پیوست تھے۔ ایک تھا انتقالِ اقتدار کی رفتار اور دوسرا ہندو اور مسلم قوموں میں اختیارات کی تقسیم۔ یہ دونوں سوالات آئندہ دو عشروں تک سیاسی بحث ونظر کا مرکز بنے رہے۔ بحث مابعد تین فریقوں ـــــ برطانیہ، ہندو اور مسلمان ـــــ کے مابین تدابیر اور جوابی تدابیر کی تفصیل سے عبارت ہے۔ یہ امر واضح تھا کہ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تقسیم اختیار کے مسئلہ پر مفاہمت ہو جاتی اور وہ برطانیہ کے سامنے ایک متفقہ مطالبہ پیش کر دیتے تو اسے انتقالِ اقتدار کی رفتار تیز تر کرنی پڑتی۔ لیکن ایسی مفاہمت کی کبھی نوبت نہ آئی۔

سنہ ۱۹۳۰ء کا آغاز کانگرس کی طرف سے گاندھی کی ذاتی قیادت میں عام سول نافرمانی کی دھمکی سے ہوا۔ اس کی یہ وجہ بیان کی گئی کہ برطانوی حکومت نے سنہ ۱۹۲۹ء کے دوران میں نہرو رپورٹ پر عمل درآمد کرنے میں کوتاہی کی ہے۔ اس ایجی ٹیشن کا محور نمک پر محصول کی منسوخی کو بنایا گیا۔ مسلمان اس ایجی ٹیشن سے الگ تھلگ رہے۔ مولانا محمد علی نے اسے یوں بیان کیا "ہم مسٹر گاندھی کا ساتھ دینے سے انکار کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کی تحریک ہند کی مکمل آزادی کی تحریک نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد سات کروڑ مسلمانوں کو ہندو مہاسبھا کا تابع بنانا ہے۔" ۲۴ ایک سال کے اندر ہی گاندھی کی اس تحریک کا زور ٹوٹ گیا۔ اس مرحلہ پر وائسرائے نے گاندھی سے بات چیت کر کے کوئی تلخی پیدا کیے بغیر اس مسئلہ کو ختم کرنا مناسب سمجھا۔ گاندھی اروِن سمجھوتہ کے تحت بعض ساحلی علاقوں میں نمک تیار کرنے پر معمولی سی رعایت دے دی گئی، سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا، اور گاندھی کی طرف سے تحریک ختم کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ نفس الامر میں فتح حکومت کو حاصل ہوئی۔ لیکن گاندھی اور وائسرائے کے درمیان مساویانہ حیثیت سے گفت و شنید سے عوام پر جو نفسیاتی اثر پڑا، اس سے فتح کے ثمرات گاندھی کے حصہ میں آئے۔

دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس الٰہ آباد میں منعقد ہوا۔ اس زمانہ میں سرگرمی عمل کے لحاظ سے مسلم لیگ کوئی نمایاں جماعت نہیں تھی۔ اور یہ اجلاس بھی خاموشی سے گزر جاتا، لیکن اس کا ایک غیر معمولی پہلو یہ تھا کہ اجلاس کی صدارت ایک شاعر کر رہے تھے، جن کا خطبۂ صدارت بھی غیر معمولی تھا۔ یہ امر مسلّم ہے کہ اقبال مسلم ہند کے سب سے بڑے فلسفی شاعر ہیں۔ اقبال نے اپنے خطبہ میں ملک کے سیاسی منظر کا جائزہ لیا، اور فلسفیانہ بصیرت سے اسے روشن کیا۔ بڑے ہی واضح اور موثر الفاظ میں انہوں نے اس منزلِ مقصود کی نشاندہی کی، جس کی طرف مسلم قوم کی شعوری اور غیر شعوری مساعی اسے لے جا رہی تھیں۔ اقبال نے اپنے خطبہ میں کہا:

> "میری خواہش ہے کہ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان ایک ہی ریاست میں ضم ہو جائیں۔ یہ خود مختار ریاست خواہ برطانوی سلطنت کے اندر ہو یا برطانوی سلطنت سے باہر، شمال مغربی ہند میں اس مسلم ریاست کی تشکیل میری نگاہ میں مسلمانوں، کم از کم شمال مغربی ہند

کے مسلمانوں کے لیے مقدر معلوم ہوتی ہے" ۲۵؎

یہ خیال بنفسہٖ نیا نہیں تھا۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں محمد عبدالقادر بلگرامی نے "ہندوؤں اور مسلمانوں میں برصغیر کی تقسیم پر زور دیا تھا۔ انہوں نے اضلاع کی ایک فہرست بھی مرتب کر دی تھی۔ جو بنیادی طور پر مشرقی اور مغربی پاکستان کی موجودہ سرحدوں سے بہت زیادہ مختلف نہ تھی" ۲۶؎ اس کے تین سال بعد سرحدی تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے سردار گل محمد خان نے بھی ہند کو تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ جس کے تحت مسلمانوں کو پشاور سے آگرہ تک کے علاقے ملنے تھے۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں لالہ لاجپت رائے نے، جو ہندو مہاسبھا کے بانیوں میں سے تھا، ہند کو مسلمانوں اور ہندوؤں میں تقسیم کر دینے کی تجویز پیش کی تھی۔ لیکن یہ ابتدائی اور محض نظریاتی تجاویز کسی خاص توجہ کا موضوع نہ بن سکیں۔ اب پہلی مرتبہ ایک مستند پلیٹ فارم سے ایک ایسے شخص نے ایک مسلم ریاست کے قیام کی تجویز پیش کی، جو نہ صرف دانش اور تدبر کے اعتبار سے بہت اونچے مقام پر فائز تھا، بلکہ وسیع رسوخ کا بھی مالک تھا۔ ایک نئے زاویۂ نگاہ نے تصویر کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ مسلمان جو اس سے پہلے اپنے آپ کو محض ایک اقلیت سمجھتے تھے، اور اپنے ثقافتی، اقتصادی اور سیاسی مفادات کے تحفظ کی نومیدی سے جستجو کیا کرتے تھے۔ اقبال کی اس تجویز کے بعد وہ اپنے آپ کو ایک ایسی قوم تصور کرنے میں حق بجانب تھے جو اپنی سرزمین میں اسلام کی اساس پر ایک آزاد عادلانہ نظام قائم کرے۔

چودھری رحمت علی نے، جو انگلستان کی کیمبرج یونیورسٹی میں طالب علم تھے، پاکستان کی اصطلاح وضع کی۔ اس میں پ پنجاب سے لی گئی، الف افغانیہ (شمال مغربی سرحدی صوبہ) سے، ک کشمیر سے س سندھ سے اور تان بلوچستان سے۔ اس اصطلاح کے لفظی معنی "پاک انسانوں کی سرزمین" ہے۔ یہ اصطلاح اقبال کے نظریہ کی جامع تعبیر بھی تھی اور مظہر اور نعرہ بھی۔ فطری توسیع کے تحت اس کا اطلاق شمال مشرق میں بنگال پر بھی اسی طرح ہوا، جس طرح شمال مغرب کے مسلم خطوں پر۔

مسلم نوجوانوں کے سوا بہت کم لوگوں نے اقبال کے ان الفاظ کی طرف توجہ کی۔ اس وقت سب نگاہوں کا مرکز لندن تھا، جہاں گول میز کانفرنس کا پہلا اجلاس نومبر سنہ ۱۹۳۰ء میں شروع ہوا۔ اس اجلاس میں، اور اس کے بعد جو اجلاس ہوئے، ان میں فرقوں کے نمائندوں کے درمیان باہمی مفاہمت سے فرقہ وارانہ مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ بالآخر سنہ ۱۹۳۲ء میں وزیرِ اعظم ریمزے میکڈانلڈ

نے وہ اعلان کیا، جو فرقہ وارانہ تصفیہ (ایوارڈ) کہلاتا ہے۔ اس ایوارڈ کے تحت مسلمانوں کو مختلف صوبائی مجالس قانون ساز میں جداگانہ نیابت کی اساس پر حسب ذیل تناسب سے نشستیں دی گئیں:

صوبہ	فیصد مسلم آبادی	مسلمانوں کیلئے مخصوص نشستوں کا فیصد
پنجاب	۵۷	۴۹
بنگال	۵۵	۴۸
سندھ	۷۱	۵۷
شمال مغربی سرحدی صوبہ	۹۲	۷۲
آسام	۳۴	۳۱
صوبجات متحدہ	۱۵	۲۹
بہار اور اڑیسہ	۱۱	۲۴
بمبئی	۹	۱۷
مدراس	۸	۱۳
وسطی صوبجات	۵	۱۴

مرکزی مجلس قانون ساز میں برطانوی ہند کے حصہ میں آنے والی نشستوں کی ایک تہائی تعداد مسلمانوں کے لیے مخصوص کر دی گئی۔ سندھ کو ایک علیحدہ صوبہ بنانے کا فیصلہ بھی کر دیا گیا۔ ہندوؤں نے اس ایوارڈ کی مخالفت کی۔ مسلمانوں نے چپ چاپ اسے مان لیا۔ ان کی رضامندی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اس ایوارڈ میں مسلمانوں سے انصاف کیا گیا تھا، بلکہ فقط یہ کہ دونوں فریق آپس میں کوئی سمجھوتہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں تھے، انہیں تناسب آبادی سے زیادہ نشستیں دی گئیں اور اس کے بدلے میں جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں تھے وہاں غیر مسلموں کو اپنے تناسب آبادی سے زیادہ نمائندگی دے دی گئی۔ کسی صوبے میں ہندو اکثریت کو اقلیت میں تبدیل نہیں کیا گیا، لیکن دو کلیدی صوبوں پنجاب اور بنگال میں اس ایوارڈ کے تحت مسلمانوں

کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کر دیا گیا۔

دوسری گول میز کانفرنس کے بعد جب گاندھی لندن سے واپس آیا تو کانگرس نے سول نافرمانی کی مہم از سرِ نو شروع کر دی۔ نئے وائسرائے لارڈ ولنگڈن نے اس کے جواب میں سختی اختیار کی، اور یہ تحریک چند ماہ کے اندر ختم ہو کر رہ گئی۔ رسمی طور پر ۱۹۳۴ء میں اس کے ختم کیے جانے کا اعلان بھی کر دیا گیا۔

گول میز کانفرنس میں مشاورت کا نتیجہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی صورت میں نکلا۔ جس کے تحت صوبوں اور ریاستوں پر مشتمل ایک وفاقِ ہند کا قیام متصور تھا۔ وفاقی مرکزی حکومت کی تشکیل سے متعلق دفعات پر اس وقت تک عمل درآمد نہیں ہو سکتا تھا، جب تک ریاستی حکمرانوں کی ایک معینہ تعداد الحاق کی دستاویز پر دستخط نہ کر دیتی۔ چونکہ اس بات تک نوبت ہی نہ آئی اس لیے مرکزی حکومت کا کاروبار ایکٹ ۱۹۱۹ کے تحت ہی چلتا رہا۔ اور ایکٹ ۱۹۳۵ء کے صرف اس حصہ کا نفاذ عمل میں آیا، جس کا تعلق صوبائی حکومتوں سے تھا۔ صوبجات تحویل شدہ امور کی حد تک خود مختار تھے۔ اب دوعملی ختم ہو گئی، اور صوبائی حکومتیں پوری ذمہ داری کی حامل تھیں۔ البتہ صوبائی گورنروں کو اقلیتوں اور سول سروسز کے تحفظ کے لیے اور امن و امان کو کسی "شدید خطرہ" سے بچانے کے لیے "خاص ذمہ داری" سونپ دی گئی تھی۔ مرکزی حکومت اور صوبوں کو تفویض کیے جانے والے امور اس قدر تفصیل کے ساتھ درج کیے گئے تھے کہ باقی ماندہ اختیارات کا پرانا جھگڑا اپنی اہمیت کھو بیٹھا۔ اس ایکٹ کا نفاذ یکم اپریل ۱۹۳۶ء سے ہوا۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء پر کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے ہی نکتہ چینی کی۔ لیکن اس کے تحت ۱۹۳۷ء کے پہلے ہفتوں میں جو انتخابات ہونے قرار پائے، دونوں جماعتوں نے ان میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ ان کے انتخابی پروگرام یکساں نوعیت کے ہی تھے، اور بڑے وثوق سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ جس طرح وہ مرکزی اسمبلی میں ایک دوسرے سے تعاون کرتی رہی ہیں، اسی طرح اب وہ صوبوں میں بھی باہمی تعاون کی راہ اختیار کریں گی۔ لیکن انتخابات کے نتائج نے، اور ان نتائج پر کانگرسی کیمپ کی بے پایاں شادمانی نے ان توقعات پر پانی پھیر دیا۔ کانگرس نے بہت بڑی انتخابی کامیابی حاصل کی۔ اسے پانچ صوبوں میں اکثریت حاصل ہو گئی اور وائسرائے سے اس غیر رسمی یقین دہانی کے بعد کہ گورنر عام طور پر اپنے خاص اختیارات استعمال نہیں کریں گے۔ کانگرس

گیارہ میں سے سات صوبوں میں وزارتیں بنانے میں کامیاب ہوگئی۔

مسلم لیگ کی کارکردگی اس قدر اچھی نہیں تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کئی سالوں تک یہ جماعت گروہوں میں منقسم رہی تھی۔ جناح نے ترپہاں کی سیاسیات سے مایوس اور بیزار ہو کر ۱۹۳۱ء میں کچھ عرصہ کے لیے انگلستان میں آباد ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بہرحال انتخابات میں ابھی ایک سال سے کچھ ہی زائد عرصہ باقی تھا، کہ انہیں ہند واپس آنے اور مسلم لیگ کی باگ ڈور سنبھالنے پر آمادہ کر لیا گیا۔ جب ۱۹۳۶ء میں انہوں نے ہند کا دورہ کیا، تو انہوں نے یہ دیکھا کہ جن مقامی مسلمان لیڈروں نے صوبوں میں اپنی گرفت مضبوط کر لی ہے، وہ ایک کل ہند مسلم پالیسی کو اختیار کرنے اور اس پر کاربند ہونے میں انتہائی متامل ہیں۔

پنجاب میں سر فضل حسین نے یونینسٹ پارٹی منظم کر لی تھی۔ یہ پارٹی مسلمانوں اور بعض ہندوؤں اور سکھوں پر مشتمل تھی۔ یونینسٹ پارٹی نے سر فضل حسین کے جانشین سر سکندر حیات خاں کی قیادت میں انتخابات میں اکثریت حاصل کر لی۔

بنگال میں مولوی فضل الحق نے کرشک پرجا پارٹی بنا لی تھی۔ اور وہ ایک ایسی مخلوط حکومت کے لیڈر بننے میں کامیاب ہوگئے جس میں مسلم لیگ اور آزاد اچھوت گروپ بھی شامل تھے۔

سندھ گروہی سیاسیات کے مقامی کھیل میں بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔ اور صوبائی اسمبلی کے ۳۵ مسلم ارکان چار گروہوں میں منقسم تھے۔

شمال مغربی سرحدی صوبہ میں عبدالغفار خان کی سرکردگی میں سرخپوشوں نے کانگرس سے الحاق کر رکھا تھا، اور انہوں نے صوبائی اسمبلی کی ۵۰ میں سے ۱۹ نشستیں جیت لی تھیں۔ صوبائی حکومت کے پہلے وزیر اعلیٰ سر عبدالقیوم خان کے انتقال کے بعد عبدالغفار خان کے بھائی ڈاکٹر خان صاحب کے تحت ایک مخلوط وزارت معرضِ وجود میں آگئی۔

مسلم لیگ کی حیثیت صرف ان صوبوں میں بہتر تھی جہاں مسلمان اقلیت میں تھے۔ آسام میں مسلم لیگ نے کافی نشستیں حاصل کر لیں، اور سر محمد سعد اللہ کے تحت ایک مخلوط وزارت قائم ہوگئی مسلم لیگ کو سب سے زیادہ کامیابی صوبجات متحدہ میں حاصل ہوئی۔ جہاں اس نے ۲۹ نشستیں جیت لیں جن نشستوں کے لیے اس نے انتخاب لڑا، ان میں سے تقریباً ۸۰ فیصد اس کے ہاتھ آئیں۔ صوبجات

متحدہ میں کانگرس کے ٹکٹ پر ایک بھی مسلمان امیدوار کامیاب نہ ہوا۔[۲۷]

ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ سے قبل جو مذاکرات ہوئے تھے، ان میں مسلمانوں نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ وزارتوں میں مسلمانوں کو نمائندگی دینے کا حق قانوناً تسلیم کر لیا جائے۔ اس ضمن میں ہندو اور برطانوی سیاستدانوں نے انہیں غیر رسمی طور پر یقین دہانی بھی کرائی تھی۔ انتخابات کے بعد مسلمانوں کو یہ توقع تھی کہ مخلوط وزارتیں بنائیں جائیں گی جن میں مسلمانوں کے قابلِ اعتماد نمائندوں کو شامل کیا جائے گا۔ لیکن کانگرس نے یہ فیصلہ کیا کہ جن صوبوں میں اسے اکثریت حاصل ہو گئی ہے، وہاں وہ مسلم لیگ سے مل کر مخلوط وزارتیں نہیں بنائے گی۔ صوبجات متحدہ میں کانگرس نے مسلم لیگ کے نمائندوں کو وزارت میں شامل کرنے کی یہ قیمت طلب کی کہ وہ مسلم لیگ گروپ ایک علیحدہ گروپ کی حیثیت سے کام نہیں کرے گا اور صوبجات متحدہ کی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے موجودہ ارکان کانگرس پارٹی کا حصہ بن جائیں گے"[۲۸] لامحالہ مسلم لیگ نے خودکشی سے انکار کر دیا اور اپوزیشن میں رہنے کو ترجیح دی۔ کانگرس اور مسلم لیگ میں اشتراکِ عمل کی تمام توقعات ختم ہو گئیں۔

جن صوبوں میں کانگرس اقلیت میں تھی، وہاں اس نے مسلمانوں میں تفرقہ ڈال کر ایسی مخلوط وزارتیں بنانے کی کوشش کی، جن کی باگ ڈور ہندوؤں یا ہندوؤں کے نیازمندوں کے ہاتھ میں ہو۔ کانگرس کو ان حربوں سے آسام اور سندھ میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ اوّل الذکر میں سعداللہ وزارت ٹوٹ گئی۔ اور اس کی جگہ ایک کانگرسی مخلوط حکومت نے لے لی۔ موخرالذکر میں ہندوؤں کی حمایت سے وزارت قائم ہو گئی۔

کانگرس کچھ سالوں سے یہ دعویٰ کر رہی تھی کہ وہ سب اہلِ ہند کی نمائندہ ہے۔ حالانکہ اس میں صرف معدودے چند مسلمان تھے، ان میں نمایاں ابوالکلام آزاد اور عبدالغفار خاں تھے۔ ابوالکلام علمائی ایک جماعت کے رہنما تھے اور عبدالغفار خاں شمال مغربی سرحدی صوبے کے سرخ پوشوں کا لیڈر تھا۔ لیکن اس سے کانگرس پر ہندوؤں کے تسلط میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے ۱۳۶ ارکان میں سے صرف ۶ مسلمان تھے، تین شمال مغربی سرحدی صوبہ سے، ایک صوبجاتِ متحدہ سے اور ایک بہار سے، چھٹے رکن ابوالکلام آزاد تھے، جو کانگرس کے ایک سابق صدر تھے[۲۹]۔ اب فتح سے بدمست ہو کر، اس کے لیڈر اس بات پر اصرار کرنے لگے کہ کانگرس ہی واحد قومی جماعت ہے۔

بلکہ وہ کسی دوسری جماعت کے وجود تک سے انکار کرنے لگے۔ یہ دراصل اس کوشش کی ایک کڑی تھی کہ کانگرس کا یہ دعویٰ تسلیم کر لیا جائے کہ صرف وہی انگریزی اقتدار کی وارث بننے کی حقدار ہے۔ جواہر لال نہرو نے مارچ ۱۹۳۷ء میں اعلان کیا "آج ہند میں صرف دو طاقتیں ہیں۔ برطانوی سامراج اور انڈین نیشنلزم جس کی نمائندگی کانگرس کرتی ہے"۔[۳۰] جناح نے اسے فوراً ٹوکا اور گرج کر کہا کہ ایک تیسرا فریق بھی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ___ اور وہ مسلمان ہیں۔

ہندو ہمیشہ سے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں سے ناروا امتیازی سلوک کرنے کے عادی تھے اب ان کا امتیازی سلوک بہت کھلم کھلا اور شدید ہو گیا۔ مثلاً بمبئی میں کے۔ ایف ناریمان مقامی کانگرس پارٹی کا مسلم الثبوت لیڈر تھا۔ اور بجا طور پر اسے ہی صوبہ بمبئی کا وزیر اعلیٰ بننا چاہیے تھا۔ لیکن وہ پارسی تھا، اور اسے ولبھ بھائی (سردار) پٹیل نے ایک ہندو بی۔ جی۔ کھیر کے حق میں نظر انداز کر دیا۔ ناریمان نے اپنی اس حق تلفی کے خلاف کانگرس کے صدر، نہرو بلکہ بذاتِ خود گاندھی سے بھی اپیل کی، لیکن بے سود۔ "غریب ناریمان کا دل ٹوٹ گیا، اور اس کی عوامی زندگی کا خاتمہ ہو گیا"۔[۳۱]

مسلمانوں کو مساوی مواقع دینے سے انکار کر دیا گیا، اور انتظامیہ میں انہیں کا حقہ حصہ سے محروم کر دیا گیا۔ جن سرکاری اداروں کے اخراجات تمام ٹیکس گزار ادا کرتے تھے، ان میں ہندو راج اور ہندو ثقافت کے مظاہر و علامات اختیار کر لیے گئے۔ تعلیم کے لیے ودیا مندر کھولے گئے۔ سکولوں میں روزانہ پڑھائی کا آغاز کانگرس کے جھنڈے کو سلامی دینے اور ایک بدنامِ زمانہ مسلم دشمن گیت "بندے ماترم" کے گانے اور پوجا یا گاندھی کی تصویر کی پرستش سے ہوتا تھا۔ مسلمان ایسے معمولات سے گہری نفرت کرتے تھے۔ گئو رکھشا پر اصرار نے ایسی صورتیں اختیار کر لیں جن سے نہ صرف غریب مسلمانوں کو اقتصادی طور پر سخت نقصان پہنچنے لگا بلکہ ایسے تصورات کے سامنے انہیں سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کیا جانے لگا، جن سے مسلم دل و دماغ بیگانہ تھے۔ اردو جو مسلمانوں اور ہندوؤں کا مشترکہ تہذیبی ورثہ تھی، اس کو مٹا کر اس کی جگہ ہندی کو رائج کرنے کی باقاعدہ کوشش شروع ہو گئی۔ ہندی کو سرکاری سرپرستی ملی۔ اردو سکول بند کر دیئے گئے یا انہیں ہندی سکولوں میں ضم کر دیا گیا۔ ہندو مسلم اتحاد کے دورِ شباب میں گاندھی اکثر یہ اعلان کیا کرتا تھا کہ اردو اور ہندی دونوں ایک ہی زبان ___ ہندوستانی ___ ہیں، جنہیں یکساں طور پر خوش اسلوبی سے فارسی یا دیوناگری رسم الخط میں لکھا جا سکتا ہے۔ اس نے خود بھی اردو رسم الخط سیکھا

اور ہر ایک کو دونوں رسم الخط سیکھنے کا مشورہ دیتا تھا۔ لیکن اب اس نے یہ موقف اختیار کیا کہ اردو چونکہ قرآنی حروف میں لکھی جاتی ہے، اس لیے یہ مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے اور ہندی۔ ہندوستانی ہی ہند کی قومی زبان ہے۔ آخر میں ہندوستانی کا لفظ بھی ترک کر دیا اور ہندی کے ہی قومی زبان ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔

ہندو مفادات کو ترجیح دینے کی جس پالیسی پر کانگرس انتظامی، تعلیمی اور ثقافتی معاملات میں کاربند تھی، اس کا اظہار اقتصادی میدان میں بھی ہو کر رہا۔ مثلاً صوبجات متحدہ اور بہار میں جہاں مسلمان زمیندار طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، کانگرسی حکومت نے مزارعین کے تحفظ کے لیے قانون بنانے میں پیش قدمی کی، اور اس طرح ترقی پسندانہ پالیسی اختیار کرنے کا سہرا اپنے سر باندھا۔ لیکن بنگال میں جہاں زیادہ تر زمیندار ہندو تھے، زرعی اصلاحات کے لیے جو بھی کوشش کی گئی، کانگرس نے اس کی سر توڑ مخالفت کی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایسی ساری مساعی ناکام ہو گئیں۔ پنجاب میں، جہاں ہندو مہاجن بڑی بے رحمی سے غریب کسانوں کی کمائی کے استحصال میں مصروف تھے۔ دیہی قرضوں کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے جو قانون بھی بنایا گیا، کانگرس پارٹی نے اس کی شدید مخالفت کی ۳۲۔

ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو کانگرسی حکومتوں کا جو ذاتی تجربہ ہوا، اس نے انہیں لیگ کے پرچم تلے جوق در جوق جمع کر دیا۔ پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کو بھی احساس ہوا کہ ہند کے طول و عرض میں مسلمانوں کے لیے ہندو غلبہ کس قدر خطرناک ہے۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کا جو اجلاس لکھنؤ میں ہوا، اس میں مسلم صفوں میں اتحاد و یکجہتی کا منظر دیکھنے میں آیا۔ اس اجلاس میں وزیر اعلیٰ پنجاب سر سکندر حیات خان، وزیر اعلیٰ بنگال مولوی فضل الحق اور وزیر اعلیٰ آسام سر محمد سعد اللہ نے کل ہند معاملات میں مسلم لیگ کی حمایت کرنے اور لیگ کے صدر محمد علی جناح کو اپنا لیڈر تسلیم کرنے کا اعلان کیا۔ اس اجلاس کے بعد مسلم لیگ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرنے لگی اور بہت جلد ایک عوامی تنظیم بن گئی۔ ہر صوبہ میں لیگ کی کثیر تعداد میں شاخیں قائم ہو گئیں۔ اب مسلم لیگ ہند میں مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا دعویٰ کرنے میں حق بجانب تھی۔

کانگرس نے مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی اور لیگ کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کے لیے مسلم عوام سے رابطہ کی ایک تحریک شروع کی، تاکہ مسلمانوں کو ترغیب و ترہیب سے کانگرس

کیمپ میں لایا جا سکے۔ کانگرس کے پاس اقتدار بھی تھا اور سرپرستی کے ذرائع بھی۔ اس لیے اس کی دعوت یہ تھی کہ اگر مسلمان مراتب و مناصب میں حصّہ لینا چاہتے ہیں تو انہیں بسرعت تمام کانگرس کا حلقہ بگوش ہو جانا چاہیے۔ مسلمانوں کو مادی مفاد کا لالچ دے کر لیگ سے دور کرنے کی اس کوشش کا نتیجہ کانگرس کی توقعات کے بالکل برعکس نکلا، بلکہ اُس کی اِس تحریک نے لیگ کو اور زیادہ مستحکم بنا دیا۔

لیگ اور کانگرس کے درمیان نزاع و اختلاف میں تلخی بڑھتی چلی گئی۔ لیگ نے راجہ پیرپور کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کی جس کا مقصد ان صوبوں کے مسلمانوں کی شکایات کی تفتیش کرنا تھا جہاں کانگرس پارٹی برسرِ اقتدار تھی۔ پیر پور رپورٹ کی تحقیقات سے پوری طرح ثابت ہو گیا کہ کانگرسی حکومتیں مختلف ذرائع سے مسلمانوں پر ہندو ثقافت ٹھونسنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اور مسلمانوں سے ناروا امتیازی سلوک کر رہی ہیں۔ اگر مسلمان اِن کوششوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں تو انہیں امن و امان میں خلل اندازی کا مرتکب قرار دے کر حکومت کی جابرانہ مشینری ان کے خلاف استعمال کی جاتی ہے۔ ایسی ہی دوسری تحقیقات مثلاً بہار میں شریف رپورٹ بھی اسی نتیجہ پر پہنچیں۔ چونکہ صوبوں میں کانگرسی حکومتوں کا کنٹرول انڈین نیشنل کانگرس کے بڑے لیڈروں کے ہاتھ میں تھا، مسلمانوں کے ساتھ جو ظلم کیے جا رہے تھے، ان کا ذمہ دار محض مقامی قیادت کو ہی نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا بلکہ کانگرس کی قیادتِ اعلیٰ کو بھی۔

مسلمانوں میں واحد وفاقِ ہند کی مخالفت شدید تر ہوتی گئی۔ کراچی میں اکتوبر ۱۹۳۸ء میں منعقد ہونے والی سندھ مسلم لیگ کانفرنس نے یہ اعلان کیا کہ "ایک متحدہ ہند اور مشترکہ مقاصد کی بنا پر ایک متحدہ قومیت کا ارتقا ناممکن الحصول ہے"۔ قرارداد میں "گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت کل ہند وفاق کے قیام کو پوری شدت سے نامنظور اور مسترد کرنے" کا اعلان کیا گیا۔ اور یہ سفارش کی گئی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کو "آئین کی کوئی ایسی صورت وضع کرنی چاہیے، جس کے تحت مسلمان مکمل آزادی حاصل کر سکیں"۔

چاروں طرف ایسے متبادل نظام کی جستجو جاری تھی، جو ہند کے آئندہ نقشۂ سیاست میں مسلمانوں کے لیے باوقار اور آبرومندانہ مقام حاصل کرنے کا ضامن بن سکے۔ پاکستان کا نظریہ بڑی تیزی سے پذیرائی پانے لگا۔ لیکن بہت سے لوگ ایسے بھی تھے، جو اس قدر آگے جانے سے ہچکچاتے تھے اس کے بجائے

ان کی یہ خواہش تھی کہ برصغیر کو چند ایسے ہم مماثل خطوں کی صورت میں از سرِ نو منظم کیا جائے، جن کا باہمی ربط ڈھیلا ڈھالا ہو۔

اس سلسلہ میں جو متعدد منصوبے پیش کیے گئے، ان میں سب سے زیادہ حزم و احتیاط سے مرتبہ منصوبہ" اے کانفیڈریسی آف انڈیا" تھا جسے میاں کفایت علی نے اپنے قلمی نام" ایک پنجابی" کے نام سے شائع کیا۔ بعض دوسرے اصحاب کی تجویز یہ تھی کہ ہند کو متعدد مکمل طور پر آزاد اور خود مختار مملکتوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ۲۴ جون ۱۸۵۸ء کو انگلستان کے دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے ایک برطانوی مدبر جان برائٹ نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہند کو پانچ پریزیڈنسیوں میں تقسیم کر دیا جائے، جن میں ہر ایک کے :۔

> " اپنے مالیات، محاصل، نظامِ عدل، پولیس، تعمیرات اور فوج کے محکموں کا انتظام بالکل انہی خطوط پر ہوگا، جیسے کہ وہ ایک مستقل مملکت ہے، جس کا ہند کے کسی دوسرے حصے سے کوئی تعلق نہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو اس ملک (برطانیہ) کے زیرِ تولیت تسلیم کیا جائے .... اگر مستقبل میں کسی مرحلہ پر برطانیہ اپنی حاکمیتِ اعلیٰ سے دستکش ہو جائے، تو ہمیں ایسی پریزیڈنسیوں کو اس قدر مستحکم چھوڑ کر واپس آنا چاہیے۔ کہ ان میں ہر ایک اپنی آزادی اور اپنی حکومت کو برقرار رکھ سکے "[۳۳]

باب ۲

قراردادِ پاکستان

دوسری جنگِ عظیم شروع ہونے پر وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے مرکزی اسمبلی یا اہم سیاسی پارٹیوں سے کسی مشورے کے بغیر ہند کی طرف سے جنگ میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ بعد میں وائسرائے نے گاندھی، جناح اور دوسرے لیڈروں سے بات چیت کی، لیکن نہ کانگرس جنگی مساعی میں غیر مشروط تعاون پر آمادہ ہوئی اور نہ مسلم لیگ۔ برطانوی حکومت جنگ کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تعاون کی خواہاں تھی، اور یہ وعدہ بھی کرتی تھی کہ جنگ کے اختتام پر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے پیش کردہ نظام میں ترمیم کرنے کے لیے وہ ہند کی مختلف قوموں، پارٹیوں اور ریاستی حکمرانوں سے بات چیت کرے گی۔ جنگی کارکردگی میں ہند کی رائے عامہ کی تائید حاصل کرنے کے لیے وائسرائے نے ایک مشاورتی گروپ کا قیام عمل میں لانے کی تجویز پیش کی۔ جس میں تمام اہم سیاسی پارٹیوں اور ریاستی حکمرانوں کے نمائندے شامل ہوں، اور اس گروپ کا صدر وائسرائے خود ہو۔ مزید براں برطانوی حکومت نے آمادگی ظاہر کی کہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں عارضی توسیع کی جائے تاکہ ہند کے ذمہ دار اہل الرائے کا اور زیادہ تعاون حاصل ہو سکے۔

کانگرس نے تقاضا کیا کہ آزادیٔ ہند کا اعلان کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو اقتدار کرنی الفور منتقل کر دیا جائے، ساتھ ہی یہ مطالبہ بھی تسلیم کروانا چاہا کہ ہند کا آئندہ آئین ایک ایسی آئین ساز اسمبلی مرتب کرے، جس کا انتخاب بالغ رائے دہی کی بناء پر ہو۔ کانگرس نے اقلیتوں کے مطالبات کو غیر متعلق مسائل قرار دیا۔ جن کی اوٹ میں برطانیہ پناہ لے رہا تھا، اور یہ دھمکی دی کہ اگر کانگرس کے مطالبات منظور نہ کیے گئے تو وہ سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دے گی۔

مسلم لیگ بھی برصغیر کی آزادی کے لیے برابر کی خواہاں تھی۔ لیکن اس نے یہ بات واضح کر دی کہ مستقبل کے آئین کے لیے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کی رضامندی حاصل کرنا لازم ہے۔ اس کا خیال تھا کہ جس دستور ساز اسمبلی کی کانگرس نے تجویز پیش کی ہے، وہ جناح کے الفاظ میں "ایک منڈلی ہو گی جو کانگرسی قیادت کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی ہو گی"۔ لیگ نے جنگی مساعی میں شمولیت کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل نہ کی۔ پنجاب اور بنگال کی صوبائی حکومتوں نے جن کے وزرائے اعلیٰ مسلم لیگ کی وفاداری کا دم بھرتے تھے، فوجی حکام سے تعاون کیا، خاص طور پر پنجاب میں جو ہند کے بازوئے شمشیر زن کے نام سے مشہور تھا۔

وائسرائے سے بات چیت ناکام ہو گئی، تو کانگرس نے برطانوی حکومت سے جنگی مساعی کے سلسلہ میں تعاون سے دستکش ہونے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ جن آٹھ صوبوں میں کانگرس برسر اقتدار تھی، وہاں کی وزارتیں مستعفی ہو گئیں۔ گورنروں نے نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس پر جناح نے ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو یوم نجات و تشکر منانے کا اعلان کر دیا۔ یہ کانگرسی حکومت کے "ظلم، استبداد اور ناانصافی" سے جان چھوٹنے کا اظہار تھا۔ مسلمانوں نے یہ دن بڑی گرمجوشی سے منایا۔

اس کے تین ماہ بعد مسلم لیگ نے برصغیر کی تقسیم کا مطالبہ باقاعدہ طور پر پیش کر دیا۔ اس طرح وہ جدوجہد شروع ہوئی، جو قیام پاکستان کی صورت میں انجام پذیر ہوئی۔ بعد میں واقعات نے جو رخ اختیار کیا اسے اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کشمکش میں جو تین فریق شامل تھے، ان کی طاقت اور کمزوریوں کا مختصراً جائزہ لیا جائے۔

جہاں تک اقتصادی، سیاسی اور فوجی طاقت کا تعلق ہے، یہ بات ظاہر ہے کہ سب سے مضبوط فریق انگریز تھے، لیکن وہ پہلی عالمی جنگ سے کمزور ہو چکے تھے۔ اس کے بعد کی عظیم کساد بازاری نے اور پھر دوسری عالمی جنگ نے ان کی طاقت کو مزید ضعف سے دوچار کر دیا تھا۔ اپنے ابتدائی دور کے

نوآبادیاتی استحصال کی یاد اب ان کے ذہن سے محو ہو گئی تھی اور اس کی جگہ اس احساس نے لے لی تھی کہ جن لوگوں پر وہ حکمرانی کر رہے ہیں، انہیں پارلیمانی جمہوریت اور قانون کی عمل داری کے فوائد سے بہرہ ور کرنا ان کا بنیادی نصب العین ہے۔ وہ اپنے تسلط کو نامہذب نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کی نگاہ میں اس کا ایک اخلاقی مقصد تھا، دوسرے لوگوں کو یہ بات شاید منافقت پر مبنی نظر آئے، لیکن انگریزوں نے اپنے آپ کو اس کی سچائی کا قائل کر لیا تھا۔ آئینی ترقی کے مدارج کا دارومدار محکوم لوگوں کی صلاحیت پر تھا۔ لیکن جیسا کہ خود برطانیہ میں جمہوری اداروں کے ارتقا سے ثابت ہو چکا تھا، اس صلاحیت کا مظاہرہ صرف منظم جدوجہد کے ذریعہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ جن لوگوں کے اعمال و افعال اس بات کی تصدیق کرتے ہوں کہ وہ حصولِ آزادی کا پختہ عزم رکھتے ہیں۔ صرف وہی آزادی کے مستحق ہوتے ہیں۔ ایسے مخالفوں سے بتدریج مفاہمت کے لیے انگریز آمادہ رہتے تھے۔ اگرچہ برطانیہ پر اکثر "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل پیرا ہونے کا الزام عائد کیا جاتا تھا، لیکن انگریز اس بات پر حد سے زیادہ فخر کرتے تھے کہ انہوں نے برِ صغیر ہند کو وحدت عطا کی ہے۔ اگر اس انتظامی وحدت کی بدولت ثقافتی ہم آہنگی یا سیاسی یگانگت پیدا نہیں ہوئی، تو انگریزوں کے خیال میں اس کے لیے انہیں قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا۔

ہندو برِ صغیر کی آبادی کا تین چوتھائی حصہ تھے۔ طاقت کے لحاظ سے وہ انگریزوں کے بعد دوسرے نمبر پر آتے تھے۔ دولت، تعلیم، سیاسی شعور اور عصبیت میں وہ مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں سے بدرجہا آگے تھے۔ وہ اپنے فرقہ وارانہ مفادات اور انڈین نیشنلزم کو ایک ہی چیز قرار دیتے تھے۔ ان کے سماجی شعور کا ڈھانچہ ذات پات کی بنا پر استوار ہوا تھا۔ جس نے غیروں سے امتیازی سلوک کو ان کے لیے ایک فطری چیز بنا دیا تھا۔ ہند کے اخبارات و جرائد اور خبر رساں ایجنسیوں پر ان کی گرفت قریب قریب مکمل تھی۔ انہیں سیاسی تنظیم کا بھی نسبتاً طویل تر تجربہ تھا، اور انڈین نیشنل کانگرس کی شکل میں انہوں نے ایک بہت مؤثر سیاسی ہتھیار وضع کر لیا تھا۔ ہندوؤں کی دوسری پارٹیوں مثلاً انتہا پسند ہندو مہاسبھا یا اعتدال پسند لبرل فیڈریشن کو کبھی کانگرس کی مانند سند و اختیار یا نمائندہ حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ پھر گاندھی کی صورت میں ان کے پاس ایک لاثانی لیڈر بھی تھا۔ وہ، جیسا کہ وہ خود بھی اکثر کہا کرتا تھا "ہندوؤں کا ہندو دُں" یعنی ہندو ازم کا مظہرِ اتم تھا۔ اس کے کھانے پینے کی عادات، اس کا لباس، اس کی جنسی نفس کشی، اس کی پوجا پاٹ، اس کے آشرم غرض اس کی ہر بات کی

بڑے وسیع پیمانہ پر اشاعت و تشہیر کی جاتی تھی، اور ہندو عوام، مرد اور عورتوں کو اس کے مہاتمائی کردار کی بار بار یاد دلاتے تھے۔ ہندو ازم کا استحکام اور احیاء اس کا مقصدِ حیات تھا۔ آزادیٔ ہند کے لیے اس کی سیاسی سرگرمیاں بھی اس کے اس وسیع تر مقصد کا ہی ایک حصہ تھیں۔ انگریزوں اور دوسرے لوگوں کے خلاف اپنی جد و جہد میں گاندھی، جیسا کہ وہ کہا کرتا تھا "روحانی قوت" استعمال میں لاتا تھا تاکہ دوسرے فریق کی مرضی کو اپنی مرضی کے تابع کیا جا سکے۔ "روحانی قوت" کے طریق کار کا لب لباب یہ تھا کہ اپنے مقصد کی سچائی میں یقینِ محکم پیدا کر کے اس کی حمایت میں رنج و محن برداشت کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ مخالف کو جس بات سے بھی ہزیمت دی جا سکے وہ جائز ہے بشرطیکہ جسمانی تشدد تک نوبت نہ پہنچے۔ انگریزوں کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ ہند کی بہبود کے لیے یہاں براجمان ہیں۔ گاندھی ان کے اس دعویٰ کو تسلیم کر کے ان کے قول اور فعل میں تضاد کی نشاندہی کیے جاتا تھا۔ اگرچہ وہ انگریزوں کو منافق ہونے کا یقین دلانے میں تو پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا، لیکن اہلِ ہند کی نظروں میں اس نے انگریزوں کی قدر و منزلت کو گرا دیا۔ اگر انگریز طاقت کا اندھا دھند استعمال کرتے، تو گاندھی کے یہ حربے کامیاب نہ ہو سکتے، لیکن انگریز نہ اتنے سفاک تھے کہ خوف اور دہشت کو حکومت کا ذریعہ بناتے اور نہ اتنے کوتاہ اندیش کہ یہ بھی نہ سمجھ سکیں کہ ان کا چھوٹا سا جزیرہ چالیس کروڑ لوگوں کو غیر معین عرصہ کے لیے محکوم نہیں رکھ سکتا۔ انگریزوں کے اپنے ملک میں آزادیٔ تقریر و تحریر اور آزادیٔ اجتماع کی بہت طویل روایات تھیں اس لیے وہ اس حد تک گرنا بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ ان آزادیوں کو بالکل ہی ختم کر دیں۔ وہ پبلک جلسوں اور جلوسوں کی اجازت دے دیتے تھے، اور عام طور پر ان پر پابندیاں اس وقت عائد کرتے تھے جب وہ جلسے جلوس بڑی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے ہوتے۔ گاہے گاہے وہ اپنے مخالفوں کو جیل میں بھی ڈال دیتے تھے، لیکن کچھ اس طرح کہ جنہیں قید کرتے وہ ہیرو بن جاتے۔ گاندھی نے انگریزوں کی ان قومی عادات اور اس کے ساتھ اقتصادی نقصان کے معاملہ میں ان کی نزاکتِ احساس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ عصرِ حاضر میں گاندھی اخلاقی جنگ و جدل کے فن کا سب سے بڑا ماہر تھا۔ اس کی ظاہری سکینی دراصل گہری بصیرت، غیر معمولی فراست اور فقید المثال مستقل مزاجی کی پردہ دار تھی۔ اس کی زبان سادگی و پرکاری کا نمونہ تھی۔ اس کے بظاہر سادہ الفاظ میں غیر محتاط لوگوں کے لیے دامِ پنہاں بھی تھے اور ضروری ذمہ داریوں سے بچنے کے لیے فرار کی راہیں بھی۔ جس دور کا یہاں ذکر ہو رہا ہے، اس میں وہ ہند کی سب سے

زیادہ طاقتور اور عظیم ترین سیاسی جماعت کا مسلمہ مختار و مالک تھا، مثلاً جب گاندھی کی مخالفت کے باوجود ۱۹۳۹ء میں سوبھاش چندر بوس کانگرس کا دوبارہ صدر منتخب ہو گیا تو گاندھی نے اس کےلیے اپنے عہدہ پر متمکن رہنا ناممکن بنا دیا، اور چند مہینوں کے اندر اسے مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا۔ اگرچہ وہ دعوےٰ کرتا تھا کہ وہ کانگرس پارٹی کا معمولی رکن بھی نہیں، لیکن جیسا کہ نہرو نے کہا ہے' گاندھی اس جماعت کا "مستقل مہا پریذیڈنٹ" تھا۔ اس طرح جب ضرورت پڑتی وہ کانگرس کے اعمال و اقدامات سے بری الذمہ ہونے کا اعلان کر سکتا تھا اسے عوام میں بے پناہ اثر و رسوخ حاصل تھا' جسے وہ کانگرس پارٹی کو مطیع فرمان بنائے رکھنے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ غیر ملکی کپڑے کے مقاطعہ کے لیے اس نے جو مہمیں شروع کیں، ان سے ہندوؤں کے صنعتی اور کاروباری حلقوں کو زبردست فائدہ پہنچا۔ بنا بریں وہ ان بڑے بڑے سیٹھوں سے خطیر عطیات حاصل کر سکا' یہ رقم اس نے سیاسی کارکنوں کی ایک فوج منظم کرنے کے لیے استعمال کی۔ اس کے رہنے سہنے کا انداز اس امر کا بلند آہنگ اعلان تھا کہ وہ غریبوں کا دوست اور بہی خواہ ہے۔ اور اُدھر اپنی سیاسی مہموں سے وہ امیروں کا مربی بننے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے ہندو سماج سے صدیوں پرانی چھوت چھات کو ختم کرنے اور اچھوتوں کی حالت بہتر بنانے کی کوشش کی۔ لیکن جب انگریزوں نے اچھوتوں کو علیحدہ نیابت کی شکل میں سیاسی حقوق عطا کیے' تو اس نے مرن برت رکھ کر اور اپنی جان پر کھیل کر انہیں اس بنیادی حق سے محروم کرا دیا۔ اچھوتوں کے لیڈر ڈاکٹر امبیدکر کو اس حربے کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے، جسے بعض لوگوں نے بلیک میل اور دوسروں نے روحانی قوت کا کرشمہ قرار دیا۔ یہ بات باعث حیرت نہیں کہ ڈاکٹر امبیدکر کی رائے میں وہ "ہند کی تاریخ میں اچھوتوں کا سب سے بڑا دشمن[۱۵]" تھا۔

گاندھی نے اپنے اخلاقی اسلحہ خانہ کے سارے ہتھیار چلائے تاکہ مسلمان آئینی تحفظات کی جگہ ہندوؤں کی طرف سے حسن نیت کی یقین دہانیوں کو قبول کر لیں۔ اس کی انسان دوستی میں شک نہیں اس کا یہ جذبہ سچا اور مخلصانہ تھا۔ لیکن اس نے یہ پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ برصغیر ہند میں فیصلہ کن اور حتمی سیاسی طاقت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہی رہنی چاہیے' اور جوں جوں کانگرس پارٹی کی طاقت اور تنظیم میں اضافہ ہوتا گیا، گاندھی کا یہ عزم زیادہ سے زیادہ واضح اور عریاں ہوتا گیا۔

اس کشمکش کے تین فریقوں میں مسلمان سب سے زیادہ کمزور تھے۔ گو ان کی تعداد دس کروڑ تھی' لیکن برصغیر کی کل آبادی کا وہ صرف ایک چوتھائی حصہ تھے۔ شمال مغرب اور شمال مشرق کے علاقوں کے

سواد وہ ہر جگہ اقلیت میں تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کے کہیں بعد انگریزی تعلیم حاصل کی تھی، انتظامیہ میں ان کی نمائندگی ناکافی تھی، اور تجارت وصنعت میں ان کی حالت بہت ہی خراب اور ناگفتہ بہ تھی۔ مختصر یہ کہ وہ غریب بھی تھے اور پسماندہ بھی۔ وہ انتخابی اداروں یا سول ملازمتوں میں اپنا جائز حق مانگتے تو ان کے مطالبات کو "فرقہ وارانہ" اور "خلافِ قوم" قرار دیا جاتا۔ چونکہ وہ ہندوؤں کے ساتھ اقتدار میں شرکت کے لیے پیشگی مفاہمت کا تقاضا کرتے، اس لیے ان پر آزادیٔ ہند کی راہ میں روڑا اٹکانے کا الزام دھرا جاتا۔ وہ انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کی خواہش میں ہندوؤں سے کسی طرح پیچھے نہیں تھے، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے، کہ ہندو انہیں جس مشترک قومیت کی دعوت دیتے ہیں، وہ ایک فریبِ نظر جال ہے۔ جس کے پیچھے ہندو غلبہ وتسلط کی بھیانک حقیقت پنہاں ہے، اور اس صورتِ حال میں آزادی کے بعد ان کے لیے معاشرے میں کوئی مساویانہ مقام نہیں ہوگا۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ہندو ان کے ساتھ جو ناروا سلوک کرتے رہتے تھے، بیشتر مسلمانوں کو اس کا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ تھا۔

مسلمانوں کو اسلامی دنیا سے جو ہمدردی تھی، ہندو اُسے غیر ملکی دلچسپی قرار دیتے، اور اس بنا پر مسلمانوں کی ہند سے وفاداری کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان حالات میں مسلمان اپنی اقلیاتی حیثیت سے بیزار تھے اور اسے اپنی عظیم روایات کے شایانِ شان نہ سمجھتے تھے۔

عدل وانصاف پر مبنی معاشرتی نظام کی آرزو مسلمانوں کی روح کی گہرائیوں میں جاگزیں ہے۔ لیکن جس تاریخی اور جغرافیائی ماحول میں وہ اپنے آپ کو پاتے تھے، اس میں سماجی انصاف کے حصول کی انہیں کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ خود اپنے معاشرہ میں بھی مسلمان طبقات وذات کے غیر اسلامی امتیازات میں مبتلا تھے۔ جاگیردار عناصر مضبوط ومقتدر تھے، اور متوسط طبقہ بہت کمزور تھا، اول الذکر ابن الوقت قسم کے دنیادار لوگ تھے، اور ان کے پیشِ نظر ہمیشہ اپنا ذاتی مفاد ہی رہتا تھا۔ اس اخلاقی کمزوری کا عکس مسلمانوں کی سیاسی تنظیم میں بھی موجود تھا۔ مسلم لیگ میں کانگرس جیسی یک جہتی اور ہم آہنگی نہ تھی اور نہ ہی اس جیسا نظم وضبط۔ "درحقیقت وہ کانگرس سے مساویانہ سطح پر نبرد آزما ہونے کی توقع ہی نہیں کر سکتی تھی۔ تنظیم میں، نشر واشاعت کے ذریعہ میں اور مالی وسائل میں وہ کانگرس کے مقابلہ میں بدرجہا غریب اور بے مایہ تھی"۔[۲] لیکن جب مسلمانوں نے پاکستان کے نصب العین کو اپنا لیا، اور اپنے عظیم لیڈر محمد علی جناح کی پیروی میں متحد ہو گئے تو مسلم لیگ نے عوام کے مؤثر سیاسی ترجمان بننے کی اہلیت پیدا کر لی اور وہ ایک طرف انگریزوں

سے اور دوسری طرف ہندوؤں سے بیک وقت ٹکر لینے کے قابل بن گئی۔

جناح اکثر و بیشتر امور میں گاندھی سے بالکل برعکس تھے۔ طرزِ معاشرت اور لباس کے اسلوب میں وہ ایک عوامی لیڈر کی وضع قطع سے کوسوں دور تھے۔ انہوں نے کبھی مذہبی آدمی ہونے کا ڈھونگ نہ رچایا، پھر وہ شخصی نمائش یا مذہبی دکھاوے سے کام نکالنے کے ہر ڈھب سے ازحد متنفر تھے۔ ان کی دیانت شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ عہدہ و منصب کے وہ کبھی حریص نہ بنے، نہ خوشامد اور چاپلوسی سے وہ رام ہو سکتے تھے اور نہ دھمکیوں یا مظاہرۂ قوت سے انہیں مرعوب کیا جا سکتا تھا۔ ان کی زبان ایچ پیچ سے پاک اور مختصر و جامع ہوتی تھی۔ تلاشِ بسیار کے باوجود ان کی گفتار میں کوئی دوسرے معنی نہیں ملیں گے۔ وہ جو کچھ زبان پر لاتے تھے وہی ان کے دل میں ہوتا تھا۔ مخالفوں سے کبھی کبھار ان کا درشت لہجہ ان کی نخوت و رعونت کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ وہ ریاکاری کو برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کشمکش کے سارے نازک اور اہم دور میں وہ مسلم لیگ کے صدر تھے، اور اپنی ذمہ داریوں اور اختیارات کو ایک سیاسی تنظیم کے سربراہ کے شایانِ شان برملا بروئے کار لاتے رہے۔ وہ سیاسی جنگ کے فن میں ماہر و کامل تھے لیکن کسی مخالف کو نیچا دکھانے کے لیے وہ "روحانی قوت" کے استعمال کے روادار نہ تھے، اور نہ مشکلات کی دلدل سے بچ نکلنے کی کوشش میں اپنی "باطنی آواز" کی طرف رجوع کرنے پر آمادہ ہو سکتے تھے۔ عزم و ارادہ کی پختگی اور قوتِ فیصلہ میں فراست، نکتہ رسی، بصیرت اور مقصد کی لگن میں وہ اگر گاندھی سے فائق نہ تھے تو اس کے ہمسر ضرور تھے۔ ان دو شخصیتوں کے تصادم نے اس دور کو ڈرامائی بنا دیا۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں منعقد ہونے والے مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس میں وہ قرارداد منظور کی گئی جو قراردادِ پاکستان کے نام سے شہرۂ آفاق بنی۔ یہ قرارداد بنگال کے وزیر اعلیٰ اے۔ کے فضل الحق نے پیش کی تھی، اس کی تائید چودھری خلیق الزمان اور بعض دوسرے اصحاب نے کی۔ اس قرارداد میں کہا گیا کہ:۔

> "اس ملک میں کوئی بھی آئینی منصوبہ نہ قابلِ عمل ہو گا، اور نہ مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول، جب تک اسے حسبِ ذیل بنیادی اصولوں کی اساس پر وضع نہیں کیا جائے گا۔ یعنی جغرافیائی طور پر متصل اکائیوں کی ایسے خطوں کی صورت میں حد بندی کی جائے، جن کی تشکیل ضروری علاقائی ردّ و بدل کے ساتھ اس

طرح کی جائے گی کہ جن علاقوں میں مسلمان آبادی کے لحاظ سے اکثریت میں ہیں، جیسا کہ وہ ہند کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں ہیں، ان علاقوں کو اس طرح آپس میں ملایا جائے گا کہ وہ آزاد مملکتیں بن جائیں۔ ان مملکتوں میں شامل ہونے والی وحدتیں خود مختار اور صاحب اقتدار ہوں گی.... اقلیتوں کے لیے آئین میں مناسب، موثر اور واجب التعمیل تحفظات کا خاص طور پر اہتمام ہونا چاہیے.. .... تاکہ ان کے مذہبی، ثقافتی، معاشی، سیاسی، انتظامی اور دوسرے حقوق کی حفاظت کی جا سکے۔"

اس قرارداد میں جو بنیادی نظریہ کارفرما تھا، جناح نے اس موقع پر اپنی تقریر میں اس کا بڑی جامعیت سے اظہار کر دیا۔ انہوں نے کہا:۔

"اس بات کو غلطی سے ہمیشہ مان لیا گیا ہے کہ مسلمان ایک اقلیت ہیں۔ مسلمان ہرگز ایک اقلیت نہیں۔ مسلمان ہر لحاظ سے ایک قوم ہیں.... ہند میں ایک وحدانی حکومت ڈیڑھ سو برس میں جو کچھ حاصل نہیں کر سکی، ایک مرکزی وفاقی حکومت کو ٹھونسنے سے اسے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اِلّا یہ کہ مسلح افواج کے ذریعہ سے ہند کے مسئلہ کی نوعیت فرقہ وارانہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک بین الاقوامی نوعیت کا مسئلہ ہے اور اسی حیثیت سے اسے زیر بحث لانا چاہیے۔ ہندو اور مسلمانوں کا تعلق..... دو مختلف تہذیبوں سے ہے، جن کی بنیاد باہم گر متصادم خیالات اور نظریات پر ہے...... ایسی اقوام کو ایک واحد مملکت کا حلقہ بگوش بنانے سے، جس میں ایک قوم آبادی کے لحاظ سے اقلیت میں ہو، اور دوسری اکثریت میں لازماً بے چینی اور کشمکش میں اضافہ ہو گا، اور بالآخر وہ ڈھانچہ ہی تباہ ہو جائے گا، جسے ایک ایسی مملکت کی حکومت کے لیے معرض وجود میں لایا گیا ہو گا" ۳ے

یہ تھا وہ مشہور زمانہ دو قومی نظریہ، جو اس قدر بحث و نزاع کا محرک ہوا۔ کانگرسی لیڈروں نے غیظ و غضب کے عالم میں اسے مسترد کر دیا، حالانکہ ہندو مہاسبھا کے صدر، ساورکر ایسے لیڈر مسلمانوں اور ہندوؤں کا ذکر اکثر دو قوموں کے طور پر کرتے رہے تھے ۴ے۔ تاریخی شعور رکھنے والے ایک ہندو نے لکھا

ہے۔ "نام نہاد دو قومی نظریہ مسٹر جناح یا مسلم لیگ سے بہت پہلے وضع کیا جا چکا تھا۔ درحقیقت یہ سرے سے کوئی نظریہ ہی نہیں تھا، یہ تو تاریخ کی ایک حقیقت تھی"[۵]

جن حقائق پر دو قومی نظریہ کی بنیاد رکھی گئی تھی، وہ سب لوگوں کو انگریزوں سمیت اچھی طرح معلوم تھے۔ برطانوی پارلیمنٹ کی مشترکہ کمیٹی برائے آئینی اصلاحاتِ ہند نے ۱۹۳۴ء میں یہ کہہ دیا تھا:۔

> "ہند میں کئی نسلیں آباد ہیں ...... جو اکثر ایک دوسرے سے اپنے مبداء، روایات اور اسالیبِ زندگی میں اسی طرح جدا اور ممیز ہیں، جس طرح یورپ کی اقوام۔ اس کے دو تہائی باشندے ہندو مت کے پیروکار ہیں ...... مسلمان سات کروڑ ۷۰ لاکھ سے زیادہ ہیں، ان دونوں میں فرق و اختلاف، سچ پوچھیے تو صرف مذہب کا ہی نہیں ہے، بلکہ قانون و ضابطہ اور تہذیب و تمدن کا بھی ہے۔ ان کے بارے میں فی الحقیقت یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دو واضح اور علیحدہ تہذیبوں کی نمائندگی کرتے ہیں"۔[۶]

لیکن انگریز اپنی پالیسی کی مصلحتوں کے تحت اور کسی حد تک اپنے وقار کی خاطر ہند کی وحدت برقرار رکھنے پر تلے ہوئے تھے، جسے پارلیمانی مشترکہ کمیٹی نے "ہند کے لیے برطانوی حکمرانوں کا غالباً عظیم ترین عطیہ"[۷] قرار دیا تھا۔ وحدتِ ہند کی دلفریب اصطلاح کے پس پردہ ہندوؤں کے غلبہ اور استحصال کی بھیانک حقیقت مستور تھی۔ مسلمانوں کو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ انگریزوں کے ایک جغرافیائی اور سیاسی نظریہ کی خاطر قربانی کے بکرے کیوں بنیں۔ چونکہ انگریزوں کی اپنی زندگی صدیوں سے قومی نظریات کی اساس پر استوار ہوئی تھی۔ اس لیے ہند کے مسلمانوں پر 'قوم' کی اصطلاح کے اطلاق سے انگریزوں کے لیے مسلمانوں کا نقطۂ نظر زیادہ قریب الفہم ہو گیا۔

اگرچہ دو قومی نظریہ سے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ مملکت کی ضرورت ثابت کرنے میں شاندار کامیابی ہوئی، لیکن اس سے برصغیر ہند میں اقلیتوں کا مسئلہ پوری طرح حل نہ ہوا۔ مسلم اکثریت کے علاقوں کو ہندو اکثریت کے علاقوں سے علیحدہ کرنے کے بعد بھی اقلیتیں دونوں طرف باقی رہ جاتی تھیں اگرچہ ان کی تعداد میں بڑی کمی واقع ہوتی۔ چنانچہ قراردادِ پاکستان میں اس مسئلہ کا ذکر کیا گیا، اور پاکستان اور ہندوستان دونوں میں اقلیتوں کے لیے موثر اور واجب التعمیل تحفظات کی سفارش کی گئی۔ پاکستان کی تخلیق سے

اقلیتوں کا مسئلہ بالکل ختم نہیں ہو سکتا تھا لیکن اس سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں نزاع کے مواقع گھٹ جانے کی توقع تھی۔ اور ہر ملک کو اپنی حدود میں آباد اقلیتوں کی حفاظت میں یکساں دلچسپی اور مفاد کی امید ہو سکتی تھی۔

قراردادِ پاکستان کا ایک اور پہلو بھی تھا جس سے کچھ خدشات رونما ہوئے۔ شمال مغرب میں پورے پنجاب اور شمال مشرق میں سارے بنگال اور آسام کا مطالبہ کرنے کے بجائے اس قرارداد میں پاکستان کی حدود مسلم اکثریت کے متصلہ خطوں تک محدود کر دی گئیں " ایسے علاقائی ردوبدل کے ساتھ جو ضروری ہو"۔ بہت سے لوگوں نے اس سے پنجاب اور بنگال و آسام کی تقسیم کا مطلب اخذ کیا۔ قرارداد میں سرحدات کو یوں مبہم چھوڑ دینے سے پاکستان کے تصور پر غیر معین ہونے کا حرف آیا۔

قراردادِ لاہور پر عام لوگوں کا ردِعمل فرقہ بہ فرقہ مختلف تھا۔ مسلمانوں نے پُرجوش مسرت سے اس کا خیر مقدم کیا۔ اور ہندوؤں نے اسے ہر لحاظ سے قابلِ مذمت قرار دیا۔ اگر دو قومی نظریہ کی صداقت کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت تھی، تو وہ اس متضاد ردِعمل سے فراہم ہو گیا۔ ہندو لیڈروں نے کچھ اس انداز سے مخالفت کی کہ ہندوؤں کے مذہبی جذبات بھڑک اٹھیں، وہ برصغیر کی تقسیم کو "بھارت ماتا کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا" کہتے تھے۔ گاندھی نے اسے ایک اخلاقی برائی اور پاپ قرار دیا۔ جس میں وہ کسی صورت شریک نہیں ہو گا۔ دراصل چند مختصر وقفوں کے سوا، برصغیرِ ہند اپنی طویل تاریخ میں کبھی ایک واحد مرکزی حکومت سے روشناس نہیں ہوا تھا۔ جب حقیقتِ حال یہ ہو تو برصغیر کو دو آزاد خود مختار مملکتوں میں تقسیم کر دینے کی تجویز سے کسی مذہبی شعار کی توہین خارج از بحث ہے۔

مسلم عوام کے تخیل کو پاکستان کے تصور نے جس طرح مسحور کر لیا، اور مسلم لیگ کی مقبولیت اور طاقت میں جو عہد آفرین ترقی ہوئی، اس سے کئی مبصر حیرت زدہ ہوئے ہیں۔ تحریک پاکستان سے وابستہ ہو کر مسلمان فقط ہندوؤں کے تسلط سے نجات پانے کے آرزو مند نہیں تھے۔ جس بات نے ان کے جوشِ کردار کو ابھارا، وہ ایک صحیح اسلامی معاشرہ کی نشاۃ ثانیہ کی دلی خواہش تھی، جس میں عدل، جمہوری مساوات، احتیاج سے آزادی اور سماجی بہبود سے دلی لگن کی وہ خوبیاں پھر از سرِ نو فروغ پائیں، جو قرونِ اولیٰ میں مسلم معاشرہ کی منفرد خصوصیات تھیں، یہ اسی نمونۂ کامل کی کشش تھی، جس نے مسلم لیگ کو جواب تک صرف اونچے طبقات کی نمائندہ تھی ایک عوامی جماعت بنا دیا۔ اس اساس کے بغیر یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ اقلیتی

صوبوں کے مسلمان تحریکِ پاکستان کا دل و جان سے ساتھ دینے پر کیوں آمادہ ہو گئے۔

لیکن ایک عظیم نصب العین بھی قیادت کے فقدان کے باعث تشنۂ تکمیل رہ سکتا ہے۔ اس تاریخی مرحلے میں مسلم قوم کی بڑی خوش قسمتی تھی کہ اسے محمد علی جناح ایسا لیڈر مل گیا، جن کے بارے میں اقبال نے کہا تھا کہ "آج کے ہند میں وہ واحد مسلمان ہے جس سے ملت بجا طور پر یہ توقع کر سکتی ہے کہ وہ اس طوفان میں ان کی بے خطر رہنمائی کرے جو شمال مغربی ہند بلکہ شاید سارے ہند میں آنے والا ہے"۔ ؎ جناح کی کامل دیانت، جرأت، تدبر اور اخلاص پر مسلمان پوری طرح اعتماد کرتے تھے۔ وہ خود بھی ماضی میں مسلمان قیادت کی کمزوریوں سے پوری طرح آگاہ تھے۔ دسمبر ۱۹۳۸ء میں پٹنہ میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا، "جو مسلمان دانشور (۱۹۳۵ء میں) سیاسی زندگی کی صفِ اوّل میں تھے، میں یہ تو نہیں کہتا کہ سب کے سب — لیکن ان میں اکثر نے سیاست کو ذریعۂ مال و جاہ بنا لیا تھا۔ وہ اپنے مفاد اور مصلحت کے مطابق اپنی جگہ کا تعین کرتے تھے — یا دفتر شاہی کے کیمپ میں، یا دوسرے کیمپ یعنی کانگرس کے کیمپ میں"۔ ؎ جناح نے ان لوگوں کو مسلم لیگ سے نکال باہر نہیں کیا، لیکن وہ ان کی کمزوریوں سے واقف تھے، اور ہمیشہ ان کی نگرانی کرتے رہتے تھے۔

جناح اپنے دل کی گہرائیوں سے عوام کی آرزوؤں کے ہمدرد اور ان کے بہی خواہ تھے۔ اپریل ۱۹۴۳ء میں دہلی میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے پاکستان کا یہ تصور پیش کیا کہ اس میں "عوامی حکومت" ہو گی، اور ساتھ ہی "زمینداروں اور سرمایہ داروں کو متنبہ کیا کہ وہ ایک ایسے نظام کے تحت ہمارا خون چوس کر پروان چڑھ رہے ہیں، جو اس قدر فاسد ہے، جو اس قدر ظالمانہ ہے، جو انسانوں کو اس قدر خود غرض بنا دیتا ہے کہ ان کے ساتھ معقول دلیل کے ساتھ بات کرنا مشکل ہے ...... ہرگز انہیں اسلام کا سبق نہیں بھولنا چاہیے، پاکستان میں آئین اور حکومت وہی ہوں گے، جن کا فیصلہ عوام کریں گے"۔ ؎۱۰

جن لوگوں نے جناح کی آواز پر لبیک کہی، اور ان کے پیغام کی اشاعت میں سرگرمی دکھائی، وہ طلبہ، مثالیت پسند نوجوان اور ابھرتے ہوئے متوسط طبقہ کے لوگ تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور دوسرے تعلیمی اداروں کے طلبہ تحریکِ پاکستان کے سرگرم کارکن تھے۔ پنجاب میں جہاں جاگیرداروں اور زمینداروں کی حکومت تھی، مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے حمید نظامی کی قیادت میں رائے عامہ کی فضا بدلنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ مسلم اخبارات نے بھی پاکستان کے نظریہ کی نشر و اشاعت میں غیر معمولی خدمات سر انجام دیں۔

انگریزی میں ممتاز ترین روزنامہ 'ڈان' اردو میں 'نوائے وقت' اور بنگلہ میں 'آزاد' تھے۔ مسلم اخبارات کی تعداد بہت کم تھی اور مضبوط و مقتدر ہندو پریس کے مقابلہ میں ان کے مالی وسائل بھی نہایت کم تھے، لیکن انہوں نے مسلم لیگ اور اس کی پالیسیوں کے دفاع میں جنگ بڑی جرأت اور ہمت سے لڑی۔

طبقہ علماء کا بھی کافی حصہ پاکستان کی جدوجہد میں شامل ہو گیا، اور عوام میں ان کے اثر و رسوخ نے حصول مقصد میں گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔ کانگرس کے حامی اور حلیف علما کی جماعت۔ جمعیۃ العلمائے ہند کے بالمقابل دیوبند کے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی قیادت میں ان علما پر مشتمل جمعیۃ العلمائے اسلام بنائی گئی جو پاکستان کے موئید تھے۔

مسلم لیگ کے اثر و طاقت میں جوں جوں اضافہ ہوتا گیا، اس کے صدر جناح صوبائی وزرائے اعلیٰ تک کو بھی ضبط و نظم کے تحت لانے میں کامیاب ہو گئے۔ حتیٰ کہ ان کی تحریک پر وہ وائسرائے کی نامزد نیشنل ڈیفنس کونسل سے مستعفی ہو گئے۔ ۱۹۴۱ء کے اواخر میں جب وزیر اعلیٰ بنگال مولوی فضل الحق نے لیگ کی مرضی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنی کابینہ کی از سر نو تنظیم کی، تو کچھ عرصہ کے بعد انہیں مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ "اتحاد، یقین اور تنظیم" کا جو نعرہ جناح نے لیگ کو دیا، وہ ایک زندہ حقیقت بن گیا۔ برطانوی حکومت کے قیام کے بعد پہلی مرتبہ مسلم قوم منظم اور متحد ہو کر جناحؒ کی قیادت میں صف آرا ہو گئی اور وہ قائد اعظم کے لقب سے مشہور ہوئے۔ یہ خطاب انہیں ممنونِ احسان عوام نے عطا کیا تھا۔

اپریل ۱۹۴۰ء تک دوسری عالمی جنگ کا وہ مرحلہ گزر چکا تھا جسے "صوتی جنگ" کہا جاتا تھا۔ سقوطِ فرانس کے ساتھ ہی انگلستان محوری طاقتوں کی فتح مند افواج کے سامنے اکیلا اور تنہا رہ گیا۔ برطانوی کمزوری کا دفعۃً انکشاف اہلِ ہند کے لیے حیران کن تھا۔ انگریزوں کے ابتلا پر زیرِ لب مسکراہٹیں بھی تھیں اور ان کی جرأت مندانہ مدافعت پر تحسین بھی۔ ۸ اگست ۱۹۴۰ء کو وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے برطانوی حکومت کی منظوری سے سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کو فی الفور ایگزیکٹو کونسل میں شامل کرنے کی پیشکش کی، اور ایک جنگی مشاورتی کونسل کے قیام کی تجویز بھی پیش کی، جو ریاستوں اور دوسرے عناصر کے نمائندوں پر مشتمل ہو گی۔ وائسرائے نے یہ اعلان بھی کیا کہ جنگ کے بعد ہند کا ایک آئین ساز ادارہ قائم کیا جائے گا، جو اقلیتوں کے حقوق و مفادات کو کماحقہٗ ملحوظ رکھتے ہوئے ایک نیا آئین وضع کرے گا۔ برطانوی حکومت نے یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ "ہند میں امن اور بہبود سے متعلق اپنی موجودہ ذمہ داریاں کسی ایسے نظامِ حکومت

کو تفویض کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی، جس کی سندِ اقتدار کو ہندی قومی زندگی کے وسیع اور طاقتور عناصر قبول نہیں کرتے۔ اور نہ ہی وہ ایسے عناصر کو کسی ایسی حکومت کا مطیع فرمان بنانے کے لیے جبر و تشدد میں حصہ لے گی "۔ حکومتِ برطانیہ کی طرف سے یہ امید ظاہر کی گئی کہ جنگ میں فتحیابی کے لیے مشترکہ جد وجہد کرنے سے "وہ راستہ ہموار ہو جائے گا، جس پر گامزن ہو کر ہند برطانوی دولتِ مشترکہ میں آزادانہ اور مساویانہ شرکت حاصل کر سکے گا، جو شہنشاہِ معظم اور برطانوی پارلیمنٹ کا منظور و معروف مطمحِ نظر ہے"۔[۱۱]

اگست کی اس پیشکش کا کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ کانگرس نے یہ پیشکش اس بنا پر مسترد کر دی کہ قومی حکومت کے بارے میں اس کا مطالبہ پورا نہیں کیا گیا۔ اس مرحلہ پر سی۔ راجگوپال اچاری نے "ایک نمائشی پیشکش" کی کہ قومی حکومت میں وزیرِ اعظم مسلم لیگ میں سے لیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک بے معنی پیشکش تھی۔ کانگرس درحقیقت یہ چاہتی تھی کہ اقتدار صرف اس کے ہاتھوں میں ہی دیا جائے۔ گاندھی جسے کانگرس پر پورا اختیار حاصل تھا اس نے اپنا نقطۂ نظر غیر معمولی صاف گوئی سے یوں ظاہر کیا:-

> "برطانوی حکومت کبھی ایک مشترکہ سمجھوتے پر اصرار نہ کرتی، اگر وہ کسی ایک پارٹی کو اقتدار سنبھالنے کے لیے کماحقہ، مضبوط تسلیم کرتی ...... اگر کانگرس کمزوری کا شکار نہ ہوئی اور پورے صبر و تحمل سے کام لیتی رہی، تو وہ اقتدار سنبھالنے کے لیے ضروری طاقت حاصل کر لے گی۔ ہم نے خود ہی یہ فریبِ نظر پیدا کر رکھا ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے تمام فریقوں سے سمجھوتہ ہمارے لیے لازمی ہے"۔[۱۲]

مسلم لیگ اگرچہ اس یقین دہانی پر مطمئن تھی کہ کوئی بھی آئین اس کی رضامندی کے بغیر نافذ نہیں کیا جائے گا، لیکن وہ بھی اگست کی پیشکش کو قبول نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ اس میں مسلم لیگ کو جو نمائندگی دینے کا وعدہ کیا گیا تھا، وہ ناکافی تھی۔ الغرض برطانیہ پہلے جنگ میں فتح حاصل کرنا چاہتا تھا اور پھر اقتدار منتقل کرنے کو تیار تھا۔ کانگرس پہلے فوری طور پر اپنی طرف انتقالِ اقتدار چاہتی تھی، اور ہندو مسلم مفاہمت بعد میں۔ مسلم لیگ کا اصرار تھا کہ ہندو مسلم مفاہمت پہلے ہو۔ جنگ کے اوّل سے آخر تک ہر ایک فریق کا یہی رویہ رہا۔

اکتوبر ۱۹۴۰ء میں گاندھی نے اپنی "انفرادی سول نافرمانی" کی مہم کا آغاز کیا۔ جس کے تحت جنگ کے خلاف تقریریں کر کے منتخب افراد اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کرتے تھے۔ لیکن نہ ملک نے

اور نہ حکومت نے ہی نافرمانی کے ایسے اقدامات کو کسی توجہ کے قابل سمجھا۔ جنگ کے لیے رسد اور بھرتی کی مانگ نے ہند کی معیشت کے لیے ایسے نئے محرکات پیدا کر دیے تھے جن کی اشد ضرورت تھی۔ جنگ سے پہلے سالہا سال سے ہند کی معیشت میں بے روزگاری اور وسائل سے ناکافی استفادہ مستقل عارضے کی صورت اختیار کر چکے تھے۔

مارچ ۱۹۴۲ء تک بہت سے اہلِ ہند یہ سمجھنے لگے تھے کہ ہند میں بھی جاپانیوں کی یلغار اسی طرح آن کی آن میں کامیاب ہو جائے گی جس طرح جنوب مشرقی ایشیا میں فتح یاب ہوئی تھی۔ سوبھاش چندر بوس جو ۱۹۴۱ء میں ہند سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا اس نے جاپان کے پاس ہندوستانی جنگی قیدیوں میں سے انڈین نیشنل آرمی منظم کرنی شروع کر دی۔

یہ تھے وہ حالات، جن میں برطانوی حکومت نے کابینۂ جنگ کے ایک ممتاز رکن سر سٹیفورڈ کرپس کو ایک مسودۂ اعلان دے کر ہند میں بھیجا کہ وہ اس پر یہاں کے لیڈروں سے تبادلہ خیالات کرے۔ وہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۲ء کو دہلی پہنچا۔ لیڈروں سے بات چیت کی، اور کسی نتیجہ خیز کامیابی کے بغیر دو ہفتوں کے بعد رخصت ہو گیا۔ کرپس جو مسودۂ اعلان لے کر آیا تھا، اس میں جنگ ختم ہونے کے فوراً بعد آئین ساز اسمبلی کا وعدہ کیا گیا تھا، جسے صوبوں کے منتخب نمائندوں اور ریاستوں کے نامزد نمائندوں پر مشتمل ہونا تھا۔ اس میں برطانوی حکومت کی طرف سے یہ ضمانت بھی دی گئی تھی کہ آئین ساز اسمبلی جو بھی آئین مرتب کرے گی حکومتِ برطانیہ اسے منظور کر لے گی اور اس کا اجرا کر دے گی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ہر صوبے اور ریاست کو نئے آئین کو قبول یا رد کرنے کی آزادی حاصل ہو گی۔ اس اثنا میں ہند کے دفاع کی باگ ڈور برطانوی حکومت کے ہاتھ میں رہے گی۔ ہند کا دفاع "برطانیہ کی عالمی جنگ کی مساعی کا حصہ ہو گا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اہلِ ہند کے اہم فرقوں کے لیڈروں کو ہند کے فوجی، اخلاقی اور مادی وسائل کو پوری طرح منظم کرنے کے لیے فوری اور موثر اشتراکِ عمل کی دعوت دی جاتی ہے" ۱۳

گاندھی کے مشورہ پر کانگرس نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا۔ گاندھی کی رائے میں یہ پیشکش "دیوالیہ ہونے والے بنک کے ایسے چیک کے مترادف تھی، جس پر بعد کی تاریخ ڈال گئی ہو" مسلم لیگ نے بھی اسے نامنظور کر دیا، کیونکہ اس پیش کش میں مطالبۂ پاکستان کو صاف اور غیر مبہم انداز میں منظور نہیں کیا گیا تھا۔ کانگرسی لیڈروں میں سے صرف راجگوپال اچاری نے کرپس کی پیش کش کو قبول کر لینے

اور جنگ کے تقاضوں سے عہدہ برا ہونے کے لیے ایک قومی محاذ کی تشکیل کی حمایت کی۔ اسے صاف نظر آ رہا تھا کہ آزادیٔ ہند کی راہ میں واحد رُکاوٹ کانگرس اور مسلم لیگ میں مفاہمت کا فقدان ہے۔ اس کی قیادت میں مدراس اسمبلی کے کانگرسی ارکان نے اپریل ۱۹۴۲ء میں ایک قرارداد منظور کی، جس میں اصولی طور پر پاکستان کو تسلیم کر لینے کی سفارش کی گئی تھی۔ لیکن کانگرس پارٹی پر جو لیڈر حاوی تھے، انہوں نے اس تجویز کو مسترد کر دیا اور راجگوپال اچاری کو سیاسی جلاوطنی میں دھکیل دیا گیا۔

اب گاندھی نے ہند سے فوری طور پر برطانوی انخلا اور کسی دوسرے فریق کے ساتھ پیشگی مفاہمت کے بغیر کانگرس کو اقتدار منتقل کر دینے پر زور دینا شروع کر دیا۔ گاندھی نے کہا "ہند میں برطانیہ کی موجودگی جاپان کو ہند پر حملہ آور ہونے کی دعوت دے رہی ہے۔ برطانوی انخلاء سے یہ تحریص باقی نہیں رہے گی۔ فرض کیجیے یوں نہیں ہوتا، تب بھی آزاد ہند حملہ سے پیدا ہونے والی صورتِ حال سے بہتر طور پر عہدہ برا ہو سکے گا۔" ؎۱۱

گاندھی کے ان خیالات کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو اپنے بمبئی کے اجلاس میں باقاعدہ طور پر اپنا لیا۔ جو بعد میں "ہند چھوڑ دو" کی قرارداد کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس قرارداد میں "ہند سے برطانوی اقتدار کی فوری کنارہ کشی" کا مطالبہ کیا گیا" اور "زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانہ پر عدم تشدد کے خطوط پر عوامی جدوجہد شروع کرنے" کی منظوری دی گئی۔ اس قرارداد کے مطابق "وسیع پیمانہ پر ایسی جدوجہد لازماً گاندھی جی کی قیادت میں ہوگی"۔ گاندھی نے خود اسے "کھلی بغاوت" کا نام دیا۔ اس سے چند دن قبل اس نے اعلان کیا تھا کہ وہ یہ نہیں چاہتا کہ قرارداد فسادات کا براہِ راست موجب بنے۔ لیکن باوجود احتیاطی تدابیر کے اگر فسادات ہو جائیں تو یہ حالت ناگزیر سمجھی جائے گی۔" اس مرتبہ حکومت نے اقدام کرنے میں زیادہ تاخیر روا نہ رکھی، گاندھی اور دوسرے کانگرسی لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا، اور کانگرس کمیٹیوں کو خلافِ قانون جماعتیں قرار دے دیا گیا۔ گاندھی نے کانگرس کے ممبروں کو جو آخری پیغام دیا وہ "کرو یا مرو" تھا۔ فوراً وسیع پیمانہ پر بدامنی شروع ہو گئی۔ ریلوے، ڈاک خانوں، تار اور ٹیلی فون کے نظام اور پولیس کے تھانوں پر حملے کیے گئے۔ نومبر کے آخر تک ۹۴۰ افراد ہلاک ہوئے اور ایک کروڑ ۳۵ لاکھ روپے کی املاک تباہ و برباد کر دی گئیں۔ دوسری سیاسی جماعتوں اور ملک کی اکثر آبادی نے اس تحریک سے کوئی سروکار نہ رکھا۔

مسلم لیگ نے کانگرس کے ان اقدامات کے متعلق کہا کہ یہ "سربرآوردہ ہندوؤں کو اقتدار سپرد

کر دینے کے لیے برطانیہ کو مجبور کرنے کی کوشش ہے۔ مسلمان بھی حصولِ آزادی کی طلب میں کسی دوسرے سے ذرا پیچھے نہ تھے۔ لیکن وہ محسوس کرتے تھے کہ کانگرس کا اصل مقصد "ہندو راج کا قیام اور مسلمانوں کے نصب العین یعنی پاکستان پر مہلک وار کرنا ہے"۔ گاندھی کے نعرہ "ہند چھوڑ دو" کا قائداعظم نے یہ جواب دیا "تقسیم کرو اور چھوڑ دو"۔

فروری ۱۹۴۳ء میں گاندھی نے ۲۱ روزہ برت شروع کر دیا، ایک وقت ایسا بھی آیا، جب اس کی زندگی خطرہ میں پڑ گئی، اور اسے غیر مشروط طور پر رہا کر دینے کے لیے وائسرائے پر بڑا دباؤ ڈالا گیا۔ اس مسئلہ پر وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے تین ارکان بھی مستعفی ہو گئے لیکن حکومت اپنے موقف پر ڈٹی رہی اور گاندھی کی جان بھی بچ گئی۔

۱۹۴۳ء کے اواخر میں جب لارڈ لنلتھگو کی جگہ لارڈ ویول وائسرائے بنا، تو جنگ کے مدوجزر کا رُخ اتحادیوں کے موافق ہو چکا تھا۔ ہند کو جنوب مشرقی ایشیا محاذ کی رسدگاہ بنا دیا گیا تھا اور امریکہ، برطانیہ اور ہند کی وسیع افواج کو ضروریات اور سازوسامان بہم پہنچانے کے بارے ہند کی معیشت پر بہت ناگوار اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ جہازوں کی نایابی درآمدات میں تخفیف، برما محاذ کے لیے افواج اور جنگی سازوسامان کی بھاری نقل وحمل سے نظامِ مواصلات میں خلل، عام اشیاء ضرورت کی کمی اور سب سے بڑھ کر ہند میں مساعی جنگ کے لیے تخلیق زر ان سب اسباب کا مل جل کر نتیجہ یہ نکلا کہ قیمتوں میں تیزی سے اضافہ ہوا اور افراطِ زر کا دباؤ سنگین صورت اختیار کر گیا۔ سب سے زیادہ مصیبت بنگال نے اٹھائی، جہاں ۱۹۴۳ء میں شدید قحط پڑا۔ چاول کے بھاؤ اتنے چڑھ گئے تھے کہ کاشتکاروں نے اپنی ساری فصل بیچ ڈالی اور پھر بھوک کے مارے لاکھوں کی تعداد میں لقمۂ اجل ہو گئے۔ سرکاری طور پر اعتراف کیا گیا کہ ۱۰ لاکھ ۳۰ ہزار ۷ سو انچاس افراد فاقہ کشی سے مر گئے۔ ذرائع مواصلات پر بے پناہ بار رسد کی نقل وحمل میں تاخیر کا باعث بنا۔ راشن بندی کا نفاذ بے حد سست رفتار سے عمل میں لایا گیا اور مرکزی حکومت نے بہت تاخیر کے بعد اس وقت مداخلت کی جب لارڈ ویول نے اس مسئلہ کی طرف اپنی ذاتی توجہ مبذول کی۔

مئی ۱۹۴۴ء میں گاندھی کو طبی وجوہ کی بناء پر رہا کر دیا گیا۔ رہائی کے فوراً بعد اس نے وائسرائے کو خط لکھا جس میں سول نافرمانی کی تحریک واپس لینے پر آمادگی ظاہر کی اور ساتھ ہی کانگرس کی طرف سے مساعی جنگ میں پورے تعاون کی بھی پیشکش کی، بشرطیکہ ہند کی آزادی کا فوراً اعلان کر دیا جائے،

اور مرکزی اسمبلی کے سامنے جوابدہ ایک قومی حکومت قائم کر دی جائے۔"[۱۵] جنگ کے ابتدائی سالوں میں جب برطانیہ شکست پر شکست کھا رہا تھا، گاندھی جنگ میں ہند کی شرکت کے خلاف تھا، اور اس کی وجہ ایک بنیادی مذہبی اصول اہنسا (عدم تشدد) بیان کیا تھا، اب کہ اتحادیوں کی فتح کا یقینی امکان پیدا ہو گیا تھا، اہنسا کو بلا تامل بالائے طاق رکھ دیا گیا اور مساعی جنگ میں اشتراکِ عمل کی پیشکش کر دی گئی تاکہ وہ سیاسی مقصد حاصل کیا جا سکے، جس کے لیے اہنسا اور تمام دوسرے اصول محض ایک ذریعہ تھے۔

جنگ کے خاتمہ کے یقین نے سیاسی سرگرمیوں کے لیے خمیر کا کام دیا۔ اور ہندو مسلم اختلافات کے تصفیہ کی عام خواہش کے احترام میں گاندھی اور قائدِ اعظم کے درمیان مذاکرات ہوئے۔

گاندھی کی اصل خواہش یہ تھی، جیسا کہ اس نے ان مذاکرات کے دوران میں راج گوپال اچاری سے کہا کہ "خود جناح کے اپنے منہ سے یہ ثابت کر دیا جائے کہ پاکستان کی تمام تر تجویز لغو اور بے معنی ہے۔"[۱۶] قائدِ اعظم اس معاملہ میں از حد سنجیدہ تھے اور انہوں نے بڑی محنت سے گاندھی کو مطالبۂ پاکستان کی اساس سمجھانے کی کوشش کی۔ انہوں نے گاندھی کے نام خط میں لکھا "ہمارا موقف یہ ہے کہ قوم کی جو بھی تعریف یا معیار اختیار کیا جائے ہر لحاظ سے ہندو اور مسلمان دو بڑی قومیں ہیں ...... ہم دس کروڑ پر مشتمل ایک قوم ہیں ...... زندگی اور زندگی کے بارے میں ہمارا اپنا منفرد نظریہ ہے۔ بین الاقوامی قانون کے ہر اصول کے لحاظ سے ہم ایک قوم ہیں۔" قائدِ اعظم نے مزید لکھا "مجھے اس بات کا پختہ یقین ہے کہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ باقی ہند کی بھی صحیح بہبود قرار دادِ لاہور میں تجویز کردہ ہند کی تقسیم میں مضمر ہے۔"[۱۷]

دوسری طرف گاندھی کا موقف یہ تھا کہ اہلِ ہند ایک ہی قوم ہیں، اور قرار دادِ پاکستان میں اسے "سارے ہند کی کلی تباہی" نظر آتی تھی۔ اگر پاکستان کا مطالبہ تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں تو پھر جن علاقوں میں مسلمان مطلق اکثریت میں ہیں، ان کی حد بندی ایک ایسے کمیشن کو کرنی چاہیے جو کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کا منظور شدہ ہو، اور ان علاقوں کے تمام بالغ افراد کی خواہشات استصواب رائے کے ذریعہ معلوم کی جائیں۔ گاندھی نے کہا:-

> "اگر فیصلہ علیحدگی کے حق میں ہوا تو پھر ہند کے غیر ملکی تسلط سے آزاد ہو جانے کے بعد حتی الوسع جلد از جلد ان علاقوں کو ایک علیحدہ مملکت کی شکل دی جائے گی ...... علیحدگی کے لیے ایک باقاعدہ معاہدہ کیا جائے گا، جس میں امورِ خارجہ، دفاع، اندرونی

مواصلات، محصولات، تجارت اور ایسے ہی دیگر امور کے موثر اور اطمینان بخش انتظام کا بھی اہتمام ہوگا، یہ امور معاہدہ کرنے والے فریقوں کے درمیان لازماً مشترک رہیں گے۔"[۵۵]

اس کا درحقیقت مطلب یہ تھا کہ سارے ہند پر اقتدار پہلے کانگرس کو منتقل کیا جائے جو اس کے بعد علیحدگی کے حق میں ووٹ ڈالنے والے مسلم اکثریتی علاقوں کو ایک خود مختار و آزاد مملکت کی حیثیت سے نہیں بلکہ وفاقِ ہند کے ایک حصہ کے طور پر اپنی تشکیل کرنے کی اجازت دے گی۔ اس منصوبہ پر عمل درآمد کرتے ہوئے پنجاب اور بنگال کے صوبوں کو، جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، تقسیم کر دیا جائے گا۔ گاندھی نے یہ دعویٰ کیا کہ اس کی پیش کش سے "قرار دادِ لاہور کا اصل مدعا" حاصل ہو جائے گا۔ قائد اعظم نے اس سے اتفاق نہ کیا، اور مذاکرات ناکام ہو گئے۔

یورپ میں جنگ ختم ہونے کے فوراً بعد مئی ۱۹۴۵ء میں وائسرائے لارڈ ویول نے ایک سیاسی کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا، جس میں کانگرس اور لیگ کے نمائندوں، صوبوں کے وزرائے اعلیٰ اور چند دیگر لیڈروں کو شریک ہونے کی دعوت دی گئی۔ وائسرائے نے ایک عبوری مرکزی حکومت قائم کرنے کی تجویز پیش کی، جس میں تمام محکمے ماسوا جنگ کے اہلِ ہند کے ہاتھ میں دیے جائیں گے۔ اور مسلمانوں اور اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے نمائندوں کی تعداد مساوی ہوگی۔ یہ کانفرنس شملہ میں ۲۵ جون کو شروع ہوئی اور ۱۴ جولائی تک چلی۔ لیکن ناکام رہی۔ مسلم لیگ کا مطالبہ یہ تھا کہ ایگزیکٹو کونسل کے پانچوں مسلم ارکان لیگ سے ہی لیے جائیں گے۔ اس پر بات رک گئی۔ وائسرائے نے کہا کہ وہ چار ارکان تو مسلم لیگ سے لینے کو تیار ہے، لیکن پانچواں ایک پنجابی مسلمان ہوگا، جو لیگ میں شامل نہیں ہے۔ بظاہر یہ معمولی اختلاف رائے تھا، لیکن اس کے پیچھے ایک سخت سیاسی تنازعہ تھا۔ ۱۹۴۲ء میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات کے بعد خضر حیات ٹوانہ ان کا جانشین بنا۔ وہ اپنے پیشرو کی سی ذہنی لچک سے عاری تھا اور بہت جلد پنجاب میں مسلم لیگ کے مقام و مرتبہ پر قائد اعظم سے اس کا جھگڑا ہو گیا۔ مسلم لیگ کے خلاف خضر حیات ٹوانہ نے جو موقف اختیار کیا، اس میں جاگیردار مسلم عناصر، یونینسٹ پارٹی کے ہندوؤں، سکھوں اور انگریز گورنر سر برٹرنڈ گلانسی نے اس کی تائید کی۔ ان سب نے پنجاب کے اہل الرائے طبقہ اور عوام میں مسلم لیگ کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو نظر انداز کر دیا۔ بڑے زمیندار جو ہر حاکمِ وقت کی فرمانبرداری کی مستقل روایات رکھتے تھے، انہیں وقت کے واضح تقاضے بھی سجھائی نہ دیے۔ وائسرائے کی طرف سے پنجاب

سے غیر لیگی مسلمان پر جو اصرار کیا جا رہا تھا، اس کی وجہ وہ مشورہ تھا جو انگریز اور ہندو حکام نے مسلم لیگ کے خلاف خضر حیات ٹوانہ کے موقف کی حمایت میں دیا تھا ۱۹ ء کانگرس بھی خضر حیات ٹوانہ کی تائید کر رہی تھی۔ کیونکہ وہ مسلم لیگ کے اس دعویٰ کو ماننے سے کہ صرف لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے، انکار کرتی تھی۔ جب قائد اعظم اپنے موقف پر چٹان کی طرح ڈٹ گئے، تو کانفرنس ناکام ہو گئی۔

۱۵ اگست ۱۹۴۵ء کو جاپان نے ہتھیار ڈال دیے اور دوسری عالمی جنگ ختم ہو گئی۔ جولائی کے آخر میں برطانیہ میں جو عام انتخابات ہوئے، ان میں لیبر پارٹی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی۔ کانگرسی رہنما جنہوں نے سالہا سال سے لیبر پارٹی کے لیڈروں سے گہرے روابط استوار کر رکھے تھے، وہ برطانیہ میں حالات کے اس غیر متوقع رُخ پر بہت مسرور ہوئے اور فی الفور اپنے اس مقام تفوق سے فائدہ اٹھانے لگے۔ برطانوی پالیسی ہمیشہ ہند کو ایک انتظامی اور سیاسی وحدت کے طور پر برقرار رکھنے کی حامی رہی تھی۔ لارڈ لنلتھگو ایسے قدامت پسند (کنزرویٹو) نے بھی اس بات پر اسی طرح زور دیا تھا، جس طرح فوجی مدبر لارڈ ویول نے۔ کانگرسی لیڈر لیبر پارٹی سے اس مسئلہ پر اور بھی زیادہ حمایت کی توقع کرتے تھے، جو کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان متنازعہ فیہ تھا۔

یہ مسئلہ کہ تقسیم ہند ہو یا نہ ۱۹۴۵-۴۶ء کے موسم سرما میں صوبائی اور مرکزی مجالس قانون ساز کے عام انتخابات کی آزمائش گاہ میں پیش ہوا۔ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، کیونکہ ہند کے آئینی مستقبل کا دارومدار انہی انتخابات کے نتائج پر تھا۔ ان انتخابات نے پاکستان کے حق میں فیصلہ کن فتح پر مہر توثیق ثبت کر دی۔ مسلم لیگ نے مرکزی اسمبلی میں ساری مسلم نشستیں جیت لیں، اور صوبائی اسمبلیوں کی کل ۴۹۵ مسلم نشستوں میں سے ۴۴۶ مسلم لیگ کے حصہ میں آئیں۔ کانگرس نے بھی ہندو نشستوں کے معاملہ میں ایسی ہی کامیابی حاصل کی، اور جن صوبوں میں ہندو اکثریت میں تھے، وہاں برسر اقتدار آ گئی۔ بنگال کی ۱۱۹ مسلم نشستوں میں سے مسلم لیگ نے ۱۱۳ جیت لیں اور حسین شہید سہروردی بطور وزیر اعلیٰ وزارت بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ پنجاب میں ۸۶ مسلم نشستوں میں سے ۷۷ مسلم لیگ کے حصہ میں آئیں۔ سندھ میں بھی مسلم لیگی وزارت قائم ہو گئی۔ صرف شمال مغربی سرحدی صوبہ میں مسلم لیگ اکثریت حاصل کرنے میں ناکام ہوئی۔ وہاں ۳۶ مسلم نشستوں میں سے صرف ۱۷ اس کے حصہ میں آئیں، اور کانگرس نے ڈاکٹر خانصاحب کے تحت وزارت قائم کر لی۔

۱۹۴۶ء کے انتخابات نے بلاشک وشبہ واضح کردیا کہ صرف مسلم لیگ ہی مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے، لیکن اس بات نے کانگرس کی مخالفت کو تیز تر کر دیا۔ مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت کو قبول کرنے اور اس سے مفاہمت کرنے کے بجائے کانگرس نے مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی پالیسی جاری رکھی، تاکہ جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں تھے، وہاں بھی مسلمانوں کے معتمد علیہ نمائندوں کو سیاسی اقتدار سے محروم رکھا جائے۔ کانگرس نے اپنی اس حرکت سے مسلمانوں کے شکوک وشبہات کو اور بھی گہرا کر دیا، فرقہ وارانہ مناقشت کو شدید تر اور خوشگوار مصالحت کو ناممکن بنا دیا۔

مسلم لیگ سے کانگرس کی مخاصمت کی اظہر من الشمس مثال پنجاب میں دیکھنے میں آئی۔ وہاں یونینسٹ پارٹی کو، جس کی قیادت خضر حیات کر رہا تھا، مسلم لیگ نے شکستِ فاش دی تھی، اور ۸۶ مسلم نشستوں میں سے ۷۹ جیت لی تھیں۔ ۱۷۵ ارکان کے ایوان میں مسلم لیگ سب سے بڑی پارٹی تھی، لیکن اسے مطلق اکثریت حاصل نہیں ہو سکی تھی، کیونکہ ۱۹۳۲ء میں برطانوی حکومت کے فرقہ وارانہ ایوارڈ نے پنجاب میں مسلم اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کر دیا تھا۔ یونینسٹ پارٹی کے چند ارکان کے علاوہ جن کی قیادت خضر حیات ٹوانہ کر رہا تھا پنجاب میں دو سرے اہم دھڑے اکالی سکھوں اور کانگرسی ہندوؤں کے تھے۔ موخر الذکر ہمیشہ یونینسٹ پارٹی کی مخالفت میں صف آرا رہے تھے اور اسے برطانوی سامراج کا رجعت پسند ایجنٹ قرار دیتے تھے۔ مسلم لیگ صرف اسی صورت میں وزارت بنا سکتی تھی کہ کچھ ہندو اور سکھ اس کا ساتھ دیں، لیکن کانگرس کی عیارانہ چالوں اور سکھ لیڈروں کی کوتاہ اندیشی نے اسے ناممکن بنا دیا۔ کانگرس کے صدر ابوالکلام آزاد اور بلدیو سنگھ نے خضر حیات ٹوانہ کو آمادہ کر لیا کہ وہ کانگرسی ہندوؤں اور اکالی سکھوں کی مدد سے ڈانواں ڈول وزارت بنالے۔ اس بے اصول گٹھ جوڑ کا واحد مقصد یہ تھا کہ پنجاب میں مسلم لیگ کے ہاتھ میں عنانِ اقتدار نہ آسکے۔ ابوالکلام آزاد یہ داستان بڑے فخر واطمینان سے بیان کرتے ہیں کہ کس طرح "میری کوششوں سے مسلم لیگ کو الگ تھلگ کر دیا گیا، اور کانگرس اقلیت میں ہونے کے باوجود پنجاب کے معاملات میں فیصلہ کن عامل بن گئی" [۲۱] نہرو کی رائے تھی کہ وزارتِ پنجاب میں کانگرس کا اشتراک ٹھیک نہیں، لیکن گاندھی نے کھل کر آزاد کی تائید کی۔ "ان کے خیال میں کانگرس کے نقطۂ نظر سے اس سے بہتر کوئی حل نہیں ہو سکتا تھا" [۲۲]

اس نازک وقت میں کانگرس نے اپنی قسمت وابستہ کر کے سکھوں نے ایک بنیادی غلطی کی۔

انہیں کس طرح اور کیوں اس غلطی کے ارتکاب پر آمادہ کیا گیا؛ یہ مسئلہ مزید محتاج وضاحت ہے۔ سکھ فرقہ کی بنیاد ایک صوفی منش ہندو گرونانک نے سولہویں صدی میں رکھی تھی۔ انہوں نے اسلام کی تعلیمات کے زیر اثر توحید اور انسانی اخوت کی تبلیغ کی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ہندو سرزمین سے پیدا ہونے والے دوسرے فرقوں کی طرح سکھوں کو بھی ہندو معاشرہ میں دوبارہ مدغم کر لیا گیا۔ اگرچہ یہ ادغام سکھوں کے سر کے بالوں اور لباس کی خاص وضع کے باعث مکمل نہیں تھا۔ ہندو معاشرہ میں ذات پات کا نظام ایک وسیع جال کی طرح ہے جس میں سکھ بھی گرفتار ہو گئے ۔ اس معاشرہ کا ایک غیر مرئی لیکن نہایت طاقتور پہلو وہ معاشی پیش بندیاں ہیں جو غیروں کے خلاف کی جاتی ہیں۔ ہندو سکھ ایک دوسرے کے ساتھ کھاتے پیتے ہیں، ان میں باہمی شادیاں بھی ہوتی ہیں، ایک ہی گھرانے میں ایک بھائی ہندو اور دوسرا سکھ ہو سکتا ہے۔ سلطنتِ مغلیہ کے دورِ زوال میں سکھوں کی شوریدہ سری نے انہیں حکومت سے بھڑا دیا، اور اس فرقہ میں مسلمانوں کے خلاف تعصب پیدا ہو گیا۔ انیسویں صدی کے پہلے نصف میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پنجاب میں سکھ سلطنت قائم کر لی؛ جو اس کی وفات کے بعد ۱۸۴۹ء میں برطانیہ کے تصرف میں آ گئی۔

سکھ اگرچہ ہند کے طول و عرض میں نظر آتے ہیں لیکن ان کا گھر پنجاب ہے۔ ان کی آبادی ۵۵ لاکھ تھی، اور وہ پنجاب کی آبادی کا ۱۳٫۲ فیصد تھے۔ پنجاب اسمبلی اور سرکاری ملازمتوں میں انہیں ۲۰ فیصد نمائندگی دی گئی تھی۔ وہ پنجاب کی زرخیز ترین اراضی کے بڑے حصے کے مالک تھے۔ خاص طور پر نہروں سے سیراب ہونے والی لائل پور اور منٹگمری کی نو آبادیوں میں۔ ہند کی فوج میں ان کی نمائندگی کافی زیادہ تھی۔ ۱۹۴۶ء میں ان کی قیادت جلد باز اور تند خو تارا سنگھ کے ہاتھ میں تھی، وہ ہندو سے سکھ بنا تھا، اس کا مالی معاون بلدیو سنگھ تھا، جس کے مفادات ہندو علاقوں سے وابستہ تھے۔

۱۹۴۶ء کے انتخابات پاکستان کے سوال پر لڑے گئے، اور مسلمانانِ پنجاب نے اپنا واضح فیصلہ پاکستان کے حق میں صادر کیا۔ ہندو پاکستان کے مخالف تھے، کیونکہ اس کا نتیجہ تقسیمِ ہند تھا۔ پاکستان کے بارے میں سکھوں کے موقف کا ابھی تعین ہونا تھا، جسے پنجاب اور خود سکھوں کے لیے فیصلہ کن ثابت ہونا تھا۔ پنجاب کے اضلاع پانچ ڈویژنوں میں تقسیم تھے۔ مغرب میں راولپنڈی اور ملتان ڈویژنوں میں اور لاہور ڈویژن کے مغربی حصہ میں مسلمان اکثریت میں تھے۔ مشرق میں انبالہ ڈویژن میں ہندو اکثریت میں تھے۔ وسطی علاقہ یعنی جالندھر ڈویژن اور لاہور ڈویژن کے مشرقی حصہ میں کسی فرقہ کو بھی

اکثریت حاصل نہ تھی ـــــ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان توازن سکھوں کے ہاتھ میں تھا۔

جب کبھی پاکستان معرضِ وجود میں آتا، تو غالباً انبالہ ڈویژن کو جہاں ہندو واضح اکثریت میں تھے، کاٹ کر ہندوستان میں شامل کر دیا جاتا۔ لیکن اس سے پنجاب کی اصل وحدت پر کوئی اثر نہ پڑتا، کیونکہ زبان و ثقافت کے اعتبار سے انبالہ ڈویژن ہندوستان کے متصلہ ہندو علاقوں سے ملتا جلتا تھا۔ دسمبر ۱۹۳۰ء میں اقبال نے پاکستان کے بارے میں جو سکیم پیش کی تھی، اس میں بھی انبالہ ڈویژن کی علیحدگی کی تجویز شامل تھی۔

لیکن اگر سکھ پاکستان کی مخالفت میں ہندوؤں سے مل جاتے، اور پاکستان میں شامل ہونے سے انکار کر دیتے، تو ایک بالکل مختلف نوعیت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا۔ اس صورت میں خطِ تقسیم پنجاب کے وسط سے گزرتا جو سکھوں کو کم و بیش دو مساوی حصوں میں کاٹ کر رکھ دیتا اور پنجاب کی معیشت جس کا انحصار ہند بھر میں سب سے زیادہ وسیع نظامِ انہار پر تھا، اسے حد سے زیادہ نقصان پہنچتا۔ سکھوں اور مسلمانوں کا صریح فائدہ پنجاب کی وحدت کو برقرار رکھنے میں تھا۔ لیکن یہ صرف اسی صورت میں ممکن تھا کہ دونوں فرقوں کے درمیان کوئی مفاہمت ہو جاتی، جس کے تحت مسلمان سکھوں کے جائز حقوق کی ضمانت دیتے اور سکھ ایک اقلیت کے طور پر پاکستان کو اور اس کے ضمن میں مسلم حکمرانی کو قبول کر لیتے۔ مسلم لیگ سکھ اقلیت کو پاکستان میں خصوصی حقوق و مراعات دینے کے لیے تیار تھی۔ قائدِ اعظم نے انہیں بارہا منصفانہ اور فراخدلانہ سلوک کی پیش کش کی، لیکن آبادی اور جغرافیہ کے حقائق کو کوئی بھی بدل نہیں سکتا تھا۔ چونکہ سکھوں کو پنجاب کے کسی ایک ضلع میں بھی اکثریت حاصل نہیں تھی، اس لیے قائدِ اعظم ان کے لیے مخصوص علاقہ یا خالصتان جیسا کہ بعض سکھ لیڈروں کا مطالبہ تھا، تراشنے سے قاصر تھے۔ اور نہ ہی سکھوں کو ایک اقلیت کے سوا کوئی اور حیثیت دے سکتے تھے۔ مجالس قانون ساز کے مسلم لیگی ارکان کی جو کنونشن اپریل ۱۹۴۶ء میں منعقد ہوئی، اس میں سکھ لیڈروں کو بھی شمولیت کی دعوت دی گئی۔ بعض سکھ لیڈروں نے شرکت بھی کی لیکن ان مذاکرات سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا، اور سکھوں نے اپنی قسمت کانگرس سے وابستہ کر لی۔ اگر سکھ لیڈروں نے مسلم پاکستان اور ہندو بھارت میں اپنے فرقے کے مستقبل کا تقابلی جائزہ لینے کے لیے دور اندیشی اور تدبر و دانش سے کام لیا ہوتا، تو ان کا فیصلہ یقیناً مختلف ہوتا۔ پاکستان میں اگرچہ وہ سب سے بڑی اقلیت نہ ہوتے، تو بھی انہیں سب سے اہم اقلیت شمار کیا جاتا، پاکستانی فوج میں انہیں زبردست اثر و رسوخ حاصل ہوتا، آسودہ حال نوآبادیاتی اضلاع میں وہ بہترین زمینوں کے مالک تھے، اور جفاکش کسانوں اور اچھے کاریگروں کے طور پر ملک کی معاشی زندگی

میں ان کی حیثیت بہت اہم ہوتی، سرکاری ملازمتوں اور پاکستان کی مجلس قانون ساز میں بھی انہیں اپنی آبادی کے تناسب سے زیادہ نمائندگی ملتی۔ لیکن مغل سلطنت کے زمانہ سے سکھوں نے جو مسلم دشمن روایات ورثہ میں پائی تھیں، ان کے فیصلہ پر وہ سیاہ بادل کی طرح سایہ فگن ہو گئیں۔

ہندو بھارت میں شامل ہونے کا فیصلہ کر کے سکھوں نے فی الحقیقت ثقافتی خودکشی کر لی۔ کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ڈاڑھی مونڈنے اور بال تراشنے کے خلاف ان کی قدغن ختم ہو جائے گی۔ اور ہندوؤں اور ان کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہیں رہے گا۔ بہرحال پنجاب پر حکومت کرنے کی جس ہوس میں وہ مبتلا تھے ہندوؤں نے اس کی حوصلہ افزائی کر کے انہیں اس انجام کی طرف دھکیل دیا جو ان کے لیے مقدر ہو چکا تھا۔ اس مرحلہ کے بعد انہوں نے قدم بقدم آنے والی "جنگ جانشینی" میں مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کا ساتھ دیا۔

باب ۳

کابینہ مشن پلان

۱۹ر فروری ۱۹۴۶ء کو برطانوی حکومت نے ہند میں ایک خاص مشن (کابینہ مشن) بھیجنے کے فیصلہ کا اعلان کیا۔ یہ مشن برطانوی کابینہ کے تین ارکان پر مشتمل تھا؛ اور اس کا مقصد وائسرائے لارڈ ویول کے ساتھ مل کر اور ہندی لیڈروں سے مشورہ کرنے کے بعد آئینی مسائل کے بارے میں مفاہمت کی صورت تلاش کرنا تھا۔ کابینہ مشن کے دورۂ ہند پر دارالعوام میں بحث کے دوران میں وزیراعظم اٹیلی نے ۱۵ر مارچ کو تقریر کرتے ہوئے کہا:

> "میں خوب جانتا ہوں کہ میں ایک ایسے ملک کے بارے میں اظہارِ خیال کر رہا ہوں، جس میں نسلوں، مذاہب اور زبانوں کے کئی مجموعے ہیں، اس طرح جو مشکلات پیدا ہو گئی ہیں میں ان سے بھی واقف ہوں، لیکن ان مشکلات پر صرف ہند کے لوگ ہی قابو پا سکتے ہیں۔ اقلیتوں کے حقوق کا بھی ہمیں پورا خیال ہے . . . مگر کسی اقلیت کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ اکثریت کی راہ ترقی میں حق استرداد (ویٹو) کا روڑا اٹکا دے۔"

ایٹلی کے ان الفاظ سے کانگرس کو بڑی خوشی ہوئی اور مسلم لیگی حلقوں میں یہ الفاظ کئی شکوک و خدشات کا باعث بنے۔ قائد اعظم محمد علی جناح نے اس ضمن میں مکڑے کی تمثیل بیان کی، جو مکھی کو اپنے دیوان خانے میں آنے کی دعوت دیتا ہے: "اگر مکھی انکار کرتی ہے۔ تو اس پر حقِ استرداد استعمال کرنے کا الزام لگایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ مکھی سخت اڑیل ہے۔"

کابینہ مشن ۲۴ مارچ ۱۹۴۶ء کو نئی دہلی پہنچ گیا۔ یہ مشن وزیرِ مملکت برائے امورِ ہند لارڈ پیتھک لارنس، تجارت بورڈ کے صدر سر سٹیفورڈ کرپس اور بحریہ کے فرسٹ لارڈ مسٹر اے وی، الیگزینڈر پر مشتمل تھا۔ جس ہند میں وہ آئے وہ پُر امید بھی تھا اور مضطرب بھی۔ آزادی کی پری سامنے نظر آ رہی تھی، لیکن جو ہاتھ اس کی طرف بڑھتے تھے وہ آپس میں اُلجھ کر رہ جاتے تھے۔ دو بڑی قوموں ـــ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشمکش دن بدن شدید تر ہو رہی تھی۔ معاشی تردد سے لوگ الگ پریشان تھے۔ جنگ کے دوران میں ۲۵ لاکھ افراد کو بھرتی کیا گیا تھا اور انہیں اسلحہ کے استعمال کی تربیت دی گئی تھی۔ ان کی بھاری اکثریت اب فوج سے علیحدہ کئے جانے کی منتظر تھی اور انہیں عام شہری زندگی میں ضم کیا جانا تھا۔ جنگی ساز و سامان کی سرکاری مانگ سے محنت و معاش کے کئی نئے سلسلے معرضِ وجود میں آ گئے تھے۔ بے شمار دوسرے سلسلوں میں توسیع ہو گئی تھی۔ کہیں مال و دولت کے انبار لگ گئے تھے اور کہیں افلاس کی چکی نے لوگوں کو پیس ڈالا تھا۔ غریبوں اور امیروں میں فرق اور زیادہ نمایاں ہو گیا تھا۔ جنگ کے دوران میں افراطِ زر نے ملک کی معیشت کے تانے بانے کو تار تار ہونے تک پہنچا دیا تھا۔ ایک مرحلہ پر تو یہ خدشہ بھی پیدا ہو گیا تھا کہ لوگ کرنسی نوٹ قبول کرنے سے گریز کرنے لگیں گے۔ اب معاشی سرگرمیوں کو ایک پہلی سطح پر لانا تھا یہ کام اور بھی زیادہ مشکل تھا۔ بیروزگاری کا ہوّا دکھائی دے رہا تھا۔

فروری ۱۹۴۶ء میں ہند کی بحریہ میں بغاوت ہو گئی، گو اسے بہت جلد کچل دیا گیا۔ بعض فضائی اڈوں پر بھی ہڑتالیں ہوئیں۔ فوج میں بے چینی تیزی سے پھیل رہی تھی۔ دہلی کے لال قلعہ میں انڈین نیشنل آرمی کے بعض باز یافتہ افسروں کے خلاف مقدمات نے انہیں ہیرو بنا دیا۔ حالانکہ انگریزوں نے ان پر غداری کا الزام لگایا تھا۔ لیکن کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے ان مقدمات میں ملزموں کا دفاع کیا۔ ان واقعات سے انگریز فوجی حکام حیران تھے کہ نہ جانے کب تک وہ

ہند کی افواج کی وفاداری اور نظم وضبط پر بھروسہ کر سکیں گے۔ جنگ کے دوران میں ہند کے کمیشن یافتہ افسروں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوگیا تھا اور فوج کی نوعیت میں مستقل تبدیلی رونما ہوچکی تھی۔ ہند کی افواج میں انگریز افسروں کی اکثریت اب بحال نہیں کی جاسکتی تھی۔ جنگ کی بڑھتی ہوئی ضروریات نے فوجی حکام کو شمال کے روایتی عسکری طبقات سے آگے بڑھ کر جنوب سے بھی وسیع پیمانہ پر بھرتی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ شمال کے علاقوں والے زیادہ تر مسلمان اور سکھ تھے، جب کہ جنوب والوں کی اکثریت ہندو تھی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد سابقہ حالات کی بحالی ناممکن تھی۔

چونکہ جنگ کے زمانہ میں سول سروس میں بھرتی بند ہوگئی تھی اس لئے انتظامیہ کے برطانوی عنصر میں شدید کمی واقع ہوگئی تھی۔ جنگ کے خاتمہ پر سول اور فوجی محکموں میں ہندوؤں کو نمایاں غلبہ حاصل ہوچکا تھا۔ ہندوؤں کے تعلیم یافتہ طبقہ کی (بشمول سرکاری ملازمین) ہمدردیاں کانگرس کے ساتھ تھیں، کانگرس کو ہندو عوام کی بھی حمایت حاصل تھی۔ یہ تھا وہ معاشرتی اور معاشی پس منظر، جس میں سیاسی ڈراما کھیلا جا رہا تھا۔

کابینہ مشن کا سب سے زیادہ سرگرم رکن سر سٹیفورڈ کرپس تھا اور وہ علانیہ کانگرس کا ہمدرد تھا۔ مشن نے سرکردہ لیڈروں ــ گاندھی، قائداعظم اور دوسروں ــ کے ساتھ فرداً فرداً بات چیت کی اور مئی ۱۹۴۶ء کے اوائل میں شملہ میں ایک مشترکہ کانفرنس منعقد کی۔ جسمیں کانگرس کی نمایندگی صدر کانگرس ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو، ولبھ بھائی پٹیل اور عبدالغفار خان نے کی اور مسلم لیگ کے نمایندوں کے طور پر صدر لیگ محمد علی جناح اور لیاقت علی خان، نواب محمد اسمٰعیل اور عبدالرب نشتر شامل ہوتے۔ گاندھی بھی شملہ پہنچ گیا تھا۔ لیکن اس نے کانفرنس میں باقاعدہ شرکت نہ کی۔ کانفرنس میں کانگرس اور لیگ نے جو موقف اختیار کئے وہ معمولی ردّوبدل کے ساتھ ان کی مسلمہ روش کے آئینہ دار تھے۔

کانگرس واحد آئین ساز اسمبلی کی طلب گار تھی۔ جو کل ہند وفاقی حکومت کا آئین مرتب کرے گی۔ اور مجلسِ قانون ساز امورِ خارجہ، دفاع، مواصلات، بنیادی حقوق، کرنسی، محصولاتِ درآمد و برآمد اور منصوبہ بندی اور ایسے دوسرے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی مجاز

ہوگی، جو مزید جانچ پڑتال کے بعد مذکورہ بالا امور سے گہرا تعلق رکھتے ہوئے پائے جائیں۔"
چنانچہ مجلسِ قانون ساز حصولِ آمدنی کے لئے ٹیکس لگا سکے گی اور علاوہ ازیں اسے "آئینی عمل
میں تعطل ہوتے پر اور شدید ہنگامی حالات میں مفیدِ مطلب اختیارات بھی حاصل ہوں گے۔"
باقی اختیارات صوبوں یا سیاسی وحدتوں کی تحویل میں دیئے جائیں گے۔" صوبوں کے گروپ بھی
معرضِ وجود میں لائے جا سکیں گے اور یہ گروپ اس امر کا تعین کرنے کے مجاز ہوں گے کہ وہ کون کون سے
اُمور کو مشترکہ قرار دیں۔" اہم فرقہ وارانہ مسائل کے لئے متعلقہ فرقہ کے نمایندوں کی اکثریت کی نمائندگی
درکار ہوگی [۲]۔

۹ را پریل ۱۹۴۶ء کو دہلی میں مرکزی اور صوبائی مجالسِ قانون ساز کے مسلم لیگی ارکان کی
کنونشن میں ایک قرارداد منظور کی گئی تھی جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ شمال مشرق میں بنگال اور
آسام اور شمال مغرب میں پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان کے چھ صوبوں پر
مشتمل پاکستان کی ایک آزاد و خود مختار مملکت معرضِ وجود میں لائی جائے اور پاکستان اور ہندوستان
کے علیحدہ علیحدہ آئین بنانے کے لئے دو جداگانہ آئین ساز اسمبلیاں قائم کی جائیں۔ اس قرارداد کے
مطابق، کابینہ مشن کے ساتھ اپنے مذاکرات میں مسلم لیگ نے دو آئین ساز اداروں کے قیام کی تجویز
پیش کی۔ ایک پاکستانی گروپ کے چھ صوبوں کے لئے اور دوسرا چھ ہندو صوبوں کے گروپ کے
لئے۔ تاہم بطورِ پیشکش مسلم لیگ نے یہ آمادگی ظاہر کی کہ اسے دونوں آئین ساز اداروں کا مشترکہ
اجلاس بھی منظور ہے۔ بشرطیکہ مرکزی حکومت میں ہندو اور مسلم صوبوں کو مساویانہ نمایندگی دی
جائے اور کسی اختلافی مسئلہ پر اس وقت تک کوئی فیصلہ نہ صادر کیا جائے، جب تک ارکان کی
تین چوتھائی اکثریت اسے قبول نہ کرلے۔ یہ شرط بھی لگائی گئی کہ مرکزی حکومت کو ٹیکس لگانے
کا کوئی اختیار نہیں ہونا چاہیئے۔ [۳]

کوئی فریق بھی دوسرے کی تجاویز کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔ بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ سارے
برصغیر میں ایک ہی آزاد و خود مختار مملکت ہونی چاہیئے یا دو آزاد و خود مختار مملکتیں۔ جو بھی حل
اختیار کیا جاتا اس میں اقلیتوں کی موجودگی ناگزیر تھی اور کانگرس اور مسلم لیگ دونوں اس بات پر
متفق تھیں کہ اقلیتوں کے لئے مناسب آئینی تحفظ کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ درحقیقت ان میں صرف

یہی بات قدرِ مشترک تھی۔ کابینہ مشن کی مصالحانہ مساعی سے بھی دونوں میں حائل خلیج پُر نہ کی جا سکی۔

۱۶ مئی کو کابینہ مشن اور وائسرائے نے ایک بیان شائع کیا جس میں انہوں نے اپنی طرف سے آئینی مسئلہ کا حل پیش کیا۔ ان کے منصوبہ کا مرکز و محور ایک ہی مملکت کو برقرار رکھنا تھا۔ جسے انگریزوں نے بڑی محنت سے تعمیر کیا تھا۔ (انتقالِ اقتدار سے عین پہلے برطانوی صوبوں اور ریاستوں کے نظام کو نقشہ ۵ میں ملاحظہ فرمائیں) انہوں نے انتظامی، اقتصادی اور فوجی اسباب کی بنا پر دو آزاد اور خود مختار مملکتوں کی تجویز مسترد کر دی۔ کابینہ مشن کی نگاہ میں اس امر کا کوئی جواز نہیں تھا کہ پاکستان میں پنجاب، بنگال اور آسام کے وہ اضلاع بھی شامل کئے جائیں۔ جن کی بیشتر آبادی غیر مسلم تھی۔ اس کے برعکس ایک ایسے پاکستان کو جو فقط مسلم اکثریتی علاقوں تک محدود ہو مسلم لیگ ناقابلِ عمل قرار دیتی تھی۔ تاہم مشن نے مسلمانوں کے ان خدشات کے وزن کو محسوس کیا کہ ہندوؤں کے زیرِ غلبہ ایک ہی وحدانی ہند میں مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت اور ان کی سیاسی و معاشرتی زندگی دب کر رہ جائے گی۔ ان وجوہ کے پیشِ نظر انہوں نے تین درجات کے آئینی منصوبہ کی ترتیب ضروری سمجھی۔

اول ــــ ایک اتحادیۂ ہند (یونین آف انڈیا) ہونی چاہئے جو برطانوی ہند اور ریاستوں دونوں پر مشتمل ہو۔ اس کی تحویل میں امورِ خارجہ، دفاع اور مواصلات کے محکمے ہونے چاہئیں اور اس کے پاس بقدرِ ضرورت مالیہ وصول کرنے کے اختیارات بھی ہونے چاہئیں۔ اہم فرقہ وارانہ مسائل کو طے کرنے کے لئے دونوں بڑے فرقوں کے نمایندوں کی اکثریت درکار ہوگی اور رائے شماری میں حصہ لینے والے کل حاضر ارکان کی اکثریت بھی ضروری ہوگی۔

دوم ــــ صوبوں کے تین گروپ ہونے چاہئیں۔ حصہ الف ہندو اکثریت کے چھ صوبوں پر مشتمل ہوگا۔ حصہ ب پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ہوگا اور حصہ ج، بنگال اور آسام پر۔

سوم ــــ صوبے اور ریاستیں بنیادی اکائیاں ہوں گی۔ مرکزی امور کے سوا باقی تمام امور اور باقی ماندہ اختیارات صوبوں کی تحویل میں دیئے جائیں گے۔ ریاستیں اپنے تمام امور اور اختیارات اپنے پاس رکھیں گی۔ ماسوا ان کے جو مرکزی حکومت کے سپرد کئے جائیں۔

ہند
انتقال اختیارات سے قبل
۱۴ اگست ۱۹۴۷ء
افغانستان
ایران
عوامی جمہوریہ چین
جموں و کشمیر
پشاور
پنجاب
لاہور
کوئٹہ
خاران
مکران
قلات
کراچی
سندھ
بہاولپور
بیکانیر
جیسلمیر
اجمیر
جودھ پور
دہلی
نیپال
بھوٹان
سکم
دریائے برہم پتر
صوبجات متحدہ
دریائے گنگا
بہار
ڈھاکہ
بنگال
کلکتہ
تری پورہ
برما
دریائے نربدا
صوبجات وسطی
دریائے گوداوری
حیدرآباد
اڑیسہ
جوناگڑھ
بمبئی
بحیرہ عرب
خلیج بنگال
میسور
مدراس
برطانوی صوبے
چیف کمشنری صوبے
دیسی ریاستیں

آئین ساز اسمبلی کے تین حصّوں میں سے ہر ایک حصّہ (الف - ب اور ج) اپنے گروپ میں شامل صوبوں کے لئے آئین بنائے گا، اور ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کرے گا کہ آیا بحیثیت مجموعی گروپ کے لئے آئین بننا چاہئے - لیکن نئے آئین کے تحت پہلے عام انتخابات کے بعد کسی بھی صوبہ کی نئی مجلس قانون ساز کو گروپ سے باہر نکل آنے کا اختیار حاصل ہوگا۔

مشن کے بیان میں کہا گیا تھا کہ وہ "ایک عبوری حکومت کے فوری قیام کو انتہائی اہمیت دیتے ہیں جس میں سب محکمے بشمول امور جنگ، ہند کے ایسے لیڈروں کے ہاتھ میں ہوں گے جنہیں عوام کا مکمل اعتماد حاصل ہے۔" [۷] یعنی کابینہ مشن کے بیان میں دستور سازی کے طویل المیعاد منصوبہ کے ساتھ ہی ساتھ ایک عبوری مرکزی حکومت کا مختصر المیعاد منصوبہ بھی شامل تھا - اس بیان کی مزید تشریح لارڈ پیتھک لارنس اور وائسرائے نے اپنی نشری تقریروں اور سر سٹیفورڈ کرپس نے ایک بیان میں کی - ۱۷ر مئی کو مشن نے ایک پریس کانفرنس بھی منعقد کی۔

گاندھی نے کابینہ مشن کے ۱۶ر مئی کے بیان کے بارے میں "اپنے قانونی دماغ کو بروئے کار لا کر" اس کی دھجیاں اڑا دیں - اس کا موقف یہ تھا کہ کابینہ مشن پلان محض "ایک اپیل اور مشورہ" ہے، چونکہ آئین ساز اسمبلی خود مختار ہوگی - اس لئے وہ اس منصوبہ کو تبدیل کرنے کی مجاز ہوگی۔ مثلاً وہ مرکزی حکومت کے دائرۂ اختیار میں توسیع کر سکے گی یا مسلمانوں اور غیر مسلموں میں امتیاز کو کالعدم قرار دے سکے گی - اس نے یہ بھی کہا کہ اسی طرح صوبوں کو آغاز کار میں ہی گروپ میں شامل ہونے یا نہ شامل ہونے کی پوری آزادی حاصل ہوگی - "گروپ سے نکل آنے کی آزادی تو ایک مزید تحفظ ہے"۔ گاندھی کے نزدیک ان "تعبیروں کے ساتھ موجودہ حالات میں یہ بہترین دستاویز ہے جو برطانوی حکومت پیش کر سکتی تھی۔" [۸] حالانکہ ان تعبیروں نے ساری سکیم کا حلیہ ہی بگاڑ کر رکھ دیا تھا - لارڈ پیتھک لارنس کا رویہ گاندھی کے بارے میں ایسا تھا کہ جیسے روحانیت پرور مشرق کے ایک گرو کے سامنے مادیت زدہ مغرب کے کسی چیلے کا ہو - انہوں نے کہیں لکھا تو نہیں کہ گاندھیائی سوفسطائیت کے اس شاہکار پر ان کا کیا تاثر تھا لیکن اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گاندھی کے "تلاش حق کے تجربات" اب کچھ کچھ ان کی سمجھ میں آ رہے تھے - اسی زمانہ میں جب گاندھی نے ریاستوں کے بارے میں کرپس کے الفاظ کو توڑ مروڑ کر کچھ اور معنی پہنائے، تو لارڈ پیتھک

لارنس بھی یہ دھیما احتجاج کئے بغیر نہ رہ سکا: "سرسٹیفورڈ نے جو کچھ کہا ہے، آپ اس کی غلط تاویل کر رہے ہیں۔" ؎۵

گاندھی نے جس راستہ کی نشاندہی کی، ۲۴ رمئی کو کانگرس ورکنگ کمیٹی بڑی اطاعت شعاری سے اس پر گامزن ہوگئی اور مجلس قانون ساز کو اقتدار منتقل کرنے کا مطالبہ کردیا جس میں ہندوؤں کو غلبہ تھا۔ اس نے بھی آئین ساز اسمبلی کے اختیارات پر جس میں ہندوؤں کی مستقل اکثریت ناگزیر تھی۔ کسی حد اور قید کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ اس کے نزدیک آئین ساز اسمبلی کابینہ مشن پلان میں جو چاہے، تبدیلی کرنے کی مجاز ہوگی۔ اس پلان میں مسلم نقطہ نظر کی رعایت ملحوظ تھی تو فقط محدود اختیارات کی مرکزی حکومت اور صوبوں کی گروپ بندی سے۔ لیکن کانگرس ورکنگ کمیٹی نے اپنی تعبیر سے انہیں صاف اُڑا دیا۔

لارڈ پیتھک لارنس کے نام ایک خط میں صدر کانگرس نے اس اندیشے کا اظہار کیا کہ حصہ ب میں چونکہ پنجاب کو اور حصہ ج میں بنگال کو غالب حیثیت حاصل ہوگی اس لئے ممکن ہے کہ وہ ایسا صوبائی آئین وضع کردیں جو شمال مغربی سرحدی صوبہ اور آسام کی خواہشات کے بالکل خلاف ہو اور شاید وہ ایسے قواعد وضوابط بھی مرتب کر ڈالیں جن کے تحت کسی گروپ سے ایک صوبے کے نکل آنے کی گنجائش باقی نہ رہے۔" ؎ ظاہر ہے کہ کانگرس کا صدر پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کے آئندہ طرز عمل سے خائف تھا۔ حالانکہ وہ اپنے اپنے حصہ میں اقلیت میں تھے۔ کابینہ مشن کے بیان کے مطابق حصہ ب میں مسلمانوں کی کل نمائندگی صرف ۶۲،۰۷ فیصد تھی اور حصہ ج میں ۱۵،۶۹ فیصد ایسی تھوڑی اکثریت کے ساتھ اگر مسلمان چاہتے تو بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور منظم و مربوط غیر مسلموں کے حقوق زبردستی پامال نہیں کرسکتے تھے۔ سچ پوچھئے تو کانگرس کہیں بھی مسلمانوں کو سیاسی اقتدار سونپنے پر آمادہ نہیں تھی۔ لیکن مسلمانوں سے یہ توقع کرتی تھی کہ جس آئین ساز اسمبلی میں ہندوؤں کو غلبہ حاصل ہوگا اس پر آنکھیں بند کرکے پوری طرح اعتبار کرلیں۔

۲۲ رمئی ۱۹۴۶ء کو قائداعظم محمد علی جناح نے کابینہ مشن پلان کے بارے میں اپنا بیان جاری کیا جس میں انہوں نے اس بات پر سخت افسوس ظاہر کیا کہ "مشن نے مکمل اور خود مختار پاکستان کے قیام کے بارے میں مسلمانوں کے مطالبہ کی نفی کردی ہے۔" اس بیان میں انہوں نے

اس منصوبہ کے مختلف پہلوؤں پر نکتہ چینی کی لیکن یہ واضح کر دیا کہ وہ مسلم لیگ کونسل کے فیصلے کے بارے میں پیش از وقت کوئی بات نہیں کہنا چاہتے جس کا اجلاس عنقریب دہلی میں ہوگا اور جو ۱۶ مئی کے بیان کا پورا اور بے لاگ جائزہ لینے کے بعد فیصلہ کرے گی۔

کابینہ مشن نے ۲۵ مئی کو ایک مزید بیان جاری کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ اس میں مشن نے اپنے منصوبہ کے معنی و مقصد کو بہت واضح اور قطعی الفاظ میں یوں بیان کیا:۔

"چونکہ ہند کے لیڈر طویل گفت و شنید کے بعد کوئی باہمی سمجھوتہ کرنے سے قاصر رہے تھے اس لئے مشن نے خود اپنی طرف سے ایسی سفارشات پیش کر دیں جو دونوں بڑی پارٹیوں کے نقطہ ہائے نظر میں زیادہ سے زیادہ مصالحت کی آئینہ دار ہیں۔ یہ سکیم اپنے تمام اجزا سمیت ایک وحدت ہے اور صرف اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے کہ اسے تعاون کے جذبہ سے قبول کر کے بروئے کار لایا جائے۔ آئین ساز اسمبلی کے اختیارات اور فرائض منصبی اور اس کے طریق کار کو کابینہ مشن کے بیان میں پوری طرح واضح کر دیا گیا ہے .... کانگرس کی قرارداد میں مشن کے بیان کے پیرا ۱۵ کی جو تعبیر کی گئی ہے کہ آغاز کار میں ہی صوبے یہ فیصلہ کرنے کے مجاز ہوں گے کہ وہ جس گروپ میں رکھے گئے ہیں آیا اس میں شامل ہوں یا نہ ہوں، یہ تعبیر مشن کے مقصد و غایت سے مطابقت نہیں رکھتی .... صوبوں کی گروپ بندی ...... سکیم کا ایک لازمی حصہ ہے، اور فریقین کی باہمی رضامندی سے ہی اس میں ترمیم کی جا سکتی ہے۔ آئین سازی کی تکمیل کے بعد گروپوں سے نکل آنے کا حق عوام خود بروئے کار لا سکیں گے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ نئے صوبائی آئین کے تحت جو پہلے عام انتخابات ہوں گے، ان میں گروپ سے باہر نکل آنے کے مسئلہ کو بہت اہمیت حاصل ہوگی اور رائے دہی کے نئے نظام کے تحت جو لوگ ووٹ دینے کے مجاز ہوں گے وہ پوری طرح حقیقی جمہوری فیصلہ میں شریک ہو سکیں گے۔"

بیان میں یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ "موجودہ آئین کو عبوری دور میں جاری رہنا ہوگا۔ اس نئے عبوری حکومت کو قانونی طور پر مرکزی مجلسِ قانون ساز کے سامنے جوابدہ نہیں بنایا جا سکتا۔"

مسلم لیگ کونسل کا اجلاس اوائلِ جون میں منعقد ہوا اور اس میں بحث و غور کا سلسلہ تین دن جاری رہا۔ یہ بات تو بالکل واضح تھی کہ برطانوی حکومت نے دو آزاد و خود مختار مملکتوں کو قبول نہ کرنے کا پختہ ارادہ کر رکھا ہے۔ سالہا سال سے مسلمانوں نے اپنی قسمت کو پاکستان سے وابستہ کر رکھا تھا۔ لیکن اب یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ ان کے نصیب میں نہیں۔ اجلاس میں کئی لوگ تو از حد مایوس تھے اور بعض امید کی اس کرن سے اپنے آپ کو تسلی دے رہے تھے کہ یہ سکیم بالآخر ایک آزاد و خود مختار پاکستان کے قیام پر منتج ہوگی۔ برصغیر کی ایک واحد مملکت کے ڈھانچے کے اندر کابینہ مشن کی سکیم اپنی سب پیشرو سکیموں سے بہتر تھی۔ اس میں پاکستان کو تسلیم تو نہیں کیا گیا تھا۔ تاہم اس کے تحت مسلمانوں کو اپنے اکثریتی علاقوں میں اپنے سیاسی، ثقافتی، معاشرتی اور معاشی مفادات پر معقول اختیار حاصل ہوگا۔ لیکن کیا یہ منصوبہ بھی، جو مسلم مطالبہ سے بہت فروتر تھا کانگرس کے حملوں کی تاب لا سکے گا؟ — اس سوال کا کوئی یقینی جواب نہیں دیا جا سکتا تھا۔

گاندھی اب تک اس بات کا دعویدار تھا کہ کابینہ مشن کے بیان کا وہی معنی ہوگا، جو اسے پسند ہو۔ خواہ اس بیان کے مصنف اس کا مطلب کچھ اور ہی کیوں نہ بتائیں۔ وہ آسام کو حصّہ ج سے باہر رہنے کے لئے اکسا رہا تھا۔ اس طرح شمال مغربی سرحدی صوبہ اور پنجاب میں سکھوں کو بھڑکا رہا تھا کہ حصّہ ب میں اپنے نمایندے نہ بھیجیں۔ آسام اور شمال مغربی سرحدی صوبہ میں کانگرسی وزارتیں تھیں۔ سکھ بپھرے ہوتے تھے۔ ایک طرف ہندو ان کے ساتھ پینگیں بڑھا رہے تھے اور دوسری طرف انگریز ان کی فوجی خدمات کے پیشِ نظر ان کی ناز برداری کر رہے تھے۔ کانگرس کا آخری فیصلہ ابھی معلوم نہیں ہوا تھا۔ لیکن چونکہ ان کا ایک ہی واحد مملکت کا بنیادی مطالبہ مان لیا گیا تھا۔ اس لئے غالب گمان یہی تھا کہ وہ اس منصوبہ کو مسترد نہیں کرے گی۔ اپنی سابقہ پالیسی کے مطابق کہ مسلمانوں کو سیاسی اقتدار میں کوئی حصّہ نہ ملے — کانگرس نے انگریزوں پر دباؤ ڈالنے کے حربے بھی شروع کر دیئے تھے اور ساتھ ہی ساتھ لیبر پارٹی کے مدبّرین سے جذباتی نوعیت کی اپیلیں بھی کر رہی تھی۔

اتنی بات ضرور تھی کہ کانگرس نے ۱۶ رمئی کے بیان کی جو بالکل نامعقول تاویل کی تھی۔ وہ کابینہ مشن سے اسے منوا نہیں سکی تھی۔ اس ضمن میں جو خدمات اور شکوک و شبہات تھے۔ وہ کابینہ مشن کے ۲۵ رمئی والے بیان نے دُور کر دیے تھے۔ ۴ جون کو وائسرائے نے قائد اعظم کو ایک خط میں برطانوی حکومت کی طرف سے اس سے بھی زیادہ باوثوق ضمانت دی کہ وہ میزانِ عدل کو مستقیم رکھنے کا عزم صمیم رکھتی ہے۔ وائسرائے نے لکھا :۔

"آپ نے مجھ سے کل کہا تھا کہ میں حتمی طور پر آپ کو بتاؤں کہ اگر کابینہ مشن کے ۱۶ مئی والے بیان کو ایک فریق نے قبول کر لیا اور دوسرے نے مسترد کر دیا، تو پھر کیا کیا جائے گا؟ کابینہ مشن کی طرف سے اور ذاتی طور پر میں خود بھی آپ کو پورا یقین دلاتا ہوں کہ ہر دو فریق کے ساتھ سلوک میں ہم کوئی امتیاز روا نہیں رکھیں گے۔ اگر کسی ایک فریق نے منصوبہ قبول کر لیا، تو جہاں تک حالات نے اجازت دی ہم منصوبہ پر عملدر آمد کریں گے، لیکن ہمیں امید ہے کہ دونوں فریق اسے قبول کر لیں گے"۔ ؎

کابینہ مشن اور وائسرائے کی اس یقین دہانی نے مسلم لیگی لیڈروں کے آخری موقف کو متعین کرنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔

مسلم لیگ کونسل نے تمام پہلوؤں کا اچھی طرح موازنہ کرنے کے بعد ۶ جون کو کابینہ مشن پلان کو منظور کرنے کا فیصلہ کر دیا۔ اس فیصلہ کا اطلاق طویل المیعاد منصوبہ اور مختصر المیعاد منصوبہ دونوں پر ہوتا تھا۔ کونسل نے یہ توثیق بھی کر دی کہ مسلم لیگ آئین ساز اسمبلی میں شامل ہوگی۔ مجوزہ عبوری حکومت کے متعلق کونسل نے اپنے صدر کو وائسرائے کے ساتھ گفت و شنید کے اختیارات دیدیئے کہ وہ جو موزوں اور مناسب سمجھیں، فیصلے اور اقدامات کریں۔ کونسل نے یہ حق محفوظ رکھا کہ حالات کی رفتار کا تقاضا ہوا، تو وہ اپنی اس پالیسی پر نظرثانی کر سکے گی۔

قائد اعظم محمد علی جناح پر کانگرسی لیڈر اکثر یہ الزام دھرتے تھے کہ وہ کبھی قطعی طور پر اپنے آپ کو کسی چیز کا پابند نہیں کرتے۔ کہا جاتا تھا کہ وہ دوسروں کو پہل کرنے دیتے ہیں جو طے اسے قابو کر لیتے ہیں اور پھر اس سے بھی بڑا مطالبہ پیش کر دیتے ہیں۔ اس تاریخی مرحلے میں مسلم

لیگ نے ان کی قیادت میں کابینہ مشن پلان کو منظور کرنے کا بہت ہی جرأت مندانہ اور دُوررس فیصلہ اس وقت کیا جب کہ کانگرس اس بارے میں ابھی حیلہ حوالہ کر رہی تھی۔ بدرجۂ آخر یہ یقین و ایمان کا معاملہ تھا۔ یقین و ایمان اس بات پر کہ شاید آزادی کا منظر ہندو لیڈروں کے دلوں کو قدرے وسعت اور فراخی عطا کر دے اور کلی اقتدار کی ہوس چھوڑ کر وہ مسلمانوں کے ساتھ شراکت سے رہنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ یقین و ایمان انگریزوں کی آبرومندی اور عدل و انصاف کے احساس پر ـــ اور سب سے بڑھ کر یقین و ایمان اس بات پر کہ مسلمانوں کو اجتماعی زندگی میں معقول مساوات کا موقع ملا، تو وہ ترقی کر کے اپنی روایات اور تہذیب و تمدن کے شایانِ شان عظمت اور قوت حاصل کر لیں گے۔ قائداعظم خاص طور پر محسوس کرتے تھے کہ زندگی بھر وہ برصغیر کی آزادی اور ہندو مسلم تعلقات میں منصفانہ مفاہمت کیلئے جو جدوجہد کرتے رہے تھے وہ کامیابی سے ہمکنار ہونے والی ہے۔ برطانوی پریس نے بھی مسلم لیگ کے اس فیصلہ کو "دانشمندانہ اور مدبرانہ" قرار دیا۔ اس پر ملک بھر میں اطمینان کا اظہار کیا گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ بالآخر ہندو مسلم اختلافات سُلجھ گئے ہیں اور آزادی کی منزل سامنے نظر آنے لگی ہے۔

یہ امید پرور کیفیت جیسا کہ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا، بیش از وقت اور بہت ہی قلیل عرصہ کے لئے تھی۔ عبوری حکومت کی تشکیل کے لئے گفت و شنید توقع سے کہیں زیادہ مشکل ثابت ہوئی۔ گاندھی اور دوسرے کانگرسی لیڈر بار بار یہ کہتے رہے تھے کہ اگر آزادی حاصل ہو گئی تو انہیں اس بات کی مطلق پروا نہیں ہوگی کہ اقتدار کی باگ ڈور کس کے ہاتھ میں آتی ہے؟ عبوری حکومت کی گفت و شنید سے پوری طرح واضح ہو گیا کہ ان کے یہ بیانات کس قدر کھوکھلے تھے۔ ۲۰ مئی کو صدر کانگرس ابوالکلام آزاد نے عبوری حکومت کی حیثیت اور ذمہ داری کے بارے میں وائسرائے سے یقین دہانی چاہی اور اس ضمن میں یہ کہا کہ "اگر یہ دونوں بنیادی مسائل" اطمینان بخش طور پر حل ہو گئے تو "عبوری کابینہ کی تشکیل کے سلسلہ میں دوسری تفصیلات" ہرگز کسی مشکل کا باعث نہیں بنیں گی۔ وائسرائے نے اپنے ۳۰ مئی کے خط میں یہ یقین دلایا کہ ملک معظم کی حکومت عبوری حکومت سے دلی احترام اور مشورہ کا وہی برتاؤ کرے گی۔ جو وہ ایک ڈومینین کی حکومت سے کرتی ہے اور وہ ملک کے روزمرہ نظم و نسق میں حکومت ہند کو حتی الوسع

زیادہ سے زیادہ آزادی سے کام کرنے دے گی"۔ [۱۸] یہ یقین دہانی حاصل کرنے کے بعد کانگرس کے لیڈروں نے عبوری کابینہ کی تشکیل میں حیص بیص شروع کر دی۔ اور اسے ہی بنیادی مسئلہ بنا کر رکھ دیا۔ وائسرائے نے قائد اعظم کو یہ تاثر دیا تھا کہ عبوری کابینہ میں بارہ قلمدانِ وزارت ہوں گے۔ پانچ کانگرس کے لئے پانچ مسلم لیگ کے لئے ایک سکھ اور ایک عیسائی یا اینگلو انڈین کے لئے۔ مسلم لیگ سے کابینہ مشن پلان منظور کرانے میں وائسرائے کی اس یقین دہانی کو بھی بڑا دخل تھا۔ کانگرس نے اس انتظام کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ نہرو نے ۱۲ جون کو وائسرائے سے ملاقات کی اور یہ تجویز پیش کی کہ عبوری کابینہ کے پندرہ ارکان ہونے چاہئیں۔ پانچ کانگرسی (تمام ہندو) چار مسلم لیگی، ایک غیر لیگی مسلمان، ایک غیر کانگرسی ہندو، ایک کانگریسی اچھوت، ایک عیسائی، ایک سکھ اور ایک عورت جسے کانگرس نامزد کرے گی۔ وائسرائے اس غیر منصفانہ تقسیم کو قبول نہیں کر سکتا تھا۔ کانگرس اور لیگ کے درمیان عبوری کابینہ میں مساوات کا سوال صدر کانگرس کے الفاظ میں اب "ناقابلِ عبور سدِ راہ" بن گیا۔ [۱۹] کانگرس کی دلجوئی کے لئے وائسرائے نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ ارکان کی تعداد تیرہ ہونی چاہئے۔ چھ کانگرسی (بشمول ایک اچھوت) پانچ مسلم لیگی اور اقلیتوں کے دو نمائندے۔ وائسرائے نے اس تجویز کے متعلق کہا۔ "مجھے سمجھ نہیں آئی کہ اسے کس طرح مساوی نمائندگی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مساوات نہیں ہے۔ کیونکہ چھ ہندوؤں کے مقابلہ میں صرف پانچ مسلمان شامل ہوں گے۔" لیکن یہ تجویز بھی کانگرس کے لئے قابلِ قبول نہیں تھی کیونکہ اس سے بھی اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین مساوی نمائندگی جھلکتی تھی۔ صدر کانگرس نے وائسرائے کو ۶ جون کو جو خط لکھا، اس میں یہ اعتراف کیا کہ کانگرس نے جولائی ۱۹۴۵ء کی شملہ کانفرنس میں اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مساوی نمائندگی منظور کر لی تھی۔ لیکن فرمایا "اب حالات یکسر تبدیل ہو چکے ہیں اور اب ہمیں اس مسئلہ پر دوسرے قرائن میں غور کرنا ہے جو یہ ہیں کہ آزادی اور آئین ساز اسمبلی کے قیام کی ساعت قریب آ رہی ہے" [۲۰]

اب یہ بات واضح ہو گئی کہ اصل رکاوٹ کانگرس کی یہ خواہش تھی کہ نئے ہند میں کلی اقتدار کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں رہے۔ بالفاظِ دیگر اختیار صرف ہندوؤں کے تصرف

میں ہونا چاہئے اور مسلمانوں کو سیاسی اقتدار میں ہرگز شریک نہیں کرنا چاہئے۔ اسی زمانہ میں کرپس کے نام گاندھی نے ایک خط میں لکھا: "اگر آپ لوگوں میں ہمت ہے تو آپ کو وہی کرنا چاہئے جس کی تجویز میں شروع سے ہی کرتا آیا ہوں۔۔۔۔۔ آپ کو دونوں ــــ مسلم لیگ اور کانگرس ــــ میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ یہ دونوں جماعتیں آپ ہی کی پیدا کردہ ہیں" [۱۲]

کابینہ مشن اور وائسرائے نے فیصلہ کیا کہ ایک مستحکم اور نمائندہ عبوری حکومت کی تشکیل کے لئے خود اپنی تجاویز شائع کر دیں۔ ان کی طرف سے ۱۶ جون کو جو بیان جاری کیا گیا۔ اس میں ان چودہ اصحاب کے ناموں کا اعلان کیا گیا۔ جنہیں عبوری کابینہ کا رکن بننے کے لئے وائسرائے کی طرف سے دعوت دی جارہی تھی۔ ان میں چھ کانگرس کے ارکان تھے۔ جن میں ایک اچھوتوں کا نمایندہ بھی تھا۔ پانچ مسلم لیگ کے ارکان تھے۔ ان کے علاوہ ایک عیسائی اور ایک پارسی تھا۔ اس فہرست میں جناح اور نہرو کے نام بھی شامل تھے۔ حالانکہ قائد اعظم نے وائسرائے کو واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ جب تک وہ مسلم لیگ کے صدر ہیں، وہ کوئی عہدہ قبول نہیں کریں گے۔ کانگرس کی تسکین کے لئے اس بیان میں یہ یقین دہانی بھی کی گئی تھی کہ "عبوری کابینہ کی اس تشکیل سے ہرگز یہ مطلب نہیں لینا چاہئے کہ کسی اور فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کے لئے اسے نظیر بنایا جائے گا۔ یہ صرف موجودہ مشکل کو حل کرنے اور حتی الوسع بہترین مخلوط حکومت بنانے کے لئے ایک قرینِ مصلحت چارۂ کار ہے۔" اس بیان میں یہ تاثر بھی دیا گیا تھا کہ یہ حتمی اور آخری ہے۔ چنانچہ اس کے پیراگراف ۸ میں یہ ادعا کیا گیا تھا کہ "اگر مذکورہ بالا خطوط پر مخلوط حکومت کی تشکیل میں دونوں بڑی پارٹیوں یا ان میں سے کسی ایک نے شمولیت پر آمادگی ظاہر نہ کی تو پھر وائسرائے کا یہ ارادہ ہے کہ وہ ایک ایسی عبوری حکومت کے قیام کے لئے کارروائی کرے، جو حتی الوسع زیادہ سے زیادہ نمایندہ ہوگی۔ اور ان لوگوں پر مشتمل ہوگی جو ۱۶ مئی کے بیان کو قبول کرنے پر آمادہ ہوں گے۔" [۱۳]

اس بیان کی اشاعت کے بعد ایک ہفتے بھر کے لئے تند و تیز سیاسی سرگرمی کی آندھی چلی۔ جس کا مقصد کابینہ مشن اور وائسرائے کے خلاف اعصابی جنگ تھا۔ اس میں کانگرس کے لیڈروں، ہندو افسروں اور ہندوؤں کے زیرِ اثر پریس نے بھرپور حصہ لیا۔ طرح طرح کی افواہوں سے فضا اَٹ گئی۔ وائسرائے اور قائد اعظم کے درمیان خط و کتابت پر جس کا سراغ پریس کو

کسی طرح مل گیا تھا، طوفان برپا کر دیا گیا۔ اس خط و کتابت کا موضوع یہ تھا کہ کابینہ میں مسلمانوں کے لئے مخصوص نشستیں صرف مسلم لیگ سے پُر کی جائیں۔ گاندھی نے یہ دھمکی دی کہ اگر ایک قوم پرست (نیشنلسٹ) مسلمان کو عبوری کابینہ میں شامل نہ کیا گیا، تو وہ دہلی چھوڑ کر چلا جائے گا۔ حالانکہ کابینہ مشن کے پاس صدر کانگرس ابوالکلام آزاد کی طرف سے اس امر کی تحریری یقین دہانی موجود تھی کہ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی اس مسئلہ پر اصرار نہیں کرے گی۔[۱۵] گاندھی نے آئین ساز اسمبلی کو ایک باغیانہ ادارہ بنا دینے کا مبہم اشارہ کیا۔ اس پر کرپس دوڑا دوڑا گاندھی کی خدمت میں آیا۔ گاندھی نے ایک مرتبہ پھر اپنا یہ مطالبہ دہرایا کہ کابینہ مشن کو چاہئے۔ "یا ایک پارٹی کو چن لے یا دوسری کو کھچڑی بنانیکی کوشش نہ کرے"۔

چھ دن کے اندر ہی کابینہ مشن نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ۲۲ جون کو کرپس کے ایک دوست سدھیر گھوش نے گاندھی کو اطلاع دی کہ اس نے کرپس سے ملاقات کی ہے اور کرپس نے کہا ہے کہ اگر کانگرس نے حکومت میں شمولیت قبول نہ کی تو پھر کابینہ مشن کی رائے میں صرف مسلم لیگ کو یہ ذمہ داری نہیں سونپی جا سکتی"۔ لیکن صرف کانگرس کو حکومت سپرد کرنے سے پہلے انہیں ذاتی تبادلہ خیالات کے لئے لندن واپس جانا پڑے گا۔ سدھیر گھوش نے ایک بار پھر کرپس سے ملاقات کی اور ۲۴ جون کی صبح کو کرپس کے ساتھ اپنی بات چیت کے لب لباب سے گاندھی کو آگاہ کیا ـــ بقول سدھیر گھوش :۔

> "کرپس نے اسے بتایا کہ وہ یعنی کابینہ مشن یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ اگر کانگرس نے طویل المیعاد منصوبہ منظور کر لیا اور مختصر المیعاد منصوبے کو مسترد کر دیا تو کابینہ مشن نے ۱۶ جون کے اعلان کے تحت ایک عبوری حکومت کی تشکیل کے لئے جو کارروائی بھی کی ہے، اسے کالعدم قرار دیدیا جائے گا، اور از سرِ نو کوشش شروع کی جائے گی۔ انہوں نے باپو (گاندھی) اور سردار (ولبھ بھائی پٹیل) کو ملاقات کے لئے دعوت دی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ لارڈ ویول کی طرف سے جناح کو یقین دہانیوں سے جو اُلجھن پیدا ہو گئی ہے، وہ اسے ختم کرنے کا عزم کر چکے ہیں"۔[۱۶]

یہاں اس رائے کا اظہار عین مناسب ہے کہ وائسرائے نے قائد اعظم کو جو یقین دہانیاں کرائی تھیں ۔۔ کہ کسی فریق سے سلوک میں امتیاز روا نہیں رکھا جائے گا، اور اگر دونوں بڑی پارٹیوں میں سے ایک یا دوسرا فریق عبوری کابینہ میں شمولیت پر آمادہ نہ ہوا، تو بھی عبوری حکومت کی تشکیل کے لئے کارروائی جاری رکھی جائے گی ۔۔۔ وہ خود کابینہ مشن کی سند اور منظوری سے کرائی گئی تھیں۔

گاندھی نے سردار پٹیل اور سدھیر گھوش کو ساتھ لے کر فوراً کابینہ مشن سے ملاقات کی۔ اس سے ذرا پہلے کابینہ مشن کے نئے منصوبے پر" کانگرس کے مردِ آہن" کو راضی کرنے کی فکر میں لارڈ پیتھک لارنس صبح سویرے ہی پٹیل کی تلاش میں نکلا تھا اور اس سے بات چیت کر لی تھی۔ چونکہ یہ گاندھی کے چُپ برت کا دن تھا، اس نے اپنی باتیں تحریری صورت میں کیں۔ گاندھی نے لکھا: "میں آپ کا منشا یہ سمجھا ہوں کہ عبوری حکومت کے منصوبے پر اب تک جو کچھ ہوا ہے، آپ اسے کالعدم قرار دینے کا ارادہ رکھتے ہیں اور صورتِ حال پر از سرِ نو غور و خوض کریں گے۔" اس بات کی تصدیق کرانے کے بعد گاندھی اور پٹیل کانگرس ورکنگ کمیٹی کو اطلاع دینے کے لئے واپس آ گئے۔ [۱۸] گاندھی اور کابینہ مشن کے درمیان جو مفاہمت ہوئی تھی۔ اسی کے مطابق صدر کانگرس نے ۲۵ جون کو وائسرائے کے نام ایک خط بھیجا کہ کانگرس عبوری حکومت کی تجویز مسترد کرتی ہے اور طویل المیعاد منصوبہ کو "اپنے نظریات پر قائم رہتے ہوئے" قبول کرتی ہے۔ [۱۹]

کانگرس نے جن نظریات پر قائم رہنے کا اعلان کیا، وہ منصوبے کے ان سب عناصر کے لئے زہرِ قاتل تھے۔ جنہوں نے اس منصوبے کو مسلم لیگ کے لئے قابلِ قبول بنایا تھا۔ یعنی محدود اختیارات کی مرکزی حکومت اور صوبوں کی گروپ بندی۔ ان عناصر کے بغیر، جو سکیم کا جزوِ لاینفک تھے یہ منصوبہ کابینہ مشن کا پلان نہیں رہتا تھا۔ بلکہ کانگرس کا پلان بن جاتا تھا۔ یعنی ہندوؤں کے تسلط میں ایک خود مختار آئین ساز اسمبلی کا قیام جو سارے برصغیر کے لئے کسی بھی قسم کا آئین مرتب کرنے کی مجاز ہو گی۔ کابینہ مشن نے اپنے ۲۵ مئی کے بیان میں دو ٹوک الفاظ میں کہا تھا کہ "یہ سکیم اپنے تمام اجزاء سمیت ایک وحدت ہے۔ اور صرف اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے کہ اسے تعاون کے جذبہ سے قبول کر کے بروئے کار لایا جائے" اور کانگرس نے اپنے (۲۴ مئی) کے بیان میں اس کی جو تعبیر کی ہے، وہ کابینہ مشن کے مقصد و غایت سے مطابقت نہیں رکھتی۔" اگرچہ یہ بات باور کرنی دشوار ہے لیکن اگر

واقعہ یہی ہے کہ کابینہ مشن نے اب یہ فیصلہ صادر کیا کہ صدر کانگرس نے اپنے ۲۵ جون کے خط میں کابینہ مشن کا پلان قبول کر لیا ہے حالانکہ اس خط میں ۱۶ مئی کے بیان کا ایک حصّہ ــ مختصر المیعاد منصوبہ ــ مسترد کر دیا گیا تھا۔ اور دوسرے حصّے ــ طویل المیعاد منصوبہ کی باطل منظوری دی گئی تھی۔ درحقیقت فقط مسلم لیگ نے ۱۶ مئی کے پورے بیان کو ــ طویل المیعاد منصوبہ بھی اور مختصر المیعاد منصوبہ بھی ــ قبول کیا تھا اور عین دیانت داری سے قبول کیا تھا۔ لیکن کابینہ مشن نے کانگرس اور لیگ دونوں کو ایک ہی صف میں برابر کھڑا کر دیا اور اعلان کر دیا کہ دونوں نے ہی ۱۶ مئی کے بیان کو منظور کر لیا ہے اور عبوری حکومت میں شامل ہونے کی اہل بن گئی ہیں۔

کانگرس کی طرف سے مختصر المیعاد منصوبہ کو مسترد کرنے کے فوراً بعد مسلم لیگ نے ایک قرارداد منظور کی، جس میں کابینہ مشن کے ۱۶ جون والے بیان کی بنیاد پر عبوری حکومت میں شامل ہونے پر رضامندی کا اظہار کیا۔ ۱۶ جون والے بیان کے تحت وائسرائے کے لئے اب لازم تھا کہ وہ مسلم لیگ کو ایسے دوسرے لوگوں کے ساتھ "جو ۱۶ مئی کا بیان قبول کرنے پر آمادہ ہیں" حکومت بنانے کی دعوت دیتا۔ ہر چند کہ قائداعظم نے کابینہ مشن اور وائسرائے پر بار بار زور دیا کہ وہ اپنے وعدوں کی پاسداری کریں لیکن وائسرائے نے صرف سرکاری افسروں پر مشتمل ایک نگران حکومت قائم کر دی تاکہ "عبوری حکومت کی تشکیل کے لئے مزید بات چیت کرنے کی کچھ مہلت مل جائے"۔ قائداعظم نے اس پر یہ تبصرہ کیا۔ "میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ اپنی حتمی تجاویز کی اشاعت کے صرف دس دن کے اندر کابینہ مشن اور وائسرائے اپنے ۱۶ جون کے بیان پر عمل درآمد نہ کر کے اپنے وعدے سے منحرف ہو گئے ہیں۔ بہت ہی خوب کہا گیا ہے کہ ــ "سیاست دانوں کو اپنے الفاظ نگلنے نہیں چاہئیں" ــ میں اس قول کی پوری تائید کرتا ہوں"۔[۴۲]

جب کوئی سیاست دان ایک مرتبہ اپنے الفاظ نگل لیتا ہے، تو ممکن ہے کہ وہ اس فن میں مہارت حاصل کر لے۔ آخر مشق سے ہی مہارتِ تامہ پیدا ہوتی ہے۔ کابینہ مشن نے مختصر المیعاد منصوبہ کے بارے میں اپنے وعدوں اور یقین دہانیوں سے جو سلوک کیا تھا، وہی کچھ طویل المیعاد منصوبہ سے بھی روا رکھنے لگے۔ آئین ساز اسمبلی کے انتخابات اوائل جولائی میں ہونے قرار پاتے تھے، اور ان قواعد کے تحت جو وائسرائے کے دفتر اصلاحات (ریفارمز آفس) نے شائع کئے تھے۔ امیدواروں

کی طرف سے یہ اعلان ضروری تھا کہ وہ "صوبے کے نمائندے کی حیثیت سے ۱۶ مئی کے بیان کے پیرا ۱۹ کے مطابق کام کرنے پر رضامند ہوں گے :" اس پیرا ۱۹ کا تعلق گروپ بندی سے تھا۔ اور گاندھی کے نزدیک یہ "زہر کی ایک بوند" تھی۔ جب ۲۴ جون کو گاندھی نے کابینہ مشن سے اپنی فیصلہ کن ملاقات میں ان سے یہ تصدیق کرائی کہ وہ مختصر المیعاد منصوبہ کو کالعدم قرار دیں گے تو گاندھی نے ان سے یہ بھی کہا کہ وہ طویل المیعاد منصوبہ میں بھی یہ نہایت اہم ترمیم کر دیں کہ آئین ساز اسمبلی کے ارکان کے لئے پیرا ۱۹ کے مطابق آئین مرتب کرنا لازمی نہیں ہوگا۔ گاندھی کو اندیشہ تھا کہ شاید کابینہ مشن کے ارکان اس کی یہ بات نہ مانیں لیکن وہ اس کی توقعات سے بڑھ گئے اور جس ترمیم کا وہ خواہاں تھا انھوں نے اسے قبول کر لیا۔ اس ترمیم کے بعد ارکان سے صرف یہ حلف لیا گیا کہ وہ ہند کے نئے آئین کی ترتیب میں تعاون کریں گے۔ اس کامیابی سے گاندھی کا حوصلہ اور بڑھا اور اس نے چاہا کہ مزید دباؤ ڈالے۔ اس کی خواہش تھی کہ آئین ساز اسمبلی کے فیصلوں کو نافذ کرنے کے لئے اختیار حاصل ہو جائے۔ چنانچہ اس نے کانگرس ورکنگ کمیٹی کو مشورہ دیا کہ "طویل المیعاد منصوبہ قبول نہ کیا جائے جب تک کہ لگے ہاتھ عبوری حکومت پر قبضہ نہ مل جائے :" لیکن ورکنگ کمیٹی نے محسوس کیا کہ سر دست جو کامیابیاں حاصل ہو چکی ہیں وہی غنیمت ہیں۔

گاندھی کے وفادار سیکرٹری پیارے لال نے لکھا ہے کہ ورکنگ کمیٹی کی طرف سے گاندھی کے اس مشورہ کو تسلیم نہ کرنے سے ایک اختلافی خلیج کا آغاز ہو گیا :۔

> "یہ اختلافی خلیج گاندھی اور اس کے بعض قریب ترین رفقائے کار کے درمیان حائل ہو گئی . . . . . اس سے پہلے عملاً یہ حالت تھی کہ تمام اہم قرار دادیں اور ورکنگ کمیٹی کے مسودے پہلے گاندھی کے ذہن میں روپ دھارتے تھے اور بعد میں ورکنگ کمیٹی انہیں اپنا لیتی تھی خواہ ہو بہو یا کسی مناسب ترمیم کے ساتھ۔ گاندھی جی مُصر تھے کہ برطانیہ کے ہٹ جانے کے بعد انہیں مسلم لیگ سے براہ راست بلا مداخلتِ غیرے نپٹنے دیا جائے۔ خواہ اس کا مطلب خانہ جنگی ہی کیوں نہ ہو . . . . . وہ برطانیہ کی اصلی طاقت کے تحت امن اور شانتی پر عام افراتفری اور تراج کو ترجیح دیتے تھے

اور اس کا سامنا کرنے کو تیار تھے۔ ان کا یہ اصرار نہ صرف باقی رہا بلکہ وقت گزرنے پر اور شدید ہوتا گیا۔ ورکنگ کمیٹی کے ارکان کا نقطۂ نظر خالصتاً سیاسی تھا اور وہ ان نامعلوم گہرائیوں کی تاب نہیں رکھتے تھے"۔[۲۱]

یہ ایک ایسا منظر تھا جسے دیکھ کر فرشتے بھی آنسو بہائیں کہ اہنسا کا علمبردار، جس نے ساری دنیا کو عدم تشدد کا وعظ سنایا کہ بلند ترین مذہبی اصول یہی ہے جس نے انگلستان کو اس کے ہلاکت آفریں خطرہ کی ساعت میں یہ مشورہ دیا کہ وہ ہتھیاروں سے ہٹلر کی مزاحمت نہ کرے۔ اب خود اس بات پر تل گیا تھا کہ "برطانیہ کے ہٹ جانے کے بعد اسے مسلم لیگ سے براہِ راست بلا مداخلتِ غیرے نپٹنے دیا جائے۔ خواہ اس کا مطلب خانہ جنگی ہی کیوں نہ ہو"۔ یعنی عدم تشدد ایک ایسا ہتھیار ہے، جسے اسلحہ سے لیس انگریزوں کے خلاف ہی استعمال کرنا چاہئے البتہ کمزور اور تعداد میں کم مسلمانوں کے خلاف جنگ سے بھی احتراز نہیں کرنا چاہئے۔

اس واقعہ سے ضمناً کانگرس میں تقسیمِ اختیار کا نقشہ بھی پوری وضاحت سے عیاں ہو جاتا ہے۔ صدر کانگرس کے طور پر کانگرس کی طرف سے کابینہ مشن سے مذاکرات میں ابوالکلام آزاد کو پیش پیش رکھا گیا۔ آزاد کابینہ مشن پلان کے پورے اخلاص کے ساتھ حامی و موید تھے۔ اور اس پر عمل درآمد کے شدید آرزومند تھے۔ لیکن جب ایک بہت نازک اور اہم فیصلہ کا وقت آیا، تو کابینہ مشن نے انہیں صاف نظر انداز کر دیا، اور ان سے بالا بالا ہی گاندھی اور پٹیل سے سودا کر لیا۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی نے اس سودے پر محض مہرِ توثیق ثبت کی۔ کانگرس سے وابستہ "قوم پرست" مسلمانوں میں ابوالکلام آزاد سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ جمعیۃ العلمائے ہند میں ان کے اثر و رسوخ سے کانگرس نے خوب فائدہ اٹھایا اور اپنے آپ کو غیر فرقہ وارانہ تنظیم ثابت کرنے کے لئے ان کی بہت نمائش کی۔ لیکن نہ ہی آزاد کو اور نہ ہی دوسرے "قوم پرست" مسلمانوں کو کانگرس کی درونِ خانہ مشاورت میں کوئی اونچا مقام حاصل تھا۔ پٹیل نے طنزاً کہا تھا کہ "صرف ایک ہی سچا قوم پرست مسلمان ہے اور وہ جواہر لال نہرو ہے"۔[۲۲] اس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ کانگرس کے "مردِ آہن" کی نظروں میں قوم پرست مسلمانوں کی کیا قدر و منزلت تھی۔

کابینہ مشن ۲۹ جون ۱۹۴۶ء کو ہند سے رخصت ہوا، اور اپنے پیچھے نزاع و اختلافات

اور تلخی کا در شہ چھوڑ گیا۔ ان کے طرزِ عمل ـــ "انصاف" کرنے کی جرأت مندانہ کوشش اور پھر کانگرس کی دھمکیوں کے سامنے ذلیل پسپائی ـــ کا اعادہ لیبر پارٹی کی طرف سے امورِ ہند کے انتظام میں پے درپے دیکھنے میں آیا۔ ایک لحاظ سے، کابینہ مشن اور کانگرسی قیادت کے درمیان قوتِ ارادی کی یہ پہلی ٹکر فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ یہ لڑائی ہار جانے کے بعد لیبر حکومت کے کس بل پھر کبھی بحال نہ ہو سکے۔ ہر پسپائی نے اسے کمزور تر چھوڑا، حتیٰ کہ آخر کار اس میں پیش قدمی کی سکت بالکل نہ رہی۔ وہ کانگرس کے اشاروں پر رقص کرتی تھی۔ البتہ اپنی ظاہری ساکھ برقرار رکھنے کے لئے بھی ہاتھ پاؤں مارتی تھی۔ جیسا کہ برطانوی مؤرخ پرسی ول سپیئر نے کہا ہے۔ "انگریز صرف دلائل پیش کر سکتے تھے اور ترغیب دے سکتے تھے۔ حکم دینے کی طاقت ان میں نہیں رہی تھی"۔[۴۳] اس میں کوئی شک نہیں کہ لیبر پارٹی میں جرأت مند اور مثالیت پسند لوگ بھی تھے، مثلاً ارنسٹ بیوان اور فلپ نیول بیکر۔ لیکن امورِ ہند میں جن لوگوں کے افکار و آراء آخر کار غالب آتے، وہ سر سٹیفورڈ کرپس اور وزیرِ اعظم ایٹلی تھے۔

جولائی ۱۹۴۶ء میں ابوالکلام آزاد کی جگہ جواہرلال نہرو کانگرس کا صدر بن گیا۔ یہ انتخاب بھی حسبِ معمول گاندھی نے کیا۔ ولبھ بھائی پٹیل کو اس سے سخت مایوسی ہوئی، کیونکہ یہ بات واضح تھی کہ جو بھی کانگرس کا صدر رہے گا، جلد ہی وہی شخص عبوری حکومت کا سربراہ اور آزاد ہند کا پہلا وزیرِ اعظم بنے گا۔ بعد میں گاندھی نے اپنے اس انتخاب کی یوں تشریح کی: "جواہرلال ہیرو کا تربیت یافتہ، کیمبرج کا گریجوایٹ اور بیرسٹر ہے۔ انگریزوں کے ساتھ مذاکرات کے لئے ہمیں اس کی ہی ضرورت ہے"۔[۴۴] ۱۰ جولائی کو کانگرس کے نئے صدر نے بمبئی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ جس میں اس نے کہا کہ کانگرس آئین ساز اسمبلی میں شامل ہوگی تو وہ معاہدوں کی زنجیروں سے بالکل آزاد ہوگی۔ اور جو بھی صورتِ حال پیدا ہوگی۔ اس سے نپٹنے کے لئے پوری طرح مجاز و مختار ہوگی"۔ جب نہرو سے پوچھا گیا کہ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ کابینہ مشن پلان میں رد و بدل کیا جا سکے گا، تو اس کے جواب میں نہرو نے پورے زور سے کہا: "کانگرس نے صرف آئین ساز اسمبلی میں شامل ہونے کو منظور کیا ہے اور جو بھی اس کی دانست میں مناسب ہوگا وہ اس کے مطابق کابینہ مشن پلان میں ردّ و بدل کرنے کے لئے اپنے آپ کو پوری طرح آزاد سمجھتی ہے"۔ نہرو نے اعلان

گیا۔ خواہ اس سوال کا کسی زاویہ سے جائزہ لیا جائے۔ اغلب امکان یہ ہے کہ کوئی گروپ بندی نہیں ہوگی۔" اپنی اس بات کی وضاحت نہرو نے یوں کی کہ حصہ الف (ہندو اکثریت والے صوبوں کا گروپ) اس کے خلاف ہوگا۔ حصہ ب میں شمال مغربی سرحدی صوبہ اور حصہ ج میں آسام اس کی مخالفت کریں گے۔ نہرو نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ مرکزی حکومت کابینہ مشن پلان کی مجوزہ صورت سے کہیں زیادہ طاقت ور ہوگی۔ امور خارجہ، دفاع اور مواصلات جو مرکزی حکومت کے دائرۂ اختیار میں ہوں گے۔ ان کی وسیع تر تعبیریں کی جائے گی کہ ان کی مددگار صنعتیں، خارجہ تجارتی پالیسی، کرنسی، قرضے اور ٹیکس لگانے کے اختیارات بھی مرکزی حکومت کے پاس ہوں گے۔ مرکزی حکومت کو صوبوں کے باہمی تنازعات طے کرنے کا بھی اختیار حاصل ہوگا اور وہ انتظامی یا معاشی تعطل سے عہدہ برآ ہونے کی بھی مجاز ہوگی۔ نہرو نے اپنی بات یوں ختم کی "مرکز کا دائرہ کار اگر محدود بھی ہو تب بھی اس کا بڑھتے رہنا ناگزیر ہے، کیونکہ اس کے بغیر مرکز اپنا وجود ہی برقرار نہیں رکھ سکتا۔"[۲۶]

نہرو کے کینیڈین سوانح نگار مائیکل بریچر نے لکھا ہے کہ "نہرو کے اس اظہار رائے نے انتشار اور منافقت کی فضا تو ضرور صاف کر دی لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ مفاہمت کا وہ ظاہری ڈھانچہ بھی درہم برہم ہوگیا، جسے کابینہ مشن نے برقرار رکھنے کی بڑی کوشش کی تھی"۔[۲۷] قائد اعظم نے فوراً کہا کہ "نہرو کا یہ بیان اس اساس کے بالکل منافی ہے، جس پر طویل المیعاد سکیم استوار ہوئی ہے"۔ انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ پارلیمنٹ میں عنقریب ہونے والی بحث میں برطانوی حکومت کو "اس تاثر کا ازالہ کر دینا چاہئے کہ کانگرس نے طویل المیعاد سکیم کو قبول کر لیا ہے۔" لیکن برطانوی حکومت نے عمداً ایسا نہ کیا۔ ۱۸ جولائی کو دارالامراء میں تقریر کرتے ہوئے لارڈ پیتھک لارنس نے کہا:۔

"آئین ساز اسمبلی میں شمولیت کے بارے میں فریقین کے عزائم کی نسبت جو حالیہ اطلاعات ہند سے موصول ہوئی ہیں مجھے ان کے متعلق چند الفاظ کہنے چاہئیں۔ ہند سے رخصت ہونے سے کچھ عرصہ پہلے ہم نے دونوں فریقوں سے ملاقات کی تھی اور انہوں نے بڑے وثوق سے ہمیں بتایا تھا کہ وہ آئین ساز اسمبلی میں اس نیت سے شریک ہو رہے ہیں کہ اسے کامیاب بنائیں۔ تاہم انہیں اپنے اپنے نظریات پیش کرنے کی پوری آزادی حاصل ہے کہ آئندہ آئین کی

اساس کیا ہونی چاہئے اور کیا نہیں ہونی چاہئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن جب وہ ۱۶ مئی کے بیان کو اور اس بیان کے مطابق منتخب شدہ آئین ساز اسمبلی کو قبول کر چکے ہیں تو لازماً وہ ان حدود سے باہر نہیں جا سکتے، جن پر سمجھوتہ ہو چکا ہے۔ ایسا فعل شامل ہونے والے دوسرے فریقوں کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ اسی متفق علیہ طریق کار کی اساس پر ملک معظم کی حکومت نے یہ کہا ہے کہ وہ آئین ساز اسمبلی کے فیصلے منظور کریگی۔"

اسی روز سر سٹیفورڈ کرپس نے دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے کم و بیش انہی الفاظ میں ایسے ہی خیالات ظاہر کئے۔ کرپس نے کابینہ مشن کے عجیب و غریب طرز عمل کا جواز بھی پیش کرنے کی کوشش کی اور اس مقصد کے لئے ۱۶ جون کے بیان کے پیرا ۸ کی ایسی توجیہہ پیش کی جسے اس پیرا کے صریح معانی پر چسپاں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یقیناً ہند میں فن "تعبیر" کے ماہروں سے کرپس کی قریبی رسم و راہ بیکار ثابت نہیں ہوئی۔ کرپس نے کہا کہ "مسٹر جناح ۱۶ جون کے بیان کے مطابق مخلوط حکومت میں شامل ہونے کے سخت آرزومند تھے۔ لیکن اس بیان کے پیرا ۸ کے مطابق چونکہ ایسی حکومت کا قیام دونوں فریقوں کی منظوری پر منحصر تھا۔ اس لئے اس بنیاد پر مزید عمل درآمد ناممکن ہوگیا جب ایک فریق ـــــ اور وہ بھی فریق غالب ـــــ اسے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔"[28] پیرا ۸ کا متن اس سے پہلے صفحہ ۷۶ پر دیا جا چکا ہے۔ کرپس کے ان الفاظ پر اُس متن سے بہتر کوئی تبصرہ پیش نہیں کیا جا سکتا۔[29]

ان واقعات کے پس منظر میں جولائی کے آخری ہفتہ میں مسلم لیگ کونسل کا بمبئی میں اجلاس ہوا۔ کونسل کو خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے کابینہ مشن سے مذاکرات کی پوری تفصیل کا اعادہ کیا اور یہ واضح کیا کہ مسلم لیگ کس طرح "رعایت کے بعد رعایت دیتی رہی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیونکہ ہماری انتہائی خواہش خوشگوار اور پُرامن مفاہمت ہے، جس سے نہ صرف ہندو اور مسلمان بلکہ اس برصغیر کی دوسری آبادی بھی آزادی حاصل کرلے۔" قائداعظم نے بتایا کہ کس طرح "مسلم لیگ ہی وہ واحد جماعت ہے جو ان مذاکرات سے عزت اور وقار اور بے داغ دامن کے ساتھ آئی ہے"۔ اور کس طرح "کانگرس نے قانونی موشگافی اور سودا بازی سے ہند کے سب لوگوں کو نہایت نقصان پہنچایا ہے۔ کانگرس کے سامنے مسلم لیگ کو نیچا دکھانے کے سوا کوئی اور مقصد نہ تھا۔" نیز یہ کہ کس طرح "کابینہ مشن کے ارکان

سارے مذاکرات کے دوران میں کانگرس کی دہشت اور دھمکیوں سے دبکے رہے" اور کس طرح کابینہ مشن نے کانگرس کی طرف سے صرف طویل المیعاد منصوبہ کی باطل منظوری کو حقیقی رضامندی قرار دے کر عبوری حکومت کے بارے میں اپنے عہد سے انحراف کیا۔ اور اس کے نتیجہ میں کابینہ مشن کے ارکان آج پوری طرح سہمے ہوئے اور مفلوج ہیں۔" قائداعظم نے یہ بھی کہا کہ کانگرس کے صدر جواہر لال نہرو نے پوری طرح واضح کر دیا ہے کہ کانگرس نے کوئی بھی ذمہ داری قبول نہیں کی اور نہ ہی کانگرس ۱۶ مئی کے بیان کے پیرا ۱۵ یا پیرا ۱۹ کی پابند ہے۔ ان حالات میں وزیر مملکت برائے ہند کا یہ فرمانا کہ ہند کی جماعتیں منصوبہ کی شرائط سے روگردانی نہیں کر سکتیں، کیونکہ یہ دوسرے فریقوں کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ محض ایک "پارسایانہ اظہارِ خیال" ہے۔ "اگر کانگرس، جسے آئین ساز اسمبلی میں بے رحم اکثریت حاصل ہوگی۔ کوئی ایسا فیصلہ کرے جو اسمبلی کے اختیاراتِ قانونی سے باہر ہو یا جس کی اسمبلی مجاز ہی نہیں تو اس کا کوئی مؤثر مداوا نہیں۔"

قائداعظم نے اپنے سخت ترین الفاظ سر سٹیفورڈ کرپس کے لئے استعمال کئے۔ انہوں نے کہا: "لفظی ہیر پھیر کے اس ماہر شعبدہ باز" نے ۱۶ جون کے بیان کے پیرا ۸ کو عبوری حکومت کی تشکیل سے بچنے کے لئے "ایک قطعی بلا اصل اور ناروا مفہوم" دے مارا۔" ان سب واقعات سے جو بات بلا شک و شبہ ثابت ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ ہند کے قضیہ کا واحد حل پاکستان ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہم نے سب دلائل آزما دیکھے ہیں۔ اعانت یا چارہ سازی کے کسی اور سرچشمہ کی تلاش اب بے سود ہے۔ کوئی بھی ایسی عدالت نہیں جس سے ہم رجوع کر سکیں۔ ہمارے لئے واحد دادگاہ مسلم قوم ہے۔" کونسل کے سامنے اختتامی تقریر میں قائداعظم نے کہا: "مذاکرات کے دوران میں مسلم لیگ انصاف کے جذبہ سے سرشار رہی۔ حتیٰ کہ سارے ہند کے لئے آزادی حاصل کرنے کی خاطر اس نے آزاد و خود مختار مملکتِ پاکستان کو بھی کانگرس کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا۔ لیگ نے رضاکارانہ طور پر اتحادیہ ہند کو تین امور تفویض کر دیئے، یہ قدم اٹھا کر اس نے کسی غلطی کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ یہ مراعات دے کر لیگ نے اعلیٰ درجہ کی سیاست و تدبر کا مظاہرہ کیا۔۔۔۔ لیکن اس کا جواب تحقیر و اہانت سے دیا گیا۔"[۳۵]

۲۹ جولائی کو جب لیگ کونسل کے سامنے کابینہ مشن پلان کی منظوری کو رد کر دینے کی

قرارداد پیش کی گئی، تو اس پر ایک بھی اختلافی آواز بلند نہ ہوئی۔ اس قرارداد کے آخری پیرا میں یہ کہا گیا :-

"جب تک تعاون کے جذبہ کے ساتھ اس سکیم پر عمل درآمد نہ کیا جائے گا، یہ کامیاب نہیں ہو سکتی۔ کانگرس کے رویّے پوری طرح واضح ہے کہ آئین ساز ادارہ کی کامیابی کے لئے یہ مقدم شرط سرے سے ناپید ہے۔ اس حقیقت کے ساتھ ساتھ ہی ساتھ اگر برطانوی حکومت کی پالیسی بھی پیش نظر رکھی جائے جو اس نے کانگرس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مسلم قوم اور اہل ہند کے دوسرے کمزور تر طبقات بالخصوص اچھوتوں کے مفادات کو قربان کر دینے کے بارے میں اختیار کر رکھی ہے، اور جس طرح وہ اپنے زبانی اور تحریری عہد و پیمان سے انحراف کرتی رہی ہے، جو اس نے وقتاً فوقتاً مسلمانوں سے کئے، تو کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا کہ ان حالات میں مجوزہ آئین ساز ادارے میں مسلمانوں کی شرکت خطرہ سے معمور ہے، اس لئے مسلم لیگ کونسل کابینہ مشن کی تجاویز کی وہ منظوری منسوخ کرتی ہے جس کی اطلاع صدر مسلم لیگ نے ۶ جون ۱۹۴۶ء کو وزیر مملکت برائے ہند کو دی تھی"[۳۱]

کونسل نے ایک اور قرارداد بھی منظور کی، جس کا ایک حصّہ یوں تھا "اب وقت آگیا ہے کہ پاکستان کے حصول کے لئے مسلم قوم براہِ راست اقدام کرے اور انگریزوں کے تحت موجودہ غلامی کے ساتھ آنے والے دور کی اس محکومی سے بھی نجات پالے، جو اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے غلبے سے پیدا ہوگی۔" اس قرارداد میں یہ ہدایات دی گئیں کہ "راست اقدام کا پروگرام تیار کیا جائے اور آنے والی جد و جہد کے لئے مسلمانوں کو منظم کیا جائے جس کا آغاز جب اور جس طرح ضروری ہوگا، کیا جائے گا۔" مزید براں کونسل نے مسلمانوں سے یہ مطالبہ کیا کہ "انہیں غیر ملکی حکومت نے جو خطابات عطا کئے ہیں وہ برطانوی رویّہ کے خلاف سخت اظہارِ ناراضگی اور احتجاج کے طور پر واپس کر دیئے جائیں۔"[۳۲]

۳۱ جولائی کو پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے قائد اعظم نے واضح کر دیا کہ راست اقدام کا مطلب کسی کے خلاف اعلان جنگ نہیں۔ انہوں نے کہا کہ صرف مسلم لیگ وہ واحد جماعت

ہے، جس نے پوری احتیاط سے اپنے آپ کو آئینی دائرے کے اندر رکھا ہے اور آئینی طریقوں پر کاربند رہی ہے لیکن کابینہ مشن پلان کے مذاکرات کے دوران میں مسلم لیگ نے دیکھ لیا کہ :-

"برطانوی حکومت کے سر پہ کانگرس نے تلوار لٹکا رکھی ہے اور اسے یہ ڈر ہے کہ اگر کانگرس کی پوری طرح دلجوئی یا تشفی نہ کی گئی تو وہ پھر مہم شروع کر دے گی ...... جو ۱۹۴۲ء کے مقابلہ میں ہزار گنا بدتر ہوگی ...... انگریزوں کے پاس مشین گنیں ہیں اور اپنی بات کی جو چاہیں تاویل کر سکتے ہیں ...... کانگرس ایک اور قسم کے ہتھیار سے پوری طرح لیس ہے ...... اسے آسانی سے چٹکیوں میں نہیں اڑایا جا سکتا۔ اس لئے ہم بھی اب اپنے دفاع اور اپنے تحفظ کے لئے آئینی ذرائع کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں اور ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ راست اقدام کے لئے تیاری کریں تاکہ جس طرح اور جب بھی وقت آئے اس پر عمل درآمد شروع کر سکیں" [۳۲]

الغرض مسلم لیگ بھی اسی قسم کے ہتھیار وضع کرنے پر مجبور ہو گئی جن کے بل بوتے پر کانگرس پچیس برس سے راست اقدام کی تحریکیں چلاتی رہی تھی۔

کانگرس نے مسلم لیگ کے اس اعلان کو اپنے لئے چیلنج قرار دیا۔ ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے سردار پٹیل نے کہا کہ مسلم لیگ نے جس راست اقدام کی دھمکی دی ہے اگر اس میں کچھ حقیقت ہے تو اس کا ہدف انگریز نہیں بلکہ کانگرس ہے کیونکہ انگریز تو پہلے ہی یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ وہ ہند میں ٹھیرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔[۳۴] ہندوؤں میں عام ردعمل یہ تھا کہ مسلم لیگ کی قرار دادیں محض دھونس جمانے اور دھمکی دینے کے لئے ہیں۔ ہندوؤں کو یہ تو معلوم تھا کہ مسلم عوام لیگ کے ساتھ ہیں لیکن ان کا استدلال یہ تھا کہ جس طرح ایک فوج کی کارکردگی اس کے افسروں کی قابلیت پر منحصر ہوتی ہے۔ اسی طرح کوئی سیاسی تنظیم بھی ہم آہنگی اور قوت مزاحمت میں اپنے قائدین کی اکثریت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ مسلم لیگ کے مخالف اپنے اس استدلال کو یوں آگے بڑھاتے تھے کہ جناح کے سوا مسلم لیگ کی قیادت اعلیٰ بیشتر اعتدال پسندوں پر مشتمل ہے۔ ان کا پس منظر جاگیردارانہ ہے اور اقتدار کے سامنے جھکنا ان کے خمیر میں ہے یا پھر مسلم لیگ کے لیڈر ادھیڑ عمر

کے آسودہ حال لوگ ہیں جن سے سول نافرمانی کی طویل جدوجہد کی سختیوں اور تکلیفوں کی تاب لانے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ ہندوؤں کا احساس یہ تھا کہ یہ لوگ جنگ کی آزمائش سے کبھی نہیں گزرے۔ اور قربانی اور ضبط و نظم کی اہلیت میں آزمودہ کار کانگرسیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مسلم لیگیوں نے انگریزوں کے انخلاء سے ذرا پہلے خطابات واپس کرنے کا جو علامتی اقدام کیا ہے۔ وہ کوئی حقیقی قربانی نہیں ہے۔ مسلم لیگ کے مخالفوں کا کہنا یہ تھا اور یہ بات بالکل بے اصل بھی نہیں تھی کہ مسلمانوں کے نوجوان عناصر جو اپنے نصب العین پر جان دیتے ہیں اور جن کا پاکستان میں یقین و ایمان مخلصانہ ہے مسلم لیگ کی ہیئتِ حاکمہ میں ان کی نمائندگی برائے نام ہے اور ان کا اثر و رسوخ بھی بہت کم ہے اور کانگرس کے برعکس مسلم لیگ کے پاس سیاسی کارکنوں کی فوج رکھنے اور وہ جیلوں میں ہوں یا باہر ان کے خاندانوں کی کفالت کرنے لئے مالی وسائل کا فقدان ہے۔ اس طرح ہندوؤں نے طنز و مذاق' سب و شتم اور دھمکیوں سے مسلمانوں کو خوفزدہ کرنا چاہا۔ لامحالہ دونوں فرقوں میں تعلقات بگڑتے چلے گئے۔

شاذ و نادر ہی تدبر و دانش کی کوئی آواز اُٹھتی تھی۔ جیسا کہ لبرل فیڈریشن کے ایک لیڈر سر چمن لال سیتل واد نے کہا کہ "مسلم لیگ نے ایک مشترکہ مرکز سے خواہ وہ کس قدر محدود تھا' اتفاق رائے کرنے اور متحدہ ہند کے لئے آئین بنانے کے لئے آئین ساز اسمبلی میں شامل ہونے کا جو پہلا فیصلہ کیا تھا اس کی اہمیت کا پوری طرح اعتراف نہیں کیا گیا۔" اس نے کانگرس سے مطالبہ کیا کہ "مسلم لیگ کو یقین دلایا جائے کہ وہ کابینہ مشن کی سکیم کے کسی بھی حصہ سے منحرف ہونے کا ارادہ نہیں رکھتی" ۵۵ ؎ سرکردہ انگریز اخبار نویس سر آرتھر مور نے، جو "سٹیٹسمین کلکتہ" کا سابق ایڈیٹر تھا، یہ تبصرہ کیا:

> "صرف مسلم لیگ نے ہی طویل المیعاد اور مختصر المیعاد منصوبے کو منظور کیا تھا۔۔۔۔۔ لیکن تشکر یا احسان مندی کی کوئی کرن ان تک نہ پہنچی۔ ہمیں تشویش ہے تو اس بات پر کہ ۱۶ جون کے بیان سے منحرف ہو کر ہم نے انہی کا ساتھ چھوڑ دیا ہے جنہوں نے ہم پر اعتبار کیا تھا۔۔۔۔۔ برطانوی پریس مجبور تھا کہ وہ کابینہ مشن کو کامیاب دکھائے اور اس ناانصافی کو چھپائے جو مسلمانوں سے روا رکھی گئی تھی۔ ہم نے ایسی صورتِ حالات پیدا کر دی ہے۔ جس

میں خانہ جنگی کا واضح امکان ہے"[۳۶]۔

جولائی کے اواخر تک آئین ساز اسمبلی کے انتخابات ہو گئے۔ مسلم لیگ نے ۹۵ فیصد مسلم نشستیں جیت لیں۔ کانگرس نے بھی اتنے ہی بھاری تناسب سے عام (غیر مسلم) نشستیں حاصل کر لیں۔ آسام میں کانگرس کی حکومت تھی اور آسام اسمبلی نے آئین ساز اسمبلی میں نمایندوں کو منتخب کرتے وقت یہ ہدایت کی کہ وہ شروع سے ہی حصہ ج سے کوئی سروکار نہ رکھیں۔ انتخابات کے نتائج سے چھ کروڑ اچھوت ازحد پریشان تھے۔ میثاقِ پونا کے تحت ان کے حقیقی نمایندوں کو اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے صوبائی اسمبلیوں میں منتخب نہیں ہونے دیا تھا اور چونکہ صوبائی اسمبلیاں ہی آئین ساز اسمبلی کے لئے انتخابی ادارہ تھیں۔ وہ آئین ساز اسمبلی میں بھی جگہ نہ پا سکے۔ شیڈولڈ کاسٹ فیڈریشن کے لیڈر ڈاکٹر امبیدکر نے اس صورتِ حال کی تشریح کرتے ہوئے کہا: "ملک بھر میں جہاں کہیں بھی ابتدائی انتخابات منعقد ہوتے، کوئی بھی کانگرسی فیڈریشن کے امیدوار کے مقابلہ میں کامیاب نہ ہو سکا۔ لیکن جن امیدواروں کو اچھوتوں نے اپنے نمایندے قرار دیا تھا انہیں عام انتخابات میں مسترد کر دیا گیا اور اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے ووٹوں کی بدولت ایک اور پارٹی کے "مرغانِ دست آموز" اور "آلہ کار" کامیاب ہو گئے"۔ مسلم لیگ کو ان پسے ہوئے لوگوں سے پوری ہمدردی تھی اور اس نے ان کی حمایت اور وکالت بھی کی۔ لیکن کانگرس کو میثاقِ پونا پہ اصرار تھا جسے ڈاکٹر امبیدکر کو گاندھی کے مرن بھرت کے دباؤ کے تحت بہ امرِ مجبوری منظور کرنا پڑا تھا اور جس کے بارے میں ڈاکٹر امبیدکر نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ "اس میثاق نے انہی لوگوں (اچھوتوں) کو سیاسی حقوقِ رائے دہی سے محروم کر دیا ہے۔ جن کی بہبود کی خاطر یہ قرار پایا تھا"[۳۷]۔

سکھوں نے بھی گروپ بندی کے خلاف احتجاج کیا اور ابتداً میں آئین ساز اسمبلی کے انتخابات سے علیحدہ رہے۔ سکھ لیڈروں کو اعتراض یہ تھا کہ حصہ ب میں چونکہ مسلم اکثریت کا غلبہ ہے اس سے سکھ علاقے باہر نہیں نکل سکیں گے۔ سکھ لیڈروں کو یہ اعتراض کرنے پر گاندھی نے اکسایا تھا۔ وہ سکھوں کے خدشات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا رہا۔ لیکن یہ اعتراض کس قدر وقیع تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ پنجاب کے کسی ایک بھی ضلع میں سکھ اکثریت میں نہیں تھے۔ اسمبلی کے حصہ ب کی ۳۵ نشستوں سے سکھ ۴ حقدار تھے اور پنجاب کی ۲۸ نشستوں میں بھی ان کا

حق ہم سے زیادہ نہیں تھا۔ یعنی حصہ ب کی تشکیل سے ان کی اقلیتی حیثیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ انگریز بھی سکھوں کے دعاوی پر انتہائی ہمدردی سے غور کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جیسا کہ ۱۰ر جولائی کو سر سٹیفرڈ کرپس نے دارالعوام میں تشریح کرتے ہوئے کہا:۔

"جو مشکل پیدا ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ سکھوں کی اہمیت کی پوری قدر نہیں کی جا رہی بلکہ اس مشکل کا اصل سبب ایسے جغرافیائی حقائق ہیں جن سے گریز ناممکن ہے۔ سکھ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے ساتھ بھی مسلمانوں کی مانند خصوصی سلوک کیا جائے۔ لیکن سکھ ان سے بدرجہا چھوٹا فرقہ ہیں۔ ان کی آبادی صرف ۵۵ لاکھ ہے۔ جب کہ مسلمانوں کی آبادی ۹ کروڑ ہے۔ مزید براں جغرافیائی طور پر اُن کی آبادی کی یہ کیفیت ہے کہ اب تک ممکن نہیں ہو سکا کہ کوئی ایسا علاقہ وضع کر دیا جائے۔ جہاں سکھ اکثریت میں ہوں"

قائد اعظم نے بار بار سکھوں کو یقین دلایا تھا کہ ان کے حقوق کا پورا پورا تحفظ کیا جائے گا اور ان کے مطالبات کے بارے میں فراخدلانہ سلوک کیا جائے گا۔ لیکن جہاں تک ان کی اقلیتی حیثیت کا تعلق تھا نہ قائد اعظم اور نہ کوئی اور اسے تبدیل کر سکتا تھا۔

کانگرس کو مسلم لیگ کے خلاف ایک حلیف کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس نے ایک قرارداد منظور کی جس میں سکھوں کو یقین دلایا کہ ان کی جائز شکایات کا ازالہ کرانے میں کانگرس ان کی ہر ممکن حمایت کرے گی"۔۳۸ کانگرس کی استدعا پر سکھوں نے ۱۶ر مئی کے بیان کو قبول کرنے اور آئین ساز اسمبلی کے لئے اپنے نمائندے منتخب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کانگرس اور سکھوں میں اتحادِ عمل معرضِ وجود میں آگیا لیکن سکھوں کو علم نہیں تھا کہ انہیں مسلمانوں کے خلاف آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ اور جب وہ آلہ کار کے طور پر استعمال ہو جائیں گے تو پھر انہیں کانگرس کے عہد و پیمان کی حقیقت معلوم ہو گی اور وہ پچھتائیں گے۔ ۱۹۶۱ء میں جب نہرو کی حکومت نے بھارت میں پنجابی صوبے کے لئے سکھوں کی ایجی ٹیشن کو پوری سختی سے کچل دیا تو تارا سنگھ نے بصد تاسف یہ اعتراف کیا کہ آزاد سکھ ریاست کے لئے کانگرس نے سکھوں کو ۱۹۴۶ء میں اس لئے اکسایا تھا کہ مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان کے خلاف جوابی چال چلی جا سکے۔۳۹ لیکن اب یہ حقائق بیان کرنا کسی سکھ مورخ کا کام ہے

کہ کس طرح بلدیو سنگھ دل شکستگی کی حالت میں مرا اور تارا سنگھ نے ہندو غلبہ کے خلاف "مرن مرت" رکھا، تو بڑی مشکل سے جانبر ہو سکا۔

۲۲ر جولائی کو لارڈ ویول نے عبوری حکومت کے قیام کے لئے اپنی کوشش دوبارہ شروع کر دی اور نہرو اور جناح کے نام خطوط میں چودہ ارکان پر مشتمل کابینہ کی تجویز پیش کی، چھ کانگرس کے (اچھوتوں کا ایک نمائندہ سمیت) پانچ مسلم لیگ کے اور تین نمائندے اقلیتوں کے ـــــ موخر الذکر کو خود وائسرائے نے نامزد کرنا تھا۔ کسی فریق کو حق نہیں تھا کہ دوسرے فریق کے پیش کئے ہوئے ناموں پر اعتراض کرے بشرطیکہ وائسرائے انہیں منظور کرلے۔ کانگرس اور مسلم لیگ کا اہم محکموں میں مساوی حصہ ہوگا۔ وائسرائے نے اپنے اس خط میں عبوری حکومت کی حیثیت کے بارے میں یقین دہانی کا اعادہ کیا، جو اُس نے ابوالکلام آزاد کے نام اپنے ۳۰ مئی کے خط میں کی تھی۔ وائسرائے نے یہ بھی لکھا کہ "اگر کانگرس نے خوشدلی سے یہ پیشکش کی کہ اہم فرقہ وارانہ مسائل کے فیصلے دونوں بڑی پارٹیوں کی رضامندی سے ہی کئے جائیں تو وہ ایسے عہد کا خیر مقدم کریگا"۔[۲۵]

نہرو نے اپنے جوابی خط میں عبوری حکومت کی حیثیت کے بارے میں وائسرائے کی یقین دہانی پر عدم اطمینان کا اظہار کیا اور یہ لکھا کہ کانگرس عبوری حکومت کے لئے پوری آزادیٔ عمل کی خواہاں ہے یعنی وائسرائے کو صرف آئینی سربراہ کے طور پر کام کرنا چاہیئے۔ اس لئے وائسرائے کی تجویز کی بنا پر وہ تشکیلِ حکومت میں تعاون کرنے سے کلی طور پر قاصر ہے۔ جناح نے اپنا جواب ۳۱ر جولائی کو بھیجا۔ انہوں نے ان متعدد پہلوؤں کی نشاندہی کی، جن کی وجہ سے عبوری حکومت کی تشکیل کی پہلی تجویز کے مقابلہ میں موجودہ تجویز مسلم لیگ کے لئے مُضر تھی۔ انہوں نے اپنے خط کے آخر میں لکھا کہ مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کی طرف سے اسے منظور کرنے کا کوئی امکان نہیں۔

یہ جوابات موصول ہونے پر وائسرائے نے نہرو کو تو ذاتی تبادلۂ خیالات کے لئے بلا بھیجا، لیکن جناح کو نہیں۔ ۶ر اگست کو اس نے برطانوی حکومت کی منظوری سے نہرو کو عبوری حکومت قائم کرنے کی دعوت دی اور یہ بات نہرو پر چھوڑ دی کہ اسے عبوری حکومت کی تشکیل کرنے سے پہلے جناح سے مشورہ کرنا چاہیئے یا نہیں۔ جناح کو وائسرائے نے یہ لکھا کہ اس نے عبوری حکومت کے قیام کی تجاویز پیش کرنے کے لئے کانگرس کو دعوت دی ہے اور یہ توقع ظاہر کی کہ اگر کانگرس

نے مسلم لیگ کو مخلوط حکومت بنانے کی معقول پیشکش کی تو وہ اس میں شامل ہو جائے گی۔ ۸۔اگست کو واردھا میں گاندھی کے آشرم میں کانگرس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا اور اس میں وائسرائے کی دعوت قبول کر لی گئی۔ نہرو نے قائد اعظم سے بھی سلسلہ جنبانی کی لیکن جیسا کہ توقع کی جا سکتی تھی اس سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

مسلم لیگ کو عبوری حکومت سے باہر رکھنے سے کانگرس کا یہ مقصد تو پورا ہو رہا تھا کہ مسلمانوں کے منتخب نمایندوں کو اقتدار میں شریک نہ کیا جائے۔ کیونکہ "قوم پرست" مسلمان اور دوسرے مرغان دست آموز بر وقت وزارتی عہدوں کے لئے دستیاب ہو سکتے تھے۔ لیکن آئین ساز اسمبلی کا معاملہ دیگر تھا۔ اگر اس میں ۹۵ فیصد منتخب مسلم نمایندوں نے شرکت نہ کی، تو اس کی ہیئت ترکیبی اتنی کھلم کھلا ہندووانہ ہو گی کہ یہ ڈھونگ نہیں چلے گا کہ یہ بھی ایک قومی ادارہ ہے جو سارے ہند کے لئے (بشمول مسلم اکثریتی صوبوں کے) آئین وضع کرنے کا اہل ہے۔ اس لئے مسلم لیگ کو کسی نہ کسی طرح بہلا پھسلا کر آئین ساز اسمبلی میں لانا ضروری تھا یا پھر اس کی عدم موجودگی کو دیدہ دانستہ ہٹ دھرمی پر محمول ظاہر کرنا تھا۔ بعض کانگرسی لیڈروں نے یہ محسوس کیا کہ نہرو نے اُن کی نیتوں کا علانیہ انکشاف کر کے غلطی کی ہے۔ وائسرائے بھی اس صورت حال پر ناخوش تھا۔ ان احساسات کی تسکین کے لئے کانگرس ورکنگ کمیٹی نے واردھا میں لفظی شعبدہ بازی کا ایک اور مظاہرہ کیا۔ اس نے ۱۰۔اگست کو ایک قرارداد منظور کی اور مسلم لیگ کی اس تنقید کے جواب میں کہ ۱۶ مئی کے بیان کو کانگرس نے مشروط طور پر قبول کیا تھا۔ اپنی قرارداد میں کانگرس ورکنگ کمیٹی نے یہ دعویٰ کیا کہ "انہوں نے سکیم کو کلیتہً منظور کر لیا تھا۔ لیکن اس کی تعبیر اس طرح کی تھی کہ اس میں جو تضادات ہیں وہ دور کئے جا سکیں اور جو فروگذاشتیں رہ گئی ہیں۔ ان کا اسی بیان میں پیش کردہ اصولوں کے مطابق تدارک کیا جا سکے" قرارداد میں اس امر کی توثیق کی گئی کہ "ہر صوبہ یہ فیصلہ کرنے کا حق رکھتا ہے کہ اسے کسی گروپ میں شامل ہونا چاہئے یا نہیں"۔ "آئین ساز اسمبلی کے خود مختار ہونے" پر بالخصوص زور دیا گیا۔ اگرچہ وہ "طبعاً اپنے داخلی حدود کے اندر رہ کر ہی کام کرے گی ..... جو اس کے کاروبار میں مضمر ہیں"۔ (۴۱)

قائد اعظم نے اس قرارداد کا بڑی شرح و بسط سے تجزیہ کیا اور واضح کیا کہ یہ محض کانگرس

کے اس مؤقف کا اعادہ ہے..... جو اس نے شروع سے اختیار کر رکھا ہے، البتہ اسے مختلف الفاظ میں پیش کیا گیا ہے اور اس لئے کانگرس کی طرف سے نام نہاد منظوری دراصل انکار کے مترادف ہے"۔ ۴۲

مسلم لیگ نے "یومِ راست اقدام" کے لئے ۱۶ اگست کا دن مقرر کیا۔ اس سے دو روز پہلے قائداعظم نے ایک اخباری بیان جاری کیا، جس میں پوری تشریح کی کہ اس دن کا:۔

"مقصد ہند کے طول و عرض میں مسلم عوام پر ان قراردادوں کی وضاحت کرنا ہے جو آل انڈیا مسلم لیگ نے ۲۹ جولائی کو بمبئی میں منظور کی تھیں.... نہ کہ کسی صورت میں راست اقدام کرنا۔ اس لئے میں مسلمانوں کو ازحد تاکید کرتا ہوں کہ وہ ان ہدایات پر پوری طرح کاربند رہیں اور ان کی سختی سے پابندی کریں، پُرامن رہیں، نظم و ضبط کا پورا خیال رکھیں اور دشمنوں کے ہاتھوں میں نہ کھیلیں"۔ ۴۳

یہ دن سارے ہند میں کلکتہ کے سوا امن و سکون سے گزر گیا۔ کلکتہ میں فقید المثال فساد ہوا جسے کلکتہ کا قتلِ عام کہا جانے لگا۔ اگرچہ بنگال مسلم اکثریت کا صوبہ تھا، لیکن اس کے دارالحکومت کلکتہ کی بیشتر آبادی ہندو تھی۔ مسلمان صرف ۲۴ فیصد تھے۔ اس زمانہ میں مسلم لیگی وزارت برسراقتدار تھی اور حسین شہید سہروردی وزیرِ اعلیٰ تھے۔ مشرقی کمان کے جنرل آفیسر کمانڈنگ ان چیف لیفٹیننٹ جنرل سر فرانسس ٹکر کے بیان کے مطابق:۔

"اگست کے پہلے نصف میں کلکتہ کے بڑے بڑے عام جلسوں میں کانگرس اور مسلم لیگ کے لیڈروں نے جو تقریریں کیں وہ اشتعال انگیز اور تیز و تند تھیں۔ سب تقریروں کا ہدف مخالف فرقہ ہوتا تھا۔ ۵ اگست کو جب حکومتِ بنگال نے یومِ راست اقدام یعنی ۱۶ اگست کو عام تعطیل کا دن قرار دینے کا اعلان کیا تو بنگال اسمبلی میں بڑی تلخ بحث ہوئی۔ بحث سے واضح ہو گیا کہ ہندو اس حکم پر کس قدر برہم تھے۔ ان کی برہمی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس سے پہلے کلکتہ کے تمام ذرائع آمد و رفت کو معطل کرنے کے لئے ہڑتالیں

کرانے کی کانگرس کو کم و بیش اجارہ داری حاصل تھی۔ اس لئے سیاسی استحصال کے اس پسندیدہ میدان میں کسی اور حریف کے داخلے پر وہ سخت ناراض تھے اور پھر حریف بھی مسلم لیگ جیسا قوی ہیکل"۴۴

۱۶ راگست کا عام جلسہ، جس سے مسٹر سہروردی نے خطاب کیا، کسی حادثہ کے بغیر گزر گیا، لیکن :۔

"سوا چار بجے سہ پہر کو فورٹرس ہیڈ کوارٹرز نے "خطرہ" کا خفیہ پیغام بھیجا' جس کا مطلب یہ تھا کہ کلکتہ کے ہر حصہ میں لڑائی جھگڑے کے حادثات ہو رہے ہیں۔ گذشتہ فروری کی قتل و غارت نے ہم سب کو سخت صدمہ پہنچایا تھا لیکن یہ تو کچھ اور ہی چیز تھی۔ یہ تو بے لگام خونخواری تھی..... صرف ایک رات کے اندر تین انگریز بٹالینوں نے گلی کوچوں سے ساڑھے چار سو نعشیں ہٹائیں ..... ۲۲ راگست تک .... کلکتہ پُرسکون ہو چکا تھا"۴۵

"سٹیٹسمین" کلکتہ کے ایڈیٹر آئن سٹیفنز نے لکھا :۔

"پہلے دن کی لڑائی میں شاید اور دوسرے اور تیسرے دن کی لڑائیوں میں یقیناً مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا..... جس بات نے پلڑا فیصلہ کن انداز میں جھکا دیا..... وہ شاید ہندوؤں کی طرف سے وسیع پیمانہ پر جوابی حملے نہ تھے بلکہ دوسرے دن سہ پہر کو سکھوں کی مداخلت تھی' جو ۱۶ ر اگست کو کم و بیش علیحدہ رہے تھے....... راقم الحروف کو یاد رہے کہ اس نے سکھوں کے بہت بڑے جتھوں کو دیکھا..... جو ہندوؤں کی حمایت میں شہر کی شمالی خستہ حال بستیوں میں شریکِ جنگ ہوتے۔ یہ بستیاں دھوئیں میں لپٹی ہوئی تھیں"۴۶

کلکتہ کے فسادات کے بارے میں مجادلانہ رنگ میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ذمہ دار انگریزوں کی مذکورہ بالا تحریروں سے احوالِ واقعی کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ ہندو مسلم فسادات کا المیہ برصغیر میں اکثر دیکھنے میں آ رہا ہے۔ لیکن کلکتہ میں قتل و غارت فقیدالمثال پیمانہ پر ہوئی

اور اس سے ہر صاحبِ عقلِ سلیم کو سخت وحشت ہوئی۔ قائداعظم محمد علی جناح نے تشدد کے ان واقعات کی کلی مذمت کی اور جن لوگوں کو نقصان پہنچا تھا۔ ان سے دلی ہمدردی ظاہر کی۔

۲۴ راگست کو وائسرائے نے عبوری حکومت کے ان ارکان کے ناموں کا اعلان کر دیا۔ جنہوں نے ۲ ستمبر کو اپنے عہدوں کا حلف اٹھانا تھا۔ نہرو چاہتا تھا کہ پانچوں مسلم نشستیں غیر لیگی مسلمانوں سے پُر کر لی جائیں، لیکن وائسرائے نے صرف تین کو مقرر کیا اور دو مسلم نشستیں خالی رکھیں اسے اب تک امید تھی کہ شاید مسلم لیگ حکومت میں شامل ہو جائے۔ اس کے بعد وائسرائے نے کلکتہ کا دورہ کیا جو کچھ اس نے وہاں دیکھا، اس سے اسے پختہ یقین ہو گیا کہ جب تک کانگرس اور مسلم لیگ میں مفاہمت نہیں ہوتی کوئی فرقہ وارانہ مصالحت ممکن نہیں اور یہی حالت رہی تو جلد ہی ملک خانہ جنگی کی لپیٹ میں آجائے گا۔

کانگرس اور مسلم لیگ میں مفاہمت کرانے کی سعی میں وائسرائے نے ۲۷ راگست کو گاندھی اور نہرو سے ملاقات کی۔ وائسرائے کا خیال یہ تھا کہ جو بات کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان مصالحت میں سدِ راہ بنی ہوئی ہے، وہ کانگرس کی طرف سے گروپ بندی کی تاویل ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ آئین ساز اسمبلی کا اجلاس بلانے سے پہلے یہ بات صاف ہو جائے۔ اس لئے گاندھی اور نہرو سے کہا کہ وہ حسبِ ذیل بیان کی اشاعت قبول کریں:۔

> "فرقہ وارانہ اتفاق کی خاطر کانگرس ۱۶ رمئی کے بیان کا یہ معنی قبول کرنے کے لئے تیار ہے کہ صوبے اس وقت تک حصوں یا گروہوں کی رکنیت کے بارے میں اپنے حقِ اختیار کو بروئے کار نہیں لا سکتے۔ جب تک ۱۶ رمئی کے بیان کے پیرا ~~۱۹~~ (۸) کے تحت نئی مجلسِ قانون ساز فیصلہ نہیں کرتی۔ یہ مرحلہ اس وقت آئے گا جب نئے آئینی انتظامات نافذ اور پہلے عام انتخابات منعقد ہو چکے ہوں گے"۔[۴۲]

گاندھی اور نہرو نے اس فارمولا کو ماننے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ یہ فارمولا کابینہ مشن کے ۱۶ رمئی کے بیان سے پوری طرح مطابقت رکھتا تھا۔ کانگرسی لیڈر اپنی بے جواز تاویل کا راگ الاپتے رہے اور کابینہ مشن پلان کو ایک آزادانہ سیاسی سمجھوتہ قرار دینے کے بجائے انہوں نے اس

کا ذکر اس انداز سے شروع کر دیا جیسے وہ کوئی قانونی دستاویز ہے جس کی متضاد تعبیرات کو فیڈرل کورٹ کے سامنے عدالتی فیصلہ صادر کرنے کے لئے پیش کرنا چاہیئے۔ مقدمہ دائر کرنے سے مشتعل جذبات میں مزید شدت پیدا ہوتی اور دونوں فریقوں کے درمیان خوشگوار مصالحت تقریباً ناممکن ہو جاتی۔ کیونکہ عدالت جو بھی فیصلہ صادر کرتی، اس کی مزید "تعبیر" کی جا سکتی تھی اور ایک نیا محاذِ جنگ کھولا جا سکتا تھا۔ گاندھی کی بے اندازہ زیرکی جس نے یہ سارے قانونی مسائل اٹھائے تھے۔ یقیناً مزید نکات پیدا کر لیتی۔ وی. پی. مینن نے لکھا ہے۔ "گاندھی نے کابینہ مشن کے بیان کی تعبیر کرتے ہوئے وکیلانہ دلائل چلائے، تو وائسرائے بول اٹھا کہ وہ سیدھا سادہ آدمی ہے، وکیل نہیں ہے، اور اسے خوب معلوم ہے کہ مشن کا مطلب کیا تھا اور یہ کہ سارے منصوبہ کا بنیادی نکتہ لازمی گروپ بندی ہے"۔[۴۵]

شانِ عالی میں یہ گستاخی کب گوارا ہو سکتی تھی۔ گاندھی نے جھٹ لندن میں ملک معظم کی حکومت کو تار بھیجا کہ "بنگال کے المیہ کے باعث وائسرائے کے اعصاب جواب دے گئے ہیں" اور اسے "ایک زیادہ قابل اور قانونی دماغ" کی اعانت کی ضرورت ہے، بصورتِ دیگر "المیہ بنگال کا اعادہ یقینی ہے"۔ معلوم ہوتا ہے کہ مہاتما کسی بہت ہی سخت مٹی کے بنے ہوتے ہیں۔ ۲۸ اگست کو گاندھی نے وائسرائے کو لکھا "گذشتہ شام آپ کی زبان تہدید آمیز تھی۔ بادشاہ کے نمائندہ کی حیثیت سے آپ صرف فوجی آدمی بن کر کام نہیں چلا سکتے۔ اور نہ آپ قانون کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ علی الخصوص جب قانون آپ کا اپنا بنایا ہوا ہو۔ اگر ضرورت محسوس ہو تو آپ کو اپنے بھروسہ کے ایک قانونی دماغ کی اعانت حاصل کرنی چاہیئے"۔ اس کے بعد گاندھی نے عبوری حکومت کے معاملہ میں کانگرس کے مؤقف کی پوری تفصیل پیش کر دی اور برطانیہ کی مسلسل موجودگی کے ناگوار نتائج کو بھی بیان کر دیا۔ گاندھی نے وائسرائے سے کہا کہ وہ اس کے خط کا مکمل متن برطانوی کابینہ کو تار کے ذریعہ بھیج دے۔ وائسرائے نے بڑی اطاعت شعاری سے ایسا ہی کیا۔ وزیر اعظم ایٹلی اس پر سخت پریشان ہو گیا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ "اگر گاندھی کی صوابدید میں صورتِ حال یہ ہے کہ وائسرائے کو اپنے سے زیادہ ذہین آدمی کی مدد چاہیئے اور اگر گاندھی کا یہ خیال ہے کہ بصورتِ دیگر المیہ کلکتہ کا اعادہ نہ صرف ممکن یا اغلب بلکہ یقینی ہے تو پھر اس مسئلہ کی طرف پوری سنجیدگی سے توجہ کرنی اشد

ضروری ہے۔"[49] البتہ لارڈ پیتھک لارنس کا خیال یہ تھا کہ کانگرس چونکہ اب بڑی مقتدر حیثیت کی مالک ہے اس لئے اسے مسلم لیگ سے کچھ رعایت کرنی چاہئے۔

اس واقعہ کے بعد لارڈ ویول کانگرس کی عداوت کا نشانہ بن گیا۔ لندن میں کانگرس کو جو اثر و رسوخ حاصل تھا۔ وہ اس نے پوری طرح استعمال کیا اور بالآخر چند ماہ بعد ویول کو برطرف کرانے میں کامیاب ہو گئی۔ گاندھی محض اس لئے لارڈ ویول کے خلاف نہیں ہوا کہ وہ قانونی موشگافی کو برداشت نہیں کرتا تھا یا غیر ضروری خونریزی سے سپاہیانہ نفرت کرتا تھا، بلکہ گاندھی کی مخالفت کی اصل وجہ یہ بھی کہ لارڈ ویول نے کانگرس اور مسلم لیگ میں اختلافات فیصل کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا۔ آخر وائسرائے کو یہ بات کیوں نظر نہیں آتی تھی کہ کانگرس کے نزدیک مفاہمت کی ہرگز ضرورت نہیں اور اقتدار کسی ایک فریق ہی کو تفویض کیا جانا چاہئے، چونکہ مسلم لیگ کو اقتدار نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے لامحالہ اقتدار کی باگ ڈور صرف کانگرس کے ہاتھ میں دے دینی چاہئے۔ ایک مرتبہ جب کانگرس اقتدار کی گدی پر متمکن ہو جائے گی، تو پھر کوئی اسے اتار نہیں سکے گا۔ افواج میں بھی ہندوؤں اور سکھوں کو غالب حیثیت حاصل تھی اور انتظامیہ تو تقریباً تمام تر ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ انگریزوں کی گرفت روز بروز ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی اور وہ زیادہ عرصہ تک ہند میں نہیں رہ سکتے تھے۔ برطانیہ کی جنگ سے تباہ شدہ معیشت کو بحال کرنے کے لئے انہیں اپنی ساری افرادی قوت کی اشد ضرورت تھی اور بہرحال وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی چپقلش کو روکنے کے کارنا سپاس میں برطانوی افواج استعمال کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اگر دھمکیوں اور ان کی نیک نیتی پر مسلسل حملوں سے انگریزوں کو ہٹ جانے پر آمادہ کیا جا سکے تو کانگرس کو ان آشفتہ سر مسلمانوں سے نپٹنے کا گر آتا ہے۔ جناح بلاشبہ ترغیب و تحریص سے بالاتر ہیں لیکن ایسے مسلمان لیڈروں کی کوئی کمی نہیں، جنہیں جب یہ نظر آئے گا کہ اقتدار اور جاہ و مال کے تمام ذرائع صرف کانگرس کے پاس ہیں تو انہیں بآسانی اپنے حق میں ہموار کیا جا سکے گا۔ اگر مسلمانوں کی صفوں میں پھوٹ ڈالنے سے یہ مقصد حاصل نہ ہوا تو پھر انہیں کچل کر رکھ دیا جائے گا، خواہ اس کا مطلب خانہ جنگی ہی کیوں نہ ہوا۔ انجام کار کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہو سکتا کیونکہ ہندو نہ صرف تعداد میں زیادہ ہیں، بلکہ معاشی طاقت، افواج، انتظامیہ، اور تنظیمی قوت میں بھی انہیں فوقیت حاصل ہے، مزید برآں نشر و اشاعت اور مواصلات کے ذرائع بھی پوری طرح ان کی دسترس میں ہیں۔

صرف اس پس منظر میں یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ کابینہ میں "قوم پرست" مسلمانوں کی شمولیت پر گاندھی کو اس قدر اصرار کیوں تھا؟ وہ کانگرس اور مسلم لیگ کی مخلوط حکومت کی اسقدر شدید اور مسلسل مخالفت کیوں کر رہا تھا —؟ اس نے آئینی مسائل کے بارے میں باہمی سمجھوتہ کی راہ میں روڑے اٹکانے کے لئے اتنی چالیں کیوں چلیں؟ اور اس نے وائسرائے اور برطانوی کابینہ کے خلاف اعصابی جنگ کیوں جاری رکھی؟ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب گاندھی ہندو مسلم اتحاد کو آزادی پر مقدم رکھتا تھا، لیکن اس وقت حصولِ مقصد کے لئے یہ ایک ذریعہ تھا۔ کچھ عرصہ بعد وہ صورتِ حال جاتی رہی۔ اب بھی وہ اسے زبانی خراج پیش کرتا تھا۔ لیکن اب یہ سیاسی لوازمات میں سے نہ تھا بلکہ ہندوؤں کے تسلط کی راہ میں رکاوٹ بن گیا تھا۔

نہرو اور کابینہ کے باقی ارکان نے ۲ ستمبر کو حلف اٹھائے۔ نہرو کو ایگزیکٹو کونسل کا نائب صدر مقرر کیا گیا۔ کانگرس کے نقطۂ نظر سے سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ سوائے اس بات کے کہ وائسرائے ابھی تک مسلم لیگ سے مفاہمت کرانے کے لئے کوشاں تھا۔ وائسرائے یہ محسوس کرتا تھا کہ اگر کانگرس کی نیت وہی ہے، جس کا اظہار گاندھی کے ۲۸ اگست کے خط سے ہوتا ہے، تو کانگرس کے برسرِاقتدار رہنے کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہند کے کئی علاقوں میں عملاً خانہ جنگی کی صورت پیدا ہو جائے گی"۔ ۵۰

وائسرائے کا خیال یہ تھا کہ ۱۶ مئی کے بیان پر بہ حیثیتِ مجموعی قائم رہنا بہت ضروری ہے، کیونکہ کابینہ مشن کا کبھی یہ ارادہ نہیں تھا کہ آئین سازی کا کام صرف ایک پارٹی کی اساس پر کیا جائے۔ اس نے قائد اعظم سے ۱۶ ستمبر کو اور پھر ۲۵ ستمبر کو ملاقات کی۔ قائد اعظم نے کہا کہ مسلم لیگ نے ۱۶ مئی کے بیان کو نیک نیتی سے قبول کیا تھا لیکن کانگرس نے نہیں کیا۔ انہوں نے مزید کہا "اس اعلان میں واحد ٹھوس بات گروپ بندی کا اہتمام تھا اور سکیم کو کامیابی سے چلانے کی واحد ضمانت یہ تھی کہ اس پر آبرومندانہ طور پر بطیبِ خاطر عمل درآمد کیا جائے"۔ ۵۱ آئین ساز اسمبلی میں مسلم لیگ کے شامل ہونے کا سوال آل انڈیا مسلم لیگ کے سامنے پیش کرنا ضروری ہے البتہ عبوری حکومت کے بارے میں مجلس عاملہ فیصلہ کرنے کی مجاز ہے لیکن اس میں بڑی رکاوٹ کانگرس کی طرف سے ایک "قوم پرست" مسلمان کو شامل کرنے پر اصرار ہے۔ جب اگلے دن لارڈ ویول کی گاندھی سے ملاقات ہوئی تو اس نے گاندھی سے کہا کہ وہ ایک "قوم پرست" مسلمان کو نامزد کرنے کے حق کو استعمال کرنے سے احتراز

بھی کرسکتا ہے۔ گاندھی نے اس کا جواب یہ دیا "حق کو استعمال کرنے سے تو احتراز کیا جاسکتا ہے، لیکن فرض ادا کرنے سے احتراز نہیں کیا جاسکتا"۔ یعنی "قوم پرست" مسلمانوں کی طرف سے کانگرس پر یہ واجب الادا فرض ہے۔ جب وائسرائے نے مسلم لیگ کی شمولیت کی ضرورت پر زور دیا تو گاندھی نے کہا۔ "جناح کو چاہئے کہ پنڈت نہرو سے ملاقات کی درخواست کرے اور آبرومندانہ مفاہمت کرلے۔" اگر مفاہمت کی صورت نہ نکلتی تو گاندھی آئین ساز اسمبلی کو بالائے طاق رکھ دینے کے لئے بھی تیار تھا، لیکن "خواہ کچھ بھی ہو، قومی حکومت کو جب ایک بار دعوت دی جاچکی ہے، اسے بہرحال کام جاری رکھنا چاہئے۔" ۵۲ہ

وائسرائے نے اس کے بعد بھی ذاتی بات چیت سے اور جناح اور نہرو کے ساتھ خط و کتابت کے ذریعہ مصالحت کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ عبوری حکومت میں چودہ وزیر ہوں گے۔ چھ کانگرس کے نامزد، جن میں سے ایک اچھوت نمائندہ ہوگا۔ پانچ مسلم لیگ سے ایک سکھ، ایک عیسائی اور ایک پارسی۔ ہر ایک پارٹی کو اپنے نمائندے نامزد کرنے کی پوری آزادی ہوگی۔ اقلیتوں کے نمائندوں کو بھی بڑے محکموں کا کچھ حصہ دیا جائے گا اور کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان اہم ترین محکمے مساوی طور پر تقسیم کئے جائیں گے۔ ایک مسلم لیگی وزیر کو کابینہ کی باہمی رابطہ کمیٹی کا نائب صدر نامزد کیا جائے گا۔ طویل المیعاد منصوبہ کے بارے میں وائسرائے نے کہا۔ "چونکہ کابینہ میں شمولیت کی اساس ۱۶ مئی کے بیان کی منظوری ہے، میں یہ فرض کررہا ہوں کہ اپنی بمبئی والی قرارداد کا از سر نو جائزہ لینے کے لئے لیگ کونسل کا اجلاس عنقریب منعقد کیا جائے گا" ۵۳ہ قائداعظم نے اس کا یہ جواب دیا کہ جونہی وہ مطمئن ہوجائیں گے کہ ۱۶ مئی کے بیان پر عمل ہوگا وہ اپنے فیصلہ کو منسوخ کرنے کے لئے مسلم لیگ کونسل کا اجلاس بلانے پر آمادہ ہوں گے۔

۱۴ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو قائداعظم نے لیاقت علی خان، آئی آئی چندریگر، عبدالرب نشتر، غضنفر علی خان اور جوگندر ناتھ منڈل کو مسلم لیگ کی طرف سے کابینہ کے لئے نامزد کیا۔ منڈل ایک اچھوت نمائندہ تھا اور بنگال کی مسلم لیگی وزارت کا رکن تھا۔ اس کے شامل کئے جانے کو کانگرس نے سخت برا منایا۔ کانگرس کی طرف سے اپنے نامزد ارکان میں ایک غیر لیگی مسلمان کے تقرر پر اس لئے اصرار کیا جاتا تھا کہ مسلم لیگ کی طرف سے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہونیکا جو دعویٰ کیا جاتا تھا

اسے کمزور کیا جا سکے۔ مسلم لیگ نے اپنے حصّہ میں منڈل کو شامل کرکے یہ ظاہر کر دیا کہ کانگرس کا یہ دعویٰ درست نہیں کہ وہ سارے اہلِ ہند کی نمایندگی کرتی ہے۔ اور تو اور وہ اچھوت ہندوؤں کی بھی نمایندہ نہیں۔ گاندھی اس صورتِ حال پر سخت ناخوش تھا، اس نے کہا کہ کابینہ میں مسلم لیگ کی شمولیت "سیدھے طور" سے نہیں ہوئی۔ گاندھی اور دوسرے کانگرسی لیڈروں کو اس بات کا دکھ تھا کہ مسلم لیگ اپنے حق کی بنیاد پر حکومت میں شامل ہوئی ہے۔ کانگرس کی مرہونِ منّت نہیں ہوئی اور نہ ہی اس نے کانگرس کی شرائط قبول کی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قائداعظم کے سیاسی تدبر کا یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا کہ وہ مسلم لیگ کو عبوری حکومت میں شامل کرانے میں اس شان سے کامیاب ہوئے کہ نہ خودداری پر کوئی حرف آیا اور نہ کسی اصول سے دستبردار ہوئے۔ ۱۵ر اکتوبر کو ایک اخباری بیان میں ایگزیکٹو کونسل کی از سرِ نو تشکیل کا اعلان کر دیا گیا۔ محکموں کی تقسیم کا مسئلہ بعد میں طے کیا جانا تھا۔

جس دوران میں مسلم لیگ کے نمایندوں کو عبوری حکومت میں شامل کرنے کے لئے مذاکرات ہو رہے تھے۔ ایک ایسا واقعہ رونما ہوا، جس نے سیاسی صورتِ حال پر تو کوئی نقش نہ چھوڑا، لیکن اس نے گاندھی اور کانگرس کی باقی ہیئتِ حاکمہ کے مابین تعلقات میں ایک قابلِ ذکر تبدیلی کو عیاں کر دیا۔ اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں نواب بھوپال، جن کے گاندھی سے دوستانہ مراسم تھے، گاندھی کی دعوت پر دہلی آئے اور انہوں نے کانگرس اور مسلم لیگ میں تصفیہ کے لئے بات چیت شروع کی۔ قائداعظم اور گاندھی کی ملاقات کا انتظام کیا گیا، اور کانگرس اور لیگ کے درمیان مصالحت کے لئے ایک فارمولا طے کیا گیا جس سے قائداعظم اور گاندھی دونوں نے اتفاق کر لیا۔ اس فارمولا کی عبارت یوں تھی:۔

> "کانگرس اس بات پر معترض نہیں، بلکہ اسے قبول کرتی ہے کہ اب مسلم لیگ ہی ہند کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت کی مُستند نمایندہ جماعت ہے اس حقیقت کے پیشِ نظر اور جمہوری اصولوں کے مطابق صرف مسلم لیگ ہی مسلمانانِ ہند کی نمایندگی کرنے کی بلا شک و شبہ حق دار ہے۔ لیکن کانگرس اپنے نمایندے منتخب کرنے کے حق پر کسی حد یا پابندی کو قبول نہیں کر سکتی وہ اپنے ارکان میں سے اپنی پسند کے نمایندے چُننے کی پوری طرح مجاز ہے۔"

جب نہرو اور پٹیل نے یہ فارمولا دیکھا، تو وہ اور کانگرس ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ارکان سخت جز بز ہوتے۔ گاندھی کے خلاف بڑی لے دے ہوئی اور نہرو نے ۸، اکتوبر کو قائدِ اعظم کو خط لکھا۔ "جیساکہ میں آپ کو بتا چکا ہوں، میں نے اور میرے ساتھیوں نے اس فارمولے کو منظور نہیں کیا، جس پر گاندھی جی اور آپ کے درمیان اتفاقِ رائے ہوا ہے"۔ یہ بھی دعویٰ کیا گیا کہ اس فارمولا میں ایک اور بیرا بھی تھا یعنی "یہ قرار پایا ہے کہ عبوری حکومت میں تمام وزیر سارے ہند کی فلاح و بہبود کے لئے ایک ٹیم کی طرح کام کریں گے، اور کسی حالت اور صورت میں بھی گورنر جنرل کو مداخلت کے لئے دعوت نہیں دیں گے"۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جس فارمولے پر قائدِ اعظم اور گاندھی نے دستخط کئے تھے۔ اس میں یہ بیرا شامل نہیں تھا، بلکہ اس پر مزید غور اور تبادلۂ خیالات ہونا تھا۔

ربع صدی سے بھی زاید عرصہ میں یہ پہلا موقع تھا کہ کانگرس ورکنگ کمیٹی نے گاندھی کی منشا حیثیت کو چیلنج کیا، اور اس کے عہد و پیمان کو مسترد کر دیا۔ اس میں نہرو، پٹیل اور ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ارکان غلطی پر تھے۔ ذہنی صلاحیت اور سیاسی بصیرت میں گاندھی ان سے بدرجہا فائق تھا۔ اور ان کے اقدامات و جذبات کی محدود جولان گاہ سے گاندھی کا دائرۂ حرکت و عمل بہت زیادہ وسیع تھا۔ سیاسی مخالفین پر اس کے سخت ترین حملے بھی بالعموم محبت اور پریم کی زبان میں نمودار ہوتے تھے۔ اسے اس کمال درجہ کا ضبطِ نفس حاصل تھا کہ وہ ایک ہی لمحے میں جنگ کے میدان سے صلح کی فضا میں قدم رکھنے پر قادر تھا۔ گاندھی نے اپنی طرف سے انتہائی کوشش کی تھی کہ مسلم لیگ کو شریک اقتدار ہونے نہ دیا جائے۔ لیکن وائسرائے سے حالیہ ملاقاتوں میں اسے پختہ یقین ہو گیا تھا کہ وائسرائے نے مسلم لیگ کو عبوری کابینہ میں لانے کا پختہ عزم کر رکھا ہے۔ اس لئے کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ مسلم لیگ کو وائسرائے کی عنایت کے بجائے کانگرس کی رضا و رغبت سے حکومت میں لایا جائے؟ جہاں جدال ناکام ہوا ہے۔ کیا وہاں لطف و مروت سے فتح حاصل نہیں ہو سکتی؟ کیوں نہ مسلم لیگ کو تسلیم کر لیا جائے، اور اس کے شک و شبہ کی ڈھال کو بے کار کر دیا جائے؟ لیکن کانگرس ورکنگ کمیٹی کے ارکان میں مسلم لیگ کی مخالفت کی عادت پختہ ہو گئی تھی اور وہ اپنے استاد کی سی ذہنی لوچ اور لچک دار حکمتِ عملی سے عاری تھے۔

اس زمانہ میں کانگرسی حلقوں میں اکثر یہ بات کہی جاتی تھی کہ بڑے میاں اس خبط میں

مبتلا ہیں کہ تاریخ میں ان کا مقام گوتم بدھ ثانی کا ہو۔ گاندھی نے ندامت کا لباس اوڑھا، توبہ کی راکھ سر پر ڈالی اور اپنی پوجا کے جلسے میں کہا کہ "تین دن پہلے مجھ سے جو غلطی ہوئی میں اسے بیان کرنے کی بڑی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ میں اس پر حد درجہ نادم ہوں۔ اس اعتراف سے اگرچہ میرے ذہن سے بار اُتر جائے گا، لیکن اپنے آپ پر اعتماد بحال کرنے میں کافی وقت لگے گا"۔ اب کانگرس کا جہاز مملکت کی بندرگاہ میں صحیح سلامت لنگر انداز ہو چکا تھا، جس ناخدا نے عوامی تحریک اور سول نافرمانی کے مانوس سمندروں میں اس کی رہنمائی کی تھی تاکہ وہ بے قابو تشدد یا افسردگی اور مایوسی کی چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش نہ ہو جائے، اب اسے چپکے سے برطرف کر دیا گیا۔ گاندھی نے خود بھی محسوس کیا کہ اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی اور وہ جلد ہی مشرقی بنگال میں دُور افتادہ نواکھلی میں چلا گیا، جہاں کلکتہ کے قتلِ عام کے نتیجے میں فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے تھے۔ کانگرس میں اس کے بعد پھر کبھی گاندھی مطلق اختیار استعمال نہ کر سکا۔ برسرِ اقتدار افراد، نہرو اور پٹیل اب سٹیج کے عین مرکز میں متمکن تھے اور اگرچہ وہ گاندھی سے اظہارِ عقیدت کرتے رہتے تھے لیکن وہ اس سے مشورہ بلکہ اسے مطلع کئے بغیر اپنے آپ کو نہایت اہم فیصلے کرنے کے اہل سمجھتے تھے۔

باب ۴

عبوری حکومت

مسلم لیگ عبوری حکومت میں کانگرس کی خواہشات کے علی الرغم شامل ہوئی۔ کانگرسی قیادت نے اپنے زعمِ برتری سے حب الوطنی کی اجارہ داری کے دعووں سے اور ہر دوسری تنظیم کی خودداری اور عزتِ نفس کو تباہ کرنے کی مسلسل کوششوں سے تعاون کے امکانات کو خود ہی زائل کر دیا تھا۔

عبوری کابینہ میں مسلم لیگ اور کانگرس کی رفاقت آغاز ہی سے خالی از خلل نہ تھی۔ چنانچہ محکموں کی تقسیم کے مسئلہ پر نبرد آزمائی شروع ہوئی۔ وائسرائے نے اہم محکموں کو مساوی اور منصفانہ طور پر تقسیم کرنے کا وعدہ کر رکھا تھا، اس نے "زور دیا کہ تین بڑے محکموں، امورِ خارجہ، دفاع اور امورِ داخلہ میں سے ایک لیگ کو دے دیا جائے۔ نہرو نے اس حجت کی بناء پر انکار کر دیا کہ اس سے ملک میں بے اطمینانی پیدا ہوگی، اور جب ویول نے اصرار کیا تو اس نے مستعفی ہونے کی دھمکی دے دی"[1] امورِ خارجہ کا محکمہ نہرو کے پاس تھا، امورِ داخلہ کا محکمہ پٹیل کو اور دفاع کا محکمہ بلدیو سنگھ کو دیا گیا تھا۔ لیگ یہ چاہتی تھی کہ اسے امورِ داخلہ یا دفاع کا محکمہ ملے۔ پٹیل جو "جانشینی کی جنگ" میں ملک کے داخلی محافظوں یعنی پولیس کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا تھا، اس نے اس تجویز کی شدید مخالفت کی اور کہہ دیا کہ "امورِ داخلہ کے محکمے سے دستبردار ہونے پر:

حکومت سے علیحدگی کو ترجیح دے گا"۔ ۲۔ بلدیو سنگھ بھی محکمہ دفاع سے اسی طرح سختی سے چمٹا رہا۔ ہند کی افواج میں سکھوں کو جو خاص حیثیت حاصل تھی اور مسلم لیگ کے خلاف کانگرس اور سکھوں کے درمیان جو گٹھ جوڑ ہو رہا تھا، اس کی وجہ سے کانگرس نے بھی اس کی تائید کی۔ پھر کانگرسی لیڈروں کو یہ سوجھی کہ مسلم لیگ کو محکمہ خزانہ پیش کر دیا جائے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ "چونکہ یہ فنی نوعیت کا مسئلہ ہے، لیگ اس پیش کش کو مسترد کر دے گی۔ اگر ایسا ہوا تو کانگرس کچھ بھی نہیں کھوئے گی۔ اس کے برعکس اگر لیگ کے نامزد وزیر نے محکمہ خزانہ کو قبول کر لیا، تو بہت جلد وہ اپنی نااہلی سے خود اپنا مذاق اڑائے گا۔ ہر دو صورتوں میں فائدہ کانگرس کو ہی پہنچے گا"۔ ۳۔ یہ بلند خیالی پٹیل کو پسند آئی اور اس نے اس تجویز کی پُر زور حمایت کی۔ وائسرائے کو مطلع کیا گیا کہ کانگرس مسلم لیگ کو محکمہ خزانہ کی پیشکش کرتی ہے۔

جون ۱۹۴۶ء میں جب پہلے پہل عبوری حکومت کے قیام نے امکانی صورت اختیار کی تھی، تو قائد اعظم نے لیگ کے لیے محکموں کے مسئلہ پر مجھ سے مشورہ کیا تھا۔ وہ خود امور داخلہ اور دفاع کو ترجیح دیتے تھے۔ میں نے یہ رائے دی کہ امن و امان اور پولیس صوبائی دائرہ اختیار میں ہیں، اور ان پر مرکزی حکومت بہت کم اثر انداز ہو سکتی ہے۔ کانگرسی صوبے مسلم لیگی وزیر داخلہ کو خاطر میں نہیں لائیں گے اور مسلم لیگ کی صوبائی حکومتوں کو اس کی رہنمائی کی خاص ضرورت نہیں ہو گی۔ میں نے کہا کہ دفاع کا محکمہ یقیناً ایسا ہے کہ اسے حاصل کرنا مفید مطلب ہو گا۔ لیکن اگر لیگ حکومت کے ہر شعبہ کی پالیسیوں پر اثر انداز ہونا چاہتی ہے، تو پھر اسے خزانے کے محکمے کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہیے۔ اس وقت میں انہیں محکمہ خزانہ کی کلیدی اہمیت کا قائل نہ کر سکا۔ لیکن اب ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ خزانہ کا محکمہ لیگ پر عملاً ٹھونسا جا رہا تھا۔ جب مجھے دوبارہ بلایا گیا، تو میں نے اور بھی زور سے اپنے مشورہ کا اعادہ کیا۔ لیاقت علی خان جنہیں کابینہ میں مسلم لیگ کے اعلیٰ نمائندہ کی حیثیت سے خزانہ کا محکمہ سنبھالنا تھا، بہت متذبذب تھے۔ میں نے انہیں اپنی خدمات پیش کیں، اور انہیں اور قائد اعظم کو یقین دلایا کہ خزانہ کا محکمہ سنبھالنے سے یقیناً کامیابی حاصل ہو گی۔ چنانچہ یہ تجویز منظور کر لی گئی اور لیاقت علی خان وزیر خزانہ بن گئے۔ اس کے بعد میں کابینہ میں مسلم لیگ بلاک کے غیر سرکاری مشیر کے طور پر خدمات سرانجام دیتا رہا۔ یہ کوئی خلاف معمول بات نہیں تھی، کیونکہ کئی اعلیٰ ہندو افسر بھی کانگرس بلاک کے لیے اسی حیثیت میں کام کر رہے تھے۔ ابوالکلام آزاد کے مطابق "کانگرس نے بہت جلد محسوس کیا کہ مسلم لیگ کی تحویل میں خزانہ دے کر اس نے بڑی فاش غلطی کا ارتکاب کیا ہے"۔ ۴۔

مسلم لیگ کو جو دوسرے محکمے تفویض کیے گئے، ان کی تفصیل یہ ہے۔ تجارت: آئی آئی چندریگر کو۔ مواصلات: ڈاک اور سول فضائیہ، عبدالرب نشتر کو۔ صحت، غضنفر علی خاں کو اور قانون سازی جوگندر ناتھ منڈل کو۔ کابینہ کی از سرِ نو تشکیل کے بعد باقی محکمے یوں تقسیم کیے گئے۔ جواہر لال نہرو (امورِ خارجہ اور تعلقات دولتِ مشترکہ) ولبھ بھائی پٹیل (امورِ داخلہ، اطلاعات اور نشریات) راجندر پرشاد (خوراک اور زراعت) سی راج گوپال اچاریہ (تعلیم اور فنونِ لطیفہ) آصف علی (نقل و حمل اور ریلوے) جگ جیون رام (محنت) آصف علی کی جگہ جلد ہی ابوالکلام آزاد کو مقرر کر دیا گیا، انہیں تعلیم اور فنونِ لطیفہ کے محکمے دیے گئے اور نقل و حمل اور ریلوے کے محکمے راجگوپال اچاریہ کو منتقل کر دیے گئے۔ اچھوت وزیر جگ جیون رام سمیت چھ کانگرسی نمائندے تھے۔ دوسری اقلیتوں کے نمائندے یہ تھے، بلدیو سنگھ (سکھ) جس کے پاس دفاع کا محکمہ تھا۔ جان متھائی (عیسائی) جسے صنعت اور رسد کا محکمہ دیا گیا اور بھابھا (پارسی) جسے تعمیرات، معادن اور برقی طاقت کے شعبے دیے گئے۔

ہر چند کہ کانگرس کو لیگ سے بدگمانی بھی تھی اور عداوت بھی۔ تاہم اس کی یہ خواہش بھی تھی کہ نہرو کو ساری کابینہ کا لیڈر تسلیم کیا جائے۔ مسلم لیگ نے یہ بات منظور کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ایک پریس کانفرنس میں لیاقت علی خان نے واضح کر دیا کہ "نہرو حکومت میں کانگرس بلاک کے سوا کسی دوسرے کا لیڈر نہیں ہے"۔ ۵ اگرچہ آئینی اعتبار سے انہوں نے کابینہ کی اجتماعی یا مشترکہ ذمہ داری کو تسلیم نہیں کیا لیکن یہ وضاحت کر دی کہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہند کے تمام لوگوں کے مفاد اور بہبود میں مسلم لیگی وزیر کابینہ کے رفقائے کار کے ساتھ ہم آہنگی اور تعاون سے کام کریں گے۔

اتحاد اور تعاون کی یقیناً ضرورت تھی، کیونکہ فرقہ وارانہ فسادات کا دائرہ پھیلتا جا رہا تھا۔ اکتوبر کے دوسرے حصہ میں مشرقی بنگال کے اضلاع نواکھالی اور تپیرہ کے بعض علاقوں میں جہاں مسلمان اکثریت میں تھے فساد رونما ہوا۔ علاقہ کا معائنہ کرنے کے بعد گورنر (سر فریڈرک بروز) اس نتیجہ پر پہنچا کہ "مسلمانوں نے ہندوؤں کے خلاف عام شورش نہیں کی۔ بلکہ فسادات کا موجب غنڈوں کا ایک گروہ ہے جس نے موجودہ فرقہ وارانہ جذبات سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے اور...... جگہ جگہ آوارہ مسلمان فسادی بھی ان سے مل گئے ہیں"۔ ۶ جنرل آفیسر کمانڈنگ ان چیف لیفٹیننٹ جنرل سر فرانسس ٹکر کا اندازہ یہ تھا کہ "اس حادثہ میں مقتولین کی تعداد تین سو سے کافی کم تھی مگر ہندو پریس نے دیوانہ وار جھوٹی من گھڑت اور وحشت انگیز

خبریں ساری دنیا میں پھیلا دیں۔ ان فسانہ طرازیوں نے بہار اور صوبجات متحدہ کے ہندوؤں میں آتشِ انتقام بھڑکا کر ہند میں بے اندازہ نقصان کیا" ؎

نومبر کے پہلے ہفتے میں بہار میں باقاعدہ منصوبہ کے تحت مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہو گیا :-

"۱۹۴۶ء میں جو وحشت انگیز واقعات ہوئے، ان میں قتل و غارت کا یہ سلسلہ سب سے زیادہ ہولناک تھا۔ اس کا سخت بزدلانہ اور کمینہ پہلو یہ تھا کہ ہندوؤں کے جمِ غفیر قتل و غارت کے لیے پوری طرح تیار ہو کر ان مٹھی بھر مسلمانوں پر پل پڑتے ہیں، جو اپنے آباؤ اجداد کے زمانے سے انہی ہندوؤں کی ہمسائیگی میں امن و امان کی زندگی بسر کرتے آرہے تھے ...... اس چند روزہ وحشیانہ قتلِ عام میں جو مسلمان مرد، عورتیں اور بچے موت کے گھاٹ اتارے گئے، ان کی تعداد سات ہزار سے آٹھ ہزار تک تھی" ؎

کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کے لیڈروں نے اس ظلم و تشدد کی بڑے سخت الفاظ میں مذمت کی۔ اور عوام کو پوری دردمندی سے نصیحت کی کہ وہ امن و آشتی بحال کریں اور انتقامی کارروائیوں سے احتراز کریں وائسرائے اور مرکزی حکومت کے چار وزیروں نہرو، پٹیل، لیاقت علی خاں اور عبدالرب نشتر نے کلکتہ اور بہار کا دورہ کیا۔ "پنڈت نہرو اور سردار نشتر نے چند دن وہاں قیام کیا۔ انہوں نے بہت پرزور اور موثر تقریریں کیں ان میں کسی نے بھی اپنے فرقے کے ان لوگوں سے نفرت اور بیزاری کے اظہار میں تامل نہیں کیا، جنہوں نے بنگال اور بہار کے دامن پر بدنامی اور رسوائی کا داغ لگایا تھا" ؎

گاندھی نواکھالی جاتے ہوئے ابھی کلکتہ میں ہی تھا، جب بہار میں مسلمانوں کے قتلِ عام کی خبریں موصول ہو گئیں۔ بہار کے کانگرسی مسلمانوں کی طرف سے گاندھی کو بڑی دردمندانہ اپیلیں کی گئیں کہ وہ اس صوبے کا دورہ کرے، اور قتل و غارت کے جنون سے بدمست ہندو اکثریت پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کرے، اس نے بہار کے بارے میں صرف ایک اپیل جاری کرنے پر اکتفا کیا، اور نواکھالی چلا گیا، جہاں اس نے ہندو تارکین کو تسلی دینے اور دوبارہ اپنے گھروں میں آباد کرنے میں چار ماہ بسر کیے۔ حالانکہ جب وہ ۶، نومبر کو عازم نواکھالی ہوا تھا، اس وقت وہاں امن بحال ہو چکا تھا۔ لیکن بہار میں آگ لگی ہوئی تھی۔ نواکھالی میں گاندھی کی سرگرمیوں پر بہار کے ایک مسلمان لیڈر نے یہ تبصرہ کیا تھا" کیوں ......: مسٹر گاندھی نے نواکھالی میں اپنے قیام کو غیر معین طول دیا اور ...... اور روزانہ دو یا تین میل کے پیدل دورہ کا مضحکہ خیز طریقہ اختیار کیا،

یہ ایک ایسا سوال ہے ...... جس کا جواب دینا آسان نہیں ہے" [۱۰]

جب مارچ ۱۹۴۷ء میں گاندھی کو بالآخر بہار کا دورہ کرنے پر آمادہ کر لیا گیا، تو اس کی آنکھیں کھلیں اس صوبے کی کانگرسی وزارت ٹال مٹول سے کام لے رہی تھی اور کوئی شرم و ندامت محسوس نہیں کرتی تھی جنرل ٹکر نے لکھا کہ "بہار کے افسر اس بات پر سخت حیرت زدہ ہوتے تھے کہ ہندو وزیر ظلم و تشدد کی ان ہولناک داستانوں کو، جن میں اکثر و بیشتر درست ہوتی تھیں، کس قدر اطمینان و سکون سے سنتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان کا دل کسی حادثے سے دہل نہیں سکتا" [۱۱] ہندو وزیر یہ دعویٰ کرتے تھے کہ جو کچھ وہ کر سکتے تھے انہوں نے کیا ہے، لیکن جب گاندھی نے کہا کہ ابھی تک کوئی تحقیقاتی کمیشن نہیں قائم کیا گیا ہے، تو کانگرس وزیر اعلیٰ سری کرشنا سنہا نے یہ خدشہ ظاہر کیا کہ مسلم لیگ اس سے سیاسی فائدہ اٹھائے گی۔

گاندھی بھی دوسرے ہندوؤں کی طرح ہمیشہ اس عام تصور میں یقین رکھتا تھا کہ ہندو بڑا نرم دل ہوتا ہے اور طبعاً اور روایتاً جنگجو نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس ہندوؤں کی نگاہ میں مسلمان اپنی خوراک اور تربیت کی بدولت مائل بہ تشدد ہوتا ہے۔ ہر فرقہ وارانہ فساد میں ہندو ہمیشہ مسلمانوں کو قصوروار ٹھیراتے تھے لیکن اب ہندو کی نرم دلی کا تصور پارہ پارہ ہو چکا تھا۔ بہار کے شواہد اتنے قوی تھے کہ کوئی بھی موہوم تصورات کی آغوش میں پناہ نہیں لے سکتا تھا۔ پیارے لال کی کتاب "مہاتما گاندھی ـــ آخری دور" میں گاندھی کے دورہ بہار سے متعلق باب کا عنوان بہت ہی موزوں اور حسب حال ہے ـــ "نقاب اترنے کے بعد" اس میں وہ لکھتا ہے کہ "۱۹۴۶ء میں بہار کے فسادات نے غیر منقسم ہند کے خواب کو قطعی طور پر ختم کر دیا" [۱۲] ان فسادات نے گاندھی کے اس موروثی اعتقاد کو بھی پاش پاش کر دیا کہ ہندو طبعاً صلح پسند ہوتا ہے۔ اس کے بعد گاندھی میں بڑی نمایاں تبدیلی واقع ہوئی، اس سے پہلے ہر فرقہ وارانہ فساد میں گاندھی کو سب سے زیادہ فکر ہندوؤں کو بچانے کی ہوتی تھی۔ اب وہ مسلمانوں کی حفاظت کے لیے بھی فکر مند ہو گیا اگرچہ اس کے بعد بھی وہ سارے ہند پر ہندوؤں کے سیاسی غلبے کے لیے کوشاں رہا، لیکن اس نے خونریزی کو روکنے کے لیے بڑے اخلاص سے کوششیں کیں۔ انسانی ہمدردی کے جذبہ نے اس کی روح کی گہرائیوں کو مضطرب کر دیا، اور اسی جذبے کی خاطر اسے اپنی جان بھی نثار کرنی پڑی۔

بہار میں وحشیانہ قتل عام کے چند ہی دن بعد نومبر میں صوبجات متحدہ کے مقام گڑھ مکتیسر میں بھی مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ یہاں ہر سال ہندوؤں کا ایک میلہ لگتا ہے۔ میلے میں کئی مسلمان

دکانداروں پر جو اطمینان سے اپنے کاروبار میں مصروف تھے، یک لخت بھرپور حملہ کر دیا گیا۔ جنرل ٹکر نے لکھا ہے:

> "تقریباً ہر مسلمان مرد، عورت اور بچے کو روح فرسا ظلم کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا...... کسی نے بہ عجلت تمام اس قتل عام پر سنسر شپ کا سخت اور مضبوط پردہ ڈال دیا، جس کی وجہ سے اس کی کوئی اطلاع باہر کی دنیا تک نہ پہنچ سکی۔ صوبائی حکومت نے ہندو افسروں کی رضا کارانہ مدد سے ہندوؤں کے اس ظلم و ستم کو نمایاں نہیں ہونے دیا۔ اور ہندو اخبارات نے اس علاقہ میں مسلمانوں کی خفیف سے خفیف انتقامی کارروائی کو بھی دیدہ دانستہ بہت اچھالا تاکہ اپنے ہندو ہم مذہبوں کے اعمالِ بد پر پردہ ڈالا جا سکے...... صوبجات متحدہ کے وزیر اعلیٰ پنڈت پنت نے بعد میں صوبائی اسمبلی میں اعلان کیا کہ اس سانحہ کی عدالتی تحقیقات کرائی جائے گی۔ لیکن اس کی کبھی نوبت نہیں آئی"۔[۱۱]

ہند کے طول و عرض میں کشیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کشیدگی کا اثر اس کشمکش پر بھی پڑا۔ جو مرکزی حکومت میں کانگرس اور مسلم لیگ کے بلاکوں میں جاری تھی۔ ہر بڑے مسئلہ پر دونوں بلاکوں میں علیحدہ علیحدہ مشورہ ہوتا تھا۔ مسلم لیگی وزیر قابل افراد تھے، اور اپنے محکموں کا انتظام بڑی اہمیت کے ساتھ کر رہے تھے۔ وہ اپنی آزادیٔ فیصلہ کو برقرار رکھنے کا مصمم ارادہ کر چکے تھے، اور کسی عنوان نہرو کے اس ادعا کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ وہ بالفعل وزیر اعظم ہے۔ قائد اعظم نے واضح کر دیا تھا کہ نہرو محض" وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں امور خارجہ کا وزیر ہے"۔

اکتوبر کے آخری دو ہفتوں میں نہرو نے وزیر امور خارجہ کی حیثیت سے شمال مغربی سرحدی صوبہ اور قبائلی علاقوں کا دورہ کیا۔ اس وقت ڈاکٹر خان صاحب کے تحت شمال مغربی سرحدی صوبہ میں کانگرسی وزارت برسر اقتدار تھی، اور نہرو کو پورا یقین تھا کہ اس کا پرتپاک استقبال کیا جائے گا۔ اس کا استقبال واقعی گرما گرم ہوا۔ لیکن وہ گرمی کچھ اور نوع کی تھی۔ اس کی پیشوائی کالی جھنڈیوں بلکہ اس سے بھی بدتر طریق سے کی گئی۔ سنہ ۱۹۴۶ء کے دوران میں شمال مغربی سرحدی صوبہ کی رائے عامہ میں بہت بڑی تبدیلی آچکی تھی۔ اور مسلمانوں کی اکثریت مسلم لیگ کے گرد جمع ہو چکی تھی۔ سرخپوش لیڈر عبد الغفار خان کے پیرو کار ابھی کافی تعداد میں تھے لیکن عام لوگوں پر اس کے اثر و رسوخ کی گرفت ڈھیلی ہوتی جا رہی تھی۔ ابوالکلام آزاد نے

اس تبدیلی کو خان برادران ـــــ ڈاکٹر خانصاحب اور عبدالغفار ـــــ کی کنجوسی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ "عام انتخابات کے دوران میں کانگرس نے بڑی خطیر رقوم خان برادران کی تحویل میں دی تھیں، لیکن انہوں نے ان رقوم میں سے حتی الامکان کم سے کم خرچ کیا۔ انتخابات میں بہت سے امیدوار اس لیے ہار گئے، کہ انہیں کافی یا بروقت مدد نہ مل سکی۔ بعد میں جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ کثیر رقوم بیکار پڑی رہ گئی ہیں، تو وہ خان برادران کے شدید دشمن بن گئے" [۱۴]۔ ہندو بھی یہ دیکھ دیکھ کر کبیدہ خاطر ہو چکے تھے کہ ان کا روپیہ سرخپوش لیڈر کی تجوریوں میں غائب ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کی حرص، کنجوسی اور کنبہ پروری ـــــ صوبے کے دونوں مسلم وزیر اس کے رشتہ دار تھے ـــــ رائے عامہ کی اس تبدیلی کا محض ایک رُخ ہے۔ اصل اسباب اس کے بہت گہرے تھے۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ میں مسلمانوں کی آبادی ۹۲ فیصد تھی۔ مقامی ہندو ان کے لیے کسی طرح بھی خطرے کا باعث نہیں بن سکتے تھے۔ یہاں مسلمانوں کی اصلی جنگ برطانوی راج کے خلاف تھی۔ آباد اضلاع سے عین متصل قبائلی علاقوں کی تقریباً ساری آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی، اور ان میں اپنی آزادی برقرار رکھنے کا شدید جذبہ تھا۔ انگریزوں نے انہیں مطیع کرنے کے لیے کئی فوجی مہمیں روانہ کیں۔ لیکن کبھی کامیاب نہ ہوئے۔ جب تک یہ حالت رہی، باقی ہند میں آئینی جدوجہد اس علاقہ کے لوگوں کی نظروں میں کماحقہٗ اہمیت حاصل نہ کر سکی۔ لیکن انگریزوں کے اخراج کی توقع نے ایک بالکل نئی صورتِ حال پیدا کر دی۔ اگر ہندوؤں کے عزائم کامیاب ہو جائیں، تو پھر سارے برِ صغیر میں ہندو ہی انگریزوں کے جانشین ہوں گے اور انگریزوں کے سب اختیارات ان کے ہاتھ میں چلے جائیں گے۔ برطانوی راج کی جگہ ہندو راج ہو گا۔ جواہر لال نہرو کے شمال مغربی سرحدی صوبہ کے دورے نے حکمرانوں کی اس تبدیلی کو مرئی صورت میں عوام کے سامنے پیش کر دیا چنانچہ صوبے کے لوگوں کا ردِ عمل اسی احساس کا آئینہ دار تھا۔ "نہرو نے ہر جگہ یہ دیکھا کہ عوام کا ایک وسیع طبقہ اس کے خلاف ہے ..... بعض مقامات پر اس کی کار پر پتھراؤ کیا گیا اور ایک مرتبہ تو جواہر لال کی پیشانی پر چوٹ آئی۔ ڈاکٹر خان صاحب اور اس کے ساتھی اس قدر بے بس نظر آتے تھے کہ جواہر لال نے صورتِ حال کو خود ہی سنبھالا" [۱۵]۔

آئین ساز اسمبلی کے اجلاس کے لیے سردست ۹ دسمبر کی تاریخ مقرر کی گئی تھی۔ کانگرس کی طرف سے وائسرائے پر زور دیا جا رہا تھا کہ وہ اسمبلی کا اجلاس بلائے اور مسلم لیگ کی شمولیت کا بھی حتمی بندوبست کرے۔ اور اگر مسلم لیگ آئین ساز اسمبلی میں آنے سے انکار کر دے، تو کابینہ سے مسلم لیگی وزیروں کو

باہر نکال دیا جائے۔ کانگرس ابھی تک ۱۶ر مئی کے بیان کی اپنی من گھڑت تاویل پر اصرار کر رہی تھی ایسی ہے جب تک صوبوں کی گروپ بندی اور آئین ساز اسمبلی میں طریق کار کے بارے میں کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان سمجھوتہ نہ ہو جاتا، اسمبلی کا اجلاس بلانا نہ صرف بیکار تھا بلکہ خطرہ سے بھی خالی نہ تھا، کیونکہ اسمبلی میں تند و تیز بحث و مباحثہ فرقہ وارانہ فساد کی اس آگ پر تیل چھڑک دیتا جو ملک بھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ جب نومبر میں وائسرائے نے اس مسئلہ کے بارے میں جناح کو خط لکھا، تو انہوں نے کہا کہ کانگرس نے کبھی ۱۶ر مئی کے بیان کو منظور نہیں کیا، اور وائسرائے کو کانگرسی لیڈروں کے ان حالیہ اقدامات کی طرف متوجہ کیا، جن سے ان کی نام نہاد منظوری بالکل منسوخ ہو جاتی تھی۔ مثلاً نہرو نے آسام کے وزیر اعلیٰ گوپی ناتھ باردولائی کو لکھا کہ "گروپ بندی اور اپنے آئین دونوں کے بارے میں ہر صوبے کو خود فیصلہ کرنا ہے اور ہم کسی طور اس بات پر رضامند نہیں ہو سکتے کہ آسام جیسے صوبے کو اس کی مرضی کے خلاف کسی اقدام پر مجبور کیا جائے"۔ اور ۲۳ر اکتوبر کو گاندھی نے پھر وہ تعبیر قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا جو کابینہ مشن نے خود اپنے منصوبہ کے بارے میں کی تھی۔ گاندھی نے کہا تھا کہ "کوئی بھی قانون ساز اپنے قانون کی مستند تعبیر نہیں کر سکتا"۔ قائد اعظم یہ محسوس کرتے تھے کہ "ہندوستان کے مختلف حصوں میں وسیع پیمانے پر باقاعدہ منصوبے کے تحت قتل و غارت سے چونکہ ازحد نازک اور فتنہ انگیز فضا پیدا ہو گئی ہے اس لیے آئین ساز اسمبلی کا اجلاس بلانا نہ مناسب ہے اور نہ ممکن" ان حالات میں امن کے قیام اور تارکین وطن کی بحالی پر تمام مساعی مرکوز کر دینی چاہئیں[16]

اس مشورے کے باوجود، جب وائسرائے اور برطانوی حکومت نے آئین ساز اسمبلی کا اجلاس ۹ر دسمبر کو بلانے کا فیصلہ کیا، تو قائد اعظم نے اسے "بڑی شدید اور خطرناک غلطی" قرار دیا۔ انہوں نے وائسرائے پر الزام لگایا کہ "وہ کانگرس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن گیا ہے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر وہ مسلم لیگ اور دوسری تنظیموں اور قومی زندگی کے دیگر عناصر کو بالکل نظرانداز کر رہا ہے"۔ قائد اعظم نے اپنے بیان میں صاف کہہ دیا کہ مسلم لیگ کا کوئی نمائندہ آئین ساز اسمبلی کی کارروائی میں شریک نہیں ہو گا[17]

اس پر وائسرائے نے لیاقت علی خان سے کہا کہ اگر لیگ آئین ساز اسمبلی میں شامل نہ ہوئی تو پھر اس کے نمائندے عبوری حکومت میں نہیں رہ سکیں گے۔ اس کا جواب لیاقت علی خان نے یہ دیا کہ ۱۶ر مئی کے بیان کی اساس کے بارے میں واضح سمجھوتے کے بغیر وہ آئین ساز اسمبلی میں شریک ہونے پر حکومت سے باہر نکل جانے کو ترجیح دیں گے۔ وائسرائے تو محض کانگرس کے مطالبات کی صدائے بازگشت بنا ہوا تھا کہ مسلم لیگ کو آئین ساز اسمبلی میں شریک ہونے یا حکومت سے علیحدہ ہو جانے پر

مجبور کیا جا سکے۔ وی۔پی مینن نے اس صورتِ حال کا لبِ لباب یوں بیان کیا ہے :۔

"بالآخر ہر بات کا انحصار متعلقہ فریقوں میں سمجھوتے پر تھا۔ کانگرس سارے ہند کے لیے مسلم لیگ کے بغیر آئین نہیں بنا سکتی تھی، اور نہ مسلم لیگ آسام یا حصّہ ب اور ج کے کسی اور صوبے پر کانگرس کی مرضی کے خلاف آئین ٹھونس سکتی تھی۔ سمجھوتہ نہ ہونے کا نتیجہ خانہ جنگی تھی جو اغلباً مسلمانوں کے لیے تباہ کن ہوتی اور ہند کی افواج کا شیرازہ توڑ دیتی۔ اور نہ ہی انگریز غیر معین عرصے کے لیے ہند میں رہ سکتے تھے تا آنکہ فریقین میں سمجھوتہ ہو جائے۔" [۵۱]

برطانوی حکومت نے ۱۶ مئی کے بیان پر سمجھوتہ کرانے کے لیے ایک آخری کوشش کرنے کا فیصلہ کیا، اور وائسرائے، کانگرس اور مسلم لیگ کے دو دو نمائندوں اور ایک سکھ نمائندے کو لندن آنے کی دعوت دی۔ پہلے تو نہرو نے انکار کر دیا لیکن پھر اسے جانے پر آمادہ کر لیا گیا۔ ۲ دسمبر کو لارڈ ویول انگلستان پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ نہرو، جناح، لیاقت علی خان اور بلدیو سنگھ بھی تھے۔ برطانوی حکومت کے ساتھ مذاکرات کا سلسلہ چار دن تک جاری رہا۔

مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان بنیادی اختلافات آئین ساز اسمبلی کے اختیارات اور صوبوں کی گروپ بندی کے بارے میں تھے۔ قائد اعظم کا موقف یہ تھا کہ آئین ساز اسمبلی کو کابینہ مشن کے منصوبے کی ساخت میں کوئی ردّ و بدل کرنے کا اختیار حاصل نہیں اور صوبوں کی گروپ بندی منصوبے کا لازمی حصہ ہے البتہ صوبے نئے آئین کے تحت پہلے عام انتخابات کے بعد اپنے گروپ سے باہر نکل آنے کے مجاز ہیں مرکزی حکومت، گروپوں اور صوبوں کے درمیان تقسیم اختیارات کی بنیاد پر ہی مسلم لیگ کو منصوبہ منظور کرنے پر آمادہ کیا گیا تھا اور کابینہ مشن نے خود بھی اپنے ۱۶ مئی کے بیان کی وہی تعبیر کی تھی، جو مسلم لیگ پیش کر رہی ہے۔

برطانوی حکومت کو اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ نہرو کو ۱۶ مئی کے بیان کا واضح مفہوم قبول کرانے کی ساری مساعی بالکل بیکار ہیں۔ حکومتِ برطانیہ نے قانونی مشورہ بھی حاصل کیا، جس نے اس بیان کے متنازعہ فیہ پیرا ۱۹ کے بارے میں کابینہ مشن کی تعبیر کی توثیق کر دی۔ مسلم لیگ کو کابینہ مشن کی تعبیر سے اتفاق رائے تھا لیکن کانگرس کو نہیں تھا۔ چنانچہ مکمل تعطل پیدا ہو گیا۔ ۶ دسمبر کو حکومتِ برطانیہ نے

ایک بیان جاری کیا، جس میں اس امر کی تصدیق کی کہ :-

"کابینہ مشن نے مسلسل یہی نظریہ اختیار کیے رکھا ہے کہ آئین ساز اسمبلی کے حصوں کے فیصلے، اگر اس کے برعکس کوئی سمجھوتہ نہ ہُوا، ان کے نمائندوں کی اکثریت سے ہونے چاہئیں۔ مسلم لیگ نے اس رائے کو قبول کر لیا ہے، لیکن کانگرس نے اس سے مختلف نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتی ہے کہ اگر سارے بیان کو پڑھا جائے، تو اس سے جو اصلی مطلب اخذ ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ صُوبوں کو ہی گروپ بندی اور اپنے آئین دونوں امور کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ ملک معظم کی حکومت نے اس پر قانونی مشورہ حاصل کیا ہے، جس نے اس امر کی تصدیق کر دی ہے کہ ۱۶ رمئی کے بیان کا وہی معنی ہے، جسے کابینہ مشن نے ہمیشہ اپنا مفہوم قرار دیا ہے۔ اس لیے بیان کے اس حصّے کی یہ تعبیر ۱۶ رمئی کی سکیم کا ایک لازمی حصہ سمجھی جانی چاہیے۔ تاکہ اہل ہند ایک ایسے آئین کی تشکیل کر سکیں جسے ملک معظم کی حکومت پارلیمنٹ میں پیش کرنے کے لیے تیار ہو۔ لہذا آئین ساز اسمبلی میں ہر فریق کو اسے قبول کر لینا چاہیئے" ۱۹ے

برطانوی حکومت نے کانگرس پر زور ڈالا کہ وہ کابینہ مشن کی رائے کو منظور کرے تاکہ مسلم لیگ بھی اپنے رویہ پر نظر ثانی کر سکے۔ ۶ر دسمبر کے بیان کے آخری پیرا میں کہا گیا کہ "باہمی اتفاق پر مبنی طریق کار کے بغیر آئین ساز اسمبلی کی کامیابی کی کوئی توقع نہیں۔ اگر کوئی آئین ساز اسمبلی جس میں ہند کی آبادی کے ایک بڑے حصہ کے نمائندے موجود نہیں۔ ایک آئین وضع بھی کر لیتی ہے تو ملک معظم کی حکومت کبھی یہ تصوّر نہیں کر سکتی کہ ایسے آئین کو ملک کے نارضامند حصّوں پر جبراً ٹھونس دیا جائے۔ جیسا کہ کانگرس نے بھی کہا ہے کہ وہ بھی ایسا تصوّر نہیں کر سکتی"۔ ۲۰ے

برطانوی حکومت کے ۶ر دسمبر کے بیان سے بھی کابینہ مشن کے ۱۶ رمئی کے بیان کی طرح کانگرس کے رویّہ میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ نہرو اور بلدیو سنگھ آئین ساز اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہونے کے لیے ہند واپس آگئے۔ قائدِ اعظم اور لیاقت علی خان کچھ عرصہ کے لیے انگلستان میں ہی ٹھہر گئے۔ ۱۴ر دسمبر کو لندن میں ایک پریس کانفرنس میں قائدِ اعظم نے کہا کہ اگر کانگرس ۱۶ رمئی کے بیان کی وہ تعبیر کسی شرط و استثنا

کے بغیر مان لے، جو برطانوی حکومت نے پیش کی ہے تو وہ اس مسئلہ کا از سرِ نو جائزہ لینے کے لیے مسلم لیگ کونسل کا اجلاس طلب کر لیں گے ۔[۲۱] لندن میں ایک تقریر کے دوران میں قائدِ اعظم نے واضح کیا کہ پاکستان کی آبادی دنیا کی بہت سی مملکتوں سے زیادہ ہوگی، اور اس کے بعد بھی برِصغیرِ ہند کا تین چوتھائی سے زیادہ حصّہ ہندوؤں کے پاس ہی رہے گا۔ پاکستان کے بارے میں واحد اعتراض یہ ہے کہ ہندو سارے کا سارا برِصغیر لینا چاہتے ہیں ۔ اگر سارا برِصغیر انہیں دے دیا جائے، تو پھر ہم محض اقلیت بن کر رہ جائیں گے ۔ اس لیے اصل مسئلہ یہ ہے کہ کیا برطانیہ سنگینیں تان کر کھڑا ہو جائے گا اور ہندو اکثریت کے ہاتھ میں اقتدار کی باگ ڈور دے دے گا ؟ اگر ایسا ہوا تو پھر آپ اپنی عزت، دیانت اور انصاف پروری کو بالکل کھو بیٹھیں گے"[۲۲]

لندن کانفرنس کی ناکامی سے عبوری حکومت میں کانگرس اور مسلم لیگ کے تعلقات اور بھی خراب ہو گئے ۔ دونوں فریقوں کے لیڈر اس قدر شائستہ اور مہذب تو تھے کہ کابینہ میں کھلم کھلا لڑائی جھگڑے روادار نہیں ہو سکتے تھے، لیکن ایک دوسرے کے خلاف ان کا رویّہ سخت سے سخت تر ہوتا گیا۔ شکوک و شبہات بڑھتے چلے گئے، اور محکمۂ خزانہ کے طریقِ کار سے غلط فہمیوں کو نشوونما ملتی رہی ۔

ہر حکومت میں خرچ کے مطالبات وسائل سے بہت زیادہ ہوتے ہیں ۔ خزانہ یا محکمۂ فنانس کو نئے اخراجات کی سکیموں کا بغور معائنہ کرنا پڑتا ہے، اس کام کی نوعیت ہی ایسی ہوتی ہے کہ دوسرے محکمے اسے خوشدلی سے قبول نہیں کر سکتے ۔ کم و بیش ہر ملک میں محکمۂ خزانہ کو دفتر شاہی تنظیموں کی توسیع میں ایک ناپسندیدہ رکاوٹ سمجھا جاتا ہے ۔ ایک ہر دلعزیز وزیرِ خزانہ اغلباً ایک نکما وزیرِ خزانہ ہو گا ۔ اگر ڈاکٹر جان متھائی ایسا غیر جانبدار شخص بھی وزیرِ خزانہ رہتا، تو وہ بھی وقت گزرنے کے ساتھ کسی حد تک اپنے ساتھیوں کی نظروں میں معتوب ہو جاتا ۔ لیکن جب کانگرس کی تجاویز محکمۂ خزانہ کی طرف سے، جس کے سربراہ لیاقت علی خان تھے، مسترد کر دی جاتیں، تو اشتعال بہت بڑھ جاتا اور اس کا ہدف مسلم لیگ کو بنایا جاتا ۔

کانگرسی وزیر بڑے تنک مزاج تھے اور محکمہ خزانہ کے اپنے معمول کے مطابق کام کرنے میں بھی انہیں عناد کا رنگ نظر آتا تھا ۔ دوسری طرف کانگرسی وزراء کے چھکے چھوٹ جانے سے وزیرِ خزانہ لطف اٹھاتے تھے اور ان کی خود اعتمادی بڑھتی تھی ۔ جو شخص محکمہ خزانہ کی کارکردگی پر سب سے زیادہ برہم اور نالاں تھا، وہ پٹیل تھا ۔ وہ امورِ داخلہ کے محکمے کا سربراہ تھا اور اسے یہ خیال تھا کہ وہ اس محکمے کے ذریعے ملک بھر

میں امن وامان کی مشینری پر حاوی ہو جائے گا۔ وہ طبعاً آمر اور مطلق العنان تھا اور مخالفت برداشت کرنے کا روادار نہیں تھا۔ ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے :-

"جب لیاقت علی خان وزیرِ خزانہ بنے، تو حکومت کی کلید ان کی تحویل میں چلی گئی۔ ہر محکمہ کی ہر تجویز کا معائنہ ان کے محکمہ نے ہی کرنا ہوتا تھا۔ مزید برآں بطور وزیرِ خزانہ انہیں حق استرداد بھی حاصل تھا...... سردار پٹیل وزارتِ امورِ داخلہ کو اپنے پاس رکھنے کا بہت مشتاق تھا۔ اب اسے سمجھ آئی کہ وزارتِ خزانہ کی پیشکش کر کے وہ مسلم لیگ کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہ گیا ہے۔ پٹیل جو بھی تجویز پیش کرتا لیاقت علی خان اسے مسترد کر دیتے یا اس کا حلیہ ہی بگاڑ دیتے...... حکومت میں پھوٹ پڑ گئی جو بڑھتی چلی گئی" ۲۳ ؎

صورتِ حال کی اس عکاسی میں قدرے مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے، لیکن اس سے کانگرسی۔ زیردل کے احساسات کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ محکمہ خزانہ جس اختیار اور ذمہ داری کا حامل تھا، اسے کسی خوف یا رعایت کے بغیر بروئے کار لایا جاتا تھا۔ محض اس وجہ سے کوئی تجویز قابلِ قبول نہیں بن سکتی تھی کہ اسے نہرو یا پٹیل کی پُرزور حمایت حاصل تھی۔ کسی ایسی تجویز کے مسترد ہونے سے ممکن تھا کہ کابینہ میں بدمزگی پیدا ہو جائے لیکن اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔

نہرو کو شک تھا کہ مسلم لیگ اور اعلیٰ انگریز افسروں کے درمیان بقول اس کے 'ذہنی اتحاد ہے'۔ یہ محض اس کے تخیل کی اختراع تھی۔ انگریز افسر تو کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کی یکساں وفاداری کے ساتھ خدمت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ہند میں برطانوی راج کے دن تھوڑے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ رخصت ہوں تو خوشگوار تعلقات کے ساتھ علی الخصوص ہندو کانگرس کے ساتھ جو سب سے زیادہ طاقتور جماعت تھی اور جس کے حیطۂ اقتدار میں سارا برصغیر نہیں تو اس کا بیشتر حصہ آنے والا تھا۔ اس طرح نہرو کا یہ الزام بھی صداقت سے یکسر عاری تھا کہ لیگ کو حکومت میں شاہی جماعت کی حیثیت حاصل ہے۔ جیسا کہ لیاقت علی خان نے واضح کیا، مسلم لیگی بلاک نے ایک مرتبہ بھی وائسرائے کے خاص اختیارات سے استمداد نہیں کی اور نہ ہی کبھی وائسرائے یا برطانوی حکومت سے کسی مسئلہ میں مداخلت کرنے کے لیے کہا۔ نہرو نے اپنی تنک مزاجی کے باعث کئی مرتبہ مستعفی ہو جانے کی دھمکی دی۔ پٹیل جو زیادہ حقیقت پسند تھا۔ اس بات کے

خلاف تھا۔ جب ان کے درمیان جھگڑا گاندھی تک پہنچا، تو پٹیل نے گاندھی کے نام ایک خط میں اپنی صفائی پیش کی کہ "میرے خلاف یہ الزام کہ میں اپنے عہدہ سے چپٹا رہنا چاہتا ہوں، محض من گھڑت ہے۔ میں صرف جواہرلال کی اس بات کے خلاف ہوں کہ عبوری حکومت سے مستعفی ہونے کی بے کار دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ ...... کھوکھلی دھمکیوں کے اعادہ سے وائسرائے کی نظر میں ہمارا کوئی وقار نہیں رہا، اور اب وہ ہمارے مستعفی ہونے کی دھمکیوں کو محض گیدڑ بھبکی سمجھتا ہے" ۲۴۔

آئین ساز اسمبلی کا اجلاس ۹ دسمبر کو شروع ہو گیا، لیکن مسلم لیگی ارکان اجلاس میں شریک نہ ہوئے۔ راجندر پرشاد کو صدر منتخب کیا گیا۔ نہرو نے قرار دادِ مقاصد پیش کی، جس میں ایک آزاد و خود مختار جمہوریہ کو مطمح نظر قرار دیا گیا جو ایسی خود مختار اکائیوں پر مشتمل ہوگی جنہیں باقیماندہ اختیارات حاصل ہوں گے۔ آئین ساز اسمبلی نے جو قواعد و ضوابط منظور کیے، ان میں یہ شق بھی تھی کہ اسمبلی کا وجود ختم نہیں کیا جا سکے گا۔ اِلّا یہ کہ اسمبلی خود ہی کم از کم دو تہائی ارکان کی حمایت کے ساتھ اس مقصد کے لیے قرار داد منظور کرے۔ بنارس میں ۵ دسمبر کو تقریر کرتے ہوئے نہرو نے کہا کہ "آئین ساز اسمبلی میں ہم جس طرز کا بھی آئین بنانے کا فیصلہ کریں گے، وہی آزاد ہند کا آئین ہوگا ـــــ خواہ برطانیہ اسے قبول کرے یا نہ کرے .... ہم کسی بیرونی مداخلت کو برداشت نہ کر سکتے ہیں اور نہ کریں گے" ۲۵۔ جب ۲۰ جنوری ۱۹۴۷ء کو آئین ساز اسمبلی کا دوسری مرتبہ اجلاس ہوا، تو قرار دادِ مقاصد کو منظور کر لیا گیا، اور نہرو نے بڑے وثوق سے کہا کہ اگرچہ اسمبلی ہر وقت لیگ کے نمائندوں کو خوش آمدید کہنے کو تیار ہے لیکن کام میں کوئی تاخیر گوارا نہیں کی جائے گی۔ خواہ کوئی آئے یا نہ آئے۔

۲۲ دسمبر کو کانگرس ورکنگ کمیٹی نے ایک قرار داد منظور کی، جس میں کابینہ مشن کے پلان کے بارے میں اپنی باطل تاویل کا اعادہ کیا۔ اس قرار داد میں برطانوی حکومت کے ۶ دسمبر والے بیان پر یہ تنقید کی گئی کہ اس میں کابینہ مشن کے ۱۶ مئی کے بیان سے انحراف کیا گیا ہے، اور یہ اعلان کیا گیا کہ برطانوی حکومت کے بیان کے پیش نظر اب اس معاملہ میں فیڈرل کورٹ سے رجوع بیکار ہو گیا ہے۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے ۶ جنوری ۱۹۴۷ء کو ایک قرار داد منظور کی، جس میں ورکنگ کمیٹی کے ۲۲ دسمبر والے بیان کی توثیق کی۔ اور یہ کہا کہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی :۔

"ان مشکلات کو محسوس کرتی ہے، جو بعض صوبوں کے راستے میں حائل کر دی گئی ہیں، بالخصوص آسام، بلوچستان، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور پنجاب

کے سکھوں کے راستے میں یہ مشکلات برطانوی کابینہ کی ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کی سکیم نے حائل کی ہیں۔ علی الخصوص اس سکیم کی اس تعبیر نے جو برطانوی حکومت نے اپنے ۶ دسمبر ۱۹۴۶ء کے بیان میں پیش کی ہے۔ کمیٹی یہ مشورہ دیتی ہے کہ اسمبلی کے حصوں میں کارروائی برطانوی حکومت کی تعبیر کے مطابق کی جائے۔"

لیکن اس کے معاً بعد کمیٹی نے اپنی منظوری یوں مشروط کر دی :۔

"تاہم یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اس کا مطلب کسی صوبہ پر جبر کرنا نہیں ہے، اور نہ یہ کہ پنجاب میں سکھوں کے حقوق خطرے میں پڑ جائیں۔ اگر ایسا کوئی جبر کرنے کی کوشش کی گئی، تو اس صورت میں صوبے یا صوبے کے کسی جزو کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنے لوگوں کی خواہشات کو بروئے کار لانے کے لیے جو اقدام بھی ضروری سمجھے، کر گزرے۔" ۲۷

جیسا کہ "اکانومسٹ" لندن نے اپنی ۱۱ جنوری ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں تبصرہ کیا "اس شرط سے نام نہاد منظوری عملاً منسوخ ہو جاتی ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ کانگرسی اکثریت کا مقصد برطانوی حکومت اور عوام کو اپنی معقولیت پسندی کا یقین دلانا ہے نہ کہ مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتہ کرنا۔"

مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس جنوری ۱۹۴۷ء کے اواخر میں کراچی میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں برطانوی حکومت کے ۶ دسمبر والے بیان پر کانگرس کے ردِ عمل اور آئین ساز اسمبلی کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا۔ ورکنگ کمیٹی نے اپنی ۳۱ جنوری کی قرارداد میں کانگرس ورکنگ کمیٹی کی ۲۲ دسمبر والی قرارداد اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی ۶ جنوری والی قرارداد کا مفصل تجزیہ کیا۔ اس قرارداد میں واضح کیا گیا کہ کانگرس کی ان قراردادوں نے چونکہ کسی صوبے بلکہ کسی صوبے کے ایک جزو کو اور پنجاب میں سکھوں کو یہ حق دے دیا ہے کہ آئین ساز اسمبلی کے متعلقہ حصوں میں شامل ہوں یا نہ شامل ہوں۔ اس لیے کانگرس کی طرف سے کابینہ مشن پلان کی نام نہاد منظوری بالکل منسوخ ہو جاتی ہے۔ درحقیقت کانگرس کے طرزِ عمل میں ایک نمایاں تضاد تھا۔ اس کا یہ دعویٰ تھا کہ آئین ساز اسمبلی تمام صوبوں کے لیے آئین بنانے کا حق رکھتی ہے مگر وہ آئین ساز اسمبلی کے حصوں کا یہ حق تسلیم نہیں کرتی تھی کہ وہ اپنے مشمولہ صوبوں کے لیے آئین بنا سکتے ہیں۔ لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے اعلان کیا :۔

"آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی قرارداد محض ایک بددیانت چال اور الفاظ کی شعبدہ بازی ہے۔ اس قرارداد کے ذریعہ کانگرس نے ایک مرتبہ پھر برطانوی حکومت، مسلم لیگ اور رائے عامہ کو فریب دینے کی کوشش کی ہے۔ زیر بحث مسئلہ بہت ہی سادہ تھا اور اس کا سیدھا اور دیانتدارانہ جواب درکار تھا......
کہ آیا کانگرس ایمانداری اور اخلاص کے ساتھ ۱۶ رمئی کی تجاویز کے ساتھ، جیسی کہ ملک معظم کی حکومت نے ۶ ر دسمبر ۱۹۴۶ء کو ان کی وضاحت کی ہے، اتفاق کرتی ہے اور آیا کانگرس آبرومندانہ طور پر ان پر کاربند رہنے کے لیے تیار ہے"

مسلم لیگ کی اس قرارداد میں آئین ساز اسمبلی کی روداد پر بھی نکتہ چینی کی گئی، اور یہ اعلان کیا گیا کہ قرارداد مقاصد میں چونکہ کابینہ مشن کے ۱۶ رمئی والے بیان سے تجاوز کیا گیا ہے، اس لیے یہ "غیر قانونی اور خلاف آئین ہے اور آئین ساز اسمبلی اسے منظور کرنے کی اہل نہیں ہے"۔ آئین ساز اسمبلی نے جو قواعد وضوابط منظور کیے تھے، اور جن کے تحت وہ حصوں پر بھی اپنا اختیار جتا رہی تھی، ان کے لیے کوئی سند یا معقول وجہ موجود نہیں تھی۔ قرارداد کے آخر میں کہا گیا کہ کانگرس نے "ملک معظم کی حکومت کی اس آخری اپیل کو مسترد کر کے اور آئین ساز اسمبلی کو اپنا من بھاتا ادارہ بنا کر نہ صرف ۱۶ رمئی والے بیان کی ساری اساس کو تہس نہس کر دیا ہے بلکہ کابینہ مشن کے آئینی منصوبہ کی بنیاد پر مصالحت کے مرامکان کو ختم کر دیا ہے"۔ آخر میں مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی نے حکومت برطانیہ سے یہ مطالبہ کیا کہ "اسے یہ فیصلہ کر دینا چاہیے کہ کابینہ مشن نے جو آئینی منصوبہ مرتب کیا تھا اور جس کا اعلان ۱۶ رمئی کو کیا گیا تھا، وہ ناکام ہو چکا ہے" اور دستور ساز اسمبلی کو توڑ دینا چاہیے۔

عبوری حکومت میں کانگرسی بلاک نے مسلم لیگ کی اس قرارداد کے جواب میں وائسرائے سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ مسلم لیگی وزیروں کو برطرف کر دے۔ جب وائسرائے نے لیاقت علی خان کو اس مطالبے سے مطلع کیا تو انہوں نے جواب میں کہا کہ اگر عبوری حکومت میں شمولیت کی اساس ۱۶ رمئی کے بیان کی منظوری ہے، تو ایسا نہ کانگرس نے کیا ہے اور نہ سکھوں نے، اس لیے عبوری حکومت میں نمائندگی کے لیے وہ مسلم لیگ سے زیادہ حق نہیں رکھتے۔ مسلم لیگ ہی وہ واحد فریق ہے، جس نے خلوص دل سے کابینہ مشن پلان کو منظور کیا ہے۔ اگر اب بھی کانگرس کسی شرط کے بغیر منصوبے کو منظور کر لے، تو لیگ اپنے موقف پر نظر ثانی کرے گی، ورنہ ہرگز نہیں۔ وائسرائے کو خود بھی یقین تھا کہ کانگرس نے منصوبے کو قبول نہیں کیا۔ برطانوی حکومت

بھی اس سے بے خبر نہیں تھی، لیکن وائسرائے کے کہنے کے باوجود برطانوی حکومت کو کانگرس سے غیر مشروط منظوری کا مطالبہ کرنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ غرض مسلم لیگ کو عبوری حکومت سے باہر نکال دینے کے لیے کانگرس کا دباؤ جاری رہا۔ نہرو نے وائسرائے کو ایک مرتبہ پھر خط لکھا، جس میں مسلم لیگی وزیروں سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا۔ اور پٹیل نے تو کھلم کھلا دھمکی دی کہ اگر مسلم لیگ کے نمائندے عبوری حکومت میں رہنے دیے گئے تو کانگرس اس سے علیحدہ ہو جائے گی۔

برطانوی حکومت بڑے مخمصے میں پڑ گئی۔ اگر وہ عبوری حکومت سے لیگ کے اخراج کے بارے میں کانگرس کا مطالبہ مان لے تو سمجھوتے اور پر امن انتقالِ اقتدار کے تمام امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف اگر مسلم لیگ کے مطالبے پر آئین ساز اسمبلی کو توڑ دے تو کانگرس سے جھٹ پٹ تصادم ہو جاتا ہے۔ انگریز نہ ان دو حریفوں میں مصالحت کرا سکتے تھے اور نہ اپنی طرف سے کوئی حل نافذ کر سکتے تھے۔

انتظامیہ اور افواج میں انگریز افسروں کی تعداد اس قدر کم ہو چکی تھی کہ وہ زیادہ دیر تک برصغیر ہند پر حکمرانی کی امید نہیں کر سکتے تھے۔ اعلیٰ سول ملازمتوں میں انگریز افسروں کی تعداد گھٹ کر ۱،۶۰۰ رہ گئی تھی۔ ۱۹۳۵ء میں ان کی تعداد ۲،۹۴۲ تھی۔ انڈین سول سروس کے آہنی ڈھانچہ میں صرف ۵۰۰ انگریز افسر باقی رہ گئے تھے۔ جنگ کے دوران میں مزید بھرتی معطل کر دی گئی تھی اور اس کا دوبارہ اجرا سیاسی لحاظ سے ناممکن تھا۔ ہند کی افواج میں انگریز افسروں کی تعداد ۱۱،۰۰۰ سے کم ہو کر ۴،۰۰۰ رہ گئی تھی۔ جنوری ۱۹۴۷ء میں امورِ ہند کا پارلیمانی انڈر سیکرٹری ان انگریز سول اور فوجی افسروں کو معاوضہ دلانے پر بات چیت کرنے کے لیے دہلی آیا، جو آئینی تبدیلیوں کے باعث ریٹائر ہو جائیں گے۔ ہند میں برطانوی فوج کے دستے واپس بلائے جا رہے تھے تاکہ انہیں فوجی ملازمت سے سبکدوش کر کے برطانیہ کی اقتصادی تعمیرِ نو کے لیے ضروری عملہ مہیا کیا جا سکے۔

جنگ نے ہند کی حیثیت میں ایک اور اہم تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ جنگ سے پہلے ہند ایک مقروض ملک تھا، لیکن اب وہ ایک قرض خواہ ملک بن چکا تھا۔ برطانیہ کی جنگی مساعی کی خاطر ہند نے لاکھوں سپاہی اور بے شمار ساز و سامان بہم پہنچایا تھا، اس وجہ سے سٹرلنگ بقایاجات جمع ہوتے گئے۔ جن کی رقم ایک ارب بیس کروڑ پونڈ تک پہنچ گئی تھی۔ برطانیہ یہ بقایاجات کئی سال کے عرصہ میں فاضل تجارت کی صورت میں ہی ادا کر سکتا تھا۔ تجارتی مقاصد کے لیے انگلستان کو ہند پر سیاسی گرفت کی ضرورت نہیں تھی۔ اب یہ بات خود

ہند کے مفاد میں تھی کہ وہ انگلستان سے تجارت جاری رکھے۔ برطانوی وزارت خزانہ کا ایک مشن سر ولفرڈ ایڈی کی قیادت میں سٹرلنگ بقایاجات میں تخفیف کے لیے بات چیت کرنے دہلی آیا۔ ایک انگریز مالیاتی مبصر کے مطابق برطانوی رائے عامہ کا ایک حصہ آزادیٔ ہند کے عوض ان بقایاجات کی کلی معافی کا خواہاں تھا اور کچھ لوگ بطور مصالحت بقایاجات کی ایک تہائی اور نصف کے بین بین رقم ادا کرنے کے حق میں تھے اس مبصر نے دو ٹوک الفاظ میں یہ کہہ دیا "یہ حقیقت کہ بقایاجات بلاشک و شبہ قانوناً واجب الادا ہیں، برطانوی عوام کی بھاری اکثریت کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں رکھتی" ۲۹؎ سٹرلنگ بقایاجات میں تخفیف کے مطالبے کی وزیر خزانہ لیاقت علی خاں نے پُرزور مخالفت کی، انھوں نے بالکل درست طور پر کہا:۔

"ہم نے نہ صرف جنگ کے بوجھ کا اپنا پورا حصہ برداشت کیا ہے، جس کے لیے ملک معظم کی حکومت اور اس زمانہ کی حکومت ہند میں آزادانہ سمجھوتہ ہوا تھا، بلکہ برطانیہ اور اس کے حلیفوں کی مدد کرنے کے لیے ہم نے انتہائی حد تک اپنی قوت صرف کی ہے۔ ہمارا اپنا بار جس کے لیے ہم کوئی مطالبہ نہیں کر رہے، بجائے خود بے حد و حساب تھا اور دوسری امیر تر قوموں سے کسی صورت فروتر نہیں تھا۔ میں باور نہیں کر سکتا کہ کوئی انصاف پسند شخص ہم جیسی غریب اور پس ماندہ قوم کو ہمارا جائز حق دینے سے کبھی انکار کرنا چاہے گا، یہ نہ صرف ہمارا حق ہے بلکہ ہماری ہولناک بدحالی کو دور کرنے کے لیے ہمیں اس کی سخت ضرورت ہے" ۳۰؎

الغرض ہند اور انگلستان کے درمیان تعلقات میں بڑی تبدیلی آ چکی تھی۔ ہند میں اپنے اقتدار اور ساکھ کو بحال کرنے کے لیے انگریزوں کے پاس نہ افرادی قوت تھی اور نہ مالی وسائل۔ ان حالات میں وائسرائے لارڈ ویول جس نتیجہ پر پہنچا، وہ اس نے شاہ جارج ششم کو ایک خط میں لکھ دیا کہ "ہمارے اور ہند دونوں کے مفاد میں یہی بات بہتر ہوگی کہ ہم حتی الوسع جلد از جلد حکومت سے دست بردار ہو جائیں، اور اہل ہند کو اپنا مستقبل خود متعین کرنے دیں ...... میں نے یہ سفارش کی تھی کہ انگریز بتدریج کنارہ گیر ہوتے جائیں، اس کا آغاز جنوبی ہند سے کیا جائے ...... میں نے آخری انتقال اقتدار کے لیے ۳۱ مارچ ۱۹۴۸ء کی تاریخ کی سفارش کی تھی" ۳۱؎ اگرچہ برطانوی حکومت نے تدریجی انخلاء کے بارے میں لارڈ ویول کی تجویز کو منظور نہ کیا، لیکن اس نے لارڈ ویول کے اس بنیادی مفروضہ کو تسلیم کر لیا کہ موجودہ اساس پر برطانوی راج

کو ۱۹۴۸ء کے موسم گرما کے بعد برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔

۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو وزیر اعظم اٹیلی نے دارالعوام میں ایک تاریخی بیان دیا۔ اس نے برطانوی حکومت کے اس قطعی عزم کا اعلان کر دیا کہ "جون ۱۹۴۸ء سے پہلے ہی ہند کے ذمہ دار ہاتھوں میں اقتدار منتقل کرنے کے لیے ضروری اقدامات کیے جائیں گے"۔ اس بیان میں برطانوی حکومت کی اس خواہش کا باقاعدہ اعلان کیا گیا کہ :۔

> "کابینہ مشن پلان کے مطابق ہند کے سب فریقوں کے منظور شدہ آئین کے تحت جو ہیئت ہائے حاکمہ قائم ہوں گی، برطانوی حکومت اپنی ذمہ داری انہیں سونپ دے گی .... اگر .... جون ۱۹۴۸ء سے پہلے ایک پوری طرح نمائندہ آئین ساز اسمبلی سے آئین وضع نہ ہو سکا تو ملک معظم کی حکومت کو یہ سوچنا پڑے گا کہ مقررہ تاریخ پر برطانوی ہند میں مرکزی حکومت کے اختیارات کسے تفویض کیے جائیں۔ آیا یہ اختیارات بہ حیثیت مجموعی برطانوی ہند کی کسی نوع کی مرکزی حکومت کو سونپ دیے جائیں یا بعض علاقوں میں موجودہ صوبائی حکومتوں کو یا کسی اور موزوں صورت میں، جو سب سے زیادہ معقول معلوم ہو اور اہل ہند کے بہترین مفاد میں ہو" ۳۲ے

وزیر اعظم نے یہ بھی اعلان کیا کہ مارچ میں لارڈ ویول کی جگہ لارڈ مونٹ بیٹن وائسرائے مقرر ہو جائے گا۔ اس تبدیلی کے اسباب کا انکشاف نہیں کیا گیا، لیکن یہ باور کرنے کے لیے کافی وجوہ ہیں کہ لندن میں کانگرس کی ریشہ دوانیوں نے ہی ویول کو برخاست کروایا۔ کانگرس نے اسے مسلم لیگ کو عبوری حکومت میں کانگرس کے پہلو بہ پہلو لانے پر کبھی معاف نہیں کیا تھا۔ اگلے وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن سے پہلی ہی ملاقات کے دوران میں نہرو نے بسرعت تمام کابینہ مشن کے دورے سے لے کر بعد کے تمام اہم حالات کے بارے میں اسے اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ کیا۔ مونٹ بیٹن نے نہرو کی باتوں کو کم و بیش درست قرار دیا۔ لندن میں اس نے جو معلومات حاصل کی تھیں، نہرو کی باتیں ان ہی کے مطابق تھیں۔ نہرو کے نزدیک ویول نے ایک ہی سنگین غلطی کی، اور وہ یہ تھی کہ اس نے مسلم لیگ کو عبوری حکومت میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ بجائے اس کے کہ وہ کچھ عرصہ اور انتظار کرتا، تاآنکہ مسلم لیگ خود شمولیت کے

لیے درخواست کرتی" ۳۳ء ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ نہرو اور اس کے رفقائے کار لارڈ ویول کے خلاف تھے۔ اس کا جانشین اس عبرت آموز مثال کو کبھی نہیں بھولا۔

جون ۱۹۴۷ء تک قطعی انتقالِ اقتدار کے فیصلے کا پس منظر بیان کرتے ہوئے سر سٹیفورڈ کرپس نے ان متبادل صورتوں کی تفصیل بیان کی، جو برطانوی حکومت کے سامنے تھیں:-

" وہ متبادل صورتیں بنیادی طور پر دو ہیں ...... پہلی یہ کہ ہم ہند پر برطانوی اقتدار کو مستحکم بنانے کی کوشش کرتے ...... یعنی جتنے عرصے کے لیے ضروری ہوتا ہم اپنی انتظامی ذمہ داری کو برقرار رکھتے، اور اس اثنا میں ہند کے فرقوں کے مابین سمجھوتے کا انتظار کرتے۔ ایسی پالیسی کا مطلب یہ ہوتا ...... کہ ہم کم از کم پندرہ سے بیس سال تک ہند میں رہتے، کیونکہ اس سے کمتر مدت میں سرد مہری کی مستحکم اساس پر تنظیم نو نہیں ہو سکتی ...... دوسری متبادل صورت یہ ہے کہ ...... اہل ہند کو متحد ہونے پر آمادہ کیا جائے، اور اس کے ساتھ ہی ساتھ انہیں یہ انتباہ بھی کر دیا جائے کہ ان کے سمجھوتے کے انتظار میں ہم ایک معین وقت تک اپنی ذمہ داری نباہنے کے لیے تیار ہیں ...... ہم پہلی متبادل صورت کو مسترد کرتے ہیں کہ وہ ناپسندیدہ بھی ہے اور ناقابلِ عمل بھی" ۳۴ء

ہند کی آزادی کے سوا درحقیقت اور کوئی متبادل صورت تھی بھی نہیں۔ ہند میں سب فریق حصولِ آزادی پر تو متفق تھے، ان میں اختلاف صرف اس بات پر تھا کہ ایک آزاد و خود مختار مملکت ہونی چاہیے یا دو۔ عالمی رائے عامہ بالخصوص امریکہ کی رائے عامہ کی طرف سے دوسری جنگ کے دوران میں اور اس کے بعد بھی برطانیہ پر مسلسل دباؤ ڈالا جا رہا تھا کہ وہ ہند میں اپنے اقتدار سے دست بردار ہو جائے برطانیہ نے اس ناگزیر صورت حالات کے سامنے خوشدلی اور خوش اسلوبی سے سر تسلیم خم کر کے بڑی سیاسی دانشمندی کا ثبوت دیا۔ انتقالِ اقتدار کے لیے معین تاریخ مقرر کرنے سے انگریز اس الزام سے بری الذمہ ہو گئے کہ وہ ہند میں دو بڑے فرقوں کے درمیان اختلافات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنی حکومت کو طول دینا چاہتے ہیں۔ اس کے برعکس انہوں نے یہ واضح کر دیا کہ انہیں اس بات کی امید ہے کہ ان کی رحلت کی ساعت سر پر آ پہنچنے سے جو دھچکا لگے گا، وہ دونوں بڑی پارٹیوں کو سمجھوتے کی ناگزیر اور فوری ضرورت

کے باعث از خود اتفاق کی راہ پر لے آئے گا۔

برطانیہ کی لیبر حکومت نے جون ۱۹۴۸ء تک ہند سے دست برداری کا جو فیصلہ کیا، اس پر کنزرویٹو اپوزیشن نے بڑی شدید نکتہ چینی کی۔ ان کا بنیادی الزام یہ تھا کہ پندرہ ماہ کی مدت ایک یا دو آئین تیار کرنے، ایک یا ایک سے زائد ہیئت ہائے حاکمہ کو اقتدار منتقل کرنے اور سروسز، دفاع، مالیات، تجارت، مواصلات وغیرہ کے مختلف النوع اور پیچیدہ معاملات کو طے کرنے کے لیے از حد ناکافی ہے۔ ونسٹن چرچل نے اپنی تقریر ان الفاظ پر ختم کی "ہمیں اس رنج و غم میں، جس کی کسک ہم میں سے اکثر محسوس کرتے ہیں، شرم کے داغ اور دھبوں کا اضافہ نہیں کرنا چاہیے ـــــ یہ اضافہ شرمناک فرار اور پیش از وقت اور بہ عجلت تمام شکست و ریخت کرنے کا لازمی نتیجہ ہوگا" ۳۵ لیکن جیسا کہ ایک سابق وائسرائے لارڈ ہیلی فیکس نے واضح کیا تھا، اس سے کوئی بہتر اور کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی چنانچہ پارلیمنٹ نے اٹیلی کے ۲۰ فروری والے بیان کی توثیق کر دی۔

اس اعلان کو بہ حیثیت مجموعی ہند میں کافی سراہا گیا۔ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے برطانیہ کی طرف سے جون ۱۹۴۸ء تک چلے جانے کے فیصلے کا خیر مقدم کیا۔ لیکن دونوں نے اس پہلو پر نکتہ چینی کی کہ جن ہیئت ہائے حاکمہ کو اقتدار منتقل کیا جانا تھا، ان کا ذکر بڑے مبہم انداز میں کیا گیا تھا۔ یہ ابہام دونوں فریقوں میں سمجھوتہ نہ ہونے کے باعث ناگزیر تھا۔ اس نے بیک وقت دونوں کے لیے امیدوں کے چراغ بھی روشن کیے اور خدشات کو بھی ابھارا۔ کانگرس کے لیڈر ابھی تک پورے برصغیر پر اقتدار کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے، لیکن انہیں یہ دھڑکا بھی لگ رہا تھا کہ شاید پورا برصغیر ان کی گرفت میں نہ آ سکے۔ ایسی صورت میں وہ برصغیر کا حتی الوسع زیادہ سے زیادہ حصہ اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے، اس لیے ان کی توجہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کی طرف ہو رہی تھی۔ جب نہرو نے ۱۲ فروری کو وائسرائے سے ملاقات کی تو اس نے دلائل دیتے ہوئے کہا کہ "ملک معظم کی حکومت نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ وہ ملک کے ناراضامند حصوں پر کوئی ناقابل قبول آئین زبردستی ٹھونسنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس کا منطقی نتیجہ یہی ہے کہ کسی صوبہ میں بڑی اقلیتوں کو، مثلاً بنگال میں ہندوؤں اور پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کو کوئی ناقابل قبول آئین منظور کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا" ۳۶

اس طرح تقسیم ملک کا امکان افق پر نمایاں ہو رہا تھا، لیکن مسلم لیگ کو یہ یقین نہیں ہو سکتا

تھا کہ یہی آخری حل ہو گا۔ یہ شبہ کسی حد تک انگریزوں کے رویے اور وحدتِ ہند کے لیے ان کے قوی رجحان سے پیدا ہوتا تھا، اور کسی حد تک مسلم اکثریت کے صوبوں کی سیاسی حالت سے، بالخصوص پنجاب کے کلیدی صوبے کی صورتِ حال سے۔

۱۹۴۶ء کے انتخابات میں اگرچہ مسلم لیگ نے پنجاب میں ۸۶ مسلم نشستوں میں سے ۷۹ جیت لی تھیں، لیکن کانگرسی ہندوؤں، اکالی سکھوں اور خضر حیات ٹوانہ کے تحت یونینسٹ پارٹی کے باقیات کے گٹھ جوڑ نے مسلم لیگ کو اس فتح و کامرانی کے ثمرات سے محروم کر دیا تھا۔ چنانچہ اس زمانہ میں پنجاب کے ایک انگریز افسر پینڈیرل مون نے لکھا ہے "اس غیر فطری اور ناپاک گٹھ جوڑ کے بارے میں یہ محسوس کیا جاتا تھا کہ اسے انگریز گورنر کے اغماض سے اس لیے وضع کیا گیا ہے تاکہ مسلمانوں کو اقتدار سے بہرہ ور نہ ہونے دیا جائے"۔ ۳۷

خضر حیات ٹوانہ کی متزلزل وزارت پر ہندوؤں اور سکھوں کو تسلط حاصل تھا، اور یہ وزارت مسلمانوں میں سخت غیر مقبول تھی۔ اس کا بقا جبر و قوت پر منحصر تھا۔ پینڈیرل مون نے خضر حیات ٹوانہ کے دو مصاحبوں کے خیالات کا ذکر کیا ہے، جن میں ایک وزیرِ حکومت تھا "ہمارے ہاتھ میں ڈنڈا ہے"۔ وہ بار بار کہے جاتے تھے "ہمیں ہرگز ڈنڈے سے دست بردار نہیں ہونا چاہیے"۔ ۳۸ ۔ ۲۴ جنوری ۱۹۴۷ء کو انہوں نے یہ ڈنڈا استعمال کرنے کا فیصلہ کیا، اور مسلم لیگ نیشنل گارڈز کو ایک خلافِ قانون تنظیم قرار دے دیا۔ دکھاوے کی خاطر راشٹریہ سوایم سیوک سنگھ کو بھی، جو ایک جنگجو ہندو تنظیم ہے، خلافِ قانون قرار دینے کا اعلان کر دیا گیا، لیکن نہ کانگرس کے رضاکاروں کے خلاف کوئی اقدام کیا گیا، اور نہ سکھوں کے خلاف حالانکہ وہ جیسا کہ سبھی جانتے تھے، بڑی سرگرمی سے اسلحہ جمع کر رہے تھے اس سے کچھ عرصہ پہلے جلسوں اور جلوسوں کی حکماً ممانعت کر دی گئی تھی، اور اس پابندی کا مقصد بھی مسلم سیاسی سرگرمیوں میں رکاوٹ پیدا کرنا تھا۔

مسلم لیگ نے اس چیلنج کا مستعدی سے جواب دیا، اور ہمہ گیر لیکن عدمِ تشدد پر مبنی عوامی جد و جہد شروع کر دینے کا فیصلہ کیا۔ پنجاب مسلم لیگ کے صدر خان آف ممدوٹ نے اعلان کیا "ہم پنجاب میں شہری آزادیوں کا بول بالا کرنے کے لیے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ یہاں ایک غیر نمائندہ وزارت برسرِ اقتدار رہنے کی خاطر عوامی آزادیوں کا گلا گھونٹنے کے لیے انتہائی قابلِ اعتراض طریقے استعمال کر رہی ہے"۔ ۳۹ آین سٹیفنز نے، جو ان دنوں سٹیٹسمین کا ایڈیٹر تھا، اس تحریک کا مفصل نقشہ پیش

کرتے ہوئے لکھا۔

"گزشتہ سال جولائی میں مسلم لیگ نے "راست اقدام" کے سلسلہ میں جو قرارداد منظور کی تھی، درحقیقت خیال یہ تھا کہ اس پر عمل درآمد کے لیے پنجاب کو پہلی باقاعدہ آزمائش گاہ بنایا جائے۔ یہ جدوجہد پوری طرح منظم تھی۔ کانگرس نے ۱۹۲۰ء کے عشرہ اور اس کے بعد انگریزوں کے خلاف "سول نافرمانی" کی جو تحریکیں گاہے گاہے چلائی تھیں، مسلم لیگ کی جدوجہد نے ان کے طور طریقوں کی ہوبہو نقل کی۔ ہزارہا پرجوش مسلم مظاہرین کو گرفتار کرنا پڑا۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، وہ بڑی خوشی سے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کرتے تھے، گویا شہادت کی تلاش میں ہیں۔ بہت جلد جیلیں بھر گئیں۔ بالآخر یہ طریق کار اختیار کیا گیا کہ صرف سرکردہ لوگوں کو گرفتار کیا جاتا، باقی ماندہ کو لاریوں میں بھر کر دور افتادہ مقامات پر پہنچا کر اتار دیا جاتا تاکہ جیسے بھی بن آئے اپنے گھروں کو واپس جائیں۔ اس سے غالباً تحریک میں اور بھی رونق پیدا ہو گئی" ۴۰ے

اس تحریک کا نرالا پہلو یہ تھا کہ اس میں پردہ دار اور بے پردہ مسلم خواتین نے نمایاں حصّہ لیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ سیاسی حقوق اور آزادی کی جنگ میں حصّہ لینے کے لیے ہزاروں لاکھوں مسلمان عورتیں میدانِ عمل میں آ گئیں۔ ان کے جلوسوں پر اشک آور گیس پھینکی گئی، اور ان کی کثیر تعداد کو جلسوں پر پابندی کی خلاف ورزی کی پاداشں میں قید و بند کی مصیبت جھیلنی پڑی۔ انہوں نے لاہور کی زنانہ جیل کے سامنے جہاں ان کی سیاسی بہنیں قید تھیں پکٹنگ اور مظاہرے کیے۔ ایک بہادر لڑکی نے بڑی جرأت سے کئی زخم کھانے کے باوجود لاہور میں پنجاب گورنمنٹ کی سیکریٹریٹ پر مسلم لیگ کا پرچم لہرا دیا۔

یہ تحریک پورے شباب پر تھی کہ برطانوی حکومت کے ۲۰ فروری والے اعلان نے خضر حیات ٹوانہ کے لیے اس وبال سے بچنے کی راہ پیدا کر دی۔ ۲۶ فروری کو حکومت پنجاب نے مسلم لیگ سے مصالحت کر لی، اور ایجی ٹیشن کے سلسلہ میں جو لوگ گرفتار کیے گئے تھے، انہیں رہا کر دیا گیا۔ مسلم لیگ نے بھی اپنی سول نافرمانی کی تحریک ختم کر دینے کا اعلان کر دیا۔ ۲ مارچ کو خضر حیات ٹوانہ مستعفی ہو گیا۔ اس موقع پر اس نے جو بیان جاری کیا، اس میں کہا کہ وزیر اعظم اٹیلی کا اعلان اس امر کا متقاضی ہے کہ صوبے میں فریقین

کا حقائق سے آمنا سامنا کرایا جائے۔ ان حالات میں "میرے لیے واجب ہے کہ مسلم لیگ کے لیے میدان خالی کردوں تاکہ وہ دوسرے فریقوں کے ساتھ ایسے انتظامات کر سکے جو اس کے نزدیک مسلمانوں اور صوبے کے بہترین مفاد میں ہوں" ۔[۴۱]

لیکن روز افزوں فرقہ وارانہ کشیدگی کے باعث کوئی مصالحت ممکن نہ تھی۔ اس صورت حال کو پیدا کرنے میں خود خضر حیات ٹوانہ نے ہندو اور سکھ عزائم کا آلۂ کار بن کر نمایاں حصہ لیا تھا۔ گورنر نے پنجاب میں مسلم لیگ کے لیڈر خان آف ممدوٹ کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔ یہ محض ایک رسمی تحریک تھی۔ فرقہ وارانہ ایوارڈ میں پنجاب کی مسلم اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کیا جا چکا تھا اور غیر مسلموں کی شمولیت کے بغیر کوئی حکومت نہیں بن سکتی تھی۔ ہندو اور سکھ مسلم لیگی حکومت کے یکسر مخالف تھے۔ ۵ مارچ کو گورنر سر ایون جنکنز نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی دفعہ ۹۳ کے تحت انتظامیہ کی باگ ڈور براہ راست خود سنبھال لی۔

ہندو اور سکھ لیڈروں نے اب اشتعال انگیز تقریریں شروع کر دیں، اور اپنے پیروکاروں کو تشدد پر اکسانے لگے۔ آتش مزاج سکھ لیڈر تارا سنگھ نے "پاکستان مردہ باد" کا نعرہ لگایا اور کرپان لہراتے ہوئے للکارا" راج کرے گا خالصہ آکی رہے نہ کو" (سکھ راج کرے گا، اور کوئی مخالف رہنے نہ پائے گا) ایک عام اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے اس نے سکھوں اور ہندوؤں کو عمل کے لیے تیار ہونے کی دعوت دی اور برملا کہا" اگر ہم انگریزوں سے حکومت چھین سکتے ہیں، تو مسلمانوں سے حکومت چھین لینے سے ہمیں کوئی نہیں روک سکتا۔ مسلم لیگ کو ختم کردو" ۔[۴۳] پنڈیرل مون نے لکھا ہے" یہ احمقانہ تہور کی ڈینگ بھٹ اپنا حشر لائی۔ اس سے صوبے بھر میں خوفناک فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے، جن میں ہندوؤں اور سکھوں کو نسبتاً بہت زیادہ نقصان پہنچا" ۔[۴۴]

بنگال اور سندھ میں تو مسلم لیگی وزارتیں تھیں، لیکن شمال مغربی سرحدی صوبہ میں ڈاکٹر خان صاحب کے تحت ابھی تک کانگرسی وزارت چلتی جا رہی تھی، اگرچہ عوام میں اس کی حمایت کا دائرہ بڑی تیزی سے سکڑ رہا تھا۔ مسلم لیگ نے شمال مغربی سرحدی صوبہ کی کانگرسی وزارت کے خلاف جو مظاہرے کیے ان کے نتیجے میں بڑے وسیع پیمانے پر گرفتاریاں کی گئیں۔ گرفتار ہونے والوں میں خان عبدالقیوم خان اور بہت ہی واجب احترام اور ذی اثر پیر مانکی شریف بھی شامل تھے۔ لیکن مسلم لیگ کے لیے عوامی تائید کا

سیلاب اس قدر زور دار تھا کہ طاقت اور جبر سے اسے روکنا ناممکن تھا۔ آین سٹیفنز نے لکھا ہے "پنجاب کی طرح سرحد میں بھی مسلم خواتین کی سرگرمیاں بہت نمایاں تھیں۔ اس سے وہ سب لوگ حیرت زدہ رہ گئے، جنہیں معلوم تھا کہ اس سے ذرا پہلے سرحد میں پردہ کی کس قدر سخت پابندی کی جاتی تھی .... دیہی علاقے بھی اس تحریک سے متاثر ہو گئے ...... قوی ہیکل پٹھانوں سے تانگے لدے ہوئے آتے۔ پولیس انہیں ہتھکڑیوں میں جکڑ کر مردان پشاور روڈ پر جیل میں ڈالنے کے لیے لاتی۔ یہ ڈٹے ہوئے بیٹھے تھے۔ انہوں نے دیہات میں لیگ کے لیے مظاہرے کیے تھے۔ یہ بات صاف ظاہر تھی کہ مسلم لیگ کی تحریک اچھی طرح منظم تھی، اور اسے ٹھوس عوامی حمایت حاصل تھی" ۴۵ آسام میں کانگرسی وزارت نے ان بنگالی مسلمانوں کو بے دخل کرنے کی مہم جاری کی، جو آکر خالی زمینوں پر آباد ہو گئے تھے، اس کے خلاف بھی مسلم لیگ نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی۔

باب ۵

غریب آدمی کا بجٹ

۲۸ فروری ۱۹۴۷ء کو لیاقت علی خان نے مرکزی اسمبلی میں مالی سال اپریل ۱۹۴۷ء تا مارچ ۱۹۴۸ء کے لیے اپنا بجٹ پیش کیا۔ غیر منقسم ہند میں یہ پہلا بجٹ تھا، جو ایک غیر انگریز وزیر نے مرتب کیا۔ یہ آخری بجٹ بھی ثابت ہوا، اور سب سے زیادہ بحث و نزاع کا باعث بھی بنا۔ اسی سے عبوری حکومت کی کابینہ میں شدید ترین بحران پیدا ہوا، اور ملک کے مالیاتی اور معاشی معاملات کے دائرے سے بڑھ کر اس کے اثرات دُور دُور تک پہنچے۔

دوسری عالمی جنگ میں جنوب مشرقی ایشیا میں اتحادی افواج کے لیے ہند ہی رسدگاہ تھا۔ اور ان افواج کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ہند سے بے پایاں رسد پہنچائی گئی۔ اگرچہ اس سلسلے میں بیشتر اخراجات کی ذمہ داری برطانیہ پر عائد ہوتی تھی، لیکن رسد کی خرید کے لیے روپوں کی جتنی ضرورت ہوتی تھی، ان کی فراہمی حکومت ہند کرتی تھی۔ اکثر و بیشتر یہ فراہمی کرنسی کی افزائش سے کی جاتی تھی۔ ہند کی معیشت میں افراطِ زر کا ایک اور سبب ان فوجیوں کی تنخواہ تھی جو یہاں سے بھرتی ہوئے اور جن کی تعداد ۲۵ لاکھ تک جا پہنچی۔ جو امریکی افواج ۱۹۴۲ء سے ہند میں تعینات ہوئیں، ان کی ضروریات بھی ہند کی طرف

سے معکوس اُدھار پٹہ (ریورس لینڈ لیز) کی اساس پر پوری کی جاتی تھیں۔ جہاز رانی میں مشکلات کے باعث یہ بات لازمی ہوگئی تھی کہ فوجی اور سول ضروریات حتی الوسع مقامی وسائل سے ہی پوری کی جائیں۔ فوجی مقاصد اور داخلی کھپت کے لیے درآمدات کم سے کم کر دی گئیں۔ اس کا ایک نتیجہ ۱۹۴۳ء کے قحطِ بنگال کی صورت میں نمودار ہوا، جس میں تقریباً بیس لاکھ افراد لقمۂ اجل ہو گئے۔ جنگ کے باعث ہند کی معیشت پر بار اس قدر بڑھ گیا تھا کہ ۱۹۴۵ء کے اوائل میں حکومتِ ہند نے اپنا ایک مشن اس مقصد کے لیے برطانیہ بھیجا کہ افواج کی ضروریات کے لیے ہند سے خریداری کم کی جائے، کیونکہ فوجی ضروریات پوری کرنے کے بعد شہریوں کے لیے جو کچھ بچتا تھا وہ بہت ناکافی تھا اور اسی وجہ سے قیمتیں بڑی تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔ تقسیم اشیاء اور قیمتوں پر کنٹرول ایک حد تک ہی مؤثر تھے۔ ہر جگہ بلیک مارکیٹ کو فروغ تھا۔ جنگ کے دوران میں انتظامیہ میں عارضی بھرتی کثرت سے ہوئی اور دیانت اور اہلیت میں زوال آگیا۔ ٹیکسوں کی ادائیگی میں بڑے وسیع پیمانے پر ہیر پھیر ہوتا تھا۔ لامحالہ جنگ کے دوران میں خطیر منافع اندوزی ہوئی اور ہند کے تاجروں اور کاروباری لوگوں نے (جو زیادہ تر ہندو تھے) اس صورتِ حال سے پورا فائدہ اٹھایا۔ ہند کے مفلس عوام کو اس منافع اندوزی کی بڑی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ قیمتوں میں مسلسل اضافے سے تنخواہ دار اور اُجرت پیشہ لوگوں کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اگرچہ زرعی پیداوار کی قیمتیں چڑھ جانے سے بڑے زمینداروں نے خوب ہاتھ رنگے لیکن عام کسانوں اور مزارعین نے بہت مصیبت جھیلی۔ جنگ سے ماقبل زمانے کے مقابلے میں روپیہ کی قوتِ خرید عشرِ عشیر رہ گئی۔ سول انتظامیہ اور فوج پر اخراجات میں پہلے معمول سے کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ ہند اور برطانیہ کے مابین جنگ کے اخراجات کی تقسیم کے بارے میں جو سمجھوتہ ہوا تھا اس کی میعاد ۳۱ مارچ ۱۹۴۷ء کو ختم ہوگئی۔ اس تاریخ کے بعد دفاع کے تمام اخراجات ہند کی ذمہ داری قرار دیے گئے۔ آئندہ سال کے لیے دفاعی اخراجات کا تخمینہ ۲۰۰ کروڑ ۸۰ لاکھ روپے تھا۔ جنگ سے پہلے یہ خرچ صرف ۴۵ کروڑ روپے سالانہ تھا۔ ابھی تک افراطِ زر کا دور دورہ تھا اور فاضل خرچ کو تخلیقِ زر سے پورا کرنے کی صورت میں یہ حالت بدتر ہوجاتی اس سے بھی زیادہ اہم عنصر یہ تھا کہ عوام کی معاشی بہتری اور سماجی انصاف کی خواہش ہمہ گیر ہوگئی تھی" ان اٹھتی توقعات کے انقلاب" کی تسکین کے لیے حکومت کو جن وسائل کی ضرورت تھی، وہ معاشرے کے امیر طبقوں سے ہی حاصل کیے جا سکتے تھے۔

وزیرِ خزانہ لیاقت علی خان نے اپنی بجٹ تقریر میں واضح کیا کہ اگر ٹیکسوں کی موجودہ شرح برقرار

رکھی جائے تو دفاع کے لیے ۷۰ کروڑ ۷۰ لاکھ روپے اور سول انتظامیہ کے لیے ۱۳۹ کروڑ ۲۰ لاکھ روپے مہیا کرنے کے بعد بجٹ میں ۴۴ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے کا خسارہ ہو گا۔ انہوں نے معیشت کی حالت بیان کی اور سٹرلنگ بقایاجات سے متعلق مسائل اور زمانہ مابعد جنگ میں تعمیر و ترقی کے لیے منصوبہ بندی کی تشریح کی اور ریزرو بنک کو قومی ملکیت میں لینے اور حصص، اجناس اور سونے چاندی کی منڈیوں میں سٹہ بازی پر کنٹرول کرنے کی تجاویز پیش کیں۔ اس کے بعد انہوں نے مرکزی اسمبلی کے سامنے اپنی بجٹ تجاویز کی تفصیل پیش کی۔ انہوں نے وضاحت سے بتایا کہ ان تجاویز کا تعلق صرف مالیاتی امور سے نہیں ہے، بلکہ بعض معاشرتی مقاصد سے بھی ہے :-

"جو ان سب لوگوں کو اچھی طرح پیش نظر رکھنے چاہئیں، جن کے دلوں میں اس برصغیر کے ان گنت لوگوں کی بہبود کا جذبہ موجزن ہے...... ہند خیرہ کن تضادات اور ناہمواریوں کی سرزمین ہے...... حالیہ جنگ سے جو حالات پیدا ہوئے ہیں انہوں نے ان ناہمواریوں کو شدید تر بنا دیا ہے، امیر امیر تر بن گئے ہیں، اور غریب پہلے سے بھی زیادہ غریب ہو گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دولت کم سے کم تر ہاتھوں میں مرتکز ہوتی گئی ہے، اس دولت سے بڑے سرمایہ داروں نے کاروبار، کمپنیوں، عوامی مفاد کے اداروں اور پریس پر تصرف حاصل کر لیا ہے۔ اور لامحالہ ان کی گرفت بہ حیثیت مجموعی ملک کی معاشی زندگی پر اور محکم ہو گئی ہے جہاں چند اشخاص کو عوام پر اس قدر وسیع اختیار حاصل ہو جائے، وہاں سماجی انصاف کے اصولوں کی نفی ہو جاتی ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں، جو نجی ملکیت کی تنسیخ اور دولت میں مکمل مساوات کو تمام خرابیوں کا واحد علاج قرار دیتے ہیں لیکن قرآن حکیم کے اس حکم پر میرا ایمان ہے کہ دولت کی گردش صرف امیروں کے درمیان ہی نہیں رہنی چاہیے۔ قرآن حکیم نے افراد کے ہاتھوں میں اکتناز زر کے خلاف بڑا سخت انتباہ کیا ہے۔ یہ ہے وہ پس منظر جس میں میری بجٹ تجاویز مرتب کی گئی ہیں۔ میں اس سے زیادہ دعوے نہیں کر سکتا کہ یہ تجاویز سماجی انصاف اور تعمیر و ترقی کی پالیسی کا محض اولیں مرحلہ ہیں۔ سالہاسال چاہئیں تا آنکہ یہ پالیسی

پوری طرح بارآور ہو۔"

وزیرِ خزانہ نے جس پالیسی کا ذکر کیا، اس پر عمل درآمد کے لیے پہلی تجویز یہ تھی کہ ٹیکس چوری سے جمع کی ہوئی دولت کے بارے میں تحقیقات کرنے کے لیے ایک کمیشن قائم کیا جائے۔

ٹیکسوں کے بارے میں جو تجاویز پیش کی گئیں، ان میں پہلی دو سے آمدنی میں کمی ہونے والی تھی۔ ایک تجویز کے تحت نمک پر محصول منسوخ کر دیا گیا، اور دوسری تجویز کے ذریعہ انکم ٹیکس سے استثنا کے لیے آمدنی کی حد ۲ ہزار روپے سے بڑھا کر اڑھائی ہزار روپے کر دی گئی۔ نمک پر محصول کے خلاف ایجی ٹیشن کی تاریخ بڑی طویل تھی۔ یہ زندگی کی ایک بنیادی ضرورت پر ٹیکس تھا، اور اس لحاظ سے رجعت پسندانہ تھا کہ امیر اور غریب دونوں کے لیے ایک ہی شرح تھی۔ گاندھی نے ۱۹۳۰ء میں اپنی سول نافرمانی کی تحریک اسی محصول کے سوال پر شروع کی تھی، لیکن وہ چند ساحلی علاقوں کے سوا اس ٹیکس کو منسوخ کرانے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ مسلم لیگ کے وزیرِ خزانہ نے اب وہ کام سرانجام دیا، جس کے لیے کانگرس کا رہنما جد و جہد کرتا رہا تھا۔

ان دو تجاویز پر عمل درآمد سے آمدنی میں ۸ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے کی کمی ہو جاتی تھی اور بجٹ میں خسارہ ۷۵ کروڑ روپے تک بڑھ جاتا تھا، وزیرِ خزانہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس خسارے کا بیشتر حصہ براہِ راست ٹیکس لگانے سے پورا کرنا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے جو نئے ٹیکس تجویز کیے یا ٹیکسوں کی شرح میں اضافے کی تجویز پیش کی، ان سے ۴۴ کروڑ روپے کی آمدنی حاصل ہو سکتی تھی، اس رقم میں سے صوبوں کو ان کے حصے کے طور پر ۴ کروڑ روپے ادا کیے جانے تھے۔

وزیرِ خزانہ کی سب سے اہم تجویز یہ تھی کہ ایک لاکھ سے متجاوز کاروباری منافعوں پر ۲۵ فیصد سپیشل انکم ٹیکس نافذ کیا جائے۔ زائد منافع پر ٹیکس جنگ کے دوران میں بھی عائد رہا تھا، لیکن ایک سال قبل اسے منسوخ کر دیا گیا تھا۔ مگر افراطِ زر میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی اور زمانہ مابعد جنگ میں کساد بازاری کے خدشات درست ثابت نہیں ہوئے تھے۔ ملک میں اہل الرائے اصحاب متفق تھے کہ زائد منافع پر ٹیکس کی تنسیخ قبل از وقت تھی۔ وزیرِ خزانہ نے کاروباری منافعوں پر جس ٹیکس کے نفاذ کی تجویز پیش کی اس پر عمل درآمد زائد منافع پر ٹیکس کے مقابلے میں نسبتاً آسان تھا اور اس کا اطلاق بھی زیادہ منصفانہ تھا۔ اس ٹیکس کا اطلاق ایسے پیشوں اور کاروبار پر بھی ہوتا تھا۔ جو زائد منافع پر ٹیکس سے مستثنیٰ تھے۔ اس ٹیکس سے ۲۰ کروڑ روپے

حاصل ہونے کی توقع تھی۔

اگلی تجویز یہ تھی کہ سرمایے میں ۵ ۵ ہزار روپے سے زائد افزائش پر ایک تدریجی ٹیکس لگایا جائے اس سے ۳ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے حاصل ہونے تھے۔ چند برس سے سرمایے میں بہت افزائش ہوئی تھی، لیکن وہ انکم ٹیکس کے دائرۂ کار سے باہر تھی۔ اس وقت تک ہند میں ٹیکس کا ڈھانچہ برطانیہ کے نمونے پر تھا جہاں سرمایے میں افزائش پر ٹیکس عائد نہیں ہوتا تھا۔ دوسری تجاویز یہ تھیں، کارپوریشن ٹیکس کی شرح ایک آنے سے بڑھا کر دو آنے کر دی جائے (اس سے چار کروڑ روپے کی آمدنی متوقع تھی) سُوپر ٹیکس کی بلند ترین شرح عائد ہونے کی حدکم کر دی جائے (اس سے ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے حاصل ہونے تھے) اور چائے پر برآمدی محصول دو آنے فی پونڈ سے بڑھا کر چار آنے فی پونڈ کر دیا جائے (اس سے چار کروڑ روپے حاصل ہونے تھے)

ان تجاویز کے بعد بھی ۷ کروڑ روپے کا خسارہ باقی رہ جاتا تھا۔ ان کے علاوہ وہ مزید اخراجات بھی خسارے میں اضافے کا موجب بن سکتے تھے، جو مرکزی تنخواہ کمیشن کی سفارشات سے پیدا ہونے والے تھے۔ وزیر خزانہ نے اپنی تقریر ان الفاظ پر ختم کی :-

> "جنگ سے صلح کی عبوری حالت ہر ملک کی معیشت کو عظیم اور کٹھن مسائل سے دوچار کر دیتی ہے۔ ہمارے ملک میں ان مسائل سے بڑھ چڑھ کر انگریزوں سے اہلِ ہند کے ہاتھوں میں انتقالِ اقتدار کا مسئلہ بھی ہے..... اگر ہم اس مسئلے سے تدبر اور حوصلہ مندی کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکیں اور پُرامن، منصفانہ اور آبرومندانہ سمجھوتہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں، تو پھر ہم اس وسیع و عریض برصغیر کے لاتعداد لوگوں کو مستقبل میں ترقی اور خوشحالی کی ضمانت دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

وزیر خزانہ کی ان تجاویز کا مرکزی اسمبلی کے سارے حلقوں نے پُرجوش خیر مقدم کیا۔ کانگرس کے بہت سے ارکان کی زبانوں پر "پہلا قومی بجٹ" اور "غریب آدمی کا بجٹ" کے الفاظ تھے اور اخبارات میں بھی ان کی صدائے بازگشت سنی گئی۔ لیکن تحسین و آفرین کا یہ مرحلہ دیرپا ثابت نہ ہوا۔ اور لیاقت علی کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ برک کا یہ قول کس قدر صداقت پر مبنی تھا: "انسانوں کے بس کی بات نہیں کہ ٹیکس لگائیں اور ہر دلعزیز بھی رہیں یا عشق کریں اور عقلمند کہلائیں۔" ان تجاویز کے خلاف سرمایہ داروں نے (جو

زیادہ تر ہندو تھے) طوفان برپا کر دیا۔ بجٹ کی تجاویز نے ان کے سب سے زیادہ نازک مقام کو ٹھیس لگائی تھی یعنی ان کی جیبوں کو۔ مزید خرابی یہ ہوئی کہ وہ اس بجٹ کو مسلم لیگی وزیر خزانہ کی طرف سے انہیں تباہ و برباد کر دینے کی دیدہ دانستہ کوشش قرار دینے لگے۔ بے پناہ شور و غل مچا۔ چائے کے باغات کے انگریز مالکان جو چائے پر زیادہ برآمدی محصول سے متاثر ہوئے تھے، وہ بھی اس ہنگامے میں شریک ہو گئے۔ امیروں میں سراسیمگی کی لہر دوڑ گئی۔ ملک میں تقریباً تمام حصص کے بازاروں نے اپنا کاروبار معطل کر دیا۔

کانگرس پارٹی کی مالی ضروریات ہندو سرمایہ دار پوری کرتے رہے تھے، اور اس کے بدلے انہوں نے کانگرس کی طرف سے بدیشی اشیاء کے مقاطعے کی تحریکوں سے بڑا نفع کمایا تھا۔ ہندو پروپیگنڈہ یہ رنگ جماتا تھا کہ کانگرس کی طاقت کا سرچشمہ ہند کے عوام ہیں، لیکن اس حقیقت پر بڑی احتیاط سے پردہ ڈالا جاتا تھا کہ کانگرس کی قوت کی بنیاد سرمایہ داروں کی مالی امداد ہے۔ ہندو سرمایہ داروں کی مدد کے بغیر کانگرس کسی طرح اتنی بھاری بھرکم تنظیم نہیں بن سکتی تھی، اور کانگرس کی حمایت کے بغیر ہندو تاجر اس قدر بے پایاں منافع اندوزی نہیں کر سکتے تھے۔ سرمایہ دار یہ معلوم کر کے سخت برافروختہ ہوئے، کہ جس کابینہ میں کانگرس کو غلبہ حاصل ہے اس نے اس نوعیت کی تجاویز کو منظور کر ڈالا۔

کانگرس کی طرف سے پٹیل فنڈ جمع کرتا رہا تھا، اور ان تاجروں نے لاکھوں کروڑوں روپے اسے دیے تھے۔ وہ بھاگم بھاگ اس کے پاس پہنچے، اور اس پر بے وفائی کا الزام دھرا۔ وہ رنج و غم کے عالم میں یہ پوچھتے تھے کہ کانگرس نے کس طرح یہ تجاویز منظور کر لیں، جن کی سب سے زیادہ زد خود ان کے مالی مددگاروں پر پڑتی تھی؟ پٹیل نے دیکھا کہ کانگرس کو روپے پیسے کے کال پڑنے کا خطرہ لاحق ہے۔ وہ پہلے ہی کافی عرصہ سے محکمہ خزانہ کی روک ٹوک سے جلا ہوا تھا، لیکن یہ تو ضرب کاری تھی۔ چنانچہ وہ لیاقت علی خان کی تجاویز کی اٹل مخالفت پر ڈٹ گیا، اور انہیں واپس لینے کا مطالبہ کیا۔ مگر لیاقت علی خان ثابت قدم رہے۔ ماضی میں وزیر خزانہ کی تجاویز کو اسمبلی میں پیش ہونے کے بعد کبھی کابینہ نے رد نہیں کیا تھا۔

چند قابل احترام مستثنیات سے قطع نظر سارا ہندو پریس ہندو سرمایہ داروں کی مدد کے لیے دوڑ پڑا۔ وہی لوگ جو پہلے ان تجاویز پر تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کر رہے تھے، اب بلا تکلف ان کی مذمت کرنے لگے۔ کانگرس کا موقف یہ تھا کہ وہ ایک سوشلسٹ تنظیم ہے جو عوام کی بہبود کے لیے وقف ہے۔ اب اس موقف کی حقیقت کھل کر سامنے آگئی۔ اس سے پہلے کبھی کانگرس اس طرح بے نقاب نہیں ہوئی

تھی۔ کانگرس اپنا اصلی روپ دکھانے پر مجبور ہو گئی کہ وہ بڑے تاجروں اور صنعت کاروں کی پشت پناہ ہے۔ اس کے برعکس مسلم لیگ کے بارے میں یہ بات عیاں ہو گئی کہ وہ سماجی انصاف اور مساوات پر مبنی معاشرے کے لیے کوشاں ہے، حالانکہ اس سے پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ مسلم لیگ تو ایک رجعت پسند جماعت ہے جو بڑے زمینداروں اور اسی قسم کے دوسرے عناصر کی نمائندہ ہے۔ یہ تجاویز انقلابی نوعیت کی نہیں تھیں بلکہ ایک عادلانہ معاشرتی نظام کے قیام کے لیے پہلے قدم کی حیثیت رکھتی تھیں۔ لیکن ان سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشمکش میں ایک اور جہت کا اضافہ ہو گیا۔ ہندوؤں کے سرمایہ دار طبقے نے یہ محسوس کیا کہ ملک کے سیاسی اقتدار میں اگر مسلمانوں کو بھی کوئی حصہ مل گیا، تو وہ لازماً معاشرتی اصلاحات، مساواتِ مواقع اور دولت اور آمدنی کی تقسیم میں کمتر ناہمواری کے طرفدار ہوں گے۔ کانگرس اور مسلم لیگ کے کارِ منصبی میں اس اچانک تبدیلی سے بہت لوگ حیران و پریشان ہو گئے۔ ہندو پراپیگنڈا بازوں نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ مسلم لیگ کا مقصد مخلصانہ ہے، انہیں بجٹ کی ان تجاویز میں ہندوؤں کی معاشی قوت تباہ و برباد کرنے کا خفیہ منصوبہ نظر آیا۔

ماضی میں معمول یہ تھا کہ وزیرِ خزانہ اپنی بجٹ تجاویز پر صرف وائسرائے کے ساتھ ہی مفصل تبادلہ خیالات کرتا تھا۔ وائسرائے کی منظوری حاصل کرنے کے بعد وہ انہیں کابینہ میں اپنے رفقائے کار کے سامنے پیش کرتا تھا، اور یہ کام صرف اس دن صبح کو کیا جاتا تھا، جس دن ان تجاویز کو اسمبلی کے سامنے پیش کرنا ہوتا تھا۔ یہ رسم رازداری کے تحفظ کے لیے اختیار کی گئی تھی۔ اس طرح کابینہ کی طرف سے بجٹ تجاویز کی توثیق گویا ایک رسمی کارروائی ہوتی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں وائسرائے نے وزیرِ خزانہ سے کہا کہ اپنی بجٹ تجاویز پر اس سے تبادلہ خیالات نہرو کی موجودگی میں کیا جائے۔ نہرو کے کہنے پر متھائی بھی اس موقع پر موجود تھا۔ متھائی ایک نہایت تجربہ کار ماہرِ معاشیات تھا، وہ حکومتِ ہند کا اقتصادی مشیر بھی رہ چکا تھا، اور بعد میں ٹاٹا کی عظیم الشان فرم کا ڈائریکٹر بن گیا تھا۔ عبوری کابینہ میں مسلم لیگ کی شمولیت سے پہلے وزارتِ خزانہ کا قلمدان اسی کے سپرد تھا۔ اس طرح ان بجٹ تجاویز پر لیاقت علی خان نے وائسرائے، نہرو اور متھائی سے تبادلہ خیالات کیا تھا اور ان کی منظوری حاصل کر لینے کے بعد ہی انہیں عام معمول کے مطابق کابینہ کے سامنے رکھا گیا تھا۔

ان تجاویز کے متعلق کابینہ کا پہلا ردِعمل بڑا موافق اور سازگار تھا۔ ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے: ”کانگرس اپنی اس پالیسی کا اعلان کرتی رہی تھی کہ معاشی ناہمواریوں کو دور کرنا چاہیے، اور سرمایہ دارانہ معاشرے کی جگہ

بتدریج ایک سوشلسٹ نظام معرضِ وجود میں لانا چاہیے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم سب اس بات کے سخت آرزومند تھے کہ دولت میں مساوات روز بروز بڑھائی جائے اور جملہ ٹیکس چوروں کا پورا مواخذہ کیا جائے۔ اس لیے اصولاً ہم لیاقت علی خان کی تجاویز کے خلاف نہیں تھے"۔[۱] کابینہ نے ایک بھی اختلافی رائے کے بغیر بجٹ کی توثیق کر دی۔

لیکن جب سرمایہ داروں نے واویلا کیا تو کابینہ میں بڑے ہنگامے ہوئے۔ سردار پٹیل اور شری ایچ۔ پی اجاری تو خاص طور پر بجٹ کے شدید مخالف تھے، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ لیاقت علی کو ملکی مفاد سے اتنا سروکار نہیں جتنا کہ صنعت کاروں اور تاجروں کو ستانے سے ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس کا اصل منشا تجارت پیشہ طبقے کو نقصان پہنچانا ہے، جن کی اکثریت ہندو ہے"۔[۲] باہر سے بھی شدید دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔ ایوان ہائے صنعت و تجارت کے فیڈریشن نے بجٹ تجاویز کے خلاف بڑی تیز مہم شروع کر دی، اور اپنی مخالفت میں یہاں تک بڑھ گئے کہ انہوں نے ایک متبادل بجٹ بھی تیار کر ڈالا۔ البتہ ملک میں سنجیدہ اور متین اہل الرائے اصحاب نے تسلیم کیا کہ وزیر خزانہ کی بجٹ تجاویز معقول ہیں، اور ان کی بدولت آمدنی میں ناہمواریاں کم کرنے میں مدد ملے گی۔ بمبئی یونیورسٹی کے پروفیسر معاشیات سی۔ این وکیل نے بجٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

> "افراطِ زر کی وجہ سے جنگ کے اخراجات غربا کو ہی بڑھتی ہوئی قیمتوں کی صورت میں برداشت کرنے پڑے۔ اس طریقِ کار نے امیروں کو امیر تر بننے میں مدد دی، نہ صرف یہ بلکہ امیروں کا ایک نیا طبقہ پیدا ہو گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ٹیکسوں کی ادائیگی میں ہیر پھیر اور بلیک مارکیٹ کی پرورش کے بعض طریقے اس قدر عام ہو گئے، کہ انہیں تقریباً قدرتی سمجھا جانے لگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ معاشرے کے نادار لوگ اور خاص طور پر درمیانہ طبقوں کے لوگ بتدریج کچل دیے گئے"۔[۳]

لیاقت علی خان پر یہ الزام بھی لگایا گیا کہ انہوں نے اپنی بجٹ تجاویز سے کانگرس کے دائیں اور بائیں بازوؤں کے درمیان رخنہ اندازی کی ہے۔ فرقہ وارانہ عزائم تو کھلے بندوں ان کی طرف منسوب کیے جاتے تھے۔ لیکن جیسا کہ ہفت روزہ انڈین فنانس نے واضح کیا "یہ بات بالکل ناگزیر ہے کہ ٹیکس کے ہر نظام میں اقلیت کی نسبت اکثریت پر زیادہ بار ڈالا جائے، اور اگر کسی فرقے میں دوسروں کے مقابلے میں امیروں کا تناسب زیادہ ہو، تو پھر وزیر خزانہ کے لیے ایسی کارروائی سے احتراز کرنے کا کوئی جواز نہیں، جو وہ فرقہ وارانہ تعصب سے کلیتہً بری ہونے کی صورت میں بھی کر گزرتا"۔[۴]

دسمبر ۱۹۴۶ء میں لندن سے واپس آنے کے بعد لیاقت علی خان نے مجھ سے یہ پوچھا کہ آیا آئندہ بجٹ کے متعلق میں کوئی تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ وہ محض روایتی بجٹ پیش کرنا چاہتے ہیں یا ایک ایسا بجٹ جو طرح نو انداختن کا مصداق ہو اور معاشرتی و معاشی مقاصد کا آئینہ دار ہو۔ انہوں نے دوسری صورت کو ترجیح دی، اور چند دن کے بعد میں نے ان کی خدمت میں ایک تو یہ تجویز پیش کی کہ جنگ کے دوران میں ارتکازِ دولت کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا جائے اور مذکورۂ بالا ٹیکسوں کی بڑی بڑی تجاویز بھی پیش کیں۔ ان تجاویز کو مرتب کرنے اور انہیں بجٹ کے ڈھانچے میں شامل کرنے کا اعزاز پرنسپل سیکرٹری سر سیرل جونز اور محکمہ خزانہ کے دوسرے اعلیٰ افسروں کو ملنا چاہیے۔ جب انگریز اور ہندو سرمایہ داروں نے بجٹ کی تجاویز پر حملے شروع کیے تو یہ حضرات ان تجاویز کی حمایت میں ثابت قدم رہے اس کی وجہ محض یہ نہیں تھی کہ وہ اپنے سیاسی سربراہ کے وفادار رہنا چاہتے تھے۔ بلکہ وہ صدق دل سے اس امر کے قائل تھے کہ یہ تجاویز درست ہیں۔ اور سابقہ بجٹوں سے بہت بہتر ہیں۔ اس سے پہلے جو بجٹ مرتب ہوتے تھے؛ ان کا واحد مقصد اتنی آمدنی حاصل کرنا ہوتا تھا کہ جس سے انتظامیہ کے اخراجات پورے ہو جائیں۔ وہ معاشرتی ضروریات اور اقتصادی ترقی کے تخیلات سے نا آشنا تھے۔

جب ان تجاویز پر مشتمل بل (مسودہ ہائے قانون) سیلکٹ کمیٹی کے سپرد کیے گئے، تو کانگرسی ارکان بشمول ان ارکان کے جو اپنے بائیں بازو کے رجحانات کے لیے مشہور تھے، اٹل مخالفت پر تل گئے اور سیلکٹ کمیٹی میں کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ وزیر خزانہ نے ان تجاویز کی حمایت بڑی جرأت کے ساتھ کی۔ لیکن ان کا رویہ اوّل سے آخر تک معقول تھا، اور وہ مصالحت کی ایسی صورت قبول کرنے کے لیے تیار تھے، جس سے تجاویز کے بنیادی خط و خال تو محفوظ رہیں البتہ ان کے اثرات میں کچھ نرمی آجائے۔ بالآخر سمجھوتے کی راہ نکل آئی۔ ۲۵ مارچ ۱۹۴۷ء کو اسمبلی میں سمجھوتے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لیاقت علی خان نے کہا کہ "حکومت کی یہ خواہش ہے کہ بجٹ تجاویز کی حمایت ایوان کے ہر طبقہ کی طرف سے کی جائے، لہٰذا سیلکٹ کمیٹی کے پیش کردہ بلوں میں بھی حکومت ترامیم قبول کرنے کے لیے آمادہ ہے۔" ترامیم حسب ذیل تھیں:-

> "تجارتی منافعوں کے ٹیکس کے بل میں چھ اور پانچ فیصد کی تخفیف کے بجائے چھ فیصد کی یکساں شرح قابلِ قبول ہوگی۔ جہاں تک ٹیکس کی شرح کا تعلق ہے، ۲۵ فیصد کی جگہ ½۱۶ فیصد کی شرح حکومت کو منظور ہوگی۔ سرمایے میں افزائش

پرٹیکس کے بارے میں حکومت ایسی ترمیم قبول کرنے کے لیے تیار ہے، جس کے
تحت ذاتی اثاثوں کو سرمایے میں افزائش سے خارج قرار دیا جائے گا۔"

جب کسی حد سے زیادہ گاڑھے محلول میں ایک بلوری ذرہ ڈال دیا جاتا ہے تو بہت سرعت سے وہ محلول بلور سازی شروع کر دیتا ہے۔ ہند کی گھنگھور سیاسی گھٹا میں لیاقت علی کے بجٹ نے کچھ ایسا ہی عمل کیا۔ ملک کے مختلف حصوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کسی اعلان کے بغیر جو خانہ جنگی جاری تھی، کابینہ میں کانگرس اور مسلم لیگ بلاکوں میں جو نزاع تھی' اور محکمہ خزانہ کی پالیسیوں پر کانگرس جس طرح پیچ و تاب کھا رہی تھی' ان کی وجہ سے اعصاب میں ناقابلِ برداشت حد تک کھچاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ ان سب پر مستزاد لیاقت علی خان کا بجٹ آیا، جس کے باعث کابینہ کے اندر اور باہر کئی تلخ لڑائیاں لڑی گئیں۔ ہندو سرمایہ داروں نے پٹیل کو بتایا کہ متحدہ ہند میں غربت زدہ مسلمان سماجی انصاف کے نام پر ہندوؤں کی دولت میں حصہ پانے کا مسلسل تقاضا کرتے رہیں گے' اور یہ ہوا ہندوؤں کے سر پر سوار رہے گا۔ اس لیے جتنی جلدی مسلمانوں کو ہندوؤں سے جدا کر دیا جائے اسی قدر بہتر ہوگا۔

پٹیل نفسیاتی طور پر تقسیم کے لیے تیار تھا۔ چنانچہ حسب معمول وہ اپنے عزم کو بروئے کار لانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے: "کانگرسیوں میں تقسیم کا سب سے زیادہ حامی سردار پٹیل تھا۔۔۔۔۔ اس نے جھنجھلاہٹ اور مجروح انانیت کے باعث اپنا سارا وزن تقسیم کی حمایت کے پلڑے میں ڈال دیا۔ ہر قدم پر وہ یہی محسوس کرتا تھا کہ لیاقت علی خان نے وزیر خزانہ بن کر اسے بے بس کر کے رکھ دیا ہے۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ پاکستان کی نئی مملکت زندہ رہنے کے قابل نہیں، اور زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکے گی" [۵]
بجٹ کی جنگ شروع ہونے کے صرف تین دن بعد ۴ مارچ کو پٹیل نے بمبئی میں اپنے ایک دوست کو لکھا "اگر مسلم لیگ پاکستان پر اصرار جاری رکھتی ہے، تو پھر واحد متبادل صورت پنجاب اور بنگال کی تقسیم ہے ۔۔ ایک مضبوط مرکز جس کے تحت سارے ہند کو خودمختاری حاصل ہو۔ مشرقی بنگال، پنجاب کے ایک ٹکڑے سندھ اور بلوچستان کے استثنا سے بھی ایسا مرکز اس قدر طاقتور ہوگا کہ بالآخر باقی ماندہ حصے اس میں آملیں گے" [۶]
پٹیل کے سیرت نگار نے لکھا ہے "اپنی عجیب و غریب دوراندیشی سے سردار پٹیل اس حتمی فیصلے پر پہنچا کہ اگر ملک تقسیم نہ کیا گیا تو ساری سرزمین میں افراتفری اور لاقانونیت پھیل جائے گی۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی نے حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اختیار کیا اور پٹیل سے اتفاق رائے کیا" [۷] ۸ مارچ کو کانگرس ورکنگ کمیٹی نے ایک

قرارداد منظور کی، جس میں گزشتہ سات مہینوں سے ہند میں تشدد کے واقعات کا حوالہ دینے کے بعد کہا "ان المناک حادثات نے ظاہر کر دیا ہے کہ جبر و تشدد اور دباؤ سے پنجاب کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا، اور نہ ہی دباؤ اور جبر پر مبنی کوئی انتظام دیرپا ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لیے کسی ایسے راستے کا پتہ لگانا ضروری ہے، جس میں کم سے کم جبر ہو۔ اس سے پنجاب کو دو صوبوں میں منقسم کرنے کی ضرورت پیش آئے گی تاکہ غالب مسلم اکثریت کا حصہ غالب غیر مسلم اکثریت والے حصے سے علیحدہ ہو جائے"۔ [۴] کانگرس کے صدر نے واضح کیا کہ بنگال کے لیے بھی انہی خطوط پر تقسیم زیرِ غور ہے۔

یہ قرارداد کانگرس کے فکر و نظر میں بنیادی تبدیلی کا پہلا بیّن نشان تھی۔ ملک بھر میں بہت وسیع پیمانے پر اس کی یہی تعبیر کی گئی کہ کانگرس نے تقسیم ہند منظور کر لی ہے۔ درحقیقت اس سے کوئی اور منطقی نتیجہ نہیں نکل سکتا تھا۔ اگر ہندو پنجاب اور بنگال کے صوبوں میں بھی مسلم اکثریت کو برداشت نہیں کر سکتے، تو مسلمانوں سے یہ توقع عبث تھی کہ وہ سارے برصغیر میں ہندو اکثریت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں گے۔ صرف پانچ صوبے ایسے تھے، جن میں مسلمان اکثریت میں تھے ـــــ شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ، بلوچستان، پنجاب اور بنگال۔ اوّل الذکر تین کی آبادی نسبتاً بہت کم تھی اور ان میں ہندو اقلیت نہ صرف عددی اعتبار سے کم تھی، بلکہ سارے صوبے کے طول و عرض میں بکھری ہوئی تھی۔ اس کے برعکس بنگال اور پنجاب کے دو بڑے صوبوں میں غیر مسلم آبادی نصف سے اُوپر تھی۔ پنجاب میں غیر مسلم صوبے کے مشرقی حصے میں اکثریت میں تھے اور بنگال کے مغربی حصے میں۔ مارچ کی قرارداد جس میں کانگرس نے غیر مسلم اکثریت والے علاقوں کی علیحدگی کا مطالبہ کیا، دراصل ہند کی تقسیم کا پیش خیمہ تھی۔ نہرو نے ۲۰ اپریل کو آل انڈیا سٹیٹس پیپلز کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے یہ بات پوری طرح واضح کر دی۔ اس نے کہا "کانگرس نے حال ہی میں عملی وجوہ کے پیشِ نظر ایک قرارداد منظور کی ہے، جس میں ملک کی تقسیم کو قبول کر لیا گیا ہے۔" چند دنوں کے بعد نہرو نے یہ کہا "مسلم لیگ اگر پاکستان چاہتی ہے، تو وہ لے سکتی ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ ہند کے ایسے حصے نہ لے جائے جو پاکستان میں شامل نہیں ہونا چاہتے"۔ [۵]

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس زمانہ میں گاندھی بہار میں تھا۔ اور اس نے پنجاب کی تقسیم کے بارے میں قرارداد کا ذکر پہلی بار اخبارات میں پڑھا۔ پیارے لال کے بیان کے مطابق گاندھی سے نہ پہلے مشورہ کیا گیا تھا، اور نہ ہی اسے پہلے سے خبردار کیا گیا تھا۔ اس نے ۲۰ مارچ کو نہرو کو ایک خط میں لکھا کہ "میں ان وجوہ سے لاعلم ہوں۔ جو ورکنگ کمیٹی کی اس قرارداد کی محرک ہوئی ہیں"۔ پٹیل کے نام خط میں گاندھی نے لکھا

کر "میں تو اسے سمجھنے سے قاصر ہوں"۔ پیارے لال نے اس ضمن میں بڑی حیرت سے یہ سوال کیا ہے " کانگرس ہائی کمان جو تقسیم کے تصور پر بھی لعنت بھیجتی تھی آخر کس بات نے انہیں غیر منقسم ہند کے نصب العین سے دستکش ہونے پر آمادہ کیا۔ جس کے لیے انہوں نے اور کانگرس نے اتنی مشقت اٹھائی تھی اور اتنی قربانیاں دی تھیں۔ اور طرفہ یہ کہ اپنے نفس ناطقہ کو رسمی طور پر بھی نہیں پوچھا"۔ لیکن گاندھی اور اس کے وفادار سیکرٹری کو نہرو یا پٹیل کی طرف سے کبھی ان سوالوں کا صاف گوئی سے جواب نہیں ملا۔ ؎

اسی زمانہ میں کانگرس ورکنگ کمیٹی نے ایک اور قرارداد منظور کی جس میں حکومت برطانیہ کے ۲۰ فروری والے بیان کا خیر مقدم کیا، اور یہ مطالبہ کیا کہ عبوری حکومت کو "عملاً ڈومینین حکومت کی مانند تسلیم کرلیا جائے، جسے سروسز اور انتظامیہ پر مؤثر کنٹرول حاصل ہو اور وائسرائے حکومت کے آئینی سربراہ کی حیثیت سے کام کرے مرکزی حکومت کو لازماً اس طریقے سے کام کرنا چاہیے کہ کابینہ کے پاس مکمل اختیار اور ذمہ داری ہو"۔ دوسرے الفاظ میں کابینہ میں کانگرسی اکثریت کے حکم کا سکہ رواں ہونا چاہیے اور وائسرائے محض آئینی سربراہ کے طور پر اکثریت کے فیصلوں پر عمل درآمد کرائے۔ ورکنگ کمیٹی نے اس قرارداد میں کابینہ مشن پلان کی نام نہاد منظوری کا بھی اعادہ کیا اور مسلم لیگ کو آئین ساز اسمبلی میں شامل ہونے کی ازسرنو دعوت دی۔ قرارداد میں کہا گیا کہ "آئین ساز اسمبلی جو آئین مرتب کرے گی، اس کا اطلاق صرف ان علاقوں پر ہوگا جو اسے منظور کریں گے۔ یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ جو صوبہ یا صوبے کا حصہ آئین کو منظور کرے گا اور متحدہ ہند میں شامل ہونے کا خواہاں ہوگا، اسے ایسا کرنے سے نہیں روکا جا سکے گا۔ اس طرح کسی طرف سے بھی جبر نہیں ہونا چاہیے"۔ اس قرارداد کے آخر میں آل انڈیا مسلم لیگ کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ کانگرس کے نمائندوں سے مذاکرات کے لیے اپنے نمائندے نامزد کرے تا کہ جو صورت حال پیدا ہو گئی ہے، اس کا جائزہ لیا جا سکے، اور اس سے عہدہ برآ ہونے کی تدبیر کی جا سکے"۔ ؎

کانگرس کے لیڈروں کو معلوم تھا کہ مسلم لیگ کے آئین ساز اسمبلی میں شامل ہونے کا کوئی امکان نہیں الّا یہ کہ کانگرس غیر متوقع طور پر اپنی پالیسی یکسر تبدیل کر دے اور اخلاص اور طیب خاطر کے ساتھ کابینہ مشن پلان کو منظور کر لے۔ نہرو نے ۹ مارچ کو یہ قراردادیں وائسرائے لارڈ ویول کے پاس بھجوا دیں اور یہ لکھ دیا کہ اگر مسلم لیگ آئین ساز اسمبلی میں شامل نہ ہوئی، تو پنجاب اور بنگال کی تقسیم ناگزیر ہو جائے گی۔ معاملہ اٹل ہو چکا تھا، اور ہند کی تقسیم ناگزیر ہو گئی تھی۔

باب ۶

مونٹ بیٹن کا مشن

لارڈ مونٹ بیٹن، ہند کا آخری گورنر جنرل اور وائسرائے ۲۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو دہلی پہنچ گیا۔ وہ یہ مشن لے کر آیا تھا کہ جون ۱۹۴۸ء تک برطانیہ سے اہلِ ہند کے ہاتھوں پرامن انتقالِ اقتدار کا اہتمام کردے۔ وزیرِاعظم اٹیلی نے پارلیمنٹ میں کہا "یہ ایسا مشن نہیں جس سے بقول کسے ہم پر بے وفائی کی تہمت آتی ہو بلکہ یہ تو ہند میں ہمارے مشن کی تکمیل ہے۔" اس سے مونٹ بیٹن کو فوراً اپنے تمام پیشروؤں پر بے پایاں فوقیت حاصل ہوگئی۔ چونکہ مونٹ بیٹن کے پیشروؤں کو ایسے واشگاف اور غیر مبہم اعلان کی تائید حاصل نہیں تھی، اس لیے ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ برِصغیر ہند کے لوگوں کی آرزوئیں پوری کردیں گے۔

مونٹ بیٹن ہند سے ناآشنا نہیں تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں وہ جنوب مشرقی ایشیا میں اتحادی افواج کا سپریم کمانڈر رہ چکا تھا۔ چونکہ ہند ان افواج کی رسدگاہ تھا اس لیے وہ کئی بار ہند آچکا تھا۔ وہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا، اور اسے بڑی شدت سے یہ احساس تھا کہ اس کی رگوں میں شاہی خون ہے۔ وہ ذہنی اور جسمانی توانائی کا پیکر تھا، صاحبِ جمال زیبا تھا اور ۴۶

سال کی عمر میں وہ اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے پورے شباب پر تھا۔ وہ فطری سحر و کشش سے بھی مالامال تھا اور اس سے پورا فائدہ اٹھاتا تھا۔ اپنے فرائض کی بجا آوری میں اُسے لیڈی ماؤنٹ بیٹن کی شائستگی اور رعنائی سے بھی بڑی مدد ملی۔ وہ کمال درجے کا خوش گفتار تھا اور بحث مباحثے میں کسی سے دبنے والا نہیں تھا۔ مستقل مزاجی، لچک اور خوش تدبیری میں بہت کم لوگ اس کے ہمسر تھے۔ وہ شہرت اور تشہیر کا دلدادہ تھا اور اکثر سیاستدانوں سے کہیں زیادہ تعلقات عامہ کے فروغ کا خیال رکھتا تھا۔ قوت و توانائی سے لبریز ہونے کے باعث وہ کبھی تکان یا افسردگی کا شکار نظر نہیں آتا تھا۔ ہر جگہ وہ مقناطیسی قوت کا حامل معلوم ہوتا تھا۔ اس قوت کی سب سے بڑی کلید خود اعتمادی تھی۔ وہ ہر مشکل پر قابو پانے کا عزم رکھتا تھا، خواہ اس میں اسے خود کتنی زحمت ہو یا دوسروں کا کتنا زیاں ہو۔ ان بہت بڑی خوبیوں کے ساتھ وہ اسی قدر خود پسند اور خود بیں بھی تھا۔ اسے عظمت کے حصول کی اس قدر حرص تھی کہ وہ اس باطنی توازن سے بہرہ ور نہیں ہو سکا تھا، جو انسانی روح کو دیانت و صداقت عطا کرتا ہے۔

ماؤنٹ بیٹن کو جو ہدایات دے کر بھیجا گیا تھا، اس کی تفصیل وزیر اعظم ایٹلی نے ایک خط میں یوں بیان کی تھی:

"ملک معظم کی حکومت کا واضح اور متعین مقصد برطانوی ہند اور ریاستوں کے لیے ایک متحدہ حکومت کا قیام ہے جو بحد امکان برطانوی دولت مشترکہ میں شامل ہو۔ یہ مقصد ایک ایسی آئین ساز اسمبلی کے ذریعے حاصل کیا جائے گا جس کے قیام اور کارروائی کی اساس کابینہ مشن پلان ہو۔ تمہیں پوری کوشش کرنی چاہیے کہ سارے فریق اس مقصد کے لیے مل جل کر کام کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ چونکہ برطانوی ہند کی حد تک اس منصوبے پر عمل درآمد کا انحصار بڑی پارٹیوں کے سمجھوتے پر ہے، اس لیے ان دونوں میں سے کسی کو بھی اسے ماننے پر مجبور کرنا خارج از بحث ہے۔ اگر یکم اکتوبر ۱۹۴۷ء تک تم یہ محسوس کرنے لگو کہ ریاستوں کے تعاون سے یا اس کے بغیر برطانوی ہند کے لیے ایک متحدہ حکومت کے قیام کی کوئی امید نہیں تو پھر تمہیں ملک معظم کی حکومت کو رپورٹ

> بھیجنی چاہیے کہ تمہارے خیال میں مقررہ تاریخ تک اقتدار منتقل کرنے کے لیے کیا اقدامات ضروری ہیں ...... تمہیں یہ مقصد پیش نظر رکھنا چاہیے کہ یکم جون ۱۹۴۸ء تک پوری طرح اقتدار منتقل ہو جائے ...... برطانوی اقتدار کے انخلا کے لیے جو قدم اٹھائے جائیں ان سب میں ہند کے لیڈروں کا پورا پورا تعاون حاصل کرنا چاہیے ..... تمہیں ہر موقع پر اس امر کی اہمیت جتانی چاہیے کہ انتقالِ اقتدار میں ہند کے دفاعی تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھنا لازم ہے۔ اس ضمن میں اولین قدم یہ ہے کہ تم ہند کے لیڈروں کو یہ بات ذہن نشین کرا دو کہ ہند کی افواج کے تسلسل میں کسی رخنہ اندازی سے احتراز کرنا اور دفاعی تنظیم کو کل ہند اساس پر برقرار رکھنا نہایت ضروری ہے۔ دوسرا اہم کام یہ ہے کہ تم علاقہ بحر ہند کے دفاع میں برطانیہ اور ہند کے درمیان مشترک عمل جاری رکھنے کی ضرورت پوری طرح واضح کر دو تاکہ دونوں ملکوں کے درمیان معاہدے سے بھی اس امر کا انصرام ہو سکے۔ مناسب وقت پر ملک معظم کی حکومت ایسے فوجی اور دوسرے ماہرین کو بھی ہند بھیجنے کے لیے تیار ہو گی جو اس قسم کے معاہدے کی شرائط طے کرنے میں مدد دے سکیں گے۔"

یہ خط غور و خوض سے مطالعے کا مستحق ہے، کیونکہ یہ حکومت برطانیہ کی طرف سے ہند کے آخری وائسرائے کے لیے پالیسی کا ہدایت نامہ ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب یہ خط لکھا گیا تھا، حکومت برطانیہ کو ذاتی تجربے سے معلوم ہو چکا تھا کہ کانگرس کو کابینہ مشن پلان کا پابند بنانے کی تمام مساعی ناکام ہو چکی ہیں اور صوبوں کی کسی گروپ بندی کے بغیر کانگرس کے پیش نظر ایک مضبوط متحدہ حکومت کا جو منصوبہ ہے، وہ مسلم لیگ کے لیے یکسر ناقابل قبول ہے۔ اگر اس مرحلے پر بھی برطانوی حکومت ہند میں ایک متحدہ حکومت کے قیام پر تلی ہوئی تھی اور کسی واضح متبادل صورت کا خاکہ مرتب کرنے سے گریزاں تھی — واحد متبادل صورت تقسیم ہی تھی — تو اس کی وجہ کچھ تو برطانیہ کے اپنے مفادات تھے اور کچھ لیبر پارٹی کا رجحان تھا۔

ایک برطانوی مورخ کے الفاظ میں لیبر پارٹی کا سیاسی رجحان مرکزیت اور منصوبہ بندی

میں اس کا اعتقاد' ایک سوشلسٹ مملکت کے بارے میں اس کا نظریہ۔ یہ سب باتیں لیبر پارٹی کے لیڈروں کو کانگرس کے بائیں بازو کی طرف پہلے سے ہی راغب کرچکی تھیں تقسیم ہند' ایک علیحدہ مسلم مملکت کے لیے مسلم لیگ کے مطالبے سے وہ اگر متنفر نہیں تھے تو کم از کم انہیں یہ ناگوار ضرور تھا''۔ [۳۵]

برطانیہ کے مفادات بھی اسی رجحان کے متقاضی تھے۔ انگریز اپنی افرادی قوت اور مادی وسائل کے وسیع استعمال کے بغیر ہند میں اپنی حکومت برقرار نہیں رکھ سکتے تھے اور دوسری عالمی جنگ کے بعد برطانیہ کی معاشی حالت ان اخراجات کی متحمل نہیں تھی۔ یہ خیال صحیح نہیں کہ انگریز چونکہ ہند میں اپنے اقتدار سے دستبردار ہو رہے تھے' اس لیے یہاں ان کا کوئی مفاد باقی نہیں رہا تھا۔ درحقیقت انگریزوں کے مفادات عالمگیر تھے اور ان میں مستقبل کا ہند ایک اہم عنصر تھا۔ لامحالہ انہوں نے اپنے مفاد کو ہند کے عوام اور پارٹیوں کے مفادات پر ترجیح دینی تھی۔ اگر ہند کے لیڈروں کی رضامندی سے وہ ایک متحدہ حکومت کو اقتدار منتقل کر سکتے تو ان کا یہ مقصد اغلباً پورا ہو جاتا کہ نیا ہند برطانوی دولت مشترکہ میں شامل رہے۔ سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے یہ بات ایک ایسی قوم کے لیے بڑی اہم تھی' جو روایت کے تسلسل کو بڑی قدر وقیمت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور منفعت بخش تجارت کو عزیز تر رکھتی ہے۔

برطانوی سلطنت کے دفاعی تقاضے بھی ہند کی افواج کو سالم ومتحد رکھ کر ہی بہترین صورت میں پورے کئے جا سکتے تھے۔ دونوں عالمی جنگوں میں مشرق وسطیٰ اور جنوب مشرقی ایشیا میں برطانوی مفادات کے تحفظ میں ہند کی افواج نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ درحقیقت بحر ہند کے علاقے میں ہند کی افواج ہی انگریزوں کے ہاتھ میں تسلط کا سب سے بڑا ہتھیار تھیں۔ ان افواج کی تقسیم سے جو خلا پیدا ہوتا' اسے انگریزوں کے اپنے کم شدہ وسائل سے پورا کرنا ازحد مشکل تھا۔ یہ تھے وہ اسباب جن کی بنا پر ایٹلی نے مونٹ بیٹن کے نام اپنے خط میں اس بات پر زور دیا کہ ''ہند کی افواج کے تسلسل میں کسی رخنہ اندازی سے احتراز کرنا اور دفاعی تنظیم کو کل ہند اساس پر برقرار رکھنا نہایت ضروری ہے''۔ افواج ہند کی تقسیم کے تصور سے ہی برطانیہ کے اہل الرائے فوجی سخت دہشت زدہ ہو جاتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ بات فوجی اعتبار سے غلط اور انتظامی لحاظ سے ناقابلِ عمل تھی۔

تقسیم ہند جس سے برطانیہ کے ان سب مفادات کو خطرہ تھا' اس کی مخالفت طاقت ور اگریزی

فرقہ کر رہا تھا۔ تقسیم ملک سے ہندو کانگرسی لیڈر برافروختہ ہو جاتے اور شاید وہ انگریزوں سے ہر قسم کے روابط ختم کر دیتے۔ کمزور تر فریق کی حیثیت سے پاکستان برطانوی دولتِ مشترکہ میں شمولیت کے لیے آمادہ بلکہ خواہاں ہوتا لیکن اس سے ہندوستان کے ساتھ تعلقات اور بگڑ جاتے اور اگر دونوں ملک ہی دولتِ مشترکہ سے باہر رہنے کی راہ اختیار کرتے تو تاجِ برطانیہ کا سب سے درخشاں ہیرا ہاتھ سے نکل جاتا۔ اور اس سے برطانیہ کی عالمی حیثیت اور وقار کو جو نقصان پہنچتا وہ بے حد و حساب ہوتا۔ برطانیہ کی تجارت کو گھاٹا ہوتا اور سٹرلنگ بقایاجات ایسے کٹھن مسائل کے حل میں تعاون کا حصول بہت دشوار ہو جاتا۔ الغرض سیاسی، اقتصادی اور فوجی ہر اعتبار سے تقسیمِ ہند برطانیہ کے لیے بے ڈھب مسائل پیدا کر دیتی اور مشرق میں ان کی حیثیت کو ضعف پہنچاتی۔

انتقالِ اقتدار کے لیے جون ۱۹۴۸ء کی تاریخ مقرر کرنے سے ایک اور نوعیت کے مسائل بھی پیدا ہو گئے تھے۔ مارچ ۱۹۴۷ء سے جون ۱۹۴۸ء تک کی میعاد لاتعداد سیاسی، آئینی اور انتظامی فیصلوں کے لیے بہت ہی کم مہلت تھی۔ کیا بالآخر ونسٹن چرچل کے الفاظ کے مطابق "شرمناک فرار" اور "عاجلانہ شکست و ریخت" تک نوبت پہنچنے والی تھی، جس کے تمام تر نتائج و عواقب کا ہند کے لوگوں نے ہدف بننا تھا؟ اگر ایسا ہوا تو اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہو گی؟ یہ ایسے سوالات ہیں کہ جو مورخ بھی ان واقعات پر قلم اٹھائے گا، اس کے لیے ان کا جواب دینا لازم ہے۔

علاوہ ازیں ایک اور ایسا مسئلہ بھی تھا جس کا کوئی واضح حل نظر نہیں آتا تھا۔ انگریزوں نے بلاشبہ برطانوی ہند میں جمہوری اداروں کی نشوونما بڑی توجہ کے ساتھ کی تھی لیکن انہوں نے ریاستوں میں شخصی اقتدار کو برقرار ہی نہیں بلکہ اپنے سایۂ عاطفت میں رکھا تھا لیکن یہ سرپرستی اس وقت تک ہی چل سکتی تھی جب تک کہ برطانوی ہند میں ان کا اقتدار قائم تھا۔ لازم تھا کہ انتقالِ اقتدار سارے کے سارے برصغیر میں مکمل طور پر سرانجام ہو۔ وگرنہ اس کی آن جاتی رہتی اور نئے سرے سے شکوک و شبہات پیدا ہو جاتے لیکن اس سے جانشین حکومت یا حکومتوں اور ریاستوں کے درمیان باہمی تعلقات کا مشکل مسئلہ پیدا ہو جاتا تھا۔ کیا جمہوریت اور شخصی اقتدار کو ایک ہی آئینی ڈھانچے میں مربوط کیا جا سکتا تھا؟

حکومتِ برطانیہ ان سب پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کے لیے نئے وائسرائے کی طرف

دیکھ رہی تھی اور سب سے زیادہ وہ ایسے حل کی خواہاں تھی جس سے انگریزوں کے سیاسی، اقتصادی مفادات کا پورا تحفظ بھی ہو جائے اور برطانیہ کی افرادی قوت اور دولت کے وسائل پر کوئی مزید بار بھی نہ پڑے۔ ہند پر اپنی طرف سے کوئی حل ٹھونسنے کی نہ ان کی منشا تھی اور نہ قدرت۔ اور نہ ہی عدل و انصاف کی خاطر وہ اپنے مفادات کو خطرے میں ڈالنا چاہتے تھے۔ حکومت برطانیہ کسی نئی پالیسی کی تلاش میں بھی سرگرداں نہیں تھی۔ جون ۱۹۴۸ء تک انتقالِ اقتدار کی پالیسی تو طے ہو چکی تھی۔ اصل سوال یہ تھا کہ اس پالیسی پر کس طرح عمل درآمد کیا جائے کہ اگر ممکن ہو تو برطانوی مفادات کو تقویت پہنچے لیکن کسی عنوان انہیں نقصان نہ پہنچے۔ یہی وجہ تھی کہ حصولِ مقصد کے لیے حکومت برطانیہ نے ایک نئی شخصیت کی تلاش شروع کی — ایک ایسی شخصیت جو سابق وائسرائے سے زیادہ لچک دار اور اثر پذیر ہو۔ اس شخصیت کو نہ صرف کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان ثالث کا کردار ادا کرنا تھا بلکہ ریاستوں کے حکمرانوں کے ساتھ بھی کسی نہ کسی قسم کی مطابقت پیدا کرنی تھی۔ لیکن ثالث بے لوث فریق نہیں تھا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے دورِ وائسرائی میں اس کے پریس اتاشی ایلن کیمبل جانسن نے لکھا ہے کہ "اس کا اصلی مقصد ایک ایسے حل کا حصول ہے جس سے ہند کی پارٹیوں میں اتنے خوشگوار جذبات پیدا ہوں کہ وہ ابتداً سے ہی برطانوی دولت مشترکہ کے اندر رہنے پر آمادہ ہو جائیں گے" اس کی اپنی اور حکومت برطانیہ کی نگاہ میں اس کی کامیابی کا معیار یہی تھا کہ وہ اس بنیادی مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے ماؤنٹ بیٹن کو مامور کیا تھا ان کا قوی رجحان ہند کی دو بڑی پارٹیوں میں سے زیادہ طاقت ور یعنی کانگرس کی طرف تھا اور وہ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے بہت خواہشمند تھے۔ ماؤنٹ بیٹن کو بھی اس ترجیح کا علم تھا اور اس کا ذاتی رجحان بھی اسی طرف تھا۔ بہر حال اس جیسا زیرک اور جاہ طلب انسان کسی دوسرے راستے پر گامزن نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر کانگرس پارٹی کی منزلِ مقصود اور ماؤنٹ بیٹن کے بنیادی مقصد میں ایک ظاہری مغایرت تھی۔ کانگرس کی تحریک پر آئین ساز اسمبلی نے جو قرارداد مقاصد منظور کی تھی، اس کی رو سے کانگرس اتحادیہ ہند (انڈین یونین) کو ایک آزاد و خود مختار جمہوریہ بنانے کی پابند ہو گئی تھی۔ اس زمانے میں دولت مشترکہ خود مختار نو آبادیات (ڈومینیوں) اور برطانیہ کے محکوم علاقوں پر مشتمل تھی اور اس میں کسی جمہوریہ کے لیے

آئینی گنجائش نہیں تھی۔ کانگرس کو دولت مشترکہ کے اندر رہنے پر آمادہ کرنا مونٹ بیٹن کے لیے سب سے بڑا اور اہم مسئلہ تھا۔

جب مونٹ بیٹن ہند میں پہنچا' اس وقت بنگال اور سندھ میں مسلم لیگی وزارتیں کام کر رہی تھیں۔ پنجاب میں انگریز گورنر کا راج تھا۔ باقی سب صوبوں میں بشمول شمال مغربی سرحدی صوبہ اور آسام کانگرس برسر اقتدار تھی۔ دونوں موخر الذکر صوبوں میں مسلم لیگ نے صوبائی حکومتوں کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک شروع کر رکھی تھی اور علی الخصوص شمال مغربی سرحدی صوبے میں کانگرسی وزارت کا حال بڑا پتلا تھا۔ عبوری مرکزی حکومت میں کانگرس اور مسلم لیگ بلاکوں میں خوب ان بن تھی۔

ملک بھر میں فرقہ دارانہ کشیدگی تھی۔ کہیں کہیں فسادات بھی ہو رہے تھے اور بمبئی اور بعض دوسرے مقامات پر کئی بار کافی وسیع جانی نقصان ہوا تھا۔ خاص طور پہ پنجاب میں فرقہ دارانہ جذبات کھول رہے تھے۔ سکھ ہتھیار جمع کرنے میں سرگرم تھے اور انتقام لینے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ چونکہ ہند کی افواج میں زیادہ تر سپاہی پنجاب ہی بہم پہنچاتا تھا — جنگ سے پہلے ۴۸ فیصد — یہ اندیشہ بھی تھا کہ پنجاب کے دیہاتی علاقوں میں فرقہ دارانہ فساد سے ان فوجی دستوں کا نظم وضبط تباہ ہو جائے گا' جن میں پنجابی مسلمان اور سکھ دونوں شامل ہیں۔

آئین ساز اسمبلی کا کام جاری تھا لیکن مسلم لیگ نے اسمبلی کا پورا مقاطعہ کر رکھا تھا۔ کانگرس کوشش کر رہی تھی کہ مسلم لیگ کی صفوں میں پھوٹ ڈال دے۔ نہرو نے ۲۴ فروری ۱۹۴۷ء کو گاندھی کے نام ایک خط میں لکھا تھا: "سردست ہمارا مطمح نظر یہ ہے کہ بعض مسلم لیڈروں سے نجی طور پر رجوع کیا جائے تاکہ انہیں آئین ساز اسمبلی میں آنے پر آمادہ کیا جا سکے۔"[۲۹] پنجاب اور بنگال سے ہندو اور سکھ' اور شمال مغربی سرحدی صوبے اور آسام سے کانگرسی وزارتوں کے نمایندے بھی آئین ساز اسمبلی کے کام میں حصہ لے رہے تھے۔ آئین ساز اسمبلی کابینہ مشن پلان کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کام کر رہی تھی۔ نہ وہ حصوں میں تقسیم ہوئی تھی اور نہ ہی گروپ بندی کے لیے اس کا کوئی ارادہ تھا۔ اس کی طرف سے جو مختلف کمیٹیاں بنائی گئی تھیں' وہ بھی اسی نیت سے کام کر رہی تھیں' چنانچہ کمیٹی برائے اختیاراتِ اتحادیۂ ہند نے جو سفارشات پیش کیں' ان میں نہ صرف کابینہ مشن پلان کے تحت مرکزی حکومت

کے لیے مخصوص معاملات — امورِ خارجہ، دفاع اور مواصلات — کی بڑی وسیع تعبیر کی گئی، بلکہ چودہ مزید معاملات کو بھی مرکزی حکومت کے دائرہ اختیار کے لیے لازمی قرار دیا گیا اور ان میں مزید آٹھ معاملات بھی شامل کر دیے گئے کیونکہ اتحادیۂ ہند کے طول و عرض میں تجارت اور کاروبار میں یکساں معیار قائم کرنے کے لیے وہ ضروری تھے۔

بایں ہمہ کابینہ مشن پلان کے بنانے والوں کے دلوں میں اگر اب بھی اپنے منصوبے کے ... کے بارے میں کوئی خوش گمانی باقی رہ گئی تھی تو وہ کانگرس کی ۸ مارچ ۱۹۴۷ء کی قرارداد سے دور ہو جانی چاہیئے تھی۔ اس قرارداد میں پنجاب کی تقسیم کا واضح مطالبہ تھا اور بالواسطہ اس کا اطلاق بنگال کی تقسیم اور لہٰذا سارے برصغیر کی تقسیم پر ہوتا تھا۔ اپنے ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کے بیان میں کابینہ مشن نے "ایک علیحدہ اور مکمل طور پر آزاد و خود مختار پاکستان" کے سوال کا جائزہ لیا تھا، جو "دو علاقوں پر مشتمل ہوگا ایک شمال مغرب میں پنجاب، سندھ، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور برطانوی بلوچستان کو شامل کئے ہوئے اور دوسرا شمال مشرق میں بنگال اور آسام کو لیے ہوئے"۔

اس امر کی صراحت کے بعد کہ شمال مغربی علاقے میں غیر مسلموں کی آبادی کا تناسب ۳۷،۹۳ فی صد ہوگا، اور شمال مشرقی علاقے میں ۴۸،۳۱ فی صد — کابینہ مشن نے کہا تھا کہ انہیں "اس بات کا کوئی جواز نظر نہیں آتا کہ پنجاب اور بنگال و آسام کے ان اضلاع کو ایک آزاد و خود مختار پاکستان میں شامل کیا جائے، جن کی آبادی کی غالب اکثریت غیر مسلم ہے۔ جو بھی دلیل پاکستان کے حق میں پیش کی جاسکتی ہے، ہمارے خیال میں اسے بعینہٖ غیر مسلم علاقوں کو پاکستان سے علیحدہ رکھنے کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے.... لیکن ایسے پاکستان کو مسلم لیگ بالکل ناقابلِ عمل قرار دیتی ہے.. خود ہمارا بھی پختہ یقین ہے کہ مسئلے کا وہ حل جس سے پنجاب اور بنگال منقسم ہو جاتے جو ان صوبوں کے بیشتر باشندوں کی خواہشات اور مفادات کے منافی ہوگا"۔ مزید انتظامی، اقتصادی اور فوجی پہلوؤں کا ذکر کرنے کے بعد کابینہ مشن نے اس بحث کو یوں ختم کیا "اس لیے ہم حکومتِ برطانیہ کو یہ مشورہ نہیں دے سکتے کہ جو اقتدار اس وقت برطانیہ کے پاس ہے، اسے دو بالکل علیحدہ و خود مختار مملکتوں کو منتقل کر دیا جائے"۔

دوسری طرف کابینہ مشن کو مسلمانوں کے ان بہت ہی حقیقی خدشات کا بھی پورا احساس تھا

کہ متحدہ ہند میں جہاں ہندو اپنی بھاری اکثریت کے باعث غالب عنصر ہوں گے مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت اور سیاسی اور سماجی زندگی بالکل دب کر رہ جائے گی۔ اس لیے انہوں نے ایک بین بین تجویز پیش کی۔ یعنی کابینہ مشن پلان۔ لیکن کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کی عدم قبولیت کے باعث یہ منصوبہ بھی ناکام ثابت ہوا۔ اور آئینی مسئلے کو حل کرنے کے لیے فقط تقسیم ہند کی تجویز باقی رہ گئی۔

مسلم لیگ کی ۱۹۴۰ء والی قرارداد کے مطابق جو عام طور پر قرارداد پاکستان کے نام سے مشہور ہے "پاکستان ایسے جغرافیائی طور پر متصل" علاقوں پر مشتمل ہونا تھا "جن میں مسلمان عددی اعتبار سے اکثریت میں ہیں جیسا کہ ہند کے شمال مغرب اور شمال مشرق کے خطوں میں ہیں .... ایسے علاقائی ردوبدل کے ساتھ جو ضروری ہو" ہندوؤں اور انگریزوں دونوں نے اور کئی مسلمانوں نے بھی اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ قرارداد پاکستان سے پنجاب، بنگال اور آسام کی سرحدوں میں ردوبدل کا پہلو نکلتا ہے۔ ردوبدل کی مقدار معرض بحث میں آسکتی تھی، لیکن ردوبدل کے اصولوں کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ کانگرس کی طرف سے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا مطالبہ ان صوبوں کے مسلمانوں کے لیے خواہ کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو لیکن اس مطالبے کی پشت پر قرارداد پاکستان کی منطق تھی۔

کانگرس کا رویہ عملاً یہ تھا کہ کابینہ مشن پلان پر کما حقہٗ عملدرآمد کے بجائے وہ ایک کٹا پھٹا پاکستان تسلیم کرنے کو ترجیح دے گی۔ کانگرس کے بعض لیڈروں کو یہ امید تھی کہ جب مسلم لیگ کو ایک کٹے پھٹے پاکستان سے دوچار کیا جائے گا، تو وہ کابینہ مشن پلان کی وہ مسخ شدہ صورت بھی قبول کر لے گی، جو کانگرس پیش کرتی تھی لیکن یہ محض خوش فہمی تھی۔ اگر سوال کٹے پھٹے پاکستان اور اصلی کابینہ مشن پلان کے درمیان انتخاب کا ہوتا، تو لیگ موخرالذکر کا انتخاب کر سکتی تھی۔ لیکن اگر سوال کٹے پھٹے پاکستان اور کانگرس کے نظریہ کے مطابق متحدہ ہند کے درمیان انتخاب کا تھا، تو پھر کٹا پھٹا پاکستان ہی قابلِ ترجیح تھا۔ الغرض مارچ ۱۹۴۷ء سے کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کے لیے ہی کٹا پھٹا پاکستان قابلِ قبول تھا۔ اگرچہ ان میں کوئی ایک بھی بہ طیبِ خاطر اسے پسند نہیں کرتا تھا۔

اس طرح جب مونٹ بیٹن نے بطور وائسرائے اور گورنر جنرل اپنے فرائض سنبھالے تو اس سے پہلے ہی تقسیم کا مسئلہ طے ہو چکا تھا اور بہت بڑے مسائل درپیش تھے لیکن ان کا تعلق تقسیم کے اصول سے

نہیں تھا بلکہ تقسیم کے وقت طریقہ کار اور حدود سے تھا۔

ان مسائل پر کانگرس اور مسلم لیگ کے نقطۂ نظر میں بڑی وسیع خلیج حائل تھی۔ مسلم لیگ کے نزدیک برصغیر کی دو آزاد و خود مختار مملکتوں۔ ہندوستان اور پاکستان۔ میں تقسیم ایک بالکل منصفانہ مطالبہ تھا جس سے نہ ہندوؤں کے حقوق کی خلاف ورزی ہوتی تھی اور نہ مسلمانوں کے حقوق کی، بلکہ ہر ایک قوم کو اس کا جائز حق ملتا تھا۔ دونوں مملکتوں میں اقلیتیں پھر بھی رہیں گی، اور انہیں نہ صرف بطور شہری کے مساوی حقوق حاصل ہوں گے بلکہ ان کی تہذیب و ثقافت کے لیے مناسب تحفظات ہوں گے۔ مسلم لیگ کی نگاہ میں برصغیر کی تقسیم گویا دو بھائیوں کے درمیان جائیداد کی تقسیم تھی۔ جسے مناسب سوچ بچار کے ساتھ پر امن اور منصفانہ طور پر پایۂ تکمیل تک پہنچنا چاہیے تاکہ کسی فریق کو بھی نقصان اور گزند نہ پہنچے۔ مسلمانوں کے نزدیک ہند سے رخصت ہونے والے حکمرانوں کا آخری کام یہ ہونا چاہیے تھا کہ دونوں بھائیوں کے درمیان جن میں ایک بھائی دوسرے سے کمزور تھا انصاف کا پورا اہتمام کیا جائے تاکہ انتقالِ اقتدار امن اور انصاف سے طے ہو جائے۔ صرف اسی صورت میں دو صدیوں کی حکمرانی کے بعد جس کے دوران میں انہوں نے عظمت و دولت کا عروج پایا، انگریز عزت اور شرافت کے ساتھ رخصت ہو سکیں گے۔

لیکن کانگرس نے تقسیم کو غم و غصہ کے ساتھ قبول کیا تھا۔ ہندوؤں کو اس بات پر بڑی مایوسی تھی کہ جب سارے برصغیر پر ان کا غلبہ ہونے والا تھا، عین اس وقت یہ نعمت ان کے ہاتھ سے نکل گئی۔ وہ اس خیال میں تھے کہ انیسویں صدی کی بڑی طاقتوں کی طرح وہ بھی ایک عظیم طاقت کے روپ میں دنیا کے سٹیج پر آنے والے ہیں۔ ستمبر ۱۹۴۶ء میں جب نہرو نے عبوری کابینہ میں وزیر امور خارجہ کا عہدہ سنبھالا تھا، تو اس نے برملا کہا تھا "دنیا میں صرف چار بڑی طاقتیں ہیں۔ امریکہ، روس، چین اور ہند۔" اس فہرست سے برطانیہ کا نام غائب تھا۔ غالباً اس لیے کہ نئے ہند کو مشرق میں برطانیہ کا جانشین تصور کر لیا گیا تھا۔ اس سے پہلے ۱۹۴۵ء میں نہرو نے اپنی کتاب تلاش ہند میں یہ اعلان کیا تھا کہ مستقبل میں بحر اوقیانوس کی جگہ بحرالکاہل دنیا کا اعصابی مرکز بننے والا ہے۔ اگرچہ ہند براہ راست بحرالکاہل کے کنارے نہیں، لیکن وہاں پر ہند لازماً وقیع اثر و رسوخ بروئے کار لائے گا۔ بحر ہند کے علاقے میں، جنوب مشرقی ایشیا میں اور مشرق وسطیٰ تک ہند کو اقتصادی

اور سیاسی مرکز کی اہم حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ اگر ہند کے دونوں طرف واقع ملکوں۔ ایران، عراق، افغانستان، ہند، سیلون، برما، ملایا، سیام، جاوا وغیرہ۔ کی علاقائی گروپ بندی ہو تو اقلیت کے آج کل جو مسائل ہیں، وہ یا تو نابود ہو جائیں گے یا ان پر بالکل نئے سیاق و سباق میں سوچ بچار کرنی ہو گی کیونکہ چھوٹی قومی ریاست مٹ جانے کو ہے۔ ثقافتی طور پر خود مختار علاقے کی حیثیت سے تو یہ زندہ رہ سکتی ہے لیکن ایک آزاد و خود مختار مملکت کے طور پر نہیں"[۵] بایں ہمہ اس نئے سامراج کے عظیم نظریہ باز کو ایک آزاد خود مختار پاکستان آج کل کے اقلیتی مسائل کے حل کے طور پر قبول کرنا پڑ رہا تھا۔ ایسے تلخ حقائق سے کانگرس کے پندار کو سخت ٹھیس لگتی تھی اور اس میں جذبہ انتقام ابھر آتا تھا۔

جنرل ٹکر نے لکھا ہے کہ اس وقت

"ہندوؤں کی اکثریت کا انداز فکر انتقامی تھا۔۔۔۔۔ ان کی باتوں کا لب لباب یہ تھا: اچھا! اگر مسلمان پاکستان چاہتے ہیں تو اسے لے لیں اور اس کی پاداش بھی بھگتیں۔ جہاں تک ممکن ہو گا ہم ان کے علاقہ کا ایک ایک انچ کاٹ لیں گے تاکہ پاکستان نہ صرف احمقانہ حرکت معلوم ہو بلکہ زندہ رہنے کے قابل نہ رہے اور جب بچا کھچا انہیں مل جائے گا تو پھر ہم اس قسم کا بندوبست کریں گے کہ پاکستان اقتصادی طور پر پنپ نہ سکے"۔[۶]

نومبر ۱۹۴۹ء میں آئین ساز اسمبلی میں سردار پٹیل کی ایک تقریر سے بھی جنرل ٹکر کے ان تاثرات کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ تقریر زیر بحث واقعات کے دو سال بعد کی گئی لیکن اس کے باوجود اس میں انتقام کا جذبہ پوری طرح کارفرما تھا۔ اپنی تقریر کے دوران میں پٹیل نے کہا "میں نے آخری چارہ کار کے طور پر تقسیم کو مانا تھا جب ہم سب کچھ کھو دینے کو تھے۔۔۔۔ مسٹر جناح کٹا پھٹا پاکستان ہرگز نہیں چاہتے تھے لیکن انہیں یہ تلخ نوالہ نگلنا ہی پڑا۔ میں نے یہ مزید شرط بھی لگا دی تھی کہ صرف دو ماہ کے عرصہ میں اقتدار منتقل کر دینا ہو گا"[۷]

کانگرس کا تقسیم قبول کر لینا ایک جنگی چال تھی لیکن اس سے اُس کے اصل مقصد۔ سارے برصغیر پر حکومت۔ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس مقصد کے حصول کا پورا پورا انتظام کرنے کے لیے ضروری تھا کہ:-

۱۔ ہندوستان یا انڈین یونین کو حکومت برطانیہ کا ہند میں واحد جانشین تسلیم کیا جائے اور پاکستان کے ساتھ علیحدہ شدہ علاقوں کے مانند سلوک کیا جائے۔

۲۔ پاکستان میں شامل ہونے والے علاقے حتی الوسع کم سے کم ہوں اور مشرقی بنگال مغربی پنجاب سندھ اور بلوچستان تک محدود رہیں اور شمال مغربی سرحدی صوبہ ان میں شامل نہ ہونے پائے۔ اگر ممکن ہو تو پاکستان کے گرداگرد جنگی نقطۂ نظر سے گھیرا ڈال دیا جائے۔

۳۔ وقت اور وسائل ۔سول اور فوجی افرادی قوت اور مادی وسائل ۔ کے اعتبار سے پاکستان کے قائم ہونے اور مستحکم بننے کی راہ میں زیادہ سے زیادہ رکاوٹیں ڈالی جائیں۔ یعنی پاکستان کو اپنے قیام اور استحکام کے لیے کم سے کم وقت اور وسائل میسر آئیں۔

۴۔ پاکستان کو جینے کے ناقابل بنانے کے لیے جو کچھ بھی کیا جا سکے اس سے احتراز نہ کیا جائے (کانگرسی لیڈروں کو پورا الیقین تھا کہ پاکستان زیادہ عرصہ تک برقرار نہیں رہ سکے گا۔ ان کی آرزو اور کوشش یہ تھی کہ اس کی معیشت کی تباہی و بربادی بسرعت تمام ہو)

۵۔ ریاستوں کو انڈین یونین میں مدغم کر دیا جائے۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے کانگرسی لیڈروں کو انگریزوں کی امداد کی ضرورت تھی جن کے ہاتھ میں اب تک انتظامیہ اور افواج کی باگ ڈور تھی۔ سب سے زیادہ کانگرس اس امر کی خواہاں تھی کہ اقتدار فوراً اسے منتقل کر دیا جائے۔ ایٹلی کی حکومت کانگرس کی خواہش کو پورا کرنے پر آمادہ تھی لیکن یہ محسوس کیا جاتا تھا کہ ہند میں حکومت برطانیہ کے نمائندے لارڈ ویول نے مسلم لیگ کو عبوری حکومت میں لا کر کھیل بگاڑ دیا ہے۔ اب نیا وائسرائے آ گیا تھا اور یہ دیکھنا تھا کہ وہ کیا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے۔ جیسا کہ بعد کے واقعات سے ظاہر ہوا' اس نے کانگرسی لیڈروں کی توقعات سے بڑھ چڑھ کر کام کیا' اور تاریخ ہند کی تاریخ میں اپنے لیے شہرت دوام حاصل کر لی۔ وہ کامیابی کا اس قدر دلدادہ تھا کہ ان مقتدر افراد کو ناراض کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا جنہوں نے اس کے پیشرو کو برطرف کرا دیا تھا۔ وہ باریک بینی اور حیلہ گری میں ہندو لیڈروں کی ٹکر کا نہیں تھا جو فن حکمداری کی مشہور زمانہ کتاب ارتھ شاستر کے مصنف کوٹلیا کی روح سے پوری طرح سرشار تھے۔ کوٹلیا جس کے سامنے میکیاولی بھی ایک طفلِ مکتب ہے۔

ماؤنٹ بیٹن اپنے ساتھ انگلستان سے جو عملہ لے کر آیا تھا' اسے بڑی احتیاط سے منتخب کیا گیا تھا۔ اس عملہ میں لارڈ اسمے جیسا ممتاز شخص بھی شامل تھا' جو دوسری جنگ عظیم میں ونسٹن چرچل کا ذاتی فوجی مشیر رہ چکا تھا اور سر ایرک میول بھی تھا' جو پہلے لارڈ ولنگڈن کا پرائیویٹ سیکرٹری تھا اور پھر شاہ جارج ششم کا اسسٹنٹ پرائیویٹ سیکرٹری بنا تھا۔ یہ افراد لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے فوجی اور سول امور میں خصوصی مشیر تھے اور لارڈ اسمے سارے عملے کے چیف آف سٹاف کے طور پر فرائض ادا کرتا تھا۔ ایلن کیمبل جانسن پریس اتاشی بن کر آیا۔ کیپٹن بروک مین پرسنل سیکرٹری اور کرنل ارسکاین کیرم کانفرنس سیکرٹری تھے۔ ان کے علاوہ انڈین سول سروس کا ایک انگریز افسر جارج ایبل تھا جو پہلے سے ہی وائسرائے کا پرائیویٹ سیکرٹری تھا' اور ان مصاحبین کا سلسلہ ایک ہندو افسر وی' پی مینن سے مکمل ہوتا تھا' جو گورنر جنرل کا آئینی مشیر تھا۔

ماؤنٹ بیٹن کا معمول یہ تھا کہ وہ اپنے خاص عملے کے ساتھ اکثر غیر رسمی محفلیں منعقد کرتا تھا' جن میں تمام مسائل پر پوری آزادی کے ساتھ اور کسی ذہنی تحفظ کے بغیر تبادلہ خیال کیا جاتا تھا۔ ابتدا میں وی' پی مینن کو گاہے گاہے عملے کی ان محفلوں میں باریابی بخشی جاتی تھی لیکن پھر اسے ہر محفل میں بلایا جانے لگا۔ نہ صرف ماؤنٹ بیٹن کو بلکہ سب کو معلوم تھا کہ وی' پی مینن بقول کیمبل جانسن "ولبھ بھائی پٹیل کا معتمد راز دار ہے"۔[۴] اس طرح نہ صرف پٹیل وائسرائے کی درون خانہ مشاورت سے پوری طرح باخبر رہتا تھا بلکہ وہ اپنے اس ترجمان کے ذریعے وائسرائے کی پالیسیوں پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔ اگر کوئی مسلمان افسر وی' پی مینن کی حیثیت میں ہوتا اور یہ معلوم ہوتا کہ اس کا قائداعظم سے بھی رابطہ ہے' تو کوئی وائسرائے بھی بے جا طرفداری کا الزام سر پر لیے بغیر اسے برداشت نہ کرتا اور بہر صورت کانگرس ایسے افسر کے لیے اس حیثیت میں کام جاری رکھنا بالکل ناممکن بنا دیتی

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا پہلا کام ان بڑے سیاسی لیڈروں سے ذاتی راہ و رسم پیدا کرنا تھا جو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے یعنی کانگرس اور مسلم لیگ کے لیڈر۔ اور وہ بہت جلد ان کا اعتماد بلکہ ستائش حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ ایک بہت ہی تعجب انگیز بات تھی کہ ایک طرف گاندھی' نہرو اور پٹیل اور دوسری طرف قائداعظم اور لیاقت علی خاں ایسے افراد سب کے سب شاہی خاندان کے اس دلفریب نہال کے گرویدہ ہو گئے جو ہند میں برطانوی سلطنت

کی بساط لپیٹنے آیا تھا۔ بظاہر یہ کارنامہ ناممکن نظر آتا تھا لیکن لارڈ مونٹ بیٹن نے اسے ممکن کر دکھایا۔
گاندھی پر اس کا فسوں چل گیا اور نہرو اس سے بھی زیادہ لارڈ اور لیڈی مونٹ بیٹن سے مسحور ہو گیا
نہرو کا سیرت نگار مائیکل بریچر لکھتا ہے کہ "مونٹ بیٹن کو ذاتی تعلقات میں جو سب سے نمایاں
کامیابی حاصل ہوئی وہ نہرو کے ساتھ دوستی کا گہرا رشتہ تھا۔ دوسرے کانگرسی لیڈروں بشمول
گاندھی اور پٹیل کے مونٹ بیٹن کے ساتھ اچھے مراسم تھے لیکن نہرو کے ساتھ باہمی اعتماد، احترام،
تحسین و الفت کا ایسا رشتہ قائم ہوا جو سیاستدانوں کے درمیان شاذ اور برطانوی راج کی تاریخ
میں فقید المثال ہے۔۔۔۔۔ جہاں تک لیڈی مونٹ بیٹن کا تعلق ہے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس
نے نہرو کی زندگی میں ایک خلا پر کرنے میں مدد دی" نہ قائد اعظم یخ بستہ وقار اور کم آمیزی کا پیکر
تھے۔ وہ بھی مونٹ بیٹن کا غیر معمولی گرمجوشی سے ذکر کرتے تھے لیکن مونٹ بیٹن نے قائد اعظم
کے ان جذبات کا جواب ویسے ہی جذبات سے نہیں دیا۔ یہ بات ہر اس شخص پر واضح ہو جاتی
ہے جس کی نظروں سے کیمبل جانسن کی کتاب MISSION WITH MOUNT BETTEN
گزری ہے۔ گو قائد اعظم کو اس کی خبر نہیں تھی۔ کیمبل جانسن نے اس تدبیر سازی اور باقاعدہ
سوچ بچار کا ذکر کیا ہے جس سے کام لیتے ہوئے مونٹ بیٹن ان گوناگوں شخصیتوں پر اپنا بظاہر
بے ساختہ افسوں پھونکتا تھا۔ لیکن مونٹ بیٹن کے پاس ایک اور ہتھیار بھی تھا جس کا شاید کیمبل جانسن
کو بھی پتہ نہ تھا

مونٹ بیٹن نے ٹھیک جانچ لیا تھا کہ اتنے پرانے سیاسی حریف، جیسے کہ کانگرس اور
مسلم لیگ کے لیڈر تھے، باہم مل کر ایک دوسرے کو مونٹ بیٹن کی باتیں نہیں بتائیں گے چنانچہ
ایک کی پشت پیچھے دوسرے کو برا بھلا کہہ کے وہ دونوں کا معتمد بن گیا۔ جس زمانے میں وہ
دن رات کانگرس کے لیڈروں کا دل موہ لینے میں سرگرم تھا۔ قائد اعظم کے سامنے وہ ان کا یوں
ذکر کرتا تھا کہ وہ تو نامعقول لوگ ہیں اور ان سے کوئی منصفانہ شرائط منوانا ازحد مشکل کام ہے۔
مونٹ بیٹن کے ایسے الفاظ قدرتی طور پر قائد اعظم کے دل میں خوشگوار تاثر پیدا کرتے تھے۔ اس
بات کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ وہ کانگرسی لیڈروں کے سامنے جناح کا ذکر کن الفاظ میں
کرتا ہو گا۔ جبکہ اس کے عملہ کو بھی یہ بتا دیا گیا کہ جناح کے لیے رات کے کھانے کی دعوت ایک دن

کے لیے ملتوی کر دی گئی ہے کیونکہ "مونٹ بیٹن یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ آج پھر ان کے ساتھ ایک اور ملاقات کی تاب نہیں رکھتا"۔[۵۸] بہر صورت یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی۔ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کے لیڈر یہ محسوس کرتے تھے کہ حسنِ اتفاق سے مونٹ بیٹن ایک ایسا شخص ہے جو سیاسی اور نفسیاتی بصیرت سے بہرہ ور ہے، انسانی کردار اور محرکات کو سمجھتا ہے، اس قدر صاف گو ہے کہ مشکلاتِ راہ کی نشاندہی کر دیتا ہے، اور انہیں دور کرنے کی صدق دلانہ کوشش کرتا ہے۔ بہر حال یہ زیرک اور زود فہم تیز طرار آدمی اپنے پیشرو کا خوشگوار نعم البدل ہے، جس کی خاموشی پریشان کن اور کم گوئی بے حسی کی شبیہہ تھی۔

مونٹ بیٹن نے جب اپنا پہلا مرحلہ کامیابی سے طے کر لیا، اور بعض حل طلب مسائل مثلاً بجٹ تجاویز پر بحث و نزاع اور انڈین نیشنل آرمی کے مقدمات سے بھی عہدہ برآ ہو گیا، تو وہ آئینی مسائل پر ہند کے لیڈروں سے بات چیت میں اپنی مخصوص توانائی کے ساتھ منہمک ہو گیا۔ گاندھی نے اپنی وہ تجویز قدرے مختلف رنگ میں پیش کر دی، جو اس نے کابینہ مشن کے سامنے رکھی تھی کہ سارے ہند کی ذمہ داری تنہا مسلم لیگ کے سپرد کر دی جائے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر تنہا کانگرس کو۔ گاندھی خوب جانتا تھا کہ حکومت برطانیہ کبھی اس بات کو نہیں مانے گی کہ سارے ہند کی حکمرانی جس میں ہندو بھاری اکثریت میں ہیں، تنہا مسلم لیگ کو سونپ دی جائے مسلم لیگ کے لیے اس کی یہ پیشکش فقط شطرنج کی پہلی چال تھی، اس کا اصل مقصد سارے ہند پر ہندو کانگرس کے لیے بلا شرکت غیرے اقتدار کا حصول تھا۔ اس مرتبہ اس نے مسلم لیگ کو حکومت بنانے کی جو پیشکش کی تھی، اس میں کانگرسی اکثریت کی طرف سے مشروط حمایت کی یقین دہانی کی نمک مرچ بھی لگی ہوئی تھی۔

گاندھی کی اس پیشکش پر نہرو اور کانگرس ورکنگ کمیٹی کے بعض دوسرے ارکان نے بھی غور و خوض کیا لیکن جیسا کہ گاندھی نے ۱۱ مارچ ۱۹۴۷ء کو مونٹ بیٹن کے نام اپنے خط میں لکھا "میں انہیں قائل نہ کر سکا کہ میری تجویز درست ہے ..... اس لیے میں عرض کرتا ہوں کہ آپ اپنی توجہ میری طرف مبذول نہ کریں"۔[۵۹] ممکن ہے بعض حضرات اس اختلاف رائے سے جو گاندھی کو نہرو اور پٹیل سے تھا، یہ نتیجہ اخذ کریں کہ کانگرس کے عملی سیاستدان گاندھی کی نظریاتی بلندیوں

تک پہنچنے سے قاصر تھے۔ ایسے حضرات کو چاہیئے کہ وہ یادداشت پڑھ لیں جس میں گاندھی نے اپنی اس تجویز کے مضمرات کی تفصیل پیش کی تھی۔ متعدد شرائط کے بعد مثلاً پنجاب اور بنگال کی تقسیم، پاکستان سے شمال مغربی سرحدی صوبے کی علیحدگی اور آئین ساز اسمبلی میں لیگ کی شرکت ـــــ گاندھی نے لکھا تھا۔

"مذکورہ بالا شرائط کے تحت اگر مسلم لیگی کابینہ معرضِ وجود میں آ تی ہے، تو کانگرس یہ وعدہ کرتی ہے کہ اس سے پورا تعاون کرے گی اور اپنی اکثریت کو کبھی لیگ کے خلاف محض اسے شکست دینے کی خاطر استعمال نہیں کرے گی۔ اس کے برعکس ہر اقدام کا اس کے حسن و قبح کی بنا پر جائزہ لیا جائے گا اور جہاں کوئی اقدام مسلم الثبوت طور پر سارے ہند کے مفاد میں ہوگا، کانگرس کی طرف سے اس میں پورا تعاون کیا جائے گا۔"

مگر اس بات کا فیصلہ کہ کونسا اقدام مسلم الثبوت طور پر سارے ہند کے مفاد میں ہے ہندو اکثریت کے ہاتھ میں ہی تھا۔

یہ تعجب کی بات نہیں کہ جب مونٹ بیٹن کے عملے کی مجلس میں گاندھی کی تجویز زیر بحث آئی تو "اس پر بھیس بدلے بغیر پرانے پتنگ اڑانے کی پھبتی کہی گئی"۔ قائد اعظم نے گاندھی کے موقف کو فتنہ انگیز قرار دیا، کیونکہ اس کے معنی تھے "اختیار بغیر ذمہ داری کے"۔ گاندھی کی تجویز میں مشکل یہ نہیں تھی کہ اس میں مسلم لیگ کو بہت کچھ دیا گیا تھا بلکہ یہ کہ کچھ بھی نہیں دیا گیا تھا۔ لہٰذا اس کی بنا پر مصالحت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس وقت تک نہرو اور پٹیل کو پوری طرح یقین ہو چکا تھا کہ مرکزی حکومت میں حقیقی اختیار بروئے کار لانے کے لیے کٹا پھٹا پاکستان تسلیم کر لیا جائے۔ پاکستان جس قدر کٹا پھٹا ہوگا اور جس قدر جلد یہ قضیہ ختم ہو گا، اسی قدر بہتر ہو گا۔

گاندھی کے بعد مونٹ بیٹن نے جناح سے جو مذاکرات کیے وہ اس پہلو سے قابلِ ذکر تھے کہ اس نے کس طرح قائد اعظم کا اعتماد حاصل کر لیا۔ ۸ اپریل کو دوسری ملاقات کے بعد مونٹ بیٹن نے اپنے عملے کے سامنے یہ رائے ظاہر کی "جناح مجھ سے گفت و شنید تو کر سکتے ہیں، لیکن بات میری ہی چلے گی"۔ مونٹ بیٹن پر اس وقت

قائداعظم کے اعتماد کی سب سے بڑی وجہ ان کا یقین تھا کہ مونٹ بیٹن منصفانہ اور غیرجانبدارانہ تقسیم پر عملدرآمد کرنے کی کوشش کرے گا۔ مونٹ بیٹن خود بھی بار بار اس بات پر زور دیتا رہتا تھا کہ "غیر جانبداری اس کا منصبی فرض ہے"۔ قائداعظم کو معلوم تھا کہ اگرچہ کانگرس نے تقسیم کو منظور کر لیا ہے لیکن وہ پاکستان کو مسخ کرنے اور نقصان پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھے گی۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے بغیر کوئی چارہ نہیں ان کے اس قول میں یہی اشارہ ہے کہ "پاکستان نہ ہونے سے کرم خوردہ پاکستان بہتر ہے"۔ لیکن اس بات نے تقسیم کی نوعیت اور طریق کار کو اور زیادہ اہم بنا دیا تھا۔ تقسیم کے منصوبے کو بروئے کار لانے میں انگریزوں کو اساسی کردار ادا کرنا تھا۔ اگر انہوں نے کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان ترازو کو متوازن رکھا' تو پاکستان کو کانگرس کی بدترین تاخت و تاراج سے بچایا جاسکتا ہے۔

گاندھی اور جناح سے مونٹ بیٹن کے مذاکرات کا ایک نتیجہ ہند کے لوگوں سے امن کے لیے اپیل تھی' جو ۱۵ اپریل کو دونوں لیڈروں کے دستخطوں سے جاری کی گئی۔ اس اپیل کا کچھ اثر ضرور ہوا' مگر یہ اثر پائدار نہ تھا۔ البتہ اس سے مونٹ بیٹن کا وقار یقیناً بڑھ گیا' اور عام لوگوں کے سامنے اس کی ماہرانہ سیاست گری کا ایک ثبوت آ گیا۔

حکومت برطانیہ نے مونٹ بیٹن کو جو ہدایت نامہ دے کر بھیجا تھا اس کے تحت اسے کابینہ مشن پلان کے مطابق ایک متحدہ حکومت کے لیے پوری کوشش کرنا لازم تھا' لیکن اس کی آمد سے مہینوں پہلے کانگرس نے کابینہ مشن پلان کی صورت اس قدر مسخ کر دی تھی کہ اس کی ہیئت مسلم لیگ کے لیے ناقابل قبول ہو گئی تھی۔ مونٹ بیٹن کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے پیشرو نے نیک نیتی سے بہت کوشش کی تھی کہ کانگرس سے کابینہ مشن اور برطانوی حکومت کے اصل منشا کے مطابق منصوبے کو منظور کروالے لیکن یہ کوششیں [illegible] سے ہی لے ڈوبیں۔ کانگرس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کے ساتھ بات چیت کے پہلے دو ہفتوں میں ہی مونٹ بیٹن کو پوری طرح یقین ہو گیا کہ کابینہ مشن پلان پر اصرار جاری رکھنا بالکل بے سود ہے۔ اگرچہ وہ اس تصور سے دل بہلاتا رہا کہ وہ "کانگرس سے کابینہ مشن پلان پوری طرح منوا کر

پھر جناح کو اس صورت حال سے دو چار کرے کہ وہ یا تو آئین ساز اسمبلی میں شامل ہوں یا کٹا پھٹا پاکستان قبول کر لیں۔[۳۳] لیکن فی الواقع اس نے ایسی کوشش نہ کی۔ ایک متبادل صورت جس پر اس نے کچھ غور و خوض کیا یہ تھی کہ پاکستان اور ہندوستان کے نمائندے مساویانہ حیثیت سے ایک ایسی مرکزی حکومت میں اکٹھے ہو جائیں، جس کی تحویل میں امور خارجہ، دفاع اور مواصلات ہوں۔[۳۴] لیکن اس متبادل صورت پر بھی غور و خوض اس کے عملے کے اجلاسوں میں تبادلۂ خیالات تک ہی محدود رہا۔ دراصل اسے ایک ایسے حل کی جستجو تھی، جس کے تحت پاکستان اور انڈین یونین دونوں ہی برطانوی دولت مشترکہ میں رہ سکیں۔

باب ۷

منصوبۂ تقسیم کی تشکیل

وسط اپریل ۱۹۴۷ء تک مونٹ بیٹن نے تقسیم کا ایک منصوبہ مرتب کر لیا تھا۔ جس کے اصولی نکات یہ تھے کہ اگر تقسیم تک نوبت آئی، تو اس کی تمام تر ذمہ داری اہلِ ہند کے سر ہونی چاہیے۔ صوبوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیے ـــــ بنگال اور پنجاب کو تقسیم کر دینا چاہیے ـــــ آسام میں ضلع سلہٹ کو مشرقی بنگال میں شامل ہونے کا حقِ انتخاب ملنا چاہیے ـــــ اور شمال مغربی سرحدی صوبہ میں عام انتخابات ہونے چاہئیں۔ اس منصوبے پر ۱۵ اور ۱۶ اپریل کو گورنروں کی کانفرنس میں تبادلہ خیالات ہوا۔ "سب گورنر دو نکات پر متفق تھے۔ اول یہ کہ نہایت ضروری ہے کہ فیصلہ جلد از جلد ہو اور دوسرے یہ کہ ایک متحدہ ہند اب خارج از بحث ہے۔ کسی کو بھی تقسیم کا خیال پسند نہ تھا، لیکن کوئی بھی یہ نہ بتا سکا کہ اس سے کیونکر بچا جائے" [۱]

ہندو اور سکھ پنجاب کی تقسیم پر اصرار کر رہے تھے۔ اس وقت تک سکھ اس طرح ہندو لیڈروں کے دام میں آچکے تھے کہ انہیں اپنا حقیقی مفاد نظر نہیں آتا تھا۔ جب سکھوں کے وفد نے مونٹ بیٹن سے ملاقات کی تو اس نے انہیں بتایا کہ وہ پنجاب کی تقسیم کا مطالبہ تو کر رہے ہیں، لیکن اس سے اُن کا چھوٹا سا فرقہ دو حصوں میں بٹ جائے گا۔ مگر وہ اپنی بات پر اڑے رہے۔ سکھ ہتھیار جمع کرنے میں مصروف تھے اور فتنہ و فساد

پرتلے ہوئے تھے۔ وزیر دفاع بلدیو سنگھ کے متعلق یہ اطلاع ملی تھی کہ سکھوں نے جس فنڈ کے لیے اپیل کر رکھی ہے وہ اس کا خزانچی ہے۔ بلدیو سنگھ نے اس الزام کی تردید کی لیکن جیسا کہ کیمبل جانسن نے لکھا "جنگجویانہ اور غیر آئینی مقاصد کے لیے بلاشبہ فنڈ جمع کیا جارہا تھا" ۲؎

گورنروں کی کانفرنس میں :-

"جنکنز (گورنر پنجاب) نے پنجاب کی تقسیم کے مضمرات کا بہت صاف تجزیہ کیا، اور یہ وضاحت کی کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے متنازع فیہ مسئلے کو سکھوں اور ہندو جاٹوں کے مطالبوں نے کیونکر پیچیدہ بنا دیا ہے۔ گورنر بنگال کے سیکرٹری ٹائی سن نے اسی طرح تقسیم کی صورت میں بنگال میں امکانات کا جائزہ لیا۔ اس کے خیال میں مشرقی بنگال دیہاتی خستہ حال علاقہ بن کر رہ جائے گا۔ بنگال میں اڑھائی کروڑ ہندو تھے ــــ آبادی کا ۴۵ فیصد حصہ ــــ اور وہ سب کے سب ہندوستان میں شامل ہونے کے خواہاں تھے۔ مشرقی بنگال کا تصور کئی مقامی مسلمانوں کے لیے بھی قابل قبول نہیں تھا۔ جناح اور بنگال کے موجودہ مسلم وزیر اعظم سہروردی کے درمیان تعلقات خوشگوار نہیں تھے۔ سہروردی تقسیم سے بہت خوفزدہ تھے، اور ہندوؤں کے ساتھ کسی حد تک شرکت کار کے لیے تیار تھے" ۳؎

شمال مغربی سرحدی صوبے میں اس وجہ سے الجھن پیدا ہو گئی تھی کہ اگرچہ اس صوبے میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت تھی، اور ان میں سے بیشتر اب لیگ کے حامی تھے، لیکن صوبے میں وزارت کانگرس کی تھی اور کانگرس اس صوبے کی دعویدار تھی۔ مسلم لیگ نے اس وزارت کے خلاف کامیاب مہم جاری کر رکھی تھی۔ اور کانگرسی وزارت ڈگمگا رہی تھی۔ اگر مسلم لیگ کے مطالبہ کے مطابق از سر نو عام انتخابات کرائے جاتے، جس کی سفارش گورنر نے بھی کی تھی، تو کانگرسی وزارت کی شکست یقینی تھی۔ اس لیے کانگرس انتخابات کے خلاف تھی۔ بلکہ اس نے "نوٹس دے رکھا تھا کہ اگر سرحد کی وزارت میں کوئی مداخلت کی گئی، تو حکومت برطانیہ کے منصوبے کے بارے میں کانگرس کا تمام تر رویہ بدل سکتا ہے" ۴؎ حقیقت حال معلوم کرنے کے لیے اواخر اپریل میں مونٹ بیٹن نے خود اس صوبے کا دورہ کیا۔ وہاں اس نے مسلم لیگ کے جو مظاہرے دیکھے اور گورنر سر اولف کیرو، وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب اور اس کے رفقائے کار، قبائلی سرداروں اور مسلم لیگ

کے لیڈر۔ ان خان عبدالقیوم خان اور پیر مانکی شریف جنہیں اس ملاقات کے لیے خاص طور پر جیل سے رہا کیا گیا تھا) سے جوبات چیت کی، اس سے مونٹ بیٹن کو پوری طرح یقین ہو گیا کہ کانگرس اور مسلم لیگ کے متضاد دعووں کا فیصلہ کرنے کے لیے عوام سے رجوع کرنا ضروری ہے۔

تقسیمِ ملک کے کسی بھی منصوبے کے لیے افواج کی تقسیم کی سکیم بھی ناگزیر تھی۔ جس آزاد و خود مختار مملکت کے ہاتھ میں اپنی افواج کی باگ ڈور نہ ہو۔ وہ قائم نہیں رہ سکتی۔ اگرچہ اپریل ۱۹۴۷ء تک ملک کی تقسیم ایک امرِ مسلم تھی، اور انگریزوں نے بھی جون ۱۹۴۸ء تک اقتدار منتقل کر دینا تھا، لیکن اب تک ہند کی افواج کی تقسیم کے لیے کوئی تیاری نہیں کی گئی تھی ۔۔۔ بلکہ اس مسئلے پر غور بھی نہیں کیا گیا تھا۔ کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکنلک اور دوسرے سب انگریز فوجی افسر افواجِ ہند پر بڑا فخر و ناز کرتے تھے۔ انہوں نے افواجِ ہند کی تنظیم و ترقی میں اس قدر جانفشانی اور مہارت سے کام لیا تھا کہ ان کی تقسیم کا خیال تک اُن کے لیے ازحد ناگوار تھا اگرچہ وقت تقاضا کر رہا تھا، لیکن کوئی بھی اس مسئلہ کا سرکاری طور پر اعتراف نہیں کر رہا تھا اس ضمن میں تاخیر کانگرس کے لیے مفید تھی، کیونکہ اسے ہی دہلی کا دارالخلافہ، حکومتِ ہند کی سول اور ملٹری تنظیم اور افواج پر اختیار ورثہ میں ملنے والا تھا۔ خسارے میں مسلم لیگ رہتی۔ چنانچہ لیاقت علی خان نے وائسرائے کو ایک خط میں یہ تجویز پیش کی کہ افواج کی ایسی تنظیم نو کی جائے جس سے مناسب وقت پر انہیں کسی تاخیر کے بغیر پاکستان اور انڈین یونین کے درمیان تقسیم کیا جا سکے۔ جب ۸ اپریل کو مونٹ بیٹن نے اپنے عملہ کے اجلاس میں یہ خط پڑھ کر سنایا:۔

> "تو اسمے نے اس بات پر زور دیا کہ اگر لیاقت کے اس خط پر عمل درآمد کیا گیا تو سیاسی مسئلے کے فیصلے پر نامناسب اثر پڑے گا"۔ "جب تک وائسرائے کی طرف سے ملکِ معظم کی حکومت کو اس کے برعکس اطلاع نہیں دی جاتی، کابینہ مشن پلان پر ہی کاربند رہنا پڑے گا، اور اس منصوبے میں صرف ایک ہی قومی فوج کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ مونٹ بیٹن نے اس سے اتفاق کیا کہ برطانیہ کے انخلاء سے قبل افواجِ ہند کی تقسیم نہیں کی جا سکتی اس کے دو اسباب ہیں" "انتظامی مصلحتیں اس کی اجازت نہیں دیتیں اور خود میں بھی اجازت نہیں دوں گا" [۵]

مونٹ بیٹن اور اسمے دونوں کو اس وقت تک پوری طرح معلوم ہو چکا تھا کہ کابینہ مشن پلان محض

جسد بے روح ہے، اور تقسیم ناگزیر ہو چکی ہے۔ لیکن افواجِ ہند کی وحدت برقرار رکھنا چونکہ برطانیہ کے مفاد میں تھا، انہوں نے فوجی دائرے میں تقسیم ملک کے نتائج کا سامنا کرنے سے انکار کر دیا۔ مونٹ بیٹن کے اصرار کے مطابق، اگر برطانیہ کے انخلاء سے قبل افواجِ ہند میں کسی نوعیت کی تقسیم خارج از بحث تھی، تو سوال یہ تھا کہ انگریز جاتے وقت افواج پر اختیار کیسے سونپیں گے اور بعد میں افواج کی تقسیم کس طرح عمل میں لائی جائے گی؟ لیاقت علی خان نے افواج کی بالفعل تقسیم کا مطالبہ نہیں کیا تھا، انہوں نے تو اس کام کے لیے ابتدائی اقدامات کی ضرورت کی طرف توجہ مبذول کرائی تھی۔ چنانچہ انہوں نے "افواجِ ہند کی تقسیم کے لیے پلان کی تیاری" کے زیرِ عنوان اپنی تجویز کو ایک یادداشت میں یوں دوبارہ بیان کیا:-

"آئینی مسئلے کا قبل از وقت تصفیہ نہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک ایسا طریقِ کار اختیار کیا جائے جس سے نہ کوئی سیاسی پارٹی گھاٹے میں رہے اور نہ نفع اٹھا سکے۔ یہ غیر جانبدارانہ کیفیت افواج کی ایسے خطوط پر تنظیمِ نو سے حاصل ہو سکتی ہے کہ جب تقسیمِ ملک کے بارے میں فیصلہ کیا جائے ــــ تو افواج کو بھی تقسیم کیا جا سکے۔ اس لیے یہ ایک ناگزیر ابتدائی تقاضا ہے کہ کمانڈر انچیف اور اس کے عملے کی طرف سے افواج کی تقسیم کے لیے ایک پلان مرتب کیا جائے۔ اس کام میں لازماً چند ہفتے لگیں گے اور اگر اس کام کو فی الفور شروع کر دیا جائے تو یہ پلان اس وقت تک تیار ہو چکا ہو گا جب اصل آئینی مسئلے کا تصفیہ ہو گا۔ ملکِ معظم کی حکومت نے جو میعاد مقرر کی ہے، اس کا ہی یہ تقاضا ہے کہ ایسے پلان کی تیاری میں اور تاخیر نہ کی جائے۔ یہ پلان نہ سیاسی مذاکرات میں اور نہ ہی افواج کی موجودہ حیثیت میں کسی قسم کا خلل ڈالے گا۔"

لیاقت علی خان کی اس تجویز کی کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل آکنلک نے مخالفت کی، اس نے یہ کہا کہ "ہند کی افواج کو، جس طرح وہ اب ہیں، ایسے دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا، جن میں ہر حصہ خود کفیل ہو۔" جب لیاقت علی نے کہا کہ ان کی تجویز کی وجہ بھی دراصل یہی ہے تو کمانڈر انچیف نے جواب دیا "ایسی دور رس تنظیمِ نو کئی مراحل میں ہو گی، جس کے لیے کئی سال درکار ہوں گے، اور اس دوران میں ایسی کوئی منظم فوج باقی نہیں رہے گی، جو شمال مغربی سرحد کی بڑی دفاعی مہم سے عہدہ برآ ہو سکے۔" یعنی کمانڈر انچیف کو تقسیمِ افواج کا منصوبہ تیار کرنا بھی ناپسند تھا۔ انہوں نے حتماً کہا "چونکہ اغلباً تقسیمِ افواج کی تجویز کے بارے

میں محض افواہ سے بھی مسلمان سپاہیوں، ملاحوں اور فضائیہ کے کارکنوں کے انضباط پر فوری برا اثر پڑنے کا احتمال ہے، اس لیے بلند ترین سطح کے سوا اس موضوع پر کسی قسم کی گفتگو نہیں ہونی چاہیے"۔[۶] وزیر دفاع اور کانگرس بلاک کے ترجمان بلدیو سنگھ نے بھی کمانڈر انچیف کے اس موقف کی پوری حمایت کی — اس معاملے میں کچھ نہ کرنے سے کانگرس کا فائدہ ہی فائدہ تھا۔ بلدیو سنگھ نے لکھا کہ اس کی "پر زور رائے ہے کہ وزیر خزانہ کی تجویز پر تبادلۂ خیالات کے لیے یہ وقت مناسب نہیں ہے"۔ یہ ۲۰ اپریل کی بات ہے۔ حالانکہ اس سے دو دن پہلے گوالیار میں نہرو برسرِعام یہ اعلان کر چکا تھا کہ "حال ہی میں کانگرس نے عملی وجوہ کی بنا پر ایک قرارداد منظور کی ہے، جس میں ملک کی تقسیم کو قبول کر لیا گیا ہے"۔ ملک بھر میں تقسیم کا چرچا تھا، لیکن وزیر دفاع اور کمانڈر انچیف اس بات پر اصرار کر رہے تھے کہ اس کے ایک منطقی نتیجہ — افواج کی تقسیم — پر ہند کی دفاعی کمیٹی میں بھی بصیغۂ راز بات چیت بے موقع ہے۔

۲۵ اپریل کو جب یہ مسئلہ دفاعی کمیٹی میں زیرِ بحث آیا تو لیاقت علی خاں نے اس بات پر زور دیا کہ تقسیم افواج کا منصوبہ تیار رہنا چاہیے تاکہ اگر مطالبۂ پاکستان مان لیا جائے تو پھر اس منصوبے پر فوراً عملدرآمد ہو سکے۔ بلدیو سنگھ نے بھی اتنے ہی زور سے کہا کہ جب پاکستان کے حق میں سیاسی فیصلہ ہو جائے گا تو اس کے بعد ہی تقسیم افواج کا معاملہ طے ہو سکتا ہے۔ آکنلک نے کہا کہ اس نے جو کچھ لکھا تھا، اس سے عملی دشواریوں کا بیان مقصود تھا، نہ کہ پاکستان کے موافق یا مخالف فیصلے پر اثر انداز ہونا۔ اگرچہ مونٹ بیٹن نے اس سے اتفاق کیا کہ "منصوبہ لازمی ہے، کیونکہ جب پاکستان کے بارے میں اعلان ہوگا، تو افواج کو فوراً یہ بتانا ضروری ہوگا کہ ان کا مقام کہاں ہے"؛ لیکن اس کے باوجود وہ صرف اتنی بات ماننے پر آمادہ ہوا کہ اعلیٰ سطح پر ایک چھوٹی سی کمیٹی قائم کر دی جائے جو پیش آنے والے مسائل کا تعین کرے۔ مونٹ بیٹن مُصر تھا کہ امن و امان کا قیام اس کی ذاتی ذمہ داری ہے تا آنکہ وہ اُسے ایک یا ایک سے زیادہ حکومتوں کو منتقل نہیں کر دیتا۔ چنانچہ اس نے کہا:۔

> "جب ملک میں ذمہ دار ہوں، میں آخری چارہ کار کے طور پر برطانوی فوجوں کو استعمال کر سکتا ہوں۔ یکم جون ۱۹۴۸ء کے بعد برطانوی فوجیں موجود نہیں ہوں گی۔ لیکن قابلِ اعتماد اور غیر جانبدار فوجوں کی ضرورت پھر بھی باقی رہے گی۔ تقسیم کے عمل کی رفتار کو غیر مناسب طور پر تیز کر کے کہیں ہم اپنے مقصد کو ہی فوت نہ کر دیں،

اور ایسی صورتِ حال پیدا کر دیں، جس میں افواج نیم منظم اور ناقابلِ اعتماد ہوں۔ ہر چند کہ میں بہت چاہتا ہوں کہ تقسیم کا عمل مکمل ہو جائے، لیکن مجھے توی شبہ ہے کہ جو مہلت ہمیں میسر ہے، اس میں یہ مقصد افواج کو کمزور کیے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک میں امن و امان کا ذمہ دار ہوں، میں یہ ہرگز قبول نہیں کر سکتا'' ۷

مونٹ بیٹن کے یہ نظریات برطانیہ کی طرف سے افواج ہند کی تقسیم کو ٹالنے یا ملتوی کرنے کی خواہش کے آئینہ دار تھے۔ لیکن خواہ اُن سے اختلاف کیا جائے یا اتفاق، ایک نکتے کے بارے میں تو کوئی شک و شبہ نہیں، اور وہ یہ ہے کہ ۲۵ را پریل ۱۹۴۷ء کو جب اس بات پر تبادلۂ خیالات ہو رہا تھا، انتقالِ اقتدار کے لیے مستقر تاریخ یکم جون ۱۹۴۸ء تھی۔ تقسیم ملک کے بارے میں جو منصوبہ مونٹ بیٹن حکومتِ برطانیہ کی منظوری کے لیے بھیجنے والا تھا، وہ بھی اسی تاریخ کی بنا پر مرتب کیا گیا تھا۔ بلکہ مونٹ بیٹن تو تقسیم کے عمل کو غیر مناسب طور پر تیز کرنے کے خلاف تھا اور اس کام کے لیے جو مہلت دی گئی تھی، اسے ناکافی سمجھتا تھا___ کس طرح اور کیوں یہ تاریخ ۱۵ ر اگست ۱۹۴۷ء میں تبدیل کر دی گئی، جس کا نتیجہ لاتعداد انسانی جانوں کے اتلاف اور ناقابلِ بیان مصائب کی صورت میں نکلا، ایک بہت ہی المناک داستان ہے، جسے اب بیان کیا جا رہا ہے۔

۲۶ را پریل کو مونٹ بیٹن نے ''اِسمے اور جارج ایبل کو لندن بھیجنے کا فیصلہ کیا، انہیں اپنے ساتھ منصوبے کا ابتدائی مسودہ لے کر جانا تھا تاکہ حکومتِ برطانیہ اور متعلقہ حکام کے ساتھ ہر شق پر مفصل غور و خوض کیا جا سکے'' ۸ منصوبے کا جو مسودہ اِسمے اپنے ساتھ لندن لے کر گیا اس کی اصل عبارت کانگرس اور مسلم لیگ کو نہیں دکھائی گئی، لیکن اس کے عام مفہوم سے وہ آگاہ تھیں۔ اس منصوبے کے مطابق ''جزیرہ نما ہند کو دو آزاد و خود مختار مملکتوں میں تقسیم کیا جانا تھا، ایک ہندو اکثریت والی جسے انڈیا کا نام دیا جانا تھا، اور دوسری مسلم اکثریت والی جسے پاکستان کے نام سے موسوم ہونا تھا۔ پنجاب اور بنگال کے صوبوں کو بھی تقسیم کیا جانا تھا'' ۹

کانگرس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس یکم مئی کو منعقد ہوا، اس میں تقسیم ملک کو باقاعدہ طور پر منظور کر لیا گیا اور نہرو نے وائسرائے کو لکھا ''وہ تجاویز جو میرا قیاس ہے کہ لارڈ اِسمے لندن لے کر جا رہا ہے، ان کے بارے میں ہماری کمیٹی اصولِ تقسیم کو منظور کرنے کے لیے تیار ہے، اس اصول کا اطلاق معین علاقوں پر حق خود

اختیاری کی بنیاد پر ہوگا۔ اس ضمن میں بنگال اور پنجاب کی تقسیم بھی آتی ہے۔۔۔۔۔۔ جائز طور پر قائم شدہ صوبائی حکومت جسے اکثریت کی حمایت حاصل ہو اسے دہشت انگیز طریقوں سے ختم کرنے اور نئے انتخابات کرانے کی کوئی بھی تجویز ہتھیار ڈال دینے کے مترادف ہوگی اور اس کی مزاحمت لازم ہے"۔[۱۰] اس آخری جملے میں منصوبے کے اس حصے کی طرف اشارہ تھا، جس کا تعلق شمال مغربی سرحدی صوبے سے تھا۔ لہٰذا اس صوبے سے قطع نظر، جہاں کانگرس عوام کی خواہشات معلوم کرنے کے خلاف تھی، مونٹ بیٹن کا منصوبۂ تقسیم جس میں انتقالِ اقتدار کی تاریخ یکم جون ۱۹۴۸ء تھی۔ کانگرس کے لیے قابلِ قبول تھا۔

لیکن ابھی یہ پتہ نہیں تھا کہ آیا انڈین یونین اور پاکستان دونوں برطانوی دولتِ مشترکہ میں شامل ہوں گے یا نہیں؟ یہ بات کہ پاکستان رضامند تھا، مونٹ بیٹن کو پہلے سے معلوم تھی، کیونکہ قائدِ اعظم نے اسے ۱۲ اپریل ۱۹۴۷ء کو ہی اس سے آگاہ کر دیا تھا۔ جبکہ کانگرس اس قرارداد کی پابند تھی جو آئین ساز اسمبلی نے ایک خود مختار و آزاد جمہوریہ کے حق میں منظور کر رکھی تھی، اور جس کا مطلب دولتِ مشترکہ کو چھوڑ دینا تھا البتہ کرشنا مینن جو نہرو کا بہت گہرا دوست تھا اور جسے نہرو نے اس نازک زمانے میں گشتی سفیر کے فرائض سونپ رکھے تھے "ایک ایسے فارمولے کی تلاش میں تھا جس سے انڈین یونین اور برطانیہ کے درمیان "مشترکہ شہریت" کا رشتہ قائم ہو جائے اور ڈومینئن کے درجے سے بچنے کی صورت پیدا ہو جائے"۔[۱۱] کانگرس کو یہ اندیشہ پریشان کر رہا تھا کہ پاکستان کو انڈین یونین پر فوقیت حاصل ہو جائے گی۔ کیمبل جانسن نے ۲۶ اپریل کو اپنی یادداشت میں لکھا:۔

> "دولتِ مشترکہ کا مسئلہ ابھر کر سامنے آ رہا ہے۔ ہندوستان ٹائمز کے آج کے ادارتی مقالے سے اس مسئلے پر پٹیل کی پالیسی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اسمے نے اس مقالے کے متعلقہ حصے کی طرف توجہ مبذول کرائی، جو حسبِ ذیل ہے ـــ "اگر کانگرس اور لیگ میں سمجھوتہ ہو جاتا ہے، جس کے تحت مسلم اکثریت کے علاقوں کو علیحدہ آزاد و خود مختار مملکتیں بننے کی اجازت مل جاتی ہے، تو ہمیں یقین ہے کہ برطانیہ کے ان مملکتوں سے روابط قائم کرنے کی راہ میں انڈین یونین کوئی رکاوٹ نہیں ڈالے گی لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اگر برطانیہ نے ان مملکتوں کے ساتھ کوئی ایسا معاہدہ کیا، جس میں فوجی یا سیاسی دفعات بھی شامل ہوئیں، تو انڈین یونین اسے

ایک معاندانہ اقدام سمجھے گی"۔ ۱۲ے

کانگرس کے اس رویے کے پیشِ نظر" مونٹ بیٹن نے اس خیال کی پُرزور مخالفت شروع کر دی کہ ہند کے صرف ایک حصے کو دولتِ مشترکہ میں شامل ہونے دیا جائے کیونکہ اس میں برطانیہ کے لیے یہ خطرہ تھا کہ اسے ہند کی ایک آزاد و مختار مملکت کی حمایت میں دوسری کی مخالفت میں ملوث ہونا پڑے گا"۔ ۱۳ے جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے مونٹ بیٹن کا اصل مقصد ایک ایسے حل کا حصول تھا جس سے انڈین یونین اور پاکستان دونوں ہی دولتِ مشترکہ میں رہ سکیں۔ جلد ہی اسے یہ رستہ بھی دکھایا گیا کہ یہ مرغوب مقصد کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔

جب حکومتِ برطانیہ سے منصوبۂ تقسیم کی منظوری حاصل کرنے کے لیے اِسمے لندن روانہ ہو گیا تو مونٹ بیٹن چند دن آرام کرنے کے لیے شملہ چلا گیا۔ وی۔ پی مینن بھی اس کے ساتھ شملہ گیا۔ وہاں اس نے مونٹ بیٹن کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اگر انتقالِ اقتدار بہت جلد ہو جائے، تو اس کے بدلے میں کانگرس ڈومینین کا درجہ قبول کرے گی۔ مینن کچھ عرصے سے پٹیل کو اس خیال پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کی دلیل یہ تھی کہ اس طرح کانگرس کو برطانیہ کی دوستی حاصل ہو جائے گی اور ہند کی انتظامیہ میں انگریز افسر ——— سول اور فوجی ——— اس کی حمایت کرنے لگیں گے۔ یکم مئی کو مینن نے میویل کی وساطت سے مونٹ بیٹن تک یہ بات پہنچا دی تھی کہ" پٹیل سردست نو آبادیاتی درجے کی پیشکش قبول کرنے پر آمادہ ہو سکتا ہے"۔ ۱۴ے شملہ میں اسے براہِ راست مونٹ بیٹن کو بتانے کا موقع مل گیا کہ نو آبادیاتی درجہ قبول کرنے کے لیے پٹیل کی شرط کیا ہے؛ شرط یہ تھی کہ دو ماہ کے اندر اندر اقتدار منتقل کر دیا جائے۔ ۱۵ے گاندھی کے سیکرٹری پیارے لال نے بھی کم و بیش یہی روایت بیان کی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اپریل کے آخری دو ہفتوں میں پٹیل سے یہ کہا گیا کہ" کانگرس اگر عبوری دور کے لیے ڈومینین کا درجہ قبول کرلے تو پھر برطانیہ کے انخلاء کا قبل از وقت اہتمام ممکن ہو گا۔ مزید برآں اس اقدام سے برطانیہ کے ساتھ مسلم لیگ کی سودا بازی کی طاقت ختم ہو جائے گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دلیل کارگر ثابت ہوئی۔ یکم مئی کو وائسرائے کے سیکرٹری نے اطلاع دی کہ اب سردار پٹیل نو آبادیاتی درجے کی پیشکش منظور کرنے کے لیے تیار ہے"۔ ۱۶ے

مونٹ بیٹن جس کا اولیں مقصد انڈین یونین کو بھی دولتِ مشترکہ میں لانا تھا۔ وی۔ پی مینن کی تجویز پر خوشی سے اچھل پڑا۔ وہ حل کی تلاش میں سرگرداں تھا، اب اچانک وی۔ پی مینن کی اعانت سے اسے

راستہ مل گیا، چنانچہ وہ بہت ہی ممنون ہوُا۔ اس نے مینن کے نام خط میں لکھا :۔

"یہ بڑی خوش بختی تھی کہ آپ میرے عملے میں کمشنر اصلاحات تھے، اور اسی طرح ابتدا سے ہی ہمارے درمیان گہرے روابط قائم ہو گئے، کیونکہ آپ ہی پہلے شخص تھے جس نے درجۂ ڈومینین کی تجویز سے کامل اتفاق ظاہر کیا، اور آپ نے ایسا حل بھی تلاش کر لیا، جس کا مجھے خیال تک نہ آیا تھا کہ بہت جلد انتقالِ اقتدار سے اسے قابلِ قبول بنایا جا سکتا ہے۔ تاریخ اس فیصلے کو ہمیشہ بہت بلند مقام دے گی، اور اس کے لیے میں آپ کے مشورے کا رہینِ منت ہوں۔ آپ نے یہ مشورہ دوسرے مشیروں کی بسیار مخالفت کے باوجود دیا" ۱۷ے

مونٹ بیٹن کے تمام دوسرے مشیر انگریز تھے، وہ بھی دولتِ مشترکہ میں انڈین یونین کی شمولیت کے ضرور حامی تھے۔ تاہم ان میں سے بعض کے خیال میں یہ سودا بہت مہنگا تھا کہ اس شمولیت کی قیمت نہایت عاجلانہ شکست و ریخت کی صورت میں ادا کی جائے لیکن مونٹ بیٹن اپنے حسبِ معمول جوش و خروش کے ساتھ اس سودا بازی میں کود پڑا۔

اب حالات کی رفتار تیز ہو گئی۔ ۸ مئی کو مونٹ بیٹن کے عملے کے اجلاس میں وی۔ پی مینن نے "اس امر کی تصدیق کر دی کہ نہرو اور پٹیل دونوں نے اس مسئلے پر مثبت نقطۂ نظر اختیار کیا ہے، اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے "فرنا نروا شہنشاہ" اور "شہنشاہی" کی اصطلاحات ترک کر دینے کی ضرورت واضح کی، جن پر اکثر اہلِ ہند کو اعتراض تھا" ۱۸ے اگلے دن نہرو اور کرشنا مینن بھی شملہ پہنچ گئے، وہ وائسرائے کے ہاں مہمان ٹھیرے۔ کرشنا مینن نے کہا کہ "نہرو کے لیے اس نظریے میں کشش کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس طرح مونٹ بیٹن کو زیادہ خود سر ریاستی حکمرانوں پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنے کا موقع مل جائے گا" ۱۹ے

۱۰ مئی کو مونٹ بیٹن نے ایک کانفرنس منعقد کی، جس میں نہرو، میویل اور وی۔ پی۔ مینن نئے منصوبے پر بات چیت کے لیے شریک ہوئے۔ وی۔ پی مینن کے مطابق :۔

"موٹی موٹی باتیں یہ تھیں کہ مسلم اکثریت کے علاقے ہند سے علیحدہ کر دیے جائیں، اور اقتدار دو مرکزی حکومتوں یعنی انڈیا اور پاکستان کو نو آبادیاتی درجے کی اساس پر منتقل کیا جائے۔ ہر ایک کا اپنا گورنر جنرل ہو گا...... وائسرائے نے

یہ کہا کہ اس کے خیال میں انڈین یونین کو درجۂ ڈومینین کی اساس پر جلدی اقتدار منتقل کردینا کافی آسان کام ہوگا، لیکن کچھ عرصے کے لیے پاکستان کی کوئی حکومت نہیں ہوگی جسے اقتدار منتقل کیا جا سکے۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ یہ مسئلہ ناقابلِ عبور مشکل پیدا نہیں کرے گا اور ہم کوئی نہ کوئی حل تلاش کرہی لیں گے۔ نہرو نے کہا کہ درجۂ ڈومینین کی اساس پر حتی الوسع جلد از جلد انتقالِ اقتدار بہت اچھی بات ہوگی"۔[۲۰]

یہ ظاہر ہے کہ اس کانفرنس میں جو منصوبہ زیرِ بحث آیا وہ اس منصوبے سے مختلف نہیں تھا جسے اسمے لے کر لندن گیا ہوا تھا، سوائے اس بات کے کہ درجۂ ڈومینین کی اساس پر بہت پہلے اقتدار منتقل کر دیا جائے۔

ماؤنٹ بیٹن ایک آزمودہ کار منتظم تھا، اور اس لیے بہت جلد انتقالِ اقتدار کے اس نئے منصوبے سے پاکستان کو جو بے پایاں مشکلات درپیش آنی تھیں، وہ اُن سے بے خبر نہیں تھا۔ اس نے پوچھا "ہم کیا کر رہے ہیں؟ انتظامی لحاظ سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان وہی فرق ہوگا جو ایک مستقل عمارت اور ایک عارضی فوجی جھونپڑے یا خیمے میں ہوتا ہے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے، ہم فقط ایک خیمہ گاڑ رہے ہیں ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے"[۲۱] لیکن اس کے نزدیک انڈین یونین کی برطانوی دولتِ مشترکہ میں شمولیت اتنا عظیم مقصد تھا کہ اس کے مقابلے میں پاکستان کے ساتھ ناانصافی کچھ وقعت نہ رکھتی تھی۔ چنانچہ اس نے کہا کہ یہ شمولیت "برطانیہ کے لیے عالمی وقار اور دفاعی پالیسی کے اعتبار سے بے پایاں قدر و قیمت رکھتی ہے"[۲۲]

برصغیر کے اندر اس عاجلانہ انتقالِ اقتدار کے تمام تر فوائد انڈین یونین کے حصے اور نقصانات پاکستان کے حصے میں آنے تھے۔ اول الذکر کو حکومتِ ہند کی انتظامی مشینری عملاً جوں کی توں ورثے میں مل رہی تھی حکومت کے تمام محکموں کے علاوہ فوج، فضائیہ اور بحریہ کے صدر دفاتر بھی دارالحکومت نئی دہلی میں تھے۔

سول اور فوجی مسلم افسروں کی تعداد بہت کم تھی، اور ان کے نہ رہنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ دو مہینے کا عرصہ جس کی پٹیل نے شرط کی تھی اور جسے ماؤنٹ بیٹن نے منظور کر لیا تھا، اتنا قلیل تھا کہ اس کے اندر انتظامی مشینری اور افواج کی خوش اسلوبی سے تقسیم ناممکن تھی اور نہ ہی اس عرصے میں ان بے شمار معاملات کو سرانجام دیا جا سکتا تھا جو پاکستان اور پنجاب اور بنگال کے تقسیم شدہ صوبوں کی حکومتوں کے قیام کے سلسلے میں پیش آنے تھے۔ انڈین یونین عملاً برطانوی ہند کی جانشین مملکت ہوگی۔ پاکستان کی حیثیت

ان علاقوں کی ہو گی جو اصل ملک سے علیحدہ ہو گئے ہوں۔ پاکستان میں آغاز کار منظم انتظامیہ کے بغیر، باقاعدہ افواج کے بغیر، دفتری ریکارڈ کے بغیر، ساز و سامان اور فوجی رسد کے ذخائر کے بغیر بے پایاں مشکلات کے زیر سایہ ہو گا۔ پاکستان کا شیرازہ بکھیرنے کے لیے اس سے بدتر حالات کا تصور تک مشکل ہے جو پیدا کیے جا رہے تھے۔

مونٹ بیٹن اور کانگرس لیڈروں کے مابین اس سودے بازی سے انسانی جانوں اور آلام و مصائب کی شکل میں جو قیمت ادا کرنی پڑی، وہ بے حد و حساب ہے۔ ونسٹن چرچل نے پندرہ ماہ کی مدت میں انتقالِ اقتدار کو "شرمناک فرار" اور "عاجلانہ شکست در ہزیمت" کے مترادف قرار دیا تھا۔ اسی عمل کو صرف دو ماہ کے قلیل وقفے میں سرانجام کرنے کو کن الفاظ سے موزوں طور پر بیان کیا جا سکتا ہے؟ اس سے جو خوفناک نتائج پیدا ہوئے، خون کی جو ندیاں بہیں اور لاکھوں افراد جو ویران اور بے گھر ہوئے، یہ سب کچھ مستقبل میں وقوع پذیر ہوا، اور شاید اس المیہ کے اداکاروں پر اس وقت عیاں نہیں تھا، لیکن یہ بات تو واضح تھی کہ میعاد کو بہت مختصر کر دینے سے انتقالِ اقتدار اور تقسیم کی مشکلات اس قدر بڑھ جائیں گی کہ ان پر قابو پانا تقریباً ناممکن ہو گا۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق تھا اس قلیل وقفے میں نظم و ترتیب سے اسے تشکیل کرنا خارج از بحث تھا۔ لیکن مونٹ بیٹن کو اس سے کیا غرض؟ اسے تو یہی بس تھا کہ انڈین یونین اور پاکستان دونوں ہی دولتِ مشترکہ میں رہیں گے، اور برطانوی حکمتِ عملی کا اصل مقصد پورا ہو جائے گا۔ اس زمانہ میں ہندو قیادت کا سینہ انتقامی جذبات سے لبریز تھا۔ اس کے سر پر یہی سودا سوار تھا کہ پاکستان کی روزِ پیدائش سے ہی اس قدر قطع و برید کر دی جائے اور اتنے گھاؤ لگا دیے جائیں کہ اس کا باقی رہنا ناممکن ہو جائے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس جذبے نے اسے انسانیت اور انصاف کے تقاضوں سے بالکل اندھا کر دیا تھا۔

اسمے اور دوسرے لوگوں نے اس خفیہ سودا بازی پر پردہ ڈالنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلے ہیں۔ اسمے نے لکھا ہے کہ انگلستان سے رخصت ہوتے وقت اس کا خیال یہ تھا کہ انتقالِ اقتدار کے لیے پندرہ ماہ کی میعاد بہت ہی مختصر ہے، لیکن ہندمیں پہنچنے کے بعد اسے پورا یقین ہو گیا کہ یہ عرصہ بہت زیادہ طویل ہے۔ اپنی اس تبدیلیٔ رائے کے اس نے جو وجوہ بیان کیے ہیں وہ یہ ہیں کہ فرقہ وارانہ تلخی از حد بڑھ گئی تھی، نظم و نسق کی حالت ابتر ہو گئی تھی، عبوری حکومت میں جھگڑے ہو رہے تھے، اور نہرو نے دھمکی دے دی تھی کہ اگر بہت جلد دوسرے انتظامات نہ کیے گئے، تو وہ مستعفی ہو جائے گا ۲۳۔ ان سب وجوہ نے بلاشبہ حکومتِ برطانیہ اور ہند کی پارٹیوں کو یہ باور کرانے میں اہم حصہ لیا تھا کہ تقسیم ناگزیر ہے۔ چنانچہ تقسیم کا فیصلہ کانگرس

اور مسلم لیگ کی رضامندی سے ہو گیا تھا۔ اس فیصلے پر منظم طریق سے عملدرآمد کے لیے وقت درکار تھا۔ اسمے جو منصوبہ تقسیم لے کر لندن گیا تھا، اسے ان سب عوامل کا پوری طرح جائزہ لینے کے بعد ہی مرتب کیا گیا تھا جن کا ذکر اسمے نے کیا ہے اور اس منصوبہ تقسیم کے تحت انتقال اقتدار کے لیے یکم جون ۱۹۴۸ء کی تاریخ ہی مقرر کی گئی تھی۔

جب یکم جون ۱۹۴۸ء کے بجائے ایک بہت پہلی تاریخ مقرر کی گئی تو اس تبدیلی کا باعث ان وجوہ میں ایک بھی نہ تھا، جن کا ذکر اسمے نے کیا ہے۔ دراصل یہ قیمت تھی، جو کانگرس کو دولت مشترکہ میں رہنے پر رضامند کرنے کے لیے ادا کی گئی۔ اس بارے میں دستاویزی شواہد اتنے واضح ہیں کہ شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس ایک مفاد کی خاطر برطانیہ ہر قیمت ادا کرنے کے لیے تیار تھا۔۔ لیکن پاکستان کے خرچ پر۔

اسی دن (۱۰ مئی) جب مونٹ بیٹن کی نہرو کے ساتھ کانفرنس ہوئی، حکومت برطانیہ نے اپنی ترمیمات کے ساتھ منصوبہ تقسیم کو لندن سے واپس بھیج دیا۔ یہ اعلان کیا گیا کہ ۱۷ مئی کو نہرو، پٹیل، جناح، لیاقت علی خان اور بلدیو سنگھ کے ساتھ کانفرنس ہو گی، جس میں حکومت برطانیہ کے منظور کردہ منصوبہ تقسیم کو ان کے سامنے رکھا جائے گا۔ لیکن مونٹ بیٹن کو یہ "ناگہانی خیال" آیا کہ اسے دوسرے لیڈروں سے پہلے منصوبہ تقسیم نہرو کو دکھا لینا چاہیے، چنانچہ اسی شام کو وہ یہ کام کر گزرا۔ نہرو کا ردعمل سخت مخالفانہ تھا۔ اگلے دن اس نے مونٹ بیٹن کو ایک تحریر بھیجی، جس میں اس نے منصوبے کی تجاویز پر زیادہ تر اس بناء پر حملہ کیا کہ "وہ انڈین یونین کو برطانوی اقتدار کا واحد جانشین تسلیم نہیں کرتیں۔ اور اس طرح بہت سی ریاستوں کو دعوائے جانشینی کی دعوت دیتی ہیں جو اگر چاہیں تو دو یا زائد مملکتوں کی صورت میں اکٹھی ہو جائیں۔ ان تجاویز کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ ہند ریاست ہائے بلقان کی طرح منقسم و منتشر ہو جائے گا" [۲۴] نہرو نے بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے لوگوں کی خواہشات معلوم کرنے کے طریق کار پر بھی اعتراض کیا۔ لیکن نہرو کی سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ منصوبہ تقسیم میں حکومت برطانیہ نے جو ترامیم کی ہیں، ان میں واحد مملکت ہند کے تسلسل کے تصور کو قائم نہیں رکھا گیا۔ کیمبل جانسن کے بیان کے مطابق "اس کا اصل منشا اس بات کو پوری طرح تسلیم کرانا تھا کہ انڈیا اور آئین ساز اسمبلی ہی برطانوی ہند کے جانشین ہیں اور پاکستان اور مسلم لیگ کی حیثیت فقط اتنی ہے کہ وہ برطانوی ہند سے الگ ہو رہے ہیں" [۲۵]

مونٹ بیٹن یہ تحریر پڑھ کر کانپ اٹھا اور اس نے فوراً وی۔ پی مینن کو متبادل منصوبے کا مسودہ

مرتب کرنے کے لیے کہا۔ یہ تصحیح شدہ منصوبہ نہرو کو دکھایا گیا، اور اس کے منظور کرنے پر حکومت برطانیہ کی توثیق کے لیے لندن بھیجا گیا۔ لندن اور دہلی کے درمیان جھٹ پٹ کئی تاریں آ گئیں، جن میں حکومت برطانیہ کو مونٹ بیٹن کے اس "پلٹا کھانے" کی اطلاع دی گئی، اور ہند کے لیڈروں کے ساتھ کانفرنس ۲ جون تک ملتوی کر دی گئی۔

اس واقعہ پر مونٹ بیٹن کا ردِعمل اس کی شخصیت کا پوری طرح آئینہ دار ہے۔ اس نے اپنے عملے کو بتایا کہ اگر نہرو کو منصوبہ دکھانے کا "ناگہانی خیال" اسے نہ آتا تو "ڈکی مونٹ بیٹن کہیں کا نہ رہتا، اور اسے بوریا بستر لپیٹنا پڑتا۔ وہ اور اس کا عملہ حکومت برطانیہ کی نظروں میں احمق قرار پاتے، کہ وہ اسے یہ سبز باغ دکھاتے رہے تھے کہ نہرو منصوبے کو قبول کرے گا...... اس کے عملے کے بیشتر ارکان اپنی طبعی احتیاط کی بنا پر نہرو کو منصوبہ دکھانے کے خلاف تھے، لیکن اپنے عملے کا مشورہ ماننے کے بجائے اس نے اپنے "ناگہانی خیال" پر عمل کرکے صورتِ حال کو بگڑنے سے بچا لیا"[26] رات بھر کے آرام کے بعد اس کی ذاتی لچک بحال ہو گئی، اور اس نے کہا کہ وہ "ہند کے لیڈروں پر اپنی دیانت کا سکہ بٹھانے میں کامیاب ہو گیا ہے"[27] معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران میں ایک لحظے کے لیے بھی مونٹ بیٹن کو یہ محسوس نہیں ہوا کہ اس نے ہند کے دو متعلقہ فریقوں میں سے صرف ایک کو منصوبہ دکھانے اور پھر اس کی خواہشات کے مطابق اس میں ترمیم کرنے کی جو حرکت کی ہے وہ ایک انگریز وائسرائے کے شایانِ شان نہیں ہے، جس کے بارے میں اس نے خود کئی بار کہا تھا کہ "غیر جانبداری اس کا منصبی فرض ہے"۔ اسے خیال آیا تو یہ کہ اس نے اپنے مستقبل کو بربادی سے بچا لیا ہے اور "ہند کے لیڈروں پر اپنی دیانت کا سکہ بٹھانے میں کامیاب ہو گیا ہے"[28] شاید اس کا دیانت کا یہی عجیب و غریب نظریہ تھا جس نے کانگرس کے لیڈروں کو اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ دی۔ پی مینن نے شملہ کے ان واقعات سے پٹیل کو پوری طرح باخبر رکھا، اس نے لکھا ہے کہ "پٹیل اس تبدیلیٔ حالات سے بہت خوش ہوا۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ کانگرس کے درجۂ ڈومینین مان لینے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی"[29]

اس اثنا میں دی۔ پی مینن نے مونٹ بیٹن کا "مکمل اعتماد"[30] حاصل کرنے کے بعد اپنی اس منفرد حیثیت سے فائدہ اٹھانے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہ ہونے دی۔ اس نے یہ موقف اختیار کیا کہ "یہ بھی عین ممکن ہے کہ جب منصوبے کا اعلان کیا جائے، تو جناح اسے منظور نہ کریں" اس طرح اس نے مونٹ بیٹن کو حکومت برطانیہ سے ایک متبادل منصوبے کی منظوری حاصل کر لینے پر آمادہ کر لیا۔ یہ متبادل منصوبہ "موجودہ آئین کے تحت اقتدار سے دستبردار ہونے پر مشتمل تھا۔ اور بدرجہ آخر اس کے لیے ہند کے لیڈروں کی منظوری

کی ضرورت نہیں تھی اس کی رُو سے صوبائی محکمے اور اختیارات موجودہ صوبائی حکومتوں کو دے دیے جائیں گے اور مرکزی محکمے اور اختیارات موجودہ مرکزی حکومت کو۔ البتہ اس سے مسلمان ہندو اکثریت کے ماتحت چلے جائیں گے" ۳۱؎ اقتدار سے دستبرداری کا یہ منصوبہ، جس کے لیے مونٹ بیٹن نے حکومت برطانیہ سے منظوری حاصل بھی کرلی، اصل میں وہی کچھ تھا جس کے لیے گاندھی بڑے طویل عرصے سے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ عین اسی زمانے میں پٹیل نے برسرعام اس کی تحریک شروع کر دی۔ ۹ مئی ۱۹۴۷ء کو پٹیل نے ایک اخباری بیان میں کہا:

> "موجودہ حکومت کو اپنی موجودہ ہیئت میں اگر اقتدار منتقل کردیا جائے تو ایک ہفتے کے اندر ملک میں امن وامان ہو جائے گا۔ وائسرائے کو چاہیے کہ ہٹ کے کھڑا ہو جائے اور عبوری حکومت کو کام کرنے دے۔ اگر تیسرا فریق جس سے کوئی پارٹی بھی اپیل کر سکتی ہے، مداخلت کرنے نہ پائے۔ تو کانگرس اور مسلم لیگ فی الفور اپنے اختلافات طے کرلیں گی۔ اگر کابینہ میں کسی سوال پر جھگڑے ہوئے تو اکثریت کا حکم چلے گا" ۳۲؎

اقتدار سے دستبردار ہونے کے اس منصوبے کا مقصد مسلم لیگ کے سر پر تلوار لٹکانا تھا۔ جن حالات کے تحت تقسیم کو بروئے کار لایا جا رہا تھا، انہیں حتی الوسع مسلم لیگ کے لیے زیادہ سے زیادہ نامساعد بنایا جا رہا تھا۔ اگر مسلم لیگ ان حالات کو ناقابل برداشت قرار دے گی، تو جس متبادل صورت کا اسے سامنا کرنا پڑے گا، وہ اس سے بھی بدتر ہوگی کیونکہ عنانِ اقتدار ہندوؤں کے ہاتھ میں دے دی جائے گی۔ ویول اور مونٹ بیٹن میں فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ مونٹ بیٹن کے اس منصوبۂ دستبرداری کی تاریخ سے صرف تین ماہ قبل، ویول نے شاہ جارج ششم کو ایک خط لکھا تھا جس میں اس نے کابینہ مشن پلان کی ناکامی کی صورت میں امکانی طریق ہائے کار کا جائزہ لیا تھا، ایک ممکن راہ عمل یہ تھی کہ "اکثریتی پارٹی یعنی کانگرس کو ہند پر تسلط جمانے میں مدد دی جائے" لیکن ویول نے اس بارے میں یہ رائے ظاہر کی تھی "میرے خیال میں یہ پالیسی نہ منصفانہ ہوگی اور نہ آبرومندانہ، کیونکہ ہم اقلیتوں اور ریاستوں کو عہد دے چکے ہیں، ممکن ہے ہم ان کی حفاظت کرنے کے قابل نہ رہیں، لیکن ان کو کچلنے میں کانگرس کی مدد کرنا غلط ہوگا۔ اکثریتی پارٹی کو تسلط جمانے میں مدد دینے کی پالیسی سے عملاً یہی نتیجہ برآمد ہوگا" ۳۳؎ اس سے یہ بات بآسانی نظر آجاتی ہے کہ کانگرس کے لیڈر ویول کے خلاف اور مونٹ بیٹن کے ثناخواں کیوں تھے؟

ماؤنٹ بیٹن کے منصوبے میں کیے بعد دیگرے ترمیموں سے برطانوی حکومت قدرے حیران ہو گئی' اور ماؤنٹ بیٹن کو مشورے کے لیے لندن بلایا۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے وی پی مینن سے اقرار نامے کے عنوانات مرتب کرنے کے لیے کہا' جو منظوری حاصل کرنے کے لیے ہند کے لیڈروں کے سامنے پیش کیے جائیں گے۔ کانگرس کے لیے یہ محض رسمی کارروائی تھی' کیونکہ جس منصوبے کی بناء پر یہ عنوانات مرتب کیے گئے تھے' اس کا مسودہ نہرو پہلے ہی منظور کر چکا تھا۔ یہ عنوانات حسب ذیل تھے :-

ا۔ یہ کہ لیڈران اس طریق کار سے متفق ہیں' جو لوگوں کی خواہشات اس بارے میں معلوم کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہے کہ آیا ہند کی تقسیم ہونی چاہیے یا نہیں؟

ب۔ یہ کہ فیصلہ اگر یہ ہو کہ ہند میں صرف ایک ہی مرکزی حکومت ہونی چاہیے تو درجۂ ڈومینین کی اساس پر موجودہ آئین ساز اسمبلی کو اقتدار منتقل کر دیا جائے۔

ج۔ یہ کہ فیصلہ اگر یہ ہو کہ ہند میں دو آزاد و خود مختار مملکتیں ہوں تو درجۂ ڈومینین کی اساس پر ہر مملکت کی مرکزی حکومت اپنی متعلقہ آئین ساز اسمبلی کے سامنے جوابدہی کے تحت اقتدار سنبھال لے۔

د۔ یہ کہ ہر دو صورتوں میں انتقال اقتدار گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی اساس پر ہو گا' جس میں درجۂ ڈومینین سے تطابق کے لیے ترمیم کر دی جائے گی۔

ہ۔ یہ کہ دونوں نئی ڈومینینوں کا گورنر جنرل مشترکہ ہو اور یہ کہ موجودہ گورنر جنرل کو ہی دوبارہ مقرر کر دیا جائے۔

و۔ یہ کہ اگر فیصلہ تقسیم کے حق میں ہو تو پھر سرحدوں کے تعین کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا جائے۔

ز۔ یہ کہ صوبوں کے گورنر متعلقہ مرکزی حکومتوں کی سفارش پر مقرر کیے جائیں۔

ح۔ اگر دو نئی ڈومینینیں معرض وجود میں آئیں' تو ہند کی افواج ان میں تقسیم کر دی جائیں۔ فوجی یونٹوں کی تقسیم ان کی علاقائی بھرتی کی اساس پر کی جائے گی۔ اور وہ متعلقہ حکومتوں کے تحت ہوں گے۔ مشترکہ فوجی یونٹوں کی علیحدگی اور تقسیم کا انتظام ایک کمیٹی کے سپرد کیا جائے' جو فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکنلک اور دونوں

ڈومینینوں کے چیفس آف جنرل سٹاف پر مشتمل ہوگی۔ یہ کمیٹی گورنر جنرل اور دونوں
وزرائے دفاع پر مشتمل کونسل کی نگرانی میں کام کرے گی۔ جونہی تقسیم کا کام پایۂ
تکمیل تک پہنچے گا، اس کونسل کا وجود از خود ختم ہو جائے گا۔

ان میں عنوان (۱۵) خاص توجہ کا مستحق ہے۔ یہ تجویز کہ مونٹ بیٹن ہی دونوں ڈومینینوں کا مشترک گورنر جنرل ہو۔ اس فیصلے کا ایک ضمنی نتیجہ تھا کہ دو ماہ کے اندر اندر اقتدار منتقل کر دیا جائے۔ کیونکہ یہ بات اظہر من الشمس تھی کہ تقسیم کے تمام مراحل اس میعاد کے اندر طے نہیں ہو سکیں گے۔ اگر یکم جون ۱۹۴۸ء کی اصل تاریخ برقرار رکھی جاتی، تو اس دفعہ کی ضرورت نہیں تھی۔

وائسرائے کی خواہش تھی کہ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں تحریری طور پر اس منصوبے کو منظور کریں۔ کانگرس کی طرف سے نہرو نے لکھ کر دے دیا کہ کانگرس کو منصوبے سے عمومی اتفاق ہے لیکن کانگرس کی منظوری اس بات سے مشروط تھی کہ دوسرا فریق بھی اسے حرفِ آخر تسلیم کرے اور کوئی مزید مطالبات پیش نہ کرے۔ کانگرس نے یہ منظور کر لیا کہ اگر عبوری عرصے میں دو مملکتیں ہوں، تو پھر دونوں کا گورنر جنرل مشترک ہونا چاہیے۔ نہرو نے لکھا کہ اگر لارڈ مونٹ بیٹن ہی اس منصب پر فائز رہا، تو کانگرس کو مسرت ہوگی، کیونکہ وہ اپنے مشورے اور تجربے سے دونوں مملکتوں کو مستفیض کر سکے گا۔

جب مونٹ بیٹن نے قائدِ اعظم اور لیاقت علی خان کے ساتھ اس منصوبے پر بات چیت کی، تو اس نے ان کے سامنے اس بات پر بہت زور دیا کہ سب سے اشد ضرورت سرعتِ کار کی ہے۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ سابق منصوبے طویل بحث مباحثے اور مزید سوچ بچار کی مہلتوں کے باعث ناکام ہوئے تھے۔ قیامِ پاکستان کا جو موقع اب سامنے آیا ہے، اگر اس سے فوری طور پر فائدہ نہ اٹھایا گیا، تو پھر یہ موقع دوبارہ نہیں آئے گا۔ کانگرس کے لیڈر اپنے معاہدوں سے بچ نکلنے کی ہزاروں راہیں ڈھونڈ لیں گے۔ ضرورت فوری اور جرأت مندانہ اقدام کی ہے، ورنہ سب کچھ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ یہ بہت ہی مؤثر دلائل تھے، لیکن جو شخص انہیں پیش کر رہا تھا، اس کی اپنی وجوہ کچھ اور تھیں۔ لیکن اس بات سے قطع نظر یہ واقعہ ہے کہ قائدِ اعظم اور لیاقت علی خان اس وقت تک مونٹ بیٹن کی غیر جانبداری پر کوئی شک نہیں کرتے تھے۔ اور نہ انہیں کانگرس کی ہیرا پھیری کی یاد دہانی کرانے کی چنداں ضرورت تھی، انہوں نے مونٹ بیٹن کے پیش کردہ خاکے کو عمومی طور پر منظور کر لیا۔ اس میں بہت جلد انتقالِ اقتدار بھی شامل تھا۔ لیکن مونٹ بیٹن کی ساری چرب زبانی کے

باوجود قائد اعظم نے تحریری صورت میں اپنی منظوری دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر مونٹ بیٹن نے منصوبہ دستبرداری کی دھمکی دی، جس کے تحت مسلمان ہندوؤں کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ کیمبل جانسن نے قائد اعظم کا ردِ عمل ان الفاظ میں لکھا ہے :۔

"جناح بظاہر بہت پُرسکون رہے، اور انہوں نے صرف یہ بات کہی کہ وہ کسی صورت ایسے اقدام کو روک نہیں سکتے۔ عجب نہیں کہ بعض پہلوؤں سے مونٹ بیٹن اور جناح دونوں کی حکمت عملی کا یہ بہت ہی نازک اور فیصلہ کن مرحلہ ثابت ہو۔ مونٹ بیٹن محسوس کرتا تھا کہ جناح کا ردِ عمل غیر معمولی بھی ہے اور تشویش انگیز بھی۔ ان کا ردِ عمل یقیناً فراست و تدبر کا آئینہ دار تھا۔ مونٹ بیٹن کا آزمائشی بیلون چڑھا بھی، اور نیچے بھی اتر آیا، اور اس سے صرف یہی ثبوت ملا کہ جناح بہت ہی مضبوط و مستحکم اعصاب کے مالک ہیں۔ مونٹ بیٹن کا خیال ہے کہ جناح کو بطور شہید اپنی طاقت کا پورا علم ہے جسے کانگرس کی قربان گاہ پر انگریزوں نے بھینٹ چڑھا دیا ہو" ۳۵؎

قائد اعظم کے مسلّم ناقدین جو ان کا رتبہ گھٹانے کے درپے رہتے ہیں اور جو ان کو برطانوی عدالت میں مسلمانوں کی وکالت کرنے والا محض ایک قابل وکیل قرار دیتے ہیں، انہیں اس واقعہ کے بنظرِ غائر مطالعے سے قائد اعظم کی عظمت کا بطور مدبر شاید کچھ اندازہ ہو سکے گا۔ وہاں ہرگز کوئی عدالت نہیں تھی، نہ برطانیہ کی اور نہ ہند کی جس نے اہلِ ہند کی سیاسی قسمت کے بارے میں فیصلہ صادر کرنا تھا اور نہ ہی حقیقت نفس الامری میں ہو سکتی تھی اس کے برعکس یہ عالمی اہمیت کی ایک کشمکش تھی، جس میں تین قومیں ــــ انگریز، ہندو اور مسلمان ــــ شریک تھیں۔ ہر ایسی کشمکش میں لیڈروں کی دانشمندی، جرأت اور عزم کی پختگی کے ساتھ اس امر کی آزمائش ہوتی ہے کہ وہ اپنے پیچھے اپنی متعلقہ قوم کو صف آرا کرنے کی کتنی قابلیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان سب صفات کی پوری پوری آزمائش اس کشمکش میں بھی ہوئی۔ محض اس بات سے کشمکش کی بنیادی نوعیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہند میں اس مقابلے نے ہمہ گیر جنگ کی صورت اختیار نہیں کی۔ بقول کلازوٹز "جنگ نام ہے سیاست کو دوسرے ذرائع (یعنی قتال) سے جاری رکھنے کا"۔ اس میں بھی اصل مقصد مخالف کے عزم و ارادہ کو سرنگوں کرنا ہوتا ہے۔ قائد اعظم محمد علی جناح کے سوا اس زمانہ میں کوئی بھی دوسرا مسلمان لیڈر ایسا نہیں تھا، جسے خوشامد سے رام نہ کیا جا سکتا یا دباؤ سے جھکایا نہ جا سکتا۔ دباؤ بے حد و حساب

تھے۔ اور ان سے مسلمانوں کے علیحدہ سیاسی وجود کو خطرہ لاحق تھا۔ دوسرے لیڈروں میں سے اکثر کے بارے میں یہ کہنا خلافِ انصاف نہیں ہوگا کہ اپنی معتدل مزاجی اور مروت کے باعث وہ قائدِ اعظم کے غیر متزلزل اور غم ناآشنا رویے کو بمشکل سمجھ سکتے تھے اور مشکل سے ہی برداشت کر سکتے تھے۔ لیکن ان اوصاف دمحاسن کے بغیر قائدِ اعظم کبھی پاکستان کی جنگ نہیں جیت سکتے تھے۔ ان کی طرف سے کمزوری کی پہلی علامت یا مصالحت پر آمادگی کے ساتھ ہی بیسیوں مسلمان لیڈر دوسرے کیمپ میں چلے جاتے۔ انہوں نے قائدِ اعظم کا اس لیے ساتھ دیا کہ مسلم عوام دل وجان سے قائدِ اعظم کے پیروکار تھے۔ دوسرے درجے کی قیادت میں ایسے مسلمان بڑی کثرت سے موجود تھے، جو ایثار پیشہ تھے اور ذاتی مصائب برداشت کرنے کا دل گردہ رکھتے تھے۔ یہ خوبیاں کمیاب نہیں۔ عظیم قومی مقاصد کے حصول کے لیے یہ صفات لازم ہیں، لیکن کافی نہیں۔ البتہ جب کبھی ساری قوم کا بار صرف ایک مدبر کے دل و دماغ پر ہوتا ہے اور اس کے اعصاب اور قوتِ فیصلہ پر اس قوم کا مستقبل بننے اور بگڑنے کا انحصار ہوتا ہے، تو پھر بلند ترین قیادت لابدی ہوتی ہے۔

اس موقع پر گاندھی کی سرگرمیوں کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ انتقالِ اقتدار کے مذاکرات سے وہ علیحدہ ہو گیا تھا، بایں ہمہ وہ بے پایاں سیاسی قوت رکھتا تھا، اور سارے برصغیر پر ہندو تسلط کے لیے، جو اس کا دلی مقصد تھا، دن رات کوشاں تھا۔ اپنی روزانہ پرارتھنا کی مجلسوں میں وہ تقسیمِ ہند کو ایک اخلاقی گناہ کے طور پر پیش کرتا تھا، جس سے دوسرے تو مصالحت کر سکتے ہیں، لیکن صداقت اور عدم تشدّد کا پرستار یعنی وہ خود کبھی نہیں کر سکتا۔ انسانی معاشرے کے مختلف گروہوں کے مابین تنازعات میں کسی نقد وجرح کے بغیر اخلاقی فیصلے صادر کرنا تمام اخلاقی اقدار میں اولیں اخلاقی قدر ـــــ صداقت ـــــ کے ہی منافی ہے ہر قومی گروہ کا طبعی رجحان ہوتا ہے کہ اپنے مفاد کو بعینہٖ خیر سمجھے۔ گاندھی اس رجحان میں عصرِ رواں کے دوسرے سب سیاستدانوں سے آگے بڑھ گیا۔ سارے برصغیر پر ہندو اکثریت کی عمل داری قائم کرنے کی اپنی ہوا و ہوس کو وہ خیرِ مطلق سمجھتا تھا۔ جو تحریک بھی اس کی خواہش میں سدِ راہ بنتی، جیسا کہ اپنی اکثریت کے علاقوں میں حقِ خود اختیاری کے لیے مسلمانوں کی تحریک تھی، وہ اسے معصیت قرار دیتا تھا۔ اس سوال کا اسے خیال تک نہ آتا تھا کہ اس کی اپنی خواہش کیونکر اخلاقاً درست ہے اور مسلمانوں کی یہ خواہش اخلاقی طور پر کیوں غلط ہے کہ جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں ہے، وہاں ان کی اپنی حکومت ہونی چاہیے۔

یہ بات بدیہی ہے کہ دو بڑے اور ممتاز انسانی گروہوں کو اپنے اپنے علاقوں میں حکومتِ خود اختیاری

کا مساوی حق حاصل ہے۔ نسبتاً مختصر اقلیت کے لیے، جو ملک بھر میں بکھری ہوئی ہو، حکومت خوداختیاری ناقابلِ عمل ہوتی ہے۔ لیکن مسلمانوں کی تعداد دس کروڑ تھی، اور بہت وسیع اور باہم گر متصل علاقوں میں وہ واضح اکثریت میں تھے۔ محض اس بات سے ہندو اور مسلمان ایک قوم نہیں بن گئے تھے، کہ دونوں پر ایک بیرونی نسل ڈیڑھ صدی تک حکومت کرتی رہی تھی۔ قومیت کا معیار لوگوں کے شعور، ان کی ثقافت، ان کے معتقدات اور باہمی یگانگت کے احساس میں مضمر ہوتا ہے۔ اس بات سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کرتا تھا کہ مسلمان ایک علیحدہ اور ممیز ثقافتی گروہ ہیں۔ لیکن گاندھی جیسے ہندو یہ دعویٰ کرتے تھے کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم نہیں ہیں، اور اس ضمن میں ان رسوم اور خصائص کا ذکر کرتے تھے، جو مسلمانوں اور ہندوؤں میں مشترک تھے۔ "قوم" کا نظریہ مغرب سے مستعار لیا گیا تھا، اور اس میں کسی گروپ کے لیے اہم اور امتیازی بات یہ تھی کہ وہ سیاسی حق خودارادیت سے بہرہ ور رہا ہو یا اس کا مستحق ہو۔

مسلمانوں میں جدید اعتبار سے سیاسی شعور کے فروغ کی رفتار ہندوؤں کے مقابلے میں کم تھی۔ ہندوؤں نے مغربی تعلیم مسلمانوں سے پچاس برس پہلے اختیار کر لی تھی۔ مزید براں ہندوؤں میں معاشرتی ہم آہنگی بھی جو زمانۂ طفولیت سے ہی چھوت چھات کے زیرِ سایہ نشوونما پاتی رہتی ہے، ایک بڑی طاقت تھی، جس میں ہر بیرونی گروہ کے لیے مخاصمت کا جذبہ بہت نمایاں تھا۔ ان دو عوامل ــــ نسبتاً زیادہ سیاسی شعور اور محکم تر داخلی ہم آہنگی ــــ نے ہندوؤں میں سارے برِصغیر پر تنہا حکومت کرنے کے عزائم کو بہت قوی کر دیا تھا، اور وہ باہمی رعایت سے کچھ لینے اور کچھ دینے کی ضرورت سے مانوس نہیں رہے تھے۔ جوں جوں مسلمانوں میں مغربی تعلیم پھیلتی چلی گئی، وہ بھی سیاسی شعور کے معاملے میں ہندوؤں کی سطح پر آتے گئے۔ یہ سوال کہ مسلمان کب قوم بنے، اسی طرح کا ہے، جس طرح کوئی یہ پوچھے کہ کس لمحے ایک لڑکا نوجوانی کی سرحد عبور کر کے مرد بن جاتا ہے۔ مسلمان نشوونما کے ایک دور سے گزرے تھے جس میں وہ پے در پے حیران اور پریشان ہوتے رہے کہ ہندو ان کے معتدل مطالبات بھی مسترد کر دیتے ہیں۔ اس تجربے نے ان میں علیحدہ قومیت کے جذبے کو ابھارا اور بڑھایا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہندوؤں کی طرف سے مخالفت بڑھتی گئی، جس کا مسلمانوں پر بھی ردِعمل ہوتا رہا۔ اگر ہندو اکثریت حساس اور دوراندیشانہ تدبر سے کام لیتی، تو اس عمل کو ابتدائی مرحلوں میں روکا اور اس کا رُخ موڑا جا سکتا تھا۔ ہر چند کہ انگریزی راج کے آخری پچاس سالوں میں باہمی مفاہمت کے کئی مواقع سامنے آئے، لیکن ہندو قیادت ان سے فائدہ اٹھانے میں بالکل ناکام ثابت ہوئی۔ بلکہ اس کے برعکس ہندو

قیادت نے ایسے ہر موقع پر ہندو اور مسلم فسادات میں مغایرت کا مظاہرہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ یہ بات کہ گاندھی یا کسی اور ہندو لیڈر نے کسی مسلمان کو انفرادی طور پر نقصان نہیں پہنچایا یا بڑی محبت سے اس کی خدمت کی، سیاسی مسئلے سے یکسر غیر متعلق ہے۔ جس طرح انگریز ڈاکٹروں یا تعلیمی مشنریوں کی خدمات سے برطانوی سامراج کا جواز پیدا نہیں ہوتا اسی طرح ہندو لیڈروں کی انفرادی خدمات سے بھی مسلمانوں پر ان کے سیاسی اقتدار کا جواز پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ انگریزی راج کے حامیوں نے ہزار کوشش کی کہ ہند پر برطانوی حکومت کو مثالیت پسندی اور بے غرضی کا مظہر ثابت کریں۔ لیکن اہل ہند کبھی ان کے استدلال سے متاثر نہیں ہوئے، اسی طرح گاندھی نے ہندو عزائم پر محبت اور اتحاد کا جو لبادہ ڈالنے کی کوشش کی، وہ مسلمانوں کے دلوں کو موہ نہ سکی۔ مسلمانوں میں بھی بعض لوگ گاندھی کے ثنا خواں اور طرفدار تھے، لیکن گاندھی جس قدر ان کی تعریف و تحسین کرتا تھا، مسلمان انہیں اسی قدر زیادہ اپنی ملت کے غدار سمجھتے تھے۔

اس مرحلے پر گاندھی نے جس شخص کو بالخصوص نمایاں کرنے کی کوشش کی وہ شمال مغربی سرحدی صوبے کا سرخپوش لیڈر عبدالغفار خان تھا۔ گاندھی اسے پیار سے بادشاہ خان کہتا تھا۔ ابوالکلام آزاد جو ایک سال پہلے تک بطور صدر کانگرس بہت مشتہر کیا جاتا تھا، اب گوشۂ گمنامی میں تھا اور شہرت کی سٹیج پر عبدالغفار خان کو سب سے اہم "قوم پرست" مسلمان کے طور پر فائز کر دیا گیا تھا۔ گاندھی کا مقصد شمال مغربی سرحدی صوبے کو پاکستان سے علیحدہ رکھنا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس صوبے میں کانگرسی وزارت کے پاؤں اکھڑ رہے ہیں اور مسلم لیگ روز افزوں تقویت حاصل کر رہی ہے۔ اگرچہ عوام کی اکثریت پاکستان کی حمایت کر رہی تھی، لیکن وزارت ہندوستان کے حق میں تھی۔ چنانچہ اسمے نے اسے "دوغلی صورت حال" قرار دیا، جو زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکتی تھی۔ اگرچہ کانگرس کے لیڈر شمال مغربی سرحدی صوبہ پر انڈین یونین کا حق جتلاتے تھے۔ اور اگرچہ اس کے نمائندے آئین ساز اسمبلی میں شرکت کرتے تھے، لیکن یہ بات ناگزیر معلوم ہونے لگی تھی کہ اس صوبے کے لوگوں سے استصواب کیا جائے گا۔ اس صوبے کی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ۹۲ فیصد تھا، اور اگر ہندوستان کا سیدھا مقابلہ پاکستان سے ہوتا تو عوام نے پاکستان کی ہی حمایت کرنی تھی اس لیے گاندھی نے پختونستان یا آزاد شمال مغربی سرحدی صوبے کا شوشہ چھوڑ دیا۔

بظاہر یہ بات بہت عجیب معلوم ہوگی کہ وحدتِ ہند کا پیامبر جس کے نزدیک مطالبۂ پاکستان بھارت ماتا کو زندہ بچاٹنے کے مترادف تھا، مزید ایک اور آزاد مملکت کے قیام کی وکالت کرے۔ لیکن یہ

حکمتِ جنگی کی ایک چال تھی، جس کا مقصد پاکستان کے علاقوں کو گھٹانا اور اس کے گرد گھیرا ڈالنا تھا۔ بعد میں جب ریاست جموں و کشمیر کے بارے میں کانگرس کے عزائم بروئے کار آجاتے، تو پھر شمال مغربی سرحدی صوبہ کو بھی، جو کشمیر سے متصل تھا، انڈین یونین میں دوبارہ شامل کیا جاتا تھا۔ وقتی طور پر گاندھی کی ساری توجہ پختونستان کی سکیم اور بادشاہ خان پر مرکوز تھی، جس کے بارے میں وہ اپنی روزانہ پرارتھنا کی مجلسوں میں بڑے سوز و گداز سے ذکر کرتا تھا۔ پیارے لال نے ایک واقعہ لکھا ہے، جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ گاندھی کس قسم کے جذبات کی آبیاری کر رہا تھا۔ ۴ مئی کو عبدالغفار خان نے بڑے حسرت و اندوہ کے ساتھ کہا "بہت جلد ہم ہندوستان میں اجنبی بن جائیں گے۔ آزادی کے لیے ہماری طویل جد و جہد کا خاتمہ پاکستان کی محکومی کی صورت میں نکلے گا۔ ہم باپو (گاندھی) سے دور ہوں گے، بھارت سے دور ہوں گے، اور آپ سب سے دور ہوں گے۔ کون جانتا ہے کہ مستقبل میں ہمارا کیا حشر ہونے والا ہے"؟ جب گاندھی نے یہ باتیں سنیں تو اس نے کہا "بادشاہ خان تو سچ مچ فقیر ہے۔ آزادی تو آئے گی، لیکن بہادر پٹھان اپنی آزادی کھو بیٹھیں گے۔ وہ بہت ہی سنگین صورتِ حال سے دوچار ہیں، لیکن بادشاہ خان تو مردِ خدا ہے"۔ ۳۶

یہ "فقیر" شمال مغربی سرحدی صوبے کے امیر ترین زمینداروں میں سے تھا۔ وہ کانگرس کی مدد سے اس صوبے میں اپنی خاندان کی حکومت کا خواب دیکھ رہا تھا، جہاں اس کا بھائی ڈاکٹر خان صاحب وزیرِ اعلیٰ تھا، اور دوسرا مسلمان وزیر اس کا رشتہ دار تھا۔ گاندھی کی طرف سے پیار کا خطاب "بادشاہ" بھی بالواسطہ طور پر ان امنگوں کی حوصلہ افزائی کے لیے تھا، جن کی یہ "مردِ خدا" اپنے دل میں پرورش کر رہا تھا۔ اور یہ کہا جا رہا تھا کہ بہادر پٹھان ہندوؤں کے تحت ہند میں تو آزادی کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے، لیکن مسلم پاکستان میں آزادی سے محروم ہو جائیں گے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ گاندھی کی پوری کوشش تھی کہ شمال مغربی سرحدی صوبے میں استصواب نہ ہو۔ ۸ مئی کو اس نے ماؤنٹ بیٹن کو لکھا "اس مرحلے پر سرحد (یا کسی اور صوبے) میں استصواب ایک بہت ہی خطرناک بات ہوگی۔ جو بھی مواد آپ کے پاس ہے، آپ کو اسی سے سروکار رکھنا چاہیے۔ بہر صورت ڈاکٹر خان صاحب کو نظر انداز کر کے کوئی بات نہیں کرنی چاہیے اور نہ ہی کی جا سکتی ہے"۔ ۳۷ اسی خط میں گاندھی نے اپنا یہ مرغوب راگ بھی الاپا کہ اقتدار صرف کانگرس کو سونپ دیا جائے۔

گاندھی نے یہ خط کلکتہ جاتے ہوئے لکھا۔ وہاں آزاد بنگال کے لیے تحریک شروع ہو چکی تھی۔ اس

تحریک میں ایسے امکانات تھے کہ ان سے فائدہ اٹھا کر پاکستان کو توڑا جا سکتا تھا۔ وزیراعلیٰ بنگال حسین شہید سہروردی نے سبھاش چندر بوس کے بھائی سرت چندر بوس کی تائید کے ساتھ ایک آزاد و خود مختار متحدہ بنگال کی بات اٹھائی تھی۔ انگریز گورنر بھی اس کا حامی تھا۔ دو سو سال سے سارے بنگال کی دولت کلکتے میں جمع ہوتی رہی تھی، یہ سلطنت برطانیہ کا دوسرا سب سے بڑا شہر تھا۔ صوبہ کا دارالحکومت اور اس کی سب سے بڑی بندرگاہ بھی تھا۔ بنگال کی سب سے اہم تجارتی فصل پٹ سن زیادہ تر مشرقی بنگال میں کاشت کی جاتی تھی لیکن پٹ سن کے سارے کارخانے کلکتہ میں یا اس کے اردگرد واقع تھے۔ متحدہ بنگال میں پٹ سن پیدا کرنے والے علاقے اور پٹ سن کی صنعت ایک ہی سیاسی وحدت میں اکٹھے رہتے۔ لہٰذا یورپین بھی جن کا پٹ سن کی صنعت میں بڑا سرمایہ لگا ہوا تھا اس خیال کی حمایت کر رہے تھے۔

کلکتے میں گاندھی نے سرت چندر بوس، سہروردی اور دوسرے لیڈروں سے جن میں بنگال مسلم لیگ کے سیکرٹری ابوالہاشم بھی شامل تھے، ملاقات کی۔ موخرالذکر کی گفتگو سے "گاندھی کو خوشگوار حیرت ہوئی۔ کیونکہ وہ متحدہ بنگال کی حمایت مشترکہ زبان، مشترکہ ثقافت اور مشترکہ تاریخ کی بنیاد پر کرتا تھا جس نے بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک وحدت میں پرو رکھا تھا"[۳۸] گاندھی کا اصرار یہ تھا کہ متحدہ بنگال میں "حکومت کے ہر اقدام کو انتظامیہ اور مقننہ میں ہندو اقلیت کے کم از کم دو تہائی حصے کا تعاون حاصل ہونا چاہیے"۔ اس کا یہ مطالبہ گاندھی، نہرو اور دوسرے ہندو اہل قلم کی طرف سے قائداعظم کے دو قومی نظریہ کے خلاف مسلسل پروپیگنڈے کا قطعی اور مسکت جواب ہے۔ بنگال میں مسلمانوں کی آبادی صرف ۵۵ فیصد تھی۔ ہندو ان کے مقابلے میں تعلیمی، اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے کہیں آگے تھے۔ لیکن اس بہت ہی طاقتور اقلیت کی طرف سے جو تقریباً ۴۵ فیصد تھی، گاندھی ایسی نوعیت کے سیاسی تحفظات کا خواہاں تھا، جو وہ ہند میں مسلمانوں کے لیے منظور کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوا تھا۔ مسلمانوں کے اس سے کہیں زیادہ نرم مطالبات ہندو لیڈر بشمول گاندھی مسترد کرتے رہے تھے۔ جو شرط گاندھی نے پیش کی تھی، اس کے تحت بنگال میں حکومت کا سارا اختیار ہندوؤں کے ہاتھوں میں منتقل ہو جاتا اور اس کے لیے جو واحد جواز پیش کیا جا سکتا تھا، وہ یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مفادات مختلف الاصل تھے۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ گاندھی مسلم لیگ سے یہ اعتراف بھی کرانا چاہتا تھا کہ بنگال ایک مشترکہ ثقافت کا گہوارہ ہے۔ پیارے لال نے آگے چل کر اس کی یوں وضاحت کی ہے:۔

"چونکہ بنگال کے لوگوں کی (خواہ ہندو ہوں یا مسلمان) بنیادی وحدت ہی

سہروردی کی تجویز کی اساس تھی، اور چونکہ بنگال کے مسلمان آبادی کے لحاظ سے پاکستان میں جس کا تصور مسلم لیگ نے پیش کیا تھا، غالب حیثیت کے مالک تھے، بنگالی مسلمانوں کی طرف سے جناح کی رضامندی کے ساتھ دوقومی نظریے کو عملاً مسترد کرنے کا مطلب یہ نکلتا کہ اس نظریے پر مبنی پاکستان کی تجویز کا کچھ بھی باقی نہ رہتا"[۴۰]

۲۰ رمئی کو ایک کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں سرت چندر بوس اور دوسرے ہندو لیڈر اور سہروردی اور بعض مسلمان لیڈر شامل ہوئے، اس میں ایک آزاد و خود مختار متحدہ بنگال کے لیے ایک آزمائشی سمجھوتہ مرتب کیا گیا[۴۱] لیکن بالآخر اس سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ہندوؤں کا ایک بہت مضبوط گروپ، جس کی قیادت ہندو مہاسبھا کے لیڈر ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کے ہاتھ میں تھی، متحدہ بنگال کی سکیم کی ایڑی چوٹی سے مخالفت کر رہا تھا۔ اس سے کافی عرصہ پہلے ۴ر اپریل کو بنگال کی صوبائی کانگرس کی مجلس عاملہ نے ایک قرارداد منظور کی تھی کہ:۔

"اگر ملکِ معظم کی حکومت بنگال کی موجودہ حکومت کو جو بنگال کو ایک علیحدہ اور آزاد و خود مختار مملکت بنانے پر تلی ہوئی ہے، اقتدار تفویض کرنے پر غور کر رہی ہے... ..... تو پھر بنگال کے ان حصّوں کو جو انڈین یونین میں شمولیت چاہتے ہیں، اس بات کی اجازت مل جانی چاہیے، اور انڈین یونین کے اندر ہی ان حصوں پر مشتمل ایک علیحدہ صوبہ بنا دینا چاہیے"[۴۲]

آسام کانگرس کو ڈر لگا کہ اگر بنگال ایک علیحدہ آزاد و خود مختار مملکت بن گیا، تو پھر آسام انڈین یونین سے کٹ جائے گا۔ نہرو اور پٹیل بھی اس تجویز کے خلاف تھے[۴۳] چنانچہ مونٹ بیٹن نے منصوبۂ تقسیم پر نظرثانی کر دی "تاکہ بنگال یا کسی اور صوبے کو آزاد مملکت بننے کا حق انتخاب نہ رہے"[۴۴]

گاندھی کی طرف سے سارے برصغیر پر ہندو راج کے لیے مسلسل پروپیگنڈے اور پاکستان قائم ہونے سے پہلے ہی اس کا شیرازہ بکھیر دینے کی کوششوں نے مسلم لیگ کو مجبور کر دیا کہ وہ مطالبۂ پاکستان کے بارے میں سخت ترلب و لہجہ اختیار کرے۔ قائد اعظم نے بنگال اور پنجاب کے صوبوں کی تقسیم کی پُرزور مذمت کی، اور مکمل پاکستان کے مطالبہ کا اعادہ کیا۔ جب رائٹر کے نامہ نگار نے ۲۲ رمئی کو ان سے ملاقات کے دوران میں پوچھا کہ آیا، مشرقی اور مغربی پاکستان کو ملانے کے لیے

ایک لمبے تنگ قطعے کی ضرورت ہے جو ہندوستان سے گزرتا ہو تو اس سوال کا جواب انہوں نے اثبات میں دیا۔ قائدِ اعظم کے اس جواب پر ہندو پریس نے بہت شور مچایا۔ ادھر گاندھی کی پاکستان کے خلاف مہم روز افزوں شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ ۳۱ مئی کو پرارتھنا کی ایک مجلس سے خطاب کرتے ہوئے اس نے کہا "خواہ سارے کا سارا ہند نذرِ آتش ہو جائے، ہم پاکستان منظور نہیں کریں گے"[۲۵] شانتی اور اہنسا کے پیامبر کی زبان سے یہ الفاظ کتنے حیرت انگیز تھے!

باب ۸

تقسیم کا منصوبہ

ہند کے لیڈروں سے تقسیم ہند کے نظر ثانی شدہ منصوبے کے اہم نکات کی منظوری لینے کے بعد ماؤنٹ بیٹن ۱۸ مئی ۱۹۴۷ء کو عازم لندن ہوا۔ ان نکات میں یہ نکتہ بھی شامل تھا کہ انتقال اقتدار کی تاریخ کو بہت پہلے کر دیا جائے۔ اس کے ہمراہ وی۔ پی مینن بھی تھا۔ برطانوی کابینہ نے منصوبہ منظور کر لیا اور دہلی واپس آنے پر ماؤنٹ بیٹن نے اسے دو جون کو سات لیڈروں کی کانفرنس میں پیش کیا۔ یہ سات لیڈر نہرو، پٹیل، کرپلانی (جو اس وقت کانگرس کا صدر تھا) جناح، لیاقت علی خاں، عبدالرب نشتر اور بلدیو سنگھ تھے۔ اس منصوبے کو ایک بیان کی شکل دی گئی تھی، جو ملک معظم کی حکومت نے ۳ جون کو جاری کرنا تھا۔

یہ منصوبہ اس بنیادی نظریے پر مبنی تھا کہ خود اہل ہند کی خواہشات کے مطابق اقتدار منتقل کیا جانا چاہیئے چونکہ ہند کی سیاسی جماعتوں میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا اس لیے حکومت برطانیہ نے ہند کے سیاسی لیڈروں کے ساتھ پورے صلاح مشورے کے بعد لوگوں کی خواہشات معلوم کرنے کا ایک عملی طریقہ وضع کیا ہے۔ موجودہ آئین ساز اسمبلی اپنا کام جاری رکھے گی لیکن جو آئین یہ اسمبلی مرتب کرے گی

ظاہر ہے کہ اس کا اطلاق ملک کے ان علاقوں پر نہیں ہو سکتا جو اسے قبول کرنے پر رضامند نہیں لہٰذا یہ معلوم کرنے کے لیے ایک طریق کار تجویز کیا گیا ہے کہ آیا ایسے علاقے موجودہ آئین ساز اسمبلی کے ذریعے اپنا آئین مرتب کرانا چاہتے ہیں یا ایک نئی اور علیحدہ آئین ساز اسمبلی کے خواہاں ہیں' جو ان علاقوں پر مشتمل ہوگی جو موجودہ آئین ساز اسمبلی میں نہ شامل ہونے کا فیصلہ کریں گے۔ جب یہ کام سرانجام پا جائے گا' تو پھر اس حکومت یا ان حکومتوں کا تعین کیا جا سکے گا جنہیں اقتدار منتقل کیا جانا چاہیے۔"

پنجاب' بنگال اور سندھ میں یہ فیصلہ صوبائی اسمبلیوں پر چھوڑ دیا گیا۔ پنجاب اور بنگال اسمبلیوں کے اجلاس دو حصوں میں منعقد کئے جانے تھے' ایک مسلم اکثریت کے اضلاع کے نمائندوں کا' اور دوسرا صوبے کے باقی علاقوں کا۔ ہر مجلس قانون ساز کے دونوں حصوں کے ارکان علیحدہ علیحدہ اجلاسوں میں یہ رائے دینے کے مجاز ہوں گے کہ صوبے کو تقسیم کرنا چاہیے یا نہیں؟ اگر کسی حصے کی اکثریت نے تقسیم کے حق میں فیصلہ کیا' تو پھر تقسیم بروئے کار لائی جائے گی۔ لیکن ہر حصے کے لوگوں کو چونکہ پہلے سے معلوم ہونا چاہیے کہ اگر بعد میں دونوں حصوں نے متحد رہنے کا فیصلہ کیا' پھر ان کا صوبہ بہ حیثیت مجموعی کس آئین ساز اسمبلی میں شامل ہوگا۔ اس لیے مجلس قانون ساز کے تمام ارکان (سوائے یورپین ارکان) کے اجلاس کا بھی اہتمام کیا گیا تھا تاکہ یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ متحدہ صوبہ کس آئین ساز اسمبلی میں شامل ہوگا۔ دونوں حصوں کی سرحدیں عارضی ہوں گی' تاآنکہ گورنر جنرل متعلقہ لوگوں کے مشورے سے ایک سرحد کمیشن مقرر کرے گا' جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے متصلہ اکثریت والے علاقوں کے تعین کی بنیاد پر حتمی سرحدیں متعین کرے گا۔ سرحد کمیشن اس کام کے سرانجام کرنے میں دوسرے عوامل کو بھی پیش نظر رکھے گا۔

اگر پنجاب نے تقسیم کا فیصلہ کیا' تو پھر شمال مغربی سرحدی صوبے میں یہ معلوم کرنے کے لیے استصواب کرایا جائے گا کہ یہ صوبہ کس آئین ساز اسمبلی میں شامل ہونا چاہتا ہے؟ اس صوبے میں کانگرس کی وزارت تھی' اور صوبے کے تین میں سے دو نمائندے موجودہ آئین ساز اسمبلی میں شرکت کر رہے تھے۔ لیکن اس صوبے کے جغرافیائی محل وقوع اور دوسرے قابل لحاظ امور کے باعث اس صوبے کو اپنی حیثیت کا از سر نو جائزہ لینے کا موقع دینا ضروری تھا۔ اسی طرح اگر بنگال کو تقسیم کرنے کا فیصلہ ہوا' تو پھر آسام کے ضلع سلہٹ میں استصواب کرایا جائے گا کہ آیا مسلم اکثریت کا یہ ضلع متصلہ مشرقی بنگال میں شامل ہوگا یا نہیں؟ ہر دو صورتوں میں استصواب گورنر جنرل کے زیر اہتمام' اور متعلقہ صوبائی حکومتوں کے مشورے سے ہوگا۔ برطانوی

بلوچستان کی خواہشات معلوم کرنے کے لیے اقدامات کیے جائیں گے۔ نیز شمال مغربی سرحد کے قبائل کے ساتھ سمجھوتوں پر متعلقہ جانشین حکومت گفت و شنید کرے گی۔ ریاستوں کے بارے میں وہی پالیسی کسی تبدیلی کے بغیر برقرار رکھی جائے گی' جو کابینہ مشن کی ۱۲ مئی ۱۹۴۶ء کی یادداشت میں بیان کی گئی تھی۔

منصوبے کے اخیر میں یہ کہا گیا تھا کہ بڑی سیاسی پارٹیوں نے چونکہ بار بار اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ :-

"ہند میں حتی الوسع جلد از جلد انتقالِ اقتدار ہونا چاہیے..... ملک معظم کی حکومت جون ۱۹۴۸ء سے بھی پہلے انتقال اقتدار پر آمادہ ہے اور پارلیمنٹ کے اجلاس رواں میں اس مقصد کے لیے مسودہ قانون پیش کر دے گی تاکہ اسی سال کے اندر درجہ ڈومنین کی اساس پر ایک یا دو جانشین حکومتوں کو اقتدار منتقل کر دیا جائے۔ مطابق ان فیصلوں کے جو اس اعلان کے نتیجے کے طور پر کیے جائیں۔ اس اعلان سے موجودہ آئین ساز اسمبلی کے اس حق پر کوئی بے جا اثر نہیں پڑے گا کہ وہ مناسب وقت پر یہ فیصلہ کرے کہ آیا ہند کا جو حصہ اس کے حیطۂ اختیار میں ہے' وہ برطانوی دولت مشترکہ میں شامل رہے گا یا نہیں" [1]

۲ جون کو سات لیڈروں کی کانفرنس میں یہ منصوبہ پیش کرتے ہوئے مونٹ بیٹن نے کہا کہ "پچھلے پانچ سال میں اس نے کئی بڑے معرکہ آرا اجلاسوں میں حصہ لیا ہے' جن میں جنگ کی قسمت کے فیصلے کیے گئے تھے' لیکن وہ صفائی قلب سے کہہ سکتا ہے کہ اسے کسی ایسے فیصلے کی یاد نہیں پڑتی جو تاریخ عالم پر اتنا اہم اثر ڈال سکے جتنے کہ وہ فیصلے' جو اس اجلاس میں کیے جانے والے ہیں" اس نے کابینہ مشن پلان کا آخری بار رسماً ذکر کیا لیکن ہر شخص جانتا تھا کہ یہ منصوبہ ختم ہو چکا ہے' اس کے بعد اس نے مسلم لیگ اور کانگرس کے رویے کے پیش نظر تقسیم ملک کے ناگزیر ہو جانے کی طرف اشارہ کیا' اور اس میں حتی الوسع پوری تیز رفتاری سے کام لینے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس نے :

"یہ واضح کرنے کی بالخصوص کوشش کی کہ برطانیہ کی حزب اختلاف (کنزرویٹو پوزیشن) بھی اس منصوبے کی تائید کرتی ہے..... اس نے منصوبہ کے نئے پیراگراف ۲۰ کا ذکر خاص نفاست سے کیا جس کا عنوان تھا "فوری انتقال اقتدار"

اور ورنئہ ڈومینین کی یوں صفائی پیش کی کہ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اپنا وقت گزارنے
کے بعد بھی برطانیہ ہند میں ٹکنا چاہتا ہے بلکہ فقط یہ ہے کہ کہیں اس پر اپنی ذمہ داریوں
سے فرار کا الزام نہ لگے لہٰذا اس نے کہا "یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ جب تک
برطانیہ کی امداد کی ضرورت ہوگی وہ اس سے دریغ نہیں کرے گا اور اسے
قبل از وقت نہیں ہٹائے گا۔"[۲۲]

چونکہ اس منصوبے کو نہرو کی خواہشات کے پیش نظر از سرِ نو مرتب کیا گیا تھا اس نے
کسی تامل کے بغیر کہہ دیا کہ کانگرس اس منصوبے کو منظور کر لے گی۔ قائدِ اعظم نے کہا کہ وہ اس منصوبے کو
مسلم لیگ کونسل کے سامنے پیش کریں گے، جس کا اجلاس ایک ہفتہ تک ہو گا۔ مونٹ بیٹن نے
ان پر فوراً فیصلہ کرنے کے لیے بڑا زور ڈالا لیکن قائدِ اعظم نے صرف اتنا وعدہ کیا کہ وہ "اپنے آقاؤں
— عوام — کے سامنے اسے پیش کریں گے اور پورے اخلاص سے انہیں اس پر رضامند کرنے کے لیے
کوشش کریں گے۔

چونکہ یہ بندوبست ہو چکا تھا کہ حکومتِ برطانیہ ۳ جون کو دارالعوام میں اس منصوبے کا اعلان
کر دے گی، مونٹ بیٹن نے کہا کہ کانگرس اور مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹیوں اور سکھوں کے ردِ عمل سے
اسے ۲ جون کی نصف شب تک آگاہ کر دیا جائے، اس نے نہرو، قائدِ اعظم اور بلدیو سنگھ سے یہ
بات بھی منوالی کہ اگلے دن شام کو اس کے بعد وہ بھی آل انڈیا ریڈیو سے عوام سے خطاب کریں گے۔

کانگرس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس اُسی دن ہوا۔ ابو الکلام آزاد کے مطابق گاندھی نے اس
اجلاس میں تقسیم کی حمایت میں تقریر کی[۲۳]۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی کی طرف سے کرپلانی نے وائسرائے کو
جو خط بھیجا اس میں منصوبے کو منظور کر لیا گیا، بشرطیکہ "مسلم لیگ بھی ان تجاویز کو منظور کر لے۔ اس واضح
سمجھوتے کے ساتھ کہ کوئی مزید مطالبات پیش نہیں کیے جائیں گے۔"[۲۴] کانگرس کی طرف سے دو مزید
نکات بھی پیش کیے گئے۔ ایک یہ کہ اگر انڈین یونین نے دولتِ مشترکہ سے باہر نکل جانے کا فیصلہ کیا
تو پاکستان کو اس میں شامل رہنے کی اجازت نہیں دی جائے گی، اور دوسرا یہ کہ شمال مغربی سرحدی
صوبہ کے لوگ مجوزہ استصواب میں اپنے صوبے کو آزاد مملکت بنانے کے حق میں بھی ووٹ ڈال سکیں
اور اس کے بعد فیصلہ کر سکیں کہ باقی ہند کے ساتھ ان کے کیا تعلقات ہوں گے۔[۲۵] پہلا نکتہ

واضح طور پر اس بات کی ناجائز کوشش تھی کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی بھارت کے تابع ہونی چاہیئے دوسرے نکتے کے متعلق مونٹ بیٹن نے ملک معظم کو یہ اطلاع دی: "میں نے نہرو کو بتایا کہ نہرو کی ذاتی درخواست پر ہی میں نے پاکستان، ہندوستان یا آزاد مملکت کے حق میں ووٹ ڈالنے کی ابتدائی تجویز ترک کر دی تھی، اب وہ مجھ سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ اس مرحلے پر میں اس تجویز کو از سر نو شامل کر دوں گا۔" ۵۶

کانگرس کے صدر نے سکھوں کے بارے میں بھی تشویش ظاہر کی کہ اگر بڑی احتیاط سے کام نہ لیا گیا اور پنجاب میں ان کی خاص حیثیت کا پوری طرح لحاظ نہ رکھا گیا تو منصوبہ سے انہیں گزند پہنچے گی۔" ۵۷ سکھوں کی طرف سے بلدیو سنگھ نے یہ مطالبہ کیا کہ مطبوعہ منصوبے میں سرحد کمیشن کے لیے ہدایات شامل کی جائیں کہ وہ سکھ مفادات کو پوری طرح پیش نظر رکھیں گے۔" ۵۸ اس وقت تو مونٹ بیٹن نے اس مطالبے سے صرف نظر کی، لیکن جیسا کہ بعد میں دیکھنے میں آئے گا، سرحد کمیشن کے فیصلے (ایوارڈ) پر ان باتوں کا اثر پڑا۔

قائد اعظم نے شام کو مونٹ بیٹن سے ملاقات کی۔ ایسٹے اس ملاقات کے دوران میں موجود تھا اس کے مطابق:-

"جناح جلال کے عالم میں تھے۔ آتے ہی منصوبے کو رسوا کن کہا۔ تاہم بعد میں مان گئے کہ وہ اس کی حمایت کریں گے اور مسلم لیگ کونسل کو بھی تائید پر آمادہ کرنے کے لیے اپنی طرف سے پوری کوشش کریں گے، مگر کونسل کے فیصلے کے بارے میں قبل از وقت کوئی ذمہ داری قبول نہیں کریں گے۔ بہت حیل و حجت کے بعد وائسرائے بمشکل ان سے صرف یہ اعتراف کرا سکا کہ مسٹر ایٹلی کو کسی خطرے کے بغیر یہ مشورہ دیا جا سکتا ہے کہ وہ اگلے دن حسب پروگرام دارالعوام میں منصوبے کا اعلان کر دے۔" ۵۹

۳ جون کی صبح کو کانفرنس کا دوبارہ اجلاس ہوا، اور مونٹ بیٹن نے کانگرس اور سکھوں کی طرف سے تحریری منظوری حاصل ہونے کا اعلان کر دیا۔ مسلم لیگ کی طرف سے اس نے کہا، مسٹر جناح نے اس بارے میں مجھے یقین دلایا ہے جو میں نے قبول کر لیا ہے اور میں اس پر

مشتعل ہوں۔ قائدِ اعظم خاموش رہے، البتہ سر ہلا کر انھوں نے اتفاق ظاہر کیا۔ اس کے بعد ماونٹ بیٹن نے "تقسیم کے انتظامی نتائج" کے زیرِ عنوان تیس صفحات کی یادداشت تقسیم کی۔

ایٹلی نے ۳ جون ۱۹۴۷ء کو دارالعوام میں منصوبے کا اعلان کر دیا۔ اس پر اپوزیشن نے محتاط انداز میں منظوری کا اظہار کیا۔ برطانوی اپوزیشن اور کناڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی برطانوی ڈومینیوں کے نزدیک یہ بات قابلِ اطمینان تھی کہ انڈین یونین اور پاکستان دونوں دولتِ مشترکہ میں رہیں گے۔ ونسٹن چرچل نے یوں اظہارِ خیال کیا:

> "معلوم ہوتا ہے کہ کرپس مشن کے وقت جن دو شرطوں کی پیش بینی کی گئی تھی وہ پوری ہو گئی ہیں۔ یعنی ہند کی پارٹیوں کے درمیان سمجھوتہ اور ..... ایک مدت کے لیے درجۂ ڈومینین جس میں ہند یا اس کا کوئی حصہ پوری آزادی کے ساتھ یہ فیصلہ کرنے کا مجاز ہو گا کہ دولتِ مشترکہ میں رہے یا نہ رہے۔ اگر ...... واضح ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں شرطیں برقرار رکھی گئی ہیں تو پھر ..... اس ایوان کی سب جماعتیں اس پیشکش اور اعلان کی پوری طرح پاسداری کریں گی۔"[۲]

شام کو ماونٹ بیٹن، نہرو، قائدِ اعظم اور بلدیو سنگھ نے تقریریں نشر کیں۔ ماونٹ بیٹن نے کہا کہ اس کی یہ پختہ رائے تھی کہ "فرقوں کے درمیان معقول رضامندی ہوتی تو ایک متحدہ ہند ہی بہترین حل ہوتا۔" اسے نہایت افسوس تھا کہ کابینہ مشن پلان پالیسی اور ایسے منصوبے پر سمجھوتہ ناممکن ہو گیا "جس سے ہند کی وحدت برقرار رکھی جا سکتی۔ لیکن یہ ہو نہیں سکتا کہ ایسے علاقوں کو جن میں ایک فرقہ کی اکثریت ہے مجبور کیا جائے کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف ایک ایسی حکومت کے ماتحت زندگی بسر کریں جس میں دوسرے فرقہ کو اکثریت حاصل ہے۔ جبر کا واحد متبادل تقسیم ہی ہے۔" مسلم لیگ نے تقسیمِ ہند کا مطالبہ کیا تھا، اور کانگرس نے اسی دلیل کی بنا پر تقسیمِ ملک کی صورت میں بعض صوبوں کو تقسیم کرنے کا مطالبہ کیا: "درحقیقت کوئی بھی فریق اس بات پر آمادہ نہیں تھا کہ ایسا کوئی معتدبہ علاقہ جس میں اس کے فرقہ کو اکثریت حاصل ہو، دوسرے فرقے کی حکومت کے تحت چھوڑ دیا جائے۔" ماونٹ بیٹن نے سکھوں سے ہمدردی ظاہر کی، جن کی آبادی اس طرح منتشر تھی کہ "پنجاب کی تقسیم سے جس کے وہ خود خواہاں ہیں، وہ لازماً کم و بیش دو حصوں میں بٹ کر رہ جائیں گے۔ سکھوں کا بٹوارا عین کس حد تک ہوتا ہے،

یہ کام سرحد کمیشن پر چھوڑ دیا جائے گا، جس میں سکھوں کو بھی یقیناً نمایندگی حاصل ہو گی۔"[۱۱]

نہرو نے کہا کہ حکومت برطانیہ کے اعلان میں ایک طرف ہند کے بعض علاقوں کے علیحدہ ہونے کا امکان پایا جاتا ہے اور دوسری طرف اس سے مکمل آزادی کی طرف بہت بڑی پیش قدمی کی توقع ہے۔ آگے چل کر اس نے کہا میں دلی خوشی کے ساتھ ان تجاویز کو قبول کرنے کی حمایت نہیں کر رہا ہوں اگرچہ مجھے کوئی شک نہیں کہ یہی صحیح راستہ ہے ..... ہم بہت چھوٹے آدمی ہیں جو عظیم مقاصد کے کام آ رہے ہیں اور ان کی کچھ عظمت ہم پر بھی سایہ فگن ہوتی ہے۔" نہرو نے مونٹ بیٹن کی سعی و محنت کو دل کی گہرائیوں سے سراہا۔

قائد اعظم نے کہا: "یہ منصوبہ بعض اہم پہلوؤں سے ہمارے نقطہ نظر کے مطابق نہیں ہے، ہم نہ یہ کہہ سکتے ہیں اور نہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم مطمئن ہیں اور نہ یہ کہ منصوبے میں امور کو جس طرح طے کیا گیا ہے ان سے ہم متفق ہیں .... اب ہمیں یہ جائزہ لینا ہے کہ آیا اس منصوبہ کو .... مصالحت کے طور پر قبول کیا جائے یا اسے تصفیہ قرار دیا جائے۔" قائد اعظم نے مزید کہا کہ اس معاملے میں قطعی فیصلہ صادر کرنے کی مجاز صرف آل انڈیا مسلم لیگ کونسل ہے۔ انہوں نے مونٹ بیٹن کو شاندار خراج پیش کیا" وائسرائے نے متعدد قوتوں کے خلاف بڑی بہادری سے جنگ لڑی ہے، میرے دل پر انہوں نے جو نقش چھوڑا ہے، وہ یہ ہے کہ ان میں انصاف اور غیر جانبداری کا جذبہ بلند کارفرما تھا۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ان کی مشکلات دلہ کم کریں، اور ان کی مدد کریں ...... تاکہ وہ اہل ہند کو امن اور خوش اسلوبی کے ساتھ اقتدار منتقل کرنے کے اس فرض کو سرانجام کر سکیں، جو انہیں سونپا گیا ہے۔" پھر انہوں نے شمال مغربی سرحدی صوبے میں ہونے والے استصواب کے پیش نظر اس صوبے کی مسلم لیگ کو اپنی سول نافرمانی کی تحریک ختم کرنے کے لیے کہا، انہوں نے اپنی تقریر سب لوگوں سے امن و امان برقرار رکھنے کی بڑی مخلصانہ اپیل پر ختم کی۔[۱۲]

قائد اعظم کے بعد بلدیو سنگھ نے نشری تقریر کی۔ اس کے خیال میں منصوبے کو مصالحت نہیں بلکہ تصفیہ کہنا ہی مناسب تھا۔ "اس سے ہر ایک خوش نہیں ہوا اور سکھ فرقہ تو ہرگز خوش نہیں، لیکن یہ منصوبہ یقیناً قابل قدر ہے اور اسی خیال سے ہم اسے قبول کر لیتے ہیں"[۱۳]

۴ جون کو مونٹ بیٹن نے ایک پریس کانفرنس منعقد کی جس کی بابت ہر ایک نے کہا کہ اس کی کارکردگی باکمال تھی۔ اس نے بتایا کہ ۳ جون کے منصوبے کی ترتیب و تکمیل میں اس نے ہر مرحلے اور ہر قدم

برِ ہند کے لیڈروں کے ساتھ مل جل کر کام کیا ہے۔ اس لیے منصوبے کے اعلان پر نہ انہیں تعجب ہوا اور نہ صدمہ۔ اس نے اس بات پر زور دیا کہ ہر ذمہ دار لیڈر نے مصمم عزم کر رکھا ہے کہ امن برقرار رکھا جائے اور خونریزی سے احتراز کیا جائے۔ اور یہ بتایا کہ عبوری حکومت میں اس بات پر مکمل اتفاق ہے کہ مزید تشدد کو ہرگز برداشت نہ کیا جائے۔

مونٹ بیٹن نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ تمام لیڈر انتقالِ اقتدار میں تعجیل چاہتے تھے لیکن اقتدار اس وقت تک منتقل نہیں کیا جا سکتا تھا جب تک جانشین حکومتوں کے پاس آئین نہ ہو۔ "ایک حکومت کا تو وجود تک نہ تھا اور نہ ہی اس کا معرض وجود میں آنا یقینی تھا۔ دوسری حکومت کو بھی اپنا آئین مرتب کرنے کے لیے وقت درکار ہے۔" گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں مناسب ترمیم سے یہ ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔ لیکن اس نے واضح کیا کہ "درجۂ ڈومینین کی اساس پر بھی آزادی مکمل ہے اور مختلف حکومتوں کو پورا اختیار حاصل ہے کہ جب چاہیں' برطانوی دولتِ مشترکہ سے نکل آنے کا فیصلہ کر لیں۔" ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا "ہم ہند کے کسی ایک علیحدہ حصے کو دولتِ مشترکہ میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دیں گے' لیکن اگر سارا ہند دو آزاد مملکتوں میں منقسم ہونے کا فیصلہ کرلے تو دونوں ہی دولتِ مشترکہ میں شامل ہو سکیں گے۔" اس سوال پر کہ "آیا ہر ڈومینین پر اپنے دفاع کی مکمل ذمہ داری عائد ہوگی' مونٹ بیٹن نے جواب میں کہا کہ ہر ڈومینین خود ہی مکمل طور پر اپنے دفاع کی پوری طرح ذمہ دار ہوگی۔ اس نے مزید کہا "فوج کے انضباط اور تنظیم کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ افواج کی تقسیم باضابطہ اور منظم طریق سے کی جائے۔ تقسیم پر عملدرآمد کے بعد نئی مملکتوں کو پوری آزادی ہوگی کہ وہ آپس میں مل کر ہند کے دفاع کا مشترکہ منصوبہ بنائیں یا اپنے لیے علیحدہ علیحدہ منصوبے اختیار کریں۔"

سکھوں کی حیثیت کا ذکر کرتے ہوئے اس نے کہا کہ اسے معلوم ہوا تھا "کانگرس نے پنجاب کی تقسیم کے لیے جو قرارداد پیش کی تھی' وہ زیادہ تر سکھوں کے کہنے پر ہی کی تھی..... لیکن جب میں نے ..... سکھوں کی آبادی کی تقسیم کا مطالعہ کیا..... تو یہ دیکھ کر میں دنگ رہ گیا کہ سکھوں نے جو تجویز پیش کی ہے' اس سے وہ کم و بیش دو مساوی حصوں میں بٹ کر رہ جاتے ہیں۔ میں نے یہاں بھی اور انگلستان میں بھی یہ معلوم کرنے میں کافی وقت صرف کیا کہ سکھ فرقہ کو اور زیادہ اکٹھا رکھنے کا کوئی حل بھی ہے..... مجھے ایسا کوئی حل نہیں ملا۔"

سرحد کمیشن کے بارے میں موئنٹ بیٹن نے کہا اس میں تمام پارٹیوں کے نمائندے لیے جائیں گے۔ جہاں تک انسانی بس میں ہے، حکومت برطانیہ نہ مداخلت کرے گی اور نہ اپنا فیصلہ ٹھونسے گی۔"

شمال مغربی سرحدی صوبے میں استصواب کی ضرورت سے متعلق ایک سوال کے جواب میں موئنٹ بیٹن نے یہ وضاحت کی کہ ہند کے دوسرے تمام صوبوں کے مقابلے میں شمال مغربی سرحدی صوبے میں اقلیت کو اپنے استحقاق سے زیادہ نمائندگی حاصل ہے۔ اگرچہ اس صوبے میں اقلیتوں کی آبادی صرف پانچ فی صد کے لگ بھگ ہے۔ انہیں اسمبلی کی کل پچاس میں سے بارہ نشستیں دی گئی ہیں۔ اس لیے منصوبے میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ وائسرائے صوبائی حکومت کے مشورے سے اسمبلی کے تمام ووٹروں سے استصواب کا بندوبست کرے گا۔ جب یہ پوچھا گیا کہ ووٹروں کو آزاد مملکت بنانے کے لیے متبادل حق انتخاب کیوں نہیں دیا گیا؟ تو وائسرائے نے کہا کہ اگر کانگرس اور مسلم لیگ اس پر متفق ہو جائیں تو وہ بھی متفق ہو جائے گا۔

پریس کانفرنس کے آخر میں موئنٹ بیٹن نے بتایا کہ اپوزیشن کے اتفاق رائے کے ساتھ حکومت برطانیہ نے اسے یقین دلایا ہے کہ وہ بسرعت تمام دو مہینوں کے اندر آزادی ہند کے لیے پارلیمنٹ سے قانون منظور کرالے گی۔[۲۳] اس نے اعلان کیا کہ اقتدار ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو یا اس کے لگ بھگ منتقل کیا جائے گا۔

موئنٹ بیٹن کو اس امر کی بڑی تشویش تھی کہ کہیں گاندھی منصوبے کی مخالفت نہ کرے، لیکن موئنٹ بیٹن سے ملاقات کے بعد گاندھی نے کہا "تقسیم کی ذمہ داری حکومت برطانیہ پر عائد نہیں ہوتی۔ وائسرائے کا بھی اس میں کوئی ہاتھ نہیں ہے، بلکہ وہ تو کانگرس کی طرح تقسیم کے خلاف ہے۔ لیکن اگر ہم دونوں ہندو اور مسلمان کسی اور بات پر متفق نہیں ہوسکتے، تو پھر وائسرائے کے لیے کوئی اور چارہ کار نہیں رہتا۔" گاندھی نے مزید کہا کہ تقسیم کے منصوبے کی اساس پر ہی سمجھوتہ ممکن ہوا ہے۔[۲۴] درحقیقت گاندھی نے اصولی طور پر تقسیم ملک کو کئی ہفتے پہلے تسلیم کر لیا تھا، لیکن وہ مصلحتاً برسر عام اس کی مخالفت کرتا رہا تھا۔ ابوالکلام آزاد کے ہاں تو اس کا تحریری ثبوت بھی ملتا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ۳۱ مارچ کو جب گاندھی کی موئنٹ بیٹن سے پہلی ملاقات ہوئی تو اس کے بعد پٹیل نے

"گاندھی جی کے ساتھ دو گھنٹے تک بند کمرے میں ملاقات کی۔ اس ملاقات

ہیں کیا ہوا میں (ابو الکلام آزاد) اس سے بے خبر ہوں۔ لیکن جب گاندھی جی سے
میری پھر ملاقات ہوئی تو مجھے زندگی بھر میں سب سے زیادہ صدمہ پہنچا کیونکہ میں نے
یہ دیکھا کہ وہ بھی بدل چکے ہیں۔ ابھی وہ کھلے بندوں تقسیم کی حمایت نہیں کرتے تھے،
لیکن اس کے خلاف پہلے سے جوش و خروش کے ساتھ اظہارِ خیال بھی نہیں کرتے
تھے۔ جس بات سے مجھے اور بھی تعجب ہوا اور مزید صدمہ پہنچا وہ یہ تھی کہ انہوں
نے ان دلائل کا اعادہ شروع کر دیا جو سردار پٹیل پہلے ہی پیش کر چکا تھا"۔

آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ۹ رجون کو دہلی میں ہوا۔ اس میں منصوبے کی حمایت
میں ایک قرارداد منظور کی گئی۔ کونسل نے قائدِ اعظم کو اس امر کا مکمل اختیار دے دیا کہ "وہ منصوبے کے بنیادی
اصولوں کو مصالحت کے طور پر قبول کر لیں" اور اس ضمن میں تمام ضروری کارروائی اور فیصلے کریں۔

سکھ تنظیموں کی ایک مشترکہ کونشن نے پنجاب کی تقسیم کا خیر مقدم کیا لیکن اس پختہ رائے کا اظہار
بھی کیا کہ صوبے کی تقسیم کی کوئی ایسی صورت سکھوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوگی جس سے سکھ قوم کی وحدت
اور سالمیت برقرار نہ رہ سکے۔

۱۴ رجون کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے ایک قرارداد منظور کی جس میں منصوبے کو قبول کرنے کا
اعلان کیا، اگرچہ ملک کے بعض حصوں کے علیحدہ ہو جانے پر افسوس ظاہر کیا۔ یہ قرارداد گوبند ولبھ پنت
نے پیش کی۔ ابو الکلام آزاد اور بعض دوسرے ارکان نے اس کی مخالفت کی۔ آزاد کا رنج ناقابلِ فہم
نہیں۔ وہ واحد کانگرسی لیڈر تھے جس نے خلوصِ دل کے ساتھ کابینہ مشن پلان کی حمایت کی تھی" لیکن
کلیدی خطاب پٹیل کا تھا۔ اس نے روگی جسم کی مثال دیتے ہوئے یہ دلیل پیش کی کہ اگر کسی عضو میں زہر
سرایت کر گیا ہو تو اسے فوراً کاٹ دینا چاہیے مبادا سارے جسم کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے۔ اس کی
تقریر اس کی شخصیت کی عکاس تھی۔ تو کدار۔ کٹر۔ کھری کھری جذبات سے معرا"۔ گاندھی نے قرارداد
کی حمایت کی، اور ۲۹ کے مقابلہ میں ۱۵۷ کی تائید سے منظور ہو گئی۔ ۳۲ نے رائے شماری میں حصہ نہ لیا۔
منصوبے کے اعلان اور بڑی سیاسی پارٹیوں کی طرف سے اسے منظور کرنے کا فوری اثر یہ ہوا کہ
بحث مباحثہ مدھم پڑ گیا اور امن و سکون کا گمان ہونے لگا۔ بالآخر ان بڑے مسائل پر مصالحت ہو گئی تھی
جو بیسیوں برس سے ہند کے سیاسی منظر پر چھائے ہوئے تھے اور جن کی وجہ سے بے حد جذباتی ہیجان

برپا رہتا تھا۔ مسلمانوں میں پاکستان حاصل کر لینے پر منزل مقصود کے ملنے کا احساس تھا۔ پاکستان شاید کٹا پھٹا ہو گا لیکن یہ کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ کس قدر۔ تاہم پاکستان جیسا بھی ہو گا' ان کا اپنا ہو گا اور وہاں ایک عادلانہ معاشرتی نظام قائم کرنے میں وہ آزاد ہوں گے۔ ہندوستان میں رہ جانے والے ہم کروڑ مسلمانوں کے لیے برادرانہ جذبات اور ان کی بہبود سے دلی لگاؤ تھا۔ ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں اور پاکستان میں ان کے زیادہ خوش قسمت بھائیوں کو معلوم تھا کہ وہ لازماً ہندوستان میں رہ جائیں گے۔ بایں ہمہ انہوں نے پوری ہمت اور خوش دلی کے ساتھ تحریک پاکستان کی حمایت کی۔ انہوں نے اس نصب العین کے لیے بڑی قربانیاں دیں اور ہندو اکثریت کی دشمنی مول لی' جس کے درمیان انہیں زندگی بسر کرنی تھی۔ اخوت کا یہ حیرت انگیز مظاہرہ صرف ایسی قوم سے ہی ممکن ہے جس کی روح کی گہرائیاں اس جذبے سے معمور ہوں۔

اس کے برعکس ہندو یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کی زبردست مخالفت کے باوجود پاکستان ان سے لے لیا گیا ہے۔ چنانچہ وہ ان کھوئے جانے والے علاقوں کو واپس لینے کا پختہ عزم رکھتے تھے۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے تقسیم کو منظور کرتے ہوئے قرارداد میں یہ کہا کہ "جغرافیہ' پہاڑوں اور سمندروں نے ہند کو وہ شکل عطا کی ہے جو اس کی ہے' کوئی بھی انسانی ادارہ نہ اس شکل کو بدل سکتا ہے اور نہ اس کے آخری مقدر کی راہ میں حائل ہو سکتا ہے۔ اقتصادی حالات اور بین الاقوامی معاملات کے پُرزور تقاضے ہند کی وحدت کو اور بھی لابدی بنا دیتے ہیں"۔ شاہ ہندو مہاسبھا نے زیادہ صاف گوئی سے کام لیا اور یہ کہا کہ "ہند ایک اور اکھنڈ ہے؛ اور اس وقت تک کبھی امن نہیں ہو گا جب تک کہ علیحدہ ہو جانے والے علاقوں کو انڈین یونین میں واپس نہیں لایا جاتا' اور انہیں ہند کا جزو لاینفک نہیں بنا دیا جاتا"۔[۱۹]

ایک اس سے بھی زیادہ خطرناک رجحان کام کر رہا تھا۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے جب تقسیم کو قبول کرنے کی قرارداد منظور کی' اس اجلاس میں کانگرس کے لیڈروں کے انداز فکر کا ذکر کرتے ہوئے ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے:۔

> "تقسیم کے خیال سے سب ہی دل گرفتہ تھے۔ شاید ہی کوئی شخص ذہنی تحفظ کے بغیر اس قرارداد کو قبول کر سکتا تھا...... اس سے بدتر بات یہ تھی

کر چکے چکے فرقہ وارانہ پروپیگنڈہ بڑھ رہا تھا۔ بعض حلقوں میں تو یہ بات کھلے بندوں کہی جارہی تھی، کہ پاکستان میں ہندوؤں کو ذرا خوف نہیں کھانا چاہیئے، کیونکہ ہندوستان میں ساڑھے چار کروڑ مسلمان ہوں گے، اور اگر پاکستان میں ہندوؤں پر کوئی ظلم کیا گیا، تو اس کی سزا ہندوستان میں مسلمانوں کو بھگتنی پڑے گی۔
آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس میں سندھ کے ارکان نے قرارداد کی پرزور مخالفت کی۔ انہیں ہر قسم کے یقین دلائے گئے۔ اگرچہ برسرِ عام تو نہیں، لیکن نجی مذاکرات میں بعض لوگوں نے انہیں یہ بھی کہا کہ اگر پاکستان میں وہ کسی قسم کی محرومی یا بدسلوکی کا شکار ہیے، تو پھر اس کا بدلہ ہندوستان کے مسلمانوں سے لیا جائے گا''۔[۳۵]

آزاد نے صراحت تو نہیں کی کہ کون سے حلقے یرغمال کے اس نظریے کو پیش کر رہے تھے۔ لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس کا اشارہ پٹیل، کرپلانی اور سندھ سے تھا، اور دوسرے متشدد مسلم دشمن لیڈروں کی طرف تھا۔ مسلمانوں میں بھی کچھ ایسے لوگ تھے، جو باہمی یرغمال کے نظریے کے قائل تھے۔ لیکن یہ بہت ہی احمقانہ اور غیر ذمہ دارانہ گفتگو تھی۔ کیونکہ اخلاقی اور انسانی اقدار سے قطع نظر پاکستان میں غیر مسلموں کے مقابلے میں ہندوستان میں مسلمان تعداد کے اعتبار سے تین گنا زیادہ تھے۔ قائدِ اعظم خود ہر مناسب موقع پر اس بات پر زور دیتے رہے کہ غیر مسلم اقلیت کو پاکستان کے شہریوں کے طور پر مساوی حقوق حاصل ہوں گے اور وہ قانون کی پوری حفاظت کے حق دار ہوں گے۔

لیکن بدترین اور سب سے زیادہ تباہ کن جذبات سکھوں میں پھیل رہے تھے۔ انہوں نے خود پنجاب کی تقسیم پر اصرار کیا تھا، لیکن اپنے مطالبہ کے نتائج پر وہ غصہ میں آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ بظاہر وہ خاموش اور پرسکون تھے، اور جب بلدیو سنگھ نے تقسیم کے منصوبہ کو قائدِ اعظم کے برعکس مصالحت نہیں بلکہ سمجھوتہ قرار دیا، تو بہت سے لوگوں کو دھوکہ ہوا۔ لیکن یہ سکون ایک پردۂ فریب تھا، اور دیدہ دانستہ تھا۔ سکھوں کے لیڈر اپنے فرقے کو اکٹھا کرنے کی ایک سکیم پر بڑی سرگرمی سے کام کر رہے تھے تاکہ وہ اپنی کھوئی جانے والی وحدت دوبارہ حاصل کر سکیں۔ ان کی سکیم وحشیانہ طور پر مذہب و اخلاق سے عاری تھی، اور اس پر عملدرآمد سے پنجاب کے لوگوں کو، جن میں سکھ بھی شامل تھے،

بے پایاں مصائب سے دوچار ہونا تھا۔

دو بڑی سیاسی پارٹیوں اور سکھوں نے جس منصوبے کو منظور کیا تھا، اس میں مسلم لیگ کے مطالبے کے مطابق اصولِ تقسیم کو تسلیم کر لیا گیا تھا، لیکن صرف ایک اس بات کے سوا، باقی ہر معاملے میں حتیٰ کہ تقسیم پر عملدرآمد کی مدت اور طریقِ کار کے بارے میں بھی ہندو کانگرس ہی کے مطالبات اور مفادات ملحوظ رکھے گئے تھے۔ یہ امر باعثِ حیرت نہیں کیونکہ منصوبہ کا مسودہ ایک ہندو افسر وی۔ پی مینن نے نہرو کی ہدایات کے تحت مرتب کیا تھا۔ مسلم لیگ کا نظریہ تقسیم یہ تھا کہ ہند کو دو جانشین حکومتوں کے درمیان منصفانہ اور غیر جانبدارانہ طور پر تقسیم کیا جائے گا۔ کانگرس کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ گو بعض حصے اصل سرزمینِ ملک سے علیحدہ ہو گئے ہیں، مگر انڈین یونین ہی برطانوی اقتدار کی واحد اور حقیقی جانشین ہے کانگرس اور مسلم لیگ کے نقطہ ہائے نظر میں یہ اختلاف کئی مرحلوں پر منصوبہ تقسیم پر عمل درآمد میں اثر انداز ہوا۔

پاکستان کو اپنے ہر علاقے پر اپنا حق مثبت رائے سے ثابت کرنا پڑا حتیٰ کہ مسلم اکثریت کے صوبوں سندھ اور بلوچستان کو بھی، جن کے نمایندے آئین ساز اسمبلی میں شامل نہیں ہوئے تھے، پاکستان کے حق میں از سرِ نو رائے کا اظہار کرنا پڑا۔ ہندو اکثریت کے صوبوں سے یہ امتحان نہیں لیا گیا۔ گو اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر دو صورتوں میں نتیجہ مختلف نہ ہوتا۔

لیکن پاکستان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ میعاد تھی، جو منصوبہ پر عملدرآمد کے لیے مقرر کی گئی تھی۔ صرف ۷۲ دن۔ وی۔ پی مینن نے بھی اپنی کتاب میں منصوبہ کے قبول کیے جانے کا ذکر کرنے کے بعد یہ لکھا ہے "منظوری اپنی جگہ تھی، لیکن اس پر عملدرآمد کا مسئلہ ایک بالکل مختلف معاملہ تھا۔ یہ ایک ایسا کام تھا، جسے عام حالات میں سرانجام کرنے کے لیے کئی سال درکار تھے، لیکن جسے کھینچ کر صرف چند ہفتوں کے مختصر عرصے میں مکمل کیا جانا تھا۔"[۱۸] بجا طور پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ میعاد کو اس قدر مختصر کرنے اور اس کے خوفناک نتائج لاکھوں انسانوں کی ہلاکت اور بے حد و حساب مصائب و مشکلات کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ اس کے ذمہ دار وہ لوگ تھے، جنھوں نے بہ عجلت تمام انتقالِ اقتدار کی سودا بازی کی تھی۔ اور وہ تھے ماونٹ بیٹن، نہرو، پٹیل اور خود وی۔ پی مینن۔

باب ۹

تقسیم کے مسائل

منصوبۂ تقسیم کا اعلان ۳ جون ۱۹۴۷ء کو کیا گیا، اور دو نوں ڈومینین —— انڈین یونین اور پاکستان —— کو اقتدار منتقل کرنے کے لیے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی تاریخ مقرر کی گئی، اس طرح تقسیم کی میعاد صرف ۷۲ دن تھی۔ تقسیم کے اہم مسائل کے تعین اور تقسیم پر عملدرآمد کے لیے انتظامی مشینری کے قیام میں کچھ دن صرف ہو گئے۔ کام کے لیے مؤثر وقفہ صرف دو ماہ کا تھا، جیسا کہ سردار پٹیل نے شرط لگائی تھی۔ اس وقفے میں بے شمار مسائل کو حل کرنا تھا اور لاتعداد انتظامی امور سرانجام پانے تھے۔ انڈین یونین کے مقابلے میں پاکستان کے لیے مسائل کئی گنا زیادہ بھی تھے اور سخت تر بھی۔ دہلی میں گورنمنٹ آف انڈیا ایک رواں ادارہ تھی، جسے کم و بیش پہلے کی طرح ہی کام کیے جانا تھا۔ فرق صرف یہ پڑنا تھا کہ پاکستان میں شامل ہونے والے علاقوں پر اس کا دائرۂ اختیار ختم ہو جانا تھا۔ مرکزی حکومت سے جو انگریز اور مسلمان افسر علیحدہ ہونے والے تھے، ان کی تعداد اتنی نہ تھی کہ وسیع پیمانہ پر از سرِ نو تنظیم کی ضرورت ہوتی۔ ملک سے باہر جو سفارتی اور تجارتی مشن قائم کیے جا چکے تھے، وہ انڈین یونین کی تحویل میں چلے گئے تھے۔ کرنسی اور بنکاری کا نظام اور دوسرے اقتصادی اور مالیاتی ادارے کل ہند بنیاد پر کام کر رہے تھے اور ان کا بندوبست انڈین یونین کے ہاتھ میں تھا۔ یوں بندرگاہ بر

اور ڈاک و تار کے ذریعے برصغیر کے مختلف حصے ایک ہی متحدہ نظامِ مواصلات میں مربوط تھے' اور ان سب کا کنٹرول دہلی سے کیا جاتا تھا۔ تقریباً تمام صنعتی ادارے اور حکومت ہند کے تحقیقاتی ادارے ان علاقوں میں تھے' جو انڈین یونین کے حصہ میں آنے والے تھے۔ مرکزی حکومت کے پرانے کاغذات اور تمام ریکارڈ دہلی میں تھے اور امپیریل لائبریری کلکتہ میں تھی۔ بری فوج' فضائیہ اور بحریہ کے صدر دفاتر بھی محکمۂ دفاع سے قریب دہلی میں تھے۔ تمام اسلحہ ساز کارخانے اور فوجی ساز و سامان کے سارے ڈپو بھی انڈین یونین میں واقع تھے۔ افواج کی تنظیمِ نو اور تقسیم کے معاملات میں پاکستان کے مقابلے میں بھارت کو بہت کم مسائل درپیش تھے۔

پاکستان کے لیے سب سے زیادہ اہم کام ایک ایسی انتظامی مشینری کو معرضِ وجود میں لانا تھا' جو ایک جدید حکومت کے تمام امور و فرائض سرانجام دینے کی اہل ہو۔ اور اس نئی حکومت کو ایک نئے دارالحکومت میں قائم کرنا تھا۔ ایک نئی آئین ساز اسمبلی کے لیے انتخابات بھی منعقد کئے جانے تھے اور ایک نئی فیڈرل کورٹ کا تقرر کرنا تھا۔ عملے کے ساتھ ہی ساتھ کتب حوالہ اور دفتری ساز و سامان کو بھی تقسیم کیا جانا تھا' پرانے ریکارڈ اور جاریہ فائلوں کو بھی بانٹنا تھا' یا ان کی نقول تیار کرنی تھیں۔ مرکزی حکومت کے محاصل کی علیحدہ وصولی کے لیے بھی بندوبست کرنا تھا تاکہ انتظامیہ کے اخراجات پورے کئے جاسکیں۔ چونکہ تقسیم برصغیر مالی سال کے وسط میں ہو رہی تھی اور مالی سال اپریل سے مارچ تک ہوتا تھا اس لیے بجٹ اور حساب کتاب کی نئی الجھنیں تھیں' جنہیں دور کرنا بھی ضروری تھا۔ پھر کرنسی اور زرمبادلہ کے مسائل تھے۔ پاکستان کے لیے اپنی کرنسی ناگزیر تھی' لیکن ۱۵ اگست تک نئے کرنسی نوٹوں کی طباعت اور ٹکسال میں نئے سکوں کی ڈھلائی ناممکن تھی۔ جب تک پاکستان اپنے کرنسی نوٹوں اور سکوں کے بارے میں اپنا علیحدہ انتظام نہیں کر سکتا تھا' اس وقت تک عبوری انتظامات ناگزیر تھے۔ تجارت اور اقتصادی کنٹرول کے دائرے میں بھی متعدد مسائل درپیش تھے۔ اگر ہندوستان اور پاکستان فوراً مختلف پالیسیاں اختیار کر لیتے' تو پھر دونوں ملکوں میں کاروبار کو نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔ دونوں ملکوں میں باقاعدہ تجارتی معاہدے کی ترتیب کے لیے کافی وقت درکار تھا۔ تب تک ساز و سامان کی نقل و حمل اور محصولات اور اقتصادی کنٹرول کے بارے میں عارضی انتظامات لازمی تھے۔ غیر منقسم حکومت ہند کے اثاثہ جات اور واجبات میں ہر مملکت کے حصے کا تعین کیا جانا تھا۔ مختلف اقسام

کے اثاثہ جات کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لینا' اور انہیں منصفانہ اساس پر تقسیم کرنا ضروری تھا۔ مثال کے طور پر ریلوے اور تار کی لائنوں جیسے غیر منقولہ اثاثہ جات کو صرف علاقائی اساس پر ہی تقسیم کیا جاسکتا تھا۔ فوجی ساز و سامان کے ذخائر ہر مملکت کے حصے میں آنے والے فوجی یونٹوں کی اساس پر تقسیم کئے جانے تھے۔ نقد بقایاجات' زرمبادلہ اور حکومت کے مجموعی قرضوں کی تقسیم کے لیے بالکل مختلف فارمولے کی ضرورت تھی۔

صوبوں نے ابھی پاکستان کے حق یا مخالفت میں اظہار رائے کرنا تھا۔ خاص طور پر شمال مغربی سرحدی صوبہ اور سلہٹ میں استصواب کے لیے منظم اور پرجوش سیاسی کام کی شدید ضرورت تھی۔ صوبوں کی طرف سے اظہار رائے کے بعد پاکستان اور ہندوستان کے مابین سرحد کا ازحد اہم مسئلہ اٹھ کھڑا ہونا تھا۔ تقسیم ہونے والے دو صوبوں پنجاب اور بنگال میں نئی صوبائی حکومتوں کی تشکیل ضروری تھی۔ ریاستوں اور دونوں ڈومینیوں میں تعلقات و روابط کا بھی تعین ہونا تھا۔ یہ کام خطرناک امکانات سے معمور تھا۔

ان سب بڑی اور دوررس تبدیلیوں کو پارلیمنٹ میں قانون سازی کے ذریعہ آئینی صورت دی جانی تھی۔ مزید براں ان مقاصد کے لیے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں بھی مناسب ترامیم کی جانی تھیں تاکہ دونوں نئی ڈومینیوں کے لیے عبوری آئینوں کا اہتمام کیا جاسکے۔

بڑے اور اہم مسائل کے اس مختصر خاکے سے جو کسی صورت مکمل نہیں ہے' بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے کہ تقسیم اور انتقال اقتدار سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سیاسی لیڈروں اور سرکاری عملے کو اپنی ساری صلاحیتیں بروئے کار لانی پڑیں۔ ان مختلف النوع مسائل سے بیک وقت عہدہ برآ ہونا ضروری تھا۔ حالانکہ منطقی اعتبار سے ان میں تقویم و تاخیر ہونی چاہیئے تھی۔ نظریاتی اعتبار سے اثاثہ جات اور واجبات' سول سرونٹس اور افواج کی تقسیم کا کام اس وقت ہونا چاہیئے تھا' جب صوبے اپنا فیصلہ صادر کر دیتے اور پارلیمنٹ میں قانون بن جاتا' کیونکہ ان اقدامات کے بعد ہی تقسیم اور دو نئی ڈومینیوں کے قیام کے بارے میں یہ کہا جاسکتا تھا کہ اس کا حتمی اور باقاعدہ فیصلہ ہو گیا ہے۔ لیکن اس طرح بہت سا قیمتی وقت ضائع ہو جاتا۔ کانگرس' مسلم لیگ اور سکھوں نے جب ۳ جون کا منصوبہ قبول کر لیا تو پھر تقسیم ناگزیر ہو گئی تھی۔ چنانچہ مرکزی حکومت اور پنجاب اور بنگال میں تقسیم کے لیے انتظامی مشینری

کی بنا فوراً ڈال دی گئی۔ ایک ایک دن بلکہ ایک ایک گھنٹہ بہت اہم تھا۔ وقت کی اہمیت اور نزاکت کا احساس دلانے کے لیے مونٹ بیٹن نے ایک ایسا کیلنڈر وضع کیا، جو ہر روز جلی حروف میں یہ دکھاتا تھا کہ انتقالِ اقتدار کے لیے کام کرنے کے کتنے دن باقی رہ گئے ہیں، جو افسر تقسیم سے متعلق کام کر رہے تھے، ان سب کی میزوں پر ایک ایک ایسا کیلنڈر رکھ دیا گیا تھا۔ بے پایاں کام سرانجام ہوا۔ سبھی نے مقدور بھر زور مارا۔ افسروں اور عملے نے سچ مچ دن رات کام کیا۔ گویا وقت کے دھارے سے مقابلہ ہو رہا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ وقت کی رفتار ہر لمحہ تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ جو رپورٹ یا اعداد و شمار کا گوشوارہ عام حالات میں ہفتوں میں مرتب ہوتا تھا، اسے ایک یا دو دن کے اندر مکمل کرنا ضروری ہو گیا تھا، اور پورے دفتر کے عملے کو دن رات کے چوبیس گھنٹے بلا وقفہ یا اس سے بھی زیادہ عرصہ کے لیے کام کرنا پڑتا تھا تاکہ وقت پر کام سرانجام پا جائے۔ پھر دوسرے فریق سے اس پر تبادلۂ خیالات ہوتا تھا اور بسا اوقات اسے از سرِ نو مرتب کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ ہر فیصلے کو بروئے کار لانے کے لیے فوری احکام جاری کرنے پڑتے تھے، اور اس پر عمل درآمد کی نگرانی کرنی پڑتی تھی۔ ایک شعبے میں تاخیر کسی اور متعلقہ شعبے میں ٹائم ٹیبل کو تہ و بالا کر سکتی تھی، اور ہر جگہ کام کی رفتار ترقی گھٹ جانے کا احتمال ہو سکتا تھا۔ تاخیر کے نتائج پاکستان کے لیے بدرجہا زیادہ سنگین ثابت ہو سکتے تھے، کیونکہ جس قدر تاخیر ہوتی، اسی قدر ۱۵ اگست کو پاکستان میں ضروری ساز و سامان کی کمی ہوتی۔ میں اس سارے کام میں سرتاپا مستغرق تھا، لیکن آج جب میں نظرِ واپسیں ڈالتا ہوں، تو خود حیران رہ جاتا ہوں کہ اتنی قلیل مدت میں کس قدر کام سرانجام پایا۔

آیندہ صفحات میں ہر موضوع پر علیحدہ علیحدہ بحث کی گئی ہے، لیکن یہ بات ملحوظِ خاطر رکھنی چاہیئے کہ علیحدہ علیحدہ ہونے کے باوجود یہ موضوعات وقت اور وقوع کے اعتبار سے باہم مربوط تھے۔

سب سے اہم معاملہ صوبوں میں رائے شماری کا تھا۔ پنجاب اور بنگال دونوں میں رائے شماری کی ایک ہی صورت اختیار کی گئی۔ جب کسی صوبے کی اسمبلی کی اکثریت نے ایک نئی آئین ساز اسمبلی میں شامل ہونے کی تائید کر دی، تو پھر مسلم اکثریت کے اضلاع اور غیر مسلم اکثریت کے اضلاع کے نمایندوں کے علیحدہ علیحدہ اجلاس منعقد کیے گئے۔ مؤخر الذکر اضلاع کے نمایندوں کی اکثریت نے صوبے کو تقسیم کرنے کی حمایت میں ووٹ ڈالے اور اوّل الذکر کے نمایندوں کی اکثریت نے اس کی مخالفت میں۔ چونکہ کسی

ایک گروپ کا تقسیم کے حق میں ووٹ فیصلہ کن تھا لہٰذا تقسیم کا اعلان ہو گیا۔ مشرقی پنجاب اور مغربی بنگال نے انڈین یونین کی آئین ساز اسمبلی میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ مغربی پنجاب اور مشرقی بنگال نے پاکستان کی نئی آئین ساز اسمبلی میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ بعد ازاں مناسب وقت پر مشرقی بنگال اور مغربی پنجاب میں پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کے لیے انتخابات کرائے گئے۔

سندھ کی اسمبلی نے کثرت رائے سے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔

بلوچستان کے بارے میں وائسرائے نے شاہی جرگہ اور کوئٹہ کی میونسپل کمیٹی کے غیر سرکاری ارکان پر ذمہ داری عائد کرنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے اتفاق رائے سے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔

سلہٹ میں پاکستان نے ــــــ ۲۳۹،۶۱۹ ــــــ کے مقابلے میں ۱،۸۴،۰۴۱ ــــــ کی اکثریت سے استصواب جیت لیا۔ اور یہ ضلع پاکستان میں شامل ہو گیا۔

شمال مغربی سرحدی صوبہ میں استصواب ایک طوفانی مباحثے کا موضوع بن گیا۔ وہاں گورنر جنرل کے زیر اہتمام صوبائی حکومت کے مشورے سے استصواب ہونا تھا۔ وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب اور اس کا بھائی سرخ پوش لیڈر عبدالغفار خاں کانگرس کے حلقہ بگوش تھے اور مسلم لیگ کے سخت مخالف تھے۔ لیکن وہ بڑے مخمصے میں تھے، کیونکہ استصواب کا نتیجہ یقیناً پاکستان کے حق میں نکلنا تھا۔ ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ ۲ جون کو جب کانگرس ورکنگ کمیٹی نے منصوبۂ تقسیم پر غور و خوض کیا، اور گاندھی نے اس کی حمایت میں تقریر کی تو عبدالغفار خان پر سکتہ طاری ہو گیا۔ جب کچھ وقفے کے بعد وہ بولنے کے قابل ہوا، تو وہ بار بار کہے جاتا تھا کہ اگر کانگرس نے تقسیم ملک پر مسلم لیگ سے مصالحت کر لی اور سرخ پوشوں کا ساتھ چھوڑ دیا، تو یہ بات غداری کے مترادف ہو گی۔ اس نے کانگرس ورکنگ کمیٹی کو اپنی سابقہ خدمات یاد دلائیں، اور اپیل کی کہ وہ اسے اس کے دشمنوں سے بچائے۔ ڈاکٹر خان صاحب بھی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں شامل ہوا۔ اسے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے شمال مغربی سرحدی صوبے میں استصواب کی تجویز سے آگاہ کر دیا تھا اور یہ پوچھا تھا کہ اسے کوئی اعتراض تو نہیں۔ دونوں بھائی استصواب نہیں چاہتے تھے، لیکن اس سے انکار بھی نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ ان کا انکار اس بات کا اعتراف ہوتا کہ انہیں شمال مغربی سرحدی صوبے میں اکثریت کی حمایت حاصل نہیں ہے۔ اپنے صوبے میں واپس جانے کے بعد

انہوں نے شمال مغربی سرحدی صوبہ کو آزاد مملکت بنانے کا نعرہ لگا دیا۔[۱]

آزاد سرحدی مملکت یا پختونستان کا نعرہ خان برادران کو گاندھی نے دیا تھا۔ اس مطالبے کی تہ میں، اس صوبے کو ہندوستان میں مدغم کرنے کی دوررس تدبیر تھی، جس پر عمل درآمد اس وقت ہونا تھا جب ریاست جموں و کشمیر پر تسلط کے ذریعے اس صوبے سے اتصال ہو جاتا۔ مونٹ بیٹن نے جون ۱۹۴۷ء میں حکومت برطانیہ کو اطلاع دی تھی کہ "نہرو نے بہت صاف گوئی سے اعتراف کیا کہ شمال مغربی سرحدی صوبہ کسی صورت اپنے آپ کو علیحدہ قائم نہیں رکھ سکتا اور کہا کہ ڈاکٹر خان صاحب بعد میں انڈین یونین میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔"[۲]

گاندھی کے اسلحہ خانۂ تدابیر میں جتنے ہتھیار تھے، وہ سب کے سب اس نے شمال مغربی سرحدی صوبہ کو پاکستان سے علیحدہ کرنے کے لیے استعمال کر ڈالے، لیکن جغرافیائی حقائق، حالات کے منطقی تقاضوں اور عوام کے عزم و ارادہ نے اسے بے بس بنا دیا۔ اس ضمن میں پہلا تیر کانگرس ورکنگ کمیٹی نے اس مطالبے کی شکل میں چلایا کہ استصواب میں رائے دہندگان کا دائرۂ انتخاب وسیع کر کے اس میں آزاد مملکت بنانے کا حق بھی شامل کر دیا جائے لیکن مونٹ بیٹن نے یہ مسکت جواب دیا کہ تقسیم کے ابتدائی منصوبے پر خود نہرو کے ایما پر جو نظر ثانی کی گئی تھی، اس کے تحت کسی بھی صوبے کو آزاد مملکت بننے کا حق انتخاب نہیں دیا گیا۔[۳]

جب یہاں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، تو گاندھی نے تشدد کے خطرے کی بنا پر فی الحال استصواب ٹالنے کی کوشش کی، تاکہ پاکستان کے حق میں قطعی فیصلے سے گریز کیا جا سکے۔ ۸ جون کو اس نے نہرو کو خط لکھا، جس میں ایک یہ الزام لگایا کہ استصواب کی موجودہ صورت حال کی بیشتر ذمہ داری اسی پر ہے۔ نہرو نے اپنے مفصل جواب میں لکھا:

> "حکومت برطانیہ اور وائسرائے قطعی پر اس استصواب کی ذمہ داری لے چکے ہیں۔ ہم میں سے بھی بعض اس ذمہ داری کو کم و بیش قبول کر چکے ہیں ....
> اس لیے استصواب کا سوال ایک طے شدہ معاملہ معلوم ہوتا ہے اور یہ واضح طور پر نظر نہیں آتا کہ جو ذمہ داری ہم قبول کر چکے ہیں، اس سے کس طرح نکل سکتے ہیں۔
> وائسرائے کے لیے تو ایسی بات اور بھی زیادہ مشکل ہے۔ منصوبے میں کوئی تبدیلی

.......بہت بڑے پیمانے پر تصادم کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔"

یہ الفاظ نہرو کے اندازِ فکر و عمل کا نمونہ ہیں۔ وہ کبھی اپنے آپ کو کسی بات کا پوری طرح پابند نہیں کرتا تھا اور کسی عہد سے کھسکنے میں اسے باک نہیں تھا۔ بدقسمتی سے اس پر عین واضح نہیں تھا کہ وہ خود اور کانگرس شمال مغربی سرحدی صوبے میں استصواب کی جو ذمہ داری قبول کر چکے ہیں اس سے کس طرح گلو خلاصی کرا سکتے ہیں۔ نہرو نے اپنے جواب میں یہ وضاحت بھی کی کہ استصواب میں حالات پُرامن رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ "استصواب کا انتظام ایسے انگریز فوجی افسر کریں" جو باہر سے منگوائے گئے ہوں "صوبائی حکومت کو ان انتظامات میں پورا عمل دخل ہونا چاہیئے اور "کسی بڑے متشددانہ تصادم" کا کوئی خاص امکان نہیں ہے۔"[۴۳]

اسی زمانے میں گاندھی نے ماؤنٹ بیٹن سے یہ کہا کہ وہ قائداعظم کو شمال مغربی سرحدی صوبے میں جانے پر آمادہ کرے "تاکہ وہ پاکستان کا موقف وہاں کے لیڈروں اور لوگوں کے سامنے واضح کر سکیں اور اس طرح استصواب تک نوبت ہی نہ پہنچے اور خونریزی کا خطرہ دور کیا جا سکے۔ جب قائداعظم نے اس تجویز کو قبول کر لیا بشرطیکہ کانگرس" وعدہ کرے کہ وہ سرحد کے لوگوں میں مداخلت نہیں کرے گی" تو گاندھی نے جواب میں لکھا کہ وہ "کانگرس سے خودکشی کرنے کے لیے نہیں کہہ سکتا۔" چونکہ قائداعظم پھانسے میں نہیں آئے یا گاندھی کے خاص محاورے میں انہوں نے عبدالغفار خاں "اس کے بھائی اور اس کے ساتھیوں" کے پاس جانے اور ان کی دلجوئی کرنے" سے انکار کر دیا۔ گاندھی نے عبدالغفار خاں سے کہا "اب وہ خود لیگ کے پاس جائے اور اس کی دلجوئی کرے۔"[۴۴] ۱۸ جون کو عبدالغفار خاں نے قائداعظم سے ملاقات کی لیکن اس سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ درحقیقت اس سے کوئی نتیجہ نکل ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ عبدالغفار خاں نے پاکستان کے کھلے طور پر مخالف ہونے کو ڈھکا چھپا نہیں رہنے دیا تھا۔ قائداعظم کے سامنے اس نے جو شرائط پیش کیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ "اگر پاکستان نے آزادی کے بعد برطانیہ کے زیرِ تسلط رہنے کا فیصلہ کیا" تو پھر صوبہ سرحد اور قبائلی علاقہ کے پٹھانوں کو اس سے نکل جانے اور ایک علیحدہ آزاد مملکت قائم کرنے کا اختیار حاصل ہونا چاہیئے۔"[۴۵] لیکن وہ اس بات پر پوری طرح مطمئن اور قانع تھا کہ شمال مغربی سرحدی صوبہ انڈین یونین کا حصہ بن جائے جو برطانوی دولتِ مشترکہ کی ایک ڈومینین بننے والی تھی۔

۲۱ جون کو شمال مغربی سرحدی صوبہ کی کانگرس کمیٹی اور خدائی خدمت گاروں یا سرخ پوشوں نے یہ

قرارداد منظور کی کہ "تمام پختونوں کی ایک آزاد پٹھان مملکت قائم کی جائے"[۵۳] گاندھی اور عبدالغفار خاں نے پختونستان کے لیے جو مہم شروع کی، افغانستان کی حکومت نے بھی اس میں حصہ لیا۔ یہ کہا گیا تھا کہ کانگرس کے ایلچی افغان حکومت کے پاس پہنچے ہیں۔ افغان حکومت نے برطانیہ اور ہند کی حکومتوں کو لکھا کہ دریائے سندھ کے مغرب کے علاقوں کو، جہاں افغان آباد ہیں، یہ فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے کہ آیا وہ افغانستان یا ہندوستان میں شامل ہوں یا اپنی آزاد مملکت قائم کریں۔ لارڈ لسٹوویل نے، جو لارڈ پیتھک لارنس کی جگہ وزیر مملکت برائے ہند بن چکا تھا، دوٹوک الفاظ میں یہ کہا کہ "افغانستان کو شمال مغربی سرحدی صوبے کے حقوق میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، جیسا کہ وہ مداخلت کرنے کی کوشش کر رہا ہے"[۵۴]

لیکن گاندھی اور عبدالغفار کی طرح افغان حکومت کی مساعی بھی شمال مغربی سرحدی صوبہ کے لوگوں کے برملا عزم کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکیں۔ ۲۹ جون کو گاندھی نے ماؤنٹ بیٹن کے نام خط میں لکھا "بادشاہ خان (عبدالغفار خان) لکھتا ہے..... کہ اس کو آزاد پٹھانستان کی تحریک میں ناکامی ہوئی ہے، اس لیے اس کے پیروکاروں کی طرف سے کسی مداخلت کے بغیر استصواب جاری رہے گا۔ اور وہ کوئی ووٹ نہیں ڈالیں گے۔ اسے پورا احساس ہے کہ اس صورت میں صوبہ سرحد اغلباً پاکستان میں شامل ہو جائے گا۔"[۵۵] گاندھی اسے بھی امید کر رہا تھا کہ کانگرس اور سرخ پوشوں کی طرف سے استصواب کا مقاطعہ مؤثر ثابت ہوگا۔ ۳۰ جون کو اس نے عبدالغفار خان کو خط لکھا "مقاطعے سے پاکستان قانونی فتح تو یقیناً حاصل کر لے گا، لیکن یہ اس کے لیے ایک اخلاقی شکست ہوگی۔ اگر آپ کی طرف سے تشدد کے کسی شائبے کے بغیر پختونوں کی اکثریت نے باوقار طور پر استصواب میں حصہ لینے سے احتراز کیا۔"[۵۶] ان امیدوں کا حشر بھی ناکامی کی صورت میں عیاں ہونے والا تھا۔

شمال مغربی سرحدی صوبہ کی مسلم لیگ نے ۳ جون کو قائداعظم کی نشری تقریر پر عمل کرتے ہوئے سول نافرمانی کی تحریک ختم کر دی۔ مسلم لیگ کا اپنا مفاد اسی میں تھا کہ استصواب سے پہلے اور اس کے دوران میں صوبے کے حالات پُرامن رہیں۔ عبدالقیوم خاں، پیر مانکی شریف اور دوسرے لیڈر استصواب کی مہم میں دل و جان سے مصروف ہو گئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی اور دوسرے کالجوں کے مسلم طلبہ نے بھی پاکستان کا پیغام ہر گاؤں تک پہنچانے میں نمایاں حصہ لیا۔ سرخ پوشوں کی طرف سے

فسادات بپا کیے جانے کا خطرہ تھا۔ سرخ پوشوں نے لوگوں کو اس بات پر آمادہ کرنے کے لیے ایجی ٹیشن شروع کر رکھی تھی کہ وہ ووٹ نہ ڈالیں' مونٹ بیٹن نے گاندھی کو خط لکھا کہ "اس نوعیت کے اقدام سے اسی تشدد کا امکان ہے' جس سے بچنے کے لیے آپ اور میں اس قدر فکرمند ہیں"۔[۱۱]

کانگرس کے اصرار پر شمال مغربی سرحدی صوبہ کے گورنر سر اولف کیرو کو ہٹا کر لیفٹیننٹ جنرل سر راب لاک ہارٹ کو گورنر مقرر کر دیا گیا۔ بریگیڈیر جے' بی بوتھ کو بطور کمشنر استصواب مامور کیا گیا۔ اس کے ماتحت افواج ہند کے ایسے چالیس انگریز افسروں کو استصواب کا نگران مقرر کیا گیا' جنہیں شمال مغربی سرحدی صوبے میں کام کرنے کا تجربہ تھا۔ امن و امان کے قیام و تحفظ میں پولیس کی امداد کے لیے ۱۵ ہزار فوجی بھی مامور کیے گئے۔ استصواب جو ۶ سے ۱۷ جولائی تک جاری رہا' بالکل پرامن رہا۔ پاکستان کے حق میں ۲۸۹٬۲۴۴ اور بھارت کے حق میں صرف ۲٬۸۷۴ ووٹ ڈالے گئے۔ پاکستان کے حق میں ووٹ کل رائے دہندگان کا ۵۱ فیصد تھے۔ لیکن چونکہ کسی بھی انتخاب میں سارے رائے دہندگان کبھی ووٹ ڈالنے کے لیے نہیں آتے۔ اس لیے استصواب کے نتیجے کا صحیح تر اندازہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھنے سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں صرف ۶۵ فیصد رائے دہندگان نے ووٹ ڈالے تھے۔ اس اساس پر پاکستان کی حمایت میں ووٹوں کا تناسب ۸۰ فی صد بنتا ہے۔ اس طرح پاکستان کا حصہ بننے والے ہر علاقے — مشرقی بنگال' سلہٹ' مغربی پنجاب' سندھ بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبہ — نے پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ مثبت ووٹ سے کیا۔

عبوری حکومت کی ازسرنو تنظیم بھی ایک بہت اہم کام تھا۔ ۷۲ دنوں میں حکومت ہند کی ساری قوت تقسیم کے مسائل پر مرکوز رہی۔ انتظامیہ کا معمول کا کام تقریباً رک گیا تھا۔ ۳ جون کے منصوبے کے اعلان کے فوراً بعد کابینہ نے اس امر پر اتفاق کیا کہ کسی محکمے کی طرف سے کوئی ایسا حکم جاری نہیں کیا جائے گا' جو کسی بھی جانشین حکومت کے مفاد کے منافی ہو یا اس کے لیے پریشانی کا موجب بن سکے۔ اور وزیر جو بھی فیصلے کریں' ان سب کی ایک فہرست ہر ہفتے کابینہ کے سامنے برائے اطلاع پیش کی جائے۔ چند ہفتوں کے بعد موخرالذکر فیصلہ پر نظرثانی کی گئی' اور تمام محکموں کو ہدایت کی گئی کہ وہ دن بھر میں جو بھی فیصلے کریں ان کی ایک فہرست اسی شام وائسرائے کے

پرائیویٹ سیکرٹری کو بھیج دیں۔ اعلیٰ مناصب پر تقرریوں کی ممانعت کر دی گئی۔ اہم معاملات کے بارے میں کابینہ کی توثیق سے ہی فیصلے کئے جا سکتے تھے۔ قانون آزادی ہند کے منظور ہو جانے کے بعد ۱۹ جولائی کو کابینہ کی دو علیحدہ علیحدہ گروپوں میں ازسرِ نو تشکیل کی گئی، جو ہندوستان اور پاکستان کی جانشین حکومتوں کی نمایندگی کرتے تھے۔ ہر گروپ اپنی مملکت کے تمام محکموں اور شعبوں کے انتظام کا ذمہ دار تھا۔ مشترکہ معاملات میں دونوں گروپوں کا اجلاس وائسرائے کی صدارت میں ہوتا تھا۔ حکومت کے ہر محکمے کو دو محکموں میں تقسیم کر دیا گیا ___ ایک انڈین محکمہ، جس کا عملہ ان اہلکاروں پر مشتمل تھا جنہوں نے پاکستان میں ملازمت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ایک اور اہم مسئلہ تنظیم برائے تقسیم کا تھا۔ مونٹ بیٹن نے ۳ جون کو لیڈروں کی کانفرنس میں تقسیم کے انتظامی عواقب کے زیر عنوان جو یادداشت پیش کی تھی، اس پر غور و خوض کے لیے کابینہ کی ایک کمیٹی مقرر کر دی گئی تھی۔ اس کمیٹی کا صدر وائسرائے تھا۔ کانگرس کی طرف سے سردار پٹیل اور راجندر پرشاد اس کے رکن تھے، اور مسلم لیگ کی نمایندگی لیاقت علی خان اور سردار عبدالرب نشتر کرتے تھے۔ ۲۷ جون کو جب صوبوں نے تقسیم کے حق میں فیصلہ کر دیا، تو اس کمیٹی کی جگہ تقسیم کونسل معرض وجود میں لائی گئی۔ اس کونسل کا صدر وائسرائے تھا۔ سردار پٹیل اور راجندر پرشاد بطورِ رکن اور راج گوپال اچاریہ بطورِ متبادل رکن کانگرس کے نمایندے تھے، اس کونسل کو چونکہ بہت ہی اہم نوعیت کے فیصلے کرنے تھے، قائد اعظم نے خود کونسل میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ پاکستان کی نمایندگی قائد اعظم اور لیاقت علی خان کرتے تھے اور سردار عبدالرب نشتر متبادل رکن تھے۔

تقسیم کونسل دو افسروں کی سٹیرنگ کمیٹی کی وساطت سے اپنے فرائض سرانجام دیتی تھی ___ انڈین سول سروس کا ایچ ایم پٹیل ہندوستان کی طرف سے اس کمیٹی کا رکن تھا، اور میں پاکستان کی نمایندگی کرتا تھا۔ ایک سیکرٹریٹ برائے تقسیم قائم کر دی گئی۔ سٹیرنگ کمیٹی کے ارکان ہی اس کے دو سیکرٹریوں کے طور پر کام کرتے تھے۔ سٹیرنگ کمیٹی کی اعانت کے لیے ماہرین کی دس کمیٹیاں قائم کر دی گئیں، ان میں سے ہر کمیٹی کو اہم مسائل کے ایک گروپ سے عہدہ برآ ہونا تھا۔ ماہرین کی ایک کمیٹی تنظیم، ریکارڈ اور عملہ سے متعلق فرائض ادا کرتی تھی، دوسری کے ذمہ اثاثہ جات اور واجبات تھے، تیسری مرکزی محاصل سے متعلق تھی، چوتھی ٹھیکوں سے متعلق معاملات کی ذمہ دار تھی۔ باقی کمیٹیاں

کرنسی اور زرمبادلہ، بجٹ اور حسابات، اقتصادی تعلقات، رسل و رسائل اور تجارت، وطنیت اور خارجہ تعلقات کی ذمہ دار تھیں، اور ایک کمیٹی افواج کی تشکیل نو کے لیے تھی۔ ماہرین کی کمیٹیوں کی اعانت کے لیے بہت سی محکماتی کمیٹیاں کام کرتی تھیں۔ مثال کے طور پر تنظیم ریکارڈ اور عملہ سے متعلق ماہرین کی کمیٹی کے تحت ۲۰ محکماتی کمیٹیاں تھیں، اثاثہ جات اور واجبات سے متعلق ماہرین کی کمیٹی کے تحت محکماتی کمیٹیوں کی تعداد ۲۱ تھی۔ ایک محکماتی کمیٹی ایک یا دو محکموں سے متعلق معاملات طے کرتی تھی، مثلاً زراعت، صنعت، تجارت، ریلوے، تعمیرات۔ ہر کمیٹی میں حکومت ہند کے مسلم اور غیر مسلم افسران کی تعداد مساوی تھی، اول الذکر پاکستان کی اور موخر الذکر ہندوستان کی نمائندگی کرتے تھے۔ افواج کی تشکیلِ نو کمیٹی اور اس کی ذیلی کمیٹیوں میں کئی انگریز افسر بھی رکن تھے۔ ان کمیٹیوں کو اپنا طریق کار طے کرنے، سرکاری گواہوں اور ریکارڈوں کا معاینہ کرنے، اور معین وقت کے اندر اپنا کام مکمل کرنے کے لیے ضروری اطلاعات حاصل کرنے کے پورے اختیارات دیے گئے تھے۔ تقسیم کے کام کو تمام دوسرے کاموں پر کامل فوقیت دی گئی تھی۔

سٹیرنگ کمیٹی کا فرض منصبی اس امر کا یقینی انتظام کرنا تھا کہ ماہرین کی کمیٹیاں وقت پر مخصوص تجاویز مرتب کر دیں گی، اور ایسی تجاویز بہ حیثیت مجموعی ایک مکمل و مربوط شکل اختیار کر لیں گی، نیز یہ کہ تقسیم کونسل کے سامنے سفارشات منظوری کے لیے مناسب صورت میں پیش کی جائیں گی اور اس کے فیصلوں پر عملدرآمد کرایا جائے گا۔ سٹیرنگ کمیٹی کو یہ ہدایت بھی کی گئی تھی کہ وہ ماہرین کی کمیٹیوں کو ضروری مشورے دے، ان کی رہنمائی کرے اور ان کے لیے جہت عمل متعین کرے۔ سٹیرنگ کمیٹی کے لیے لازم تھا کہ وہ تقسیم کونسل سے قریبی رابطہ قائم رکھے۔ سٹیرنگ کمیٹی نے تقسیم کے کام میں بہت اہم خدمات سرانجام دیں۔ ایک طرف اس نے ماہرین کی کمیٹیوں اور محکماتی کمیٹیوں سے قریبی اور مسلسل رابطہ قائم کیے رکھا اور اس طرح وہ مشکلات کو بڑھنے اور شدت اختیار کرنے سے پہلے ہی انہیں دور کرنے میں کامیاب ہوئی۔ دوسری طرف تقسیم کونسل کے لیے سیکرٹریوں کے طور پر کام کرنے سے سٹیرنگ کمیٹی کے ارکان کو ذاتی تجربہ سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ کسی تجویز پر کونسل کا ردِعمل اغلباً کیا ہو گا؛ سٹیرنگ کمیٹی کا ہر رکن لازماً اپنی طرف کے سیاسی لیڈروں سے قریبی رابطہ رکھتا تھا۔ اس طرح سٹیرنگ کمیٹی نزاع و اختلاف سے معمور اکھاڑے میں یقین و اعتماد سے قدم رکھ سکتی تھی۔ پچھلے چند برسوں کے اہم سیاسی مباحث سے انتظامیہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ جو امور بظاہر انتظامی یا مالیاتی نوعیت کے معلوم ہوتے تھے، ان میں اکثر

یاسی پہلو مضمر ہوتے تھے' لہٰذا جذباتی طوفان برپا ہو سکتا تھا۔

کمیٹیوں نے تیسرے ہفتے میں کام شروع کیا' ان کے ذمے یہ فرض تھا کہ وہ ایک ماہ کے اندر اپنی رپورٹیں پیش کر دیں۔ پوری کوشش کی جاتی تھی کہ تقسیم کونسل کے سامنے ان کے فیصلہ کے لیے متفقہ سفارشات پیش کی جائیں۔ ایسے معاملات کا دائرہ کافی وسیع تھا جن کے بارے میں کمیٹیاں متفقہ سفارشات پیش کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ کمیٹیوں کی رپورٹوں پر پہلے سٹیرنگ کمیٹی غور کرتی تھی اور وہ متنازعہ فیہ نکات میں سے اکثر و بیشتر کا تصفیہ کرنے میں کامیاب ہوئی۔

اس کامیاب کارکردگی کی وجہ یہ تھی کہ آغاز کار میں ہی ایچ ایم پٹیل اور میرے درمیان یہ مفاہمت ہو گئی تھی کہ ہم ایک دوسرے سے مکمل طور پر صاف گوئی سے کام لیں گے۔ ہم ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف تھے' اور ہمیں یہ معلوم تھا کہ کامیابی کے بہترین امکانات صاف گوئی میں ہی مضمر ہیں۔ ایسے امور کا دائرہ بہت وسیع تھا' جہاں دونوں نئی مملکتوں کے مفادات باہمدگر متصادم تھے' لیکن بجائے ہیرپھیر کے ایسے معاملات میں کھل کر بات کرنے سے جلدی تصفیہ ہو سکتا تھا۔ کسی تجویز کے ہندوستان اور پاکستان کے لیے فوائد اور نقصانات پر ہم آپس میں پوری آزادی سے تبادلۂ خیالات کرتے تھے۔ چونکہ بیک وقت بہت سے معاملات پر گفت و شنید ہو رہی تھی' یہ بات رکاوٹ کی بجائے معاون ثابت ہوئی' کیونکہ اس سے باہمی رعایت میں آسانی ہو گئی۔ ایچ ایم پٹیل کے ساتھ کئی اعلیٰ ہندو افسر منسلک کر دیئے گئے تھے' جو ہر روز صبح کے وقت اپنا اجلاس کرتے' اور اسے مشورہ دیتے۔ اگرچہ یہ سب مشیر متفق تھے کہ پاکستان کو گھاٹے میں رکھ کر ہندوستان کو نفع پہنچایا جائے لیکن اس بات پر اتفاق رائے نہیں ہوتا تھا کہ حصول مدعا کے لیے کونسا طریقہ اختیار کیا جائے' اور اس سے انتشار پیدا ہو جاتا تھا۔ چونکہ اعلیٰ مسلمان افسروں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلہ میں بدرجہا کمتر تھی' اس لیے مجھے زیادہ آزادیٔ فکر و عمل حاصل تھی' اور اس طرح میں پٹیل کے مقابلے میں فائدے میں رہتا تھا۔ محکمہ فنانس میں گیارہ سالہ ملازمت کے دوران میں مجھے حکومت ہند کے دوسرے محکموں ۔۔۔ سول اور فوجی ۔۔۔ کے طریق کار کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئی تھیں وہ بہت مفید ثابت ہوئیں۔ تمام اہم مسائل پر میں قائد اعظم اور لیاقت علی خان یا متعلقہ وزیر مثلاً عبدالرب نشتر سے مشورہ کر لیتا تھا۔ مالیاتی معاملات کے بارے میں غلام محمد سے مشورہ کرتا تھا' جن کو مستقبل میں پاکستان کا وزیر خزانہ نامزد کر دیا گیا تھا۔ وہ اعتماد جو ان حضرات کو میری قوت فیصلہ پر تھا

اس نے مجھے کام کو بر وقت طے کرنے میں بڑی مدد دی۔ یہ بات دہرانے کی ضرورت نہیں کہ جہاں تک پاکستان کا تعلق تھا مسائل کا بر وقت حل ہونا اشد لازمی تھا۔ تعطل سے ہندوستان کو شاذ و نادر ہی گزند پہنچ سکتی تھی کیونکہ کم و بیش ہر چیز اس کے قبضہ و تصرف میں تھی۔

ایچ ایم پٹیل کو سردار پٹیل کا پورا اعتماد حاصل تھا۔ جب کسی بات پر ایچ ایم پٹیل اور میرے درمیان اتفاق رائے نہیں ہوتا تھا تو عام طور پر تقسیم کونسل بھی دو مساوی حصوں میں بٹ جاتی تھی اور نوبت تند و تیز بحث تک پہنچ جاتی تھی۔ سردار پٹیل بدتمیزی کی حد تک منہ پھٹ تھا' قائداعظم کو چبھتے ہوئے جملے کسنے میں مہارت تامہ حاصل تھی' شرارے پھوٹتے تھے اور بعض اوقات مزاج برہم ہو جاتے تھے۔

بایں ہمہ تقسیم کونسل نے اختلافات کو دور گھٹایا۔ مونٹ بیٹن با کمال چیئرمین تھا اور اس نے یہ پختہ ارادہ کر رکھا تھا کہ کوئی تعطل پیدا نہیں ہونے دے گا' گاڑی کو چلتی رکھنے کے لیے اس نے اپنی کاردانی اور حاضر دماغی سے بہت کام لیا۔ اس کے طریق کار کی وضاحت کے لیے ایک ہی مثال کافی ہوگی۔ پاکستان میں چھاپہ خانوں کی بڑی کمی تھی۔ کراچی میں' جس کا انتخاب بطور دارالحکومت ہو چکا تھا' کوئی جدید چھاپہ خانہ نہیں تھا۔ اس کے برعکس ہندوستان میں کئی اعلیٰ درجہ کے چھاپہ خانے تھے' خود حکومت ہند کا اپنا ایک پریس دہلی میں تھا اور دوسرا شملہ میں تھا جسے بہت کم استعمال کیا جاتا تھا۔ دور جدید میں کوئی بھی حکومت چھاپہ خانے کے بغیر کام نہیں چلا سکتی۔ پاکستان کے نمایندوں نے یہ تجویز پیش کی کہ شملہ میں حکومت ہند کا جو پریس ہے' اسے کراچی منتقل کر دیا جائے۔ ہندوستان کے نمایندوں نے اس کی مخالفت کی۔ جب یہ مسئلہ تقسیم کونسل کے سامنے پیش ہوا' سردار پٹیل نے سخت کٹر رویہ اختیار کیا۔ اس کا موقف یہ تھا کہ وہ ہرگز کسی قسم کی مشینری کو پاکستان میں منتقل کرنے پر رضامند نہیں ہوگا۔ اس کا یہ رویہ صریحاً نامعقول تھا۔ مونٹ بیٹن نے پہلے تو اسے نرمی پہ مائل کرنے کی کوشش کی' لیکن جب پاکستانی لیڈروں اور مونٹ بیٹن کی مجموعی کوششوں سے بھی پٹیل پر کوئی اثر نہ ہوا' تو مونٹ بیٹن نے یہ تجویز پیش کر دی کہ وہ حکومت برطانیہ سے سفارش کرے گا کہ ایک جدید چھاپہ خانے کے لیے سب سے مقدم آرڈر دیا جائے تاکہ وہ چند ماہ کے اندر حکومت پاکستان کے حوالے کر دیا جائے۔ جو لوگ اس زمانے میں صنعتی پیداوار کے معاملے میں برطانیہ کی نازک صورت حال جانتے تھے ان کے

نزدیک مونٹ بیٹن کی یہ پیشکش کوئی معنی نہیں رکھتی تھی ـــــ پاکستان کو چھاپہ خانہ بہم پہنچانے میں کئی سال لگ جائیں گے۔ لیکن مونٹ بیٹن نے اپنی تجویز کو اس قدر یقین افروز طور پر پیش کیا کہ وہ اس مسئلے کے حل کی سراب آسا جھلک دکھانے میں کامیاب ہو گئے، اور تقسیم کونسل اپنا کام جاری رکھ سکی۔

تقسیم کونسل ۱۵ راگست کے بعد بھی اپنے فرائض منصبی ادا کرتی رہی۔ اس کی از سرِ نو تشکیل کر دی گئی۔ اس میں ہندوستان کے دو وزارتی نمایندے تھے، اور دو پاکستان کے، ایک وزیر اور دوسرا یا وزیر ہوتا تھا یا ہندوستان میں پاکستان کا ہائی کمشنر۔

مرکزی حکومت کی تقسیم کونسل کے خطوط پر منقسم ہونے والے صوبوں میں بھی تنظیمیں قائم کر دی گئیں۔ ان کی صدارت کے فرائض صوبائی گورنر ادا کرتے تھے، اور ان میں اس صوبہ کی کانگرس اور مسلم لیگ کے مساوی نمایندے لیے گئے تھے۔ کانگرس کے نمایندوں میں اس کے حلیف مثلاً سکھ بھی شامل تھے، اس طرح بنگال تقسیم کونسل، آسام تقسیم کونسل اور پنجاب تقسیم کمیٹی قائم ہو گئیں۔

مرکزی حکومت کی تقسیم کونسل یا صوبائی تقسیم کمیٹیوں میں کسی سوال پر اختلاف رائے کی صورت میں فیصلے کے لیے ثالثی ٹربیونل سے رجوع کیا جاتا تھا۔ ثالثی ٹربیونل کے قیام پر ہندوستان کے نمایندے بڑی مشکل سے آمادہ ہوئے۔ ثالثی ٹربیونل کا چیرمین ایک آزاد شخصیت تھی۔ یعنی ہند کا سابق چیف جسٹس سر پیٹرک سپنس اور دو رکن تھے۔ ایک ہندوستان کا نمایندہ جسٹس سر ہیرالال اور ایک پاکستان کا نمایندہ جسٹس ایم اسمٰعیل۔ اثاثہ جات اور واجبات اور دوسرے متعلقہ امور کے تنازعات خواہ وہ مرکزی حکومت کے ہوں اور خواہ تقسیم ہونے والے صوبوں کے، اس ٹربیونل کے فیصلے کے لیے ۳۱ مارچ ۱۹۴۸ء تک پیش ہو سکتے تھے۔ اس کے بعد اس ٹربیونل کو ختم ہو جانا تھا۔

قانون آزادی ہند (انڈین انڈی پنڈنس ایکٹ ۱۹۴۷ء) نے تقسیم کے فیصلے کو اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے دو آزاد ڈومنین ـــــ انڈیا اور پاکستان ـــــ کے قیام کو قانونی صورت دے دی۔ سابق برٹش انڈیا کے صرف ایک حصے کے لیے انڈیا کا نام استعمال کرنے سے بیرونی دنیا میں بڑی الجھنیں اور غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ کانگرسی لیڈروں نے اس پر اصرار کیا تھا، تاکہ برٹش انڈیا کے ساتھ تسلسل اور یکسانی ثابت ہو جائے، اور ان کا یہ دعویٰ تسلیم کر لیا جائے کہ غیر منقسم ہند کے معاہدوں کی ذمہ داریوں، اور اقوام متحدہ اور دوسرے بین الاقوامی اداروں کی رکنیت کے وہ واحد وارث ہیں

۴ جولائی کو انگلستان میں دارالعوام میں پیش کرنے سے پہلے قانون آزادی کے مسودہ کو کانگرس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کو دکھا دیا گیا تھا۔ اس میں دونوں ڈومینیوں کی حدود کو متعین کیا گیا تھا، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ان حدود کا قطعی فیصلہ سرحد کمیشن کرے گا جسے گورنر جنرل نے مقرر کرنا تھا اس قانون میں یہ شق رکھی گئی تھی کہ "ہر ڈومینین کا ایک گورنر جنرل ہو گا، جسے ملک معظم مقرر کرے گا لیکن ایک ہی شخص دونوں نئی ڈومینیوں کا گورنر جنرل ہو سکتا ہے۔" گورنر جنرل محض آئینی گورنر جنرل ہو گا" اسے ملک معظم کے نام پر اپنی ڈومینین کی مجلس قانون ساز کے منظور کردہ قوانین کی توثیق کے پورے اختیارات حاصل ہوں گے" لیکن اسے قوانین مسترد کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہو گا" اور نہ ہی وہ" ملک معظم کی خوشنودی کے حصول کی خاطر ان کی توثیق کا حق محفوظ رکھنے کا مجاز ہو گا۔ ہر ڈومینین کی آئین ساز اسمبلی نے ہی مجلس قانون ساز کے فرائض بھی ادا کرنے تھے اور اسے" اس ڈومینین کے لیے قوانین بنانے کے پورے اختیارات حاصل ہوں گے، بشمول ایسے قوانین کے، جن کا دائرۂ عمل ماورائے ملک بھی ہو گا" خواہ ایسے قوانین" انگلستان کے قانون یا اس قانون یا برطانوی پارلیمنٹ کے کسی موجودہ یا آیندہ قانون کے منافی ہی کیوں نہ ہوں" شاہ انگلستان کے القاب سے" فرمانروائے ہند" اور" شہنشاہ ہند" کے الفاظ حذف کر دئے گئے، اور وضاحت کر دی گئی کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد حکومت برطانیہ کو نئی ڈومینیوں کے امور و معاملات پر کوئی اختیار حاصل نہیں ہو گا۔

قانون آزادی کے تحت ریاستوں پر بھی شاہ انگلستان کی حاکمیت اعلیٰ ختم ہو گئی اور ریاستوں کے حکمرانوں اور ملک معظم کے درمیان معاہدے اور سمجھوتے بھی منسوخ ہو گئے، قبائلی علاقوں میں بھی حکومت برطانیہ اپنے اختیار و اقتدار سے دست بردار ہو گئی۔ تاہم محاصل، عبور اور مواصلات، ڈاک اور تار یا ایسے ہی دوسرے معاملات میں ریاستوں اور قبائلی علاقوں کے ساتھ معاہدے اس وقت تک نافذالعمل رہنے تھے، جب تک ایک طرف سے ریاستوں کے حکمران یا قبائلی علاقوں میں صاحب اختیار اشخاص اور دوسری طرف سے متعلقہ ڈومینین ان سے دستکش نہیں ہوتے یا ان کے بجائے اور معاہدے نہیں کئے جاتے۔

گورنر جنرل کو ۳ جون سے قانون آزادی ہند پر مؤثر عملدرآمد کے لئے احکام جاری کرنے کے اختیارات دیے گئے، تاکہ وہ دونوں ڈومینیوں میں اثاثہ جات اور واجبات کو تقسیم کر سکے، گورنمنٹ

آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں اور اس کے تحت جاری شدہ احکام میں ترمیم اور اصلاح کر سکے اور اسی نوعیت کے دوسرے امور کے بارے میں احکام جاری کر سکے۔ یہ اختیارات ۳۱ مارچ ۱۹۴۸ء تک جاری رہنے تھے لیکن ہر ڈومینین اس سے قبل بھی ان اختیارات کو کالعدم قرار دینے کا فیصلہ کر سکتی تھی۔ ان اختیارات کے تحت گورنر جنرل کو "ملک معظم کی افواجِ ہند کو نئی ڈومینینوں میں تقسیم کرنے کا بندوبست کرنا تھا اور جب تک تقسیم کا کام پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ جاتا' اسے ان افواج کی کمان اور نظم وضبط کا بھی انتظام کرنا تھا" علاوہ ازیں اسے نئی ڈومینینوں سے برطانوی فوجوں کے انخلا کے لیے بھی ضروری سہولتیں بہم پہنچانی تھیں۔ اس اثنا میں برطانوی فوجوں پر حکومت برطانیہ کا ہی حکم برقرار رہنا تھا۔ سیکرٹری آف سٹیٹ کی سروسز کے جو ارکان کسی نئی ڈومینین کی حکومت کے تحت ملازمت جاری رکھیں گے ان کی تنخواہ' پنشن وغیرہ کے سلسلے میں انہیں موجودہ شرائط ملازمت کی ضمانت دی گئی تھی۔ اس مسودۂ قانون میں کچھ اور متفرق اور عبوری دفعات بھی شامل تھیں۔ برطانوی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں یہ مسودہ قانون بلا وقت منظور کر لیا گیا' اور ۱۸ جولائی کو اسے شاہی توثیق بھی حاصل ہو گئی۔ قانون آزادیٔ ہند جو برصغیر میں برطانوی اقتدار کے خاتمے کا نشان تھا۔ بقول وزیر اعظم ایٹلی دستبرداری نہیں تھا بلکہ ہند میں برطانوی مشن کی حسنِ تکمیل تھا۔ ایک سابق وائسرائے لارڈ ہیلی فیکس نے دارالامرا میں تقریر کرتے ہوئے کہا "دور رس نتائج کے اعتبار سے اثر ورسوخ اقتدار سے زیادہ بہتر' زیادہ پائدار اور دوامی ہوتا ہے"۔

یہ مسئلہ بھی تصفیہ طلب تھا کہ گورنر جنرل ایک ہونا چاہیئے یا دو۔ مونٹ بیٹن اور کانگرسی لیڈروں میں زود تر انتقال اقتدار کی جو سودا بازی ہوئی تھی' بعوض اس کے کہ کانگرس درجۂ ڈومینین قبول کر لے اس کا ایک غیر متوقع نتیجہ بھی نکلا جس نے تقسیم ہند کی تاریخ پر گہرا اثر چھوڑا۔ انتظامیہ کا معمولی تجربہ رکھنے والے ہر شخص پر یہ بات واضح تھی کہ تقسیم کے تمام امور و معاملات دو ماہ کے اندر ہرگز پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچائے جا سکتے' لہذا تصفیہ طلب مسائل کو حل کرنے کا کچھ نہ کچھ اہتمام ناگزیر ہے۔ مونٹ بیٹن نے اس کا یہ حل پیش کیا کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد آٹھ مہینے تک اسے ہی دونوں ڈومینینز' کا گورنر جنرل رہنا چاہیئے۔ اس نے کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کے لیڈروں کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ اس لیے اسے پورا یقین تھا کہ دونوں ہی اس کے مشترک گورنر جنرل رہنے کو قبول کر لیں گے۔ کانگرس اور مسلم لیگ کے سامنے

اس نے ۱۰ مئی کو اقرار نامے کے جو عنوانات رکھے تھے، ان میں یہ تجویز بھی شامل تھی۔ کانگرس کو یہ بات منظور کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی، کیونکہ اس وقت تک نہرو اور سردار پٹیل کو پورا یقین ہو چکا تھا کہ مونٹ بیٹن ان کے حسب منشا کام کرے گا۔ مزید براں وہ اس کے اثر و رسوخ کو بحیثیت وائسرائے اور فرمانروائے انگلستان کے ابن عم کے، ریاستی حکمرانوں پر استعمال کرنا چاہتے تھے تاکہ ریاستوں کا الحاق حاصل ہو جائے۔ نہرو نے مونٹ بیٹن کو لکھا: "ہمیں اس تجویز سے اتفاق ہے کہ عبوری دور میں دونوں ڈومنیوں کا گورنر جنرل مشترک ہونا چاہیے..... جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہمیں مسرت ہو گی، اگر آپ اس منصب پر فائز رہیں، اور اپنے مشورے اور تجربے سے ہمیں مستفیض کریں۔"[۲۳]

قائد اعظم اس وقت تک مونٹ بیٹن پر بے اعتمادی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ان کی یہ خواہش تھی کہ ۱۵ اگست کے بعد وہ بالاتر گورنر جنرل کی حیثیت سے اپنا کام جاری رکھے، اس کا تقرر برطانوی تاج کی طرف سے عمل میں لایا جائے اور اسے دونوں ڈومنیوں کے دعاوی کو طے کرنے کے لیے ثالث کے اختیارات حاصل ہوں۔ صرف اسی طرح اثاثہ جات اور واجبات کی تقسیم منصفانہ طور پر ہو سکے گی۔ لیکن کانگرس ہرگز یہ نہیں چاہتی تھی۔ اس نے مونٹ بیٹن کے ساتھ زود تر انتقالِ اقتدار کی جو سودا بازی کی تھی، اس کا مقصود ہی یہ تھا کہ پاکستان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا موقع نہ دیا جائے۔ حکومت برطانیہ نے جب ہند میں اپنے اقتدار کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا، تو پھر وہ بے تاب تھی کہ ۱۵ اگست کے بعد ہند کے معاملات میں اس کی کوئی ذمہ داری باقی نہ رہے۔ قائد اعظم آخری مرحلے تک اپنی تجویز پر زور دیتے رہے لیکن ان کی تجویز نہ کانگرس کے لیے قابل قبول تھی اور نہ حکومت برطانیہ کے لیے۔ اس طرح صرف مشترک گورنر جنرل کی تجویز ہی باقی رہ گئی اور اسے قانونِ آزادی ہند میں شامل کر دیا گیا۔

قائد اعظم افتادِ طبع اور زندگی بھر کی تربیت کے باعث آئین پسند مزاج رکھتے تھے۔ ان کے لیے یہ بات ناقابلِ فہم تھی کہ جس آئینی گورنر جنرل کو دو ڈومنیوں کی وزارتوں کی طرف سے متضاد مشورہ دیا جا رہا ہو، وہ اپنی ذمہ داری سے کس طرح بطریقِ احسن عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ فریقین کو وہ فقط صلح کی ترغیب دلا سکے گا، لیکن اسے تقسیم کے تصفیہ طلب مسائل کو طے کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہو گا۔ اگرچہ قائد اعظم خود مسلمانوں کے مسلم الثبوت رہنما تھے اور مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت میں انہیں وسیع اختیارات بھی حاصل تھے، لیکن وہ اپنے دائرہ اختیار سے کبھی تجاوز نہیں کرتے تھے، اور جب بھی آئینی طور پر ضروری ہوتا، وہ ورکنگ کمیٹی

یا مسلم لیگ کونسل کی پیشگی منظوری پر اصرار کرتے تھے۔ ماؤنٹ بیٹن اور دوسروں کو قاعدہ قانون کی یہ شدید پابندی بہت ناگوار گزرتی اور انہیں شک ہوتا کہ یہ ایک گہری چال ہے جو قائداعظم نے ذمہ داری سے بچنے اور ٹال مٹول سے مہلت حاصل کرنے پر پردہ پوشی کے لیے اختیار کر رکھی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ طرزِ عمل کلیتہً اخلاص پر مبنی تھا۔ قائداعظم کو پورا یقین تھا کہ آئین کے تحت جو اختیارات حاصل ہوں صرف انہی کی حدود کے اندر انسان احساسِ ذمہ داری سے کام کر سکتا ہے۔ دو ایسی آزاد حکومتوں کا مشترک گورنر جنرل جن کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوں، انہیں ایک آئینی لغویت معلوم ہوتی تھی۔

ایک مشترک گورنر جنرل کے خلاف آئینی استدلال اگرچہ بہت وزنی تھا، لیکن اس سے بھی زیادہ وزنی ایک سیاسی پہلو بھی تھا۔ کانگرس کی انتہائی موثر پروپیگنڈہ مشینری اس بات پر اپنا سارا زور لگا رہی تھی کہ پاکستان ہند سے چند علاقوں کی عارضی علیحدگی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، اور جلد ہی پاکستان کو باقی ہند میں دوبارہ ضم کر لیا جائے گا۔ ہندوستان اور پاکستان کا صدر مملکت اگر مشترک ہوگا تو وہ لامحالہ زیادہ وقت ہندوستان میں گزارے گا، اس سے یقیناً نہ صرف ہندوستان اور پاکستان میں، بلکہ دنیا بھر میں اس تاثر کو تقویت پہنچے گی جو کانگرس پھیلا رہی ہے۔ پاکستان کے لوگ یہ سوال کریں گے کہ یہ کس قسم کی آزادی ہے جب ہندوستان کا گورنر جنرل ہمارا بھی گورنر جنرل ہے، اور انگلستان کا بادشاہ ہمارا بھی بادشاہ ہے۔

اس تاثر کو اس وقت اور بھی زیادہ تقویت پہنچے گی، جب وہ یہ دیکھیں گے کہ پاکستان میں چار میں سے تین گورنر انگریز ہیں، اور بری فوج، بحریہ اور فضائیہ کے کمانڈر انچیف سب کے سب انگریز ہیں، ان کے علاوہ کثیر تعداد میں سول اور فوجی ملازمت میں انگریز افسر ہوں گے جن کی خدمات موجودہ کار منتظمین اور فوجی افسروں کی کمی کے باعث پاکستان حاصل کرنے پر مجبور ہوگا۔ پاکستان کو ابتدائی سالوں میں سخت آزمائش کا سامنا ہوگا۔ ایک آزاد قوم کے طور پر اپنے مستقبل میں پختہ یقین ہی اہلِ پاکستان کو اس آزمائش و ابتلا کے دور میں استقامت بخش سکے گا۔ اس لیے ہندوستان اور پاکستان کی علیحدگی کا عمل اتنا بیّن ہونا چاہیئے کہ ہر ایک کو دکھائی دے۔ اگر قائداعظم خود پاکستان کے گورنر جنرل بن جائیں تو وہ پاکستان کی آزادی و خود مختاری کا زندہ مظہر ہوں گے۔ ان کی بلند و بالا شخصیت کے مقابلے میں تمام دوسری باتیں دب کر رہ جائیں گی اور انگریز گورنر اور سول اور فوجی افسران کے سایے تلے ہوں گے۔ شاید پاکستان کئی کروڑ روپے کے اثاثہ جات سے محروم ہو جائے گا، جو ماؤنٹ بیٹن کی عنایت سے اسے مل جاتے

لیکن پاکستان کو جو جہد للبقاء درپیش تھی اس میں اخلاقی عوامل کو مادی نقصانات پر بدرجہا زیادہ فوقیت حاصل ہو گی۔ یہ تھے وہ قابلِ لحاظ امور جنہیں قائداعظم اور ان کے وزراء کو جانچنا تھا۔

جوں جوں جون گزرتا گیا، اور قائداعظم اس مسئلے پر سوچ بچار کرتے رہے مونٹ بیٹن کا پیمانۂ صبر روز بروز لبریز ہوتا گیا۔ اس نے تاریخ میں اپنے لیے یہ مقام حاصل کرنے کا دلی ارادہ کر رکھا تھا کہ وہ نہ صرف ایسا وائسرائے تھا، جس کی وساطت سے ہندوستان اور پاکستان کو آزادی حاصل ہوئی، بلکہ وہ ایک عظیم مدبر بھی تھا، جس نے دونوں نئی مملکتوں کو ان کی آزادی کے عہد طفولیت میں، لڑکھڑاتے قدم اٹھانے میں مدد اور رہنمائی کی۔ کانگرس کے لیڈروں سے یہ خدشہ ہو سکتا تھا کہ وہ ایک انگریز کو نئے ہندوستان کا پہلا گورنر جنرل مقرر کرنے میں لیت و لعل کریں گے لیکن انہوں نے تو گرمجوشی سے اپنی رضامندی دے دی وقت پیدا کر رہا ہے تو یہ سخت آدمی جناح جو چپ سادھے ہوئے ہے اور دن بدن فیصلے کو ملتوی کرتا جاتا ہے۔ کیا اس پر یہ بات عیاں نہیں کہ پاکستان کمزور تر فریق ہے، اور مونٹ بیٹن کے بغیر کانگرس اس سے کوئی انصاف روا نہیں رکھے گی، اور کانگرس ہی کے قبضہ و تصرف میں ہند کے تمام اثاثہ جات ہیں۔ بیشک پاکستان کا اس میں فائدہ تھا کہ امورِ تقسیم کی تکمیل تک ایک غیر جانبدار چیرمین رہے۔ مونٹ بیٹن ان سارے پہلوؤں کا ذکر ہر اس شخص سے کرتا تھا، جو اس کے خیال میں قائداعظم پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔ اس نے اِسمے اور میویل کو دو تین بار اس امید کے ساتھ قائداعظم کے پاس بھیجا کہ وہ قائل کئے جا سکیں گے۔ اِسمے نے لکھا ہے :۔

> "جون کے اواخر میں ہمیں معلوم ہوا..... کہ جناح نے اپنے آپ کو گورنر جنرل نامزد کرنے اور لیاقت علی خاں کو وزیر اعظم بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ مونٹ بیٹن کو یہ اطلاع دیتے ہوئے جناح نے یہ امید ظاہر کی کہ اس فیصلے سے اس بات پر کوئی اثر نہیں پڑے گا کہ مونٹ بیٹن ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل کا عہدہ قبول کر لے یا دونوں ملکوں کی مشترکہ دفاع کونسل کا صدر رہے۔ حالات کے یوں غیر متوقع طور پر پلٹا کھانے سے سخت صدمہ ہوا۔ ہم سب یہی محسوس کرتے تھے کہ خوش اسلوبی سے انتقال اقتدار، اثاثہ جات کی منصفانہ تقسیم اور دونوں نئی ڈومینیوں میں دوستانہ تعلقات کے لیے بہترین امید اسی میں ہے کہ وہ ایک ہی گورنر جنرل کے تحت سفر

شروعات کریں تھے

ماؤنٹ بیٹن کے دل پر چوٹ لگی۔ اس کا غرور مجروح ہوا اور اس کے تکبّر نے منہ کی کھائی۔ حکومت برطانیہ کے سامنے بھی اس کی کرکری ہوئی، کیونکہ انہیں یقین دلایا جا چکا تھا کہ دونوں ڈومینیوں کے لیے ماؤنٹ بیٹن مشترک گورنر جنرل قابل قبول ہے۔ مزید خرابی یہ ہوئی کہ اسے خود بھی اور اس کے مشیروں کو بھی قائد اعظم کے محرکات عمل سمجھنے میں انتہائی غلط فہمی ہوئی۔ ۲ جولائی کو اسمے کے گھر پر اجلاس بلایا گیا تاکہ کوئی ایسا فارمولا وضع کیا جائے کہ وائسرائے دونوں ڈومینیوں کا گورنر جنرل بھی رہ سکے، اور مسٹر جناح کی خود پسندی کی بھی تسکین ہو جائے۔ لیکن خود پسندی کو قائد اعظم کے فیصلے میں ذرا دخل نہیں تھا۔ انہوں نے پاکستان کے مفاد کا بے لاگ جائزہ لینے کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا۔

مجھے ماؤنٹ بیٹن کی شدتِ احساس کا علم ایک تکلیف دہ منظر دیکھ کر ہوا۔ قائد اعظم وائسرائے ہاؤس کے ایک کمرے میں لیاقت علی خان اور میرے ساتھ قانون آزادئ ہند پر غور و فکر کر رہے تھے کہ ماؤنٹ بیٹن دراتا ہوا داخل ہوا۔ اس نے قائد اعظم پر دلائل، اپیلوں اور دھمکیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ مشترک گورنر جنرل کی تجویز میں بلند ترین مقاصد کارفرما تھے، اور یہ بات پاکستان کے بہترین مفاد میں ہے۔ اگر اسے مشترک گورنر جنرل نہ بنایا گیا، تو پاکستان انتہائی گھاٹے میں رہے گا۔ وہ سخت مشکل سے پاکستان کے لیے اس کا حق حاصل کر رہا ہے، اور اگر یہ پتہ چل گیا کہ تقسیم ملک کے بعد وہ اس منصب پر نہیں رہے گا تو پاکستان کی مدد کرنے کے معاملے میں اس کا اثر بڑی تیزی سے گھٹ جائے گا۔ اس طرح پاکستان کو جو بے پایاں نقصان پہنچے گا، اس کی ذمہ داری جناح پر ہوگی۔ اس نے یہ دھمکی بھی دی کہ وہ سب کچھ منظر عام پر لے آئے گا اور فیصلہ دنیا کے لوگوں پر چھوڑ دے گا۔ اسے پختہ یقین تھا کہ تاریخ کا فیصلہ اس کے حق میں اور جناح کے خلاف ہوگا۔ وہ بار بار یہ کہتا تھا کہ اس کے لیے یہ بات انتہائی تعجب کا باعث ہے کہ اس کے مشترک گورنر جنرل بننے پر اعتراض پاکستان کی طرف سے کیا گیا ہے، کانگرس کی طرف سے نہیں کیا گیا۔

قائد اعظم نے اس بھرپور حملہ کا مقابلہ بڑے وقار اور تحمل سے کیا۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ یہ فیصلہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنی ذاتی پسند و ناپسند کا لحاظ نہیں کیا بلکہ اپنی قوم کے مفاد کا پوری واقعیت پسندی سے جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے ماؤنٹ بیٹن کو یقین دلایا کہ وہ اس کے اخلاص اور غیر جانبداری پر پورا اعتماد کرتے ہیں، اور انہوں نے ماؤنٹ بیٹن کو بالاتر گورنر جنرل بنانے کے متعلق اپنی تجویز کا اعادہ کیا۔ لیکن

قائداعظم کی طرف سے مونٹ بیٹن پر اعتماد کے اعتراف و اقرار سے بھی ان زخموں کی مرہم پٹی نہ ہوئی، جو اس کے غرور کو لگ چکے تھے۔

پاکستان کے گورنر جنرل کی تقرری کے بارے میں آین سٹیفنز نے لکھا ہے۔

"یوں معلوم ہوتا تھا کہ لارڈ مونٹ بیٹن تو اس فیصلے سے مشتعل ہو گیا تھا، جن لوگوں کو اسے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے، وہ اس بات سے یقیناً اتفاق کریں گے کہ اس کی کمزوری — غالباً واحد کمزوری — ایک عجیب قسم کی حساس خود پسندی تھی مرفی کی سوانح عمری سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس جیسے عظیم الشان خوبیوں کے مالک شخص میں ایسی کمزوری عجیب بات ہے۔ لیکن صریحاً تھی یہی بات۔ مسٹر جناح کے فیصلے کے اعلان سے قبل سہ پہر کو ایڈیٹروں کی جو کانفرنس بلائی گئی تھی، اس میں بھی یہ بات بالکل واضح تھی۔ ہم میں سے اکثر نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مونٹ بیٹن کے لیے یہ فیصلہ صرف سیاسی اعتبار سے ہی پریشانی کا باعث نہیں بنا بلکہ اس سے اسے ذاتی صدمہ بھی ہوا ہے۔ شاید وہ مشترک گورنر جنرل بننے پر دل لگا بیٹھا تھا اور اس میں ناکامی کی چوٹ اس کے کمزور ترین پہلو — تکبر — پر پڑی ہے"

اس مرحلے کے بعد مسائلِ تقسیم اور پاکستان کے بارے میں مونٹ بیٹن کے رویے میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔ مونٹ بیٹن اس سے پہلے قائداعظم کو تکلفاً ہی برداشت کرتا تھا۔ اب اس کا رویہ عملاً معاندانہ ہو گیا۔ قائداعظم اس کے بعد بھی مونٹ بیٹن کے بنیادی طور پر انصاف پسند ہونے کے قائل تھے بلکہ جب اور لوگ مونٹ بیٹن کے رویے میں تبدیلی کی طرف اشارہ کرتے، تو بھی وہ اسے تسلیم نہ کرتے۔ ایک ہی مشترک گورنر جنرل کے خلاف فیصلہ دوررس اثرات کا حامل ثابت ہوا۔ مادی اثاثہ جات کی صورت میں پاکستان کو جو نقصان پہنچنے والا تھا، اس کی پیش بینی تو آسان تھی۔ لیکن اس کے علاوہ کئی نامحسوس عناصر تھے مثلاً ریاستوں کا الحاق، مسئلہ کشمیر اور سرحد کمیشن کا ایوارڈ۔ جن میں پاکستان کے خلاف پلڑے کے جھکاؤ نے بدرجہا زیادہ اہم نتائج پیدا کیے۔

مونٹ بیٹن کا پہلا ردِ عمل "خیرباد کہہ دینے کا تھا" لیکن کم و بیش اس کے سارے عملے کا خیال یہ تھا کہ ہندوستان کا گورنر جنرل بنے رہنے کے حق میں دلائل بہت قوی ہیں" ان کا کہنا تھا کہ اگر کانگرس

کی پیشکش کو مسترد کر دیا گیا تو" کانگرس اور انگریزوں کے باہمی تعلقات میں جو نمایاں بہتری پیدا ہوئی ہے، اسے سخت دھچکا لگنے کا احتمال ہے..... اور دونوں ڈومینیوں میں مخاصمت بڑھنے کا اندیشہ ہے..... مزید برآں برطانوی افسر۔ کمانڈر انچیف سے لے کر نیچے تک ہندوستان میں اپنی خدمات جاری رکھنے سے اغلباً انکار کر دیں گے..... اور ریاستی حکمران یہ محسوس کریں گے کہ وہ حصول انصاف کے واحد امکان سے محروم ہو رہے ہیں۔"[۱] بالآخر مونٹ بیٹن انڈین ڈومینین کا گورنر جنرل بن جانے پر آمادہ ہو گیا بشرطیکہ ملک معظم کی حکومت اور اپوزیشن اس امر کی خواہش ظاہر کریں۔ اِسمے کو صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے لندن بھیجا گیا اور وہ چند دنوں کے اندر ہی حصولِ مقصد میں کامیابی کے ساتھ دہلی واپس آ گیا، اور آزادی کے بعد بھی مونٹ بیٹن انڈین یونین کے پہلے گورنر جنرل کے طور پر برقرار رہا۔

تقسیم کونسل کو جو مسئلہ سب سے پہلے سلجھانا پڑا، وہ حکومتِ ہند کے سابق ملازمین کی دونوں نئی مملکتوں کے درمیان تقسیم کرنے کا تھا۔ سردار پٹیل نے بڑے زور سے کہا کہ کوئی بھی ہندو اہلکار خواہ مرکزی حکومت کا ہو یا مشرقی بنگال اور مغربی پنجاب کی صوبائی حکومتوں کا؛ پاکستان میں ملازمت کو قبول نہیں کرے گا۔ اس لیے مرکزی حکومت اور تقسیم ہونے والے صوبوں کے ہر ایک سرکاری ملازم کو ہندوستان یا پاکستان میں سے کسی ایک کی ملازمت کے بارے میں حق انتخاب دیا جائے۔ پٹیل کا مقصد مشرقی بنگال اور مغربی پنجاب کی حکومتوں کو تجربہ کار افسروں کی خدمات سے محروم کرنا تھا۔ غیر مسلم چونکہ تعلیمی لحاظ سے بہت آگے تھے، اس لیے زیادہ تر سرکاری ملازمتوں پر وہی فائز تھے، ان کے چلے جانے سے نظم و نسق میں ابتری پیدا ہو سکتی تھی۔ جن ہندو اہلکاروں کے آبائی گھر مسلم اکثریت کے علاقوں میں تھے، اس حقِ انتخاب کے بغیر شاید وہ اپنے مناصب پر اطمینان سے قائم رہتے، اور ان کی موجودگی ان دونوں صوبوں میں اقلیتوں کے لیے بھی وجہ اعتماد ثابت ہوتی۔ لیکن پٹیل اپنی بات پر اڑ گیا۔ بڑی مشکل کے ساتھ اسے یہ بات ماننے پر آمادہ کیا گیا کہ ہر سرکاری ملازم کو قطعی فیصلہ کرنے کا اختیار دینے کے ساتھ اس امر کا بھی حق دیا جائے کہ اگر وہ چاہے تو مشروط فیصلہ بھی کر سکتا ہے تاکہ اسے نظر ثانی کا موقع مل سکے اور چھ ماہ کے اندر وہ اپنے حتمی فیصلہ کا اظہار کر سکے۔ تقسیم کے جلو میں فسادات کا جو سلسلہ شروع ہوا، اس سے یہ مشروط حقِ انتخاب عملاً معدوم ہو گیا، اور بہت کم لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ تمام سرکاری ملازمین کو یقین دلایا گیا کہ ان کی ملازمت کی موجودہ شرائط کی دونوں نئی حکومتیں ضامن ہوں گی۔ جوابات موصول ہونے

پر دونوں حکومتوں کے لیے علیحدہ علیحدہ عملہ جات کی فہرستیں مرتب کی گئیں، لیکن تبادلوں کا بندوبست تو بتدریج ہی ہو سکتا تھا۔ حکومتِ پاکستان کو اپنے فرائض سرانجام دینے کے قابل بنانے کے لیے غیر منقسم حکومت ہند کے دفتری ساز و سامان، فرنیچر اور سٹیشنری میں سے ایک متفق علیہ حصّہ دینے کا اہتمام کیا گیا۔ حکومتِ پاکستان کو ایسا ریکارڈ اور دستاویزیں دینے کا فیصلہ کیا گیا، جو صرف اس سے متعلق تھیں، نیز یہ کہ مشترک مفاد کے ریکارڈ اور دستاویزوں کی نقول دی جائیں گی۔

اس کام کی وسعت کا اندازہ ریلوے کے اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے۔ جو سب سے بڑا آجر ادارہ تھی۔ اس زمانہ میں ہند کی ریلوں میں ملازمین کی تعداد ۹،۲۵،۰۰۰ تھی۔ نارتھ ویسٹرن ریلوے اور بنگال آسام ریلوے کے پاکستانی حصوں میں کام کرنے والوں میں سے تقریباً ۲،۰۰۰ ملازموں نے ہندوستان کی ملازمت اختیار کرنے کا عندیہ ظاہر کیا اور باقی ریلوں کے ملازمین سے تقریباً ۲۳،۰۰۰ نے پاکستان کی ملازمت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ لہٰذا ۷۳،۰۰۰ ریلوے ملازمین کا تبادلہ دونوں ڈومینیوں کے درمیان اس طرح کرنا تھا کہ ریلوے کی کارکردگی اور معمولات میں کوئی خلل نہ آئے۔ اگرچہ تبادلوں کے کام کو حتی الوسع کم سے کم وقت میں مکمل کرنے کی ضرورت پر بڑا زور دیا گیا، لیکن اس کے باوجود ۱۵ اگست تک سب تبادلوں کا انتظام نہ ہو سکا۔ ایک دقت یہ بھی تھی کہ جو اہلکار پاکستان کو یا پاکستان سے جانا چاہتے تھے، وہ ہر درجۂ ملازمت میں مساوی نہ تھے۔ چنانچہ عملے کے بعض لوگوں کو ضروری خدمات کی بجاآوری کے لیے روکنا ناگزیر ہو گیا، اور سبکدوشیوں کا انتظام ایک خاص ترتیب کے ساتھ کرنا پڑا۔ جب یہ تبادلے ہو رہے تھے، پنجاب، دہلی اور صوبجات متحدہ کے شمالی اضلاع میں فسادات کا وسیع سلسلہ شروع ہو گیا۔ بعض سرکاری ملازم اپنی جگہ چھوڑ کر بھاگ گئے، دوسروں کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے میں دشواری پیش آئی۔ ان مشکلات اور آزمائشوں کے باوجود کام پایۂ تکمیل تک پہنچ ہی گیا۔

سیکرٹری آف سٹیٹ سروسز کے وہ ارکان جن کی ملازمتیں انتقالِ اقتدار کے ساتھ ختم ہو جاتی تھیں، ان کے معاوضے کا سوال کئی ماہ سے زیر غور چلا آ رہا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں کی آئندہ حکومتیں تجربہ کار افسروں کی ملازمتیں برقرار رکھنے کی خواہاں تھیں، اور جہاں تک تنخواہ اور پنشنوں کا تعلق تھا، ان کی موجودہ شرائط کی ضمانت دینے کے لیے تیار تھیں، جو افسر ملازمت جاری رکھنا نہیں چاہتے تھے، متناسب پنشن پر ریٹائر ہو سکتے تھے۔ چونکہ انتقالِ اقتدار سے انگریز افسروں کی حالت

میں بہ نسبت دیسی افسروں کے بہت زیادہ فرق آتا تھا اس لیے حکومت برطانیہ نے ان کو مزید معاوضہ بھی ادا کیا۔ دونوں نئی حکومتوں نے کئی انگریز افسروں کو ایک مقررہ مدت کے لیے ملازمتوں کی پیشکش کی۔ پاکستان میں اعلیٰ منتظمین اور فنی افسروں کی کمی تھی، اس لیے اس نے کافی تعداد میں انگریز افسروں کی خدمات حاصل کیں۔

مالی اثاثہ جات اور واجبات کی تقسیم میں ہندوستان اور پاکستان کے نمائندوں کے درمیان شدید اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ سب سے اہم اختلاف نقد بقایا جات، سٹرلنگ بقایا جات اور سرکاری قرضے سے متعلق تھا۔ تقسیم کے وقت حکومت ہند کے نقد بقایا جات چار ارب روپے تھے۔ پاکستان کو ابتدائی مرحلے میں بھاری اخراجات برداشت کرنے تھے، اس نے نقد بقایا جات کے ایک چوتھائی حصے یعنی ایک ارب روپے کا مطالبہ کیا۔ آبادی، وسائل اور ضروریات کے لحاظ سے یہ مطالبہ کسی صورت نامناسب نہیں تھا لیکن ہندوستان کے نمائندے پاکستان کو نقد بقایا جات کا بیسواں حصہ یعنی صرف ۲۰ کروڑ روپے دینے پر تیار تھے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ اتنے خطیر نقد بقایا جات افراطِ زر کی روک تھام کے نتیجے میں جمع ہو گئے ہیں اور کام چلانے کے نقد بقایا جات صرف ۵۰ کروڑ روپے ہیں۔ لیکن ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا کہ افراطِ زر کی روک تھام کا فائدہ صرف انڈین ڈومینین کے حصے میں ہی کیوں آنا چاہیے؟ تقسیم کونسل میں بھی اس سوال پر سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ وہاں حسبِ معمول سردار پٹیل اس نامعقول موقف پر ڈٹ گیا اس ہٹ دھرمی کا صریح مقصد پاکستان کو اس کے دشوار عبوری دور میں مالی ذرائع سے محروم کرنا تھا پیشتر اس کے کہ وہ اپنے نظامِ زر اور صرافہ کا انتظام کر سکے۔ اس سوال کا تصفیہ ثالثی ٹریبونل پر چھوڑ دیا گیا۔ سٹرلنگ بقایا جات کی تقسیم پر بھی تصفیہ نہ ہو سکا۔

واجبات کی تقسیم میں اصل مسئلہ اس قرضے کی بانٹ کا تھا جو غیر منقسم حکومت ہند کے اثاثہ جات سے مستزاد تھا۔ اگرچہ ہندوستان کے نمائندے نقد بقاجات کا پانچ فی صد سے زیادہ حصہ پاکستان کو دینے پر آمادہ نہ تھے لیکن واجبات کے معاملہ میں آبادی اور اسی قسم کے دوسرے عوامل کی بنا پر مستزاد قرضہ کا بیس فیصد حصہ پاکستان کے ذمہ ڈالنا چاہتے تھے۔ پاکستان کے نمائندوں کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ مستزاد قرضے میں ہندوستان اور پاکستان کی ذمہ داری ان محاصل کے تناسب سے ہونی چاہیے جو ان ڈومینینوں میں شامل ہونے والے علاقے اب تک مرکزی حکومت کو ادا کرتے رہے ہیں۔ ہند سے برما کی علیحدگی کے وقت امیری ٹریبونل نے اسی اساس کو تسلیم کیا تھا۔ اس مسئلے پر بھی کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔

اس سے بھی زیادہ شدید اختلافِ رائے پاکستان کی اس تجویز پر ہوا کہ دونوں ڈومینیوں کو غیر منقسم ہند کے سرکاری قرضے کی ذمہ داری مشترکہ طور پر سنبھالنی چاہیئے اور اس کا انتظام ہندوستان اور پاکستان کے مساوی تعداد میں نمایندوں پر مشتمل ایک ایسے کمیشن کو کرنا چاہیئے جسے آئینی حیثیت حاصل ہو۔ ہر حکومت وقتاً فوقتاً اس کمیشن کو اپنے حصے کی واجب رقم ادا کرتی رہے گی۔ اس سیدھی سادی تجویز کی ہندوستان کے نمایندوں نے سخت مخالفت کی۔ چونکہ مسلمانوں کے مقابلے میں ہندو بدرجہا زیادہ امیر تھے۔ تمسکات کا غالب حصہ ہندو اداروں اور انفرادی سرمایہ کاروں کی تحویل میں تھا، کانگرسی لیڈروں کو یقین تھا کہ پاکستان معاشی اور مالی اعتبار سے زندہ رہنے کے قابل نہیں۔ ان کے مالی ماہرین نے انہیں یہ مشورہ دیا کہ اگر پاکستان کی تجویز مان لی گئی تو ہندوستان میں تمسکات کے بازارِ حصص میں تباہ کن بحران پیدا ہو جائیگا اور ہندو بنکوں اور دوسرے سرمایہ کاروں کو بے پایاں نقصانات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس لیے ہندوستان کے نمایندوں نے یہ جوابی تجویز پیش کی کہ ہندوستان کو ہی سارے قرضے کی ذمہ داری سنبھال لینی چاہیئے، اور پاکستان کو قرضے میں اپنا حصہ انڈین یونین کو ادا کرنا چاہیئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان تمسکات کے مالکوں کو واجبات ادا کرنے کے بجائے اپنے آپ کو انڈین یونین کا مقروض بنا لے گا۔ میں نے اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، کیونکہ یہ تجویز پاکستان کی ساکھ پر ناواجب عدم اعتماد کے مترادف تھی۔ میں نے وضاحت سے بتایا کہ اقتصادی طور پر پاکستان کے زندہ رہنے کی صلاحیت پر شکوک و شبہات یکسر بعید از حقیقت ہیں اور ہندوستان میں تمسکات کے مالکوں کو پاکستان کی طرف سے نادہندگی کا کوئی خدشہ نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن جس قدر میں وضاحت کرتا جاتا تھا، اسی قدر ان کے اس شبہ میں اضافہ ہوتا جاتا تھا کہ پاکستان کی تجویز ہندوستان کے مالیاتی ڈھانچے کو درہم برہم کرنے کی ایک گہری چال ہے۔

اس تعطل کو ختم کرنے کے لیے بالآخر میں نے یہ مشورہ دیا کہ ہندوستان کی تجویز پر صرف اسی صورت میں غور کیا جا سکتا ہے کہ ہماری تجویز میں پاکستان کا جو مفاد مدِنظر ہے، وہ حاصل ہو سکے۔ مثلاً کچھ سالوں کی مہلت ہونی چاہیئے، جس کے دوران میں کوئی بازادائیگی نہیں ہونی چاہیئے، اور بازادائیگی کو پچاس سال یا اس سے بھی زیادہ مدت پر پھیلا دینا چاہیئے اور شرحِ سود ہند کے قومی قرضے پر سود کی اوسط شرح کے مطابق ہونی چاہیئے۔ میں نے یہ کہا کہ اگر ایسی کوئی تجویز ہندوستان کے بااختیار حلقوں کی طرف سے پیش کی جائے تو ممکن ہے کہ میں اسے قائداعظم کی خدمت میں پیش کر سکوں۔ لیکن اس مسئلے کے آخری تصفیے سے پہلے ہندوستان

اور پاکستان میں نقد بقایا جات کی منصفانہ تقسیم پر ہوگا۔ اس پر مجھے سردار پٹیل کے دستخطوں کے ساتھ ایک تجویز دی گئی کہ پاکستان اپنے حصے کی بازادائیگی پچاس سالانہ قسطوں میں کرے گا اور پہلی قسط پانچ سال بعد ۱۵ اگست ۱۹۵۲ء کو واجب الادا ہوگی۔ اس دوران میں قائد اعظم کراچی میں تشریف لے گئے تھے۔ میں ۹ اگست کو کراچی گیا، اور قائد اعظم کی مشروط منظوری لے کر واپس آ گیا۔ شرط یہ تھی کہ نقد بقایا جات کے مسئلے کو اطمینان بخش طور پر حل کیا جائے گا۔ وائسرائے نے اسے غنیمت سمجھا اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے ایک آرڈر جاری کر دیا، جس کی رو سے تمام قرضہ جات کی اولیں ذمہ داری ہندوستان کی حکومت پر عائد ہوتی تھی۔ لیکن پاکستان کے واجبات کا تعین ہونا ابھی باقی تھا اور اس کا اہتمام ہونے تک پاکستان کی طرف سے کوئی باقاعدہ ذمہ داری قبول نہیں کی گئی۔

ان اور دوسرے متنازعہ فیہ مسائل کو ثالثی ٹریبونل کے سامنے پیش کرنے سے پہلے میں نے ان کو باہمی گفت وشنید کے ذریعے حل کرنے کی ایک آخری کوشش کی۔ نومبر ۱۹۴۷ء میں میں نے ایچ ایم پٹیل سے کہا کہ اگر سردار پٹیل منظور کر لے، تو میں اپنے وزیر خزانہ غلام محمد سے کہوں گا کہ وہ میرے ساتھ دہلی جاکر تمام تصفیہ طلب مسائل کا فیصلہ کر لیں۔ اگر یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی، تو پھر ثالثی ٹریبونل سے رجوع کرنا پڑے گا۔ سردار پٹیل رضامند ہو گیا، اور ہم دہلی چلے گئے۔ نچلی سطح پر ملاقاتوں میں تمام دوسرے مسائل کا تصفیہ ہو گیا، اور صرف نقد بقایا جات، سٹرلنگ بقایا جات اور قومی قرضے کے مسائل باقی رہ گئے جن کا ابھی تصفیہ کرنا تھا۔

سردار پٹیل کے مکان پر جو مجلس ہوئی۔ اس میں ہندوستان کا وزیر خزانہ شان مکھم چیٹی بھی شامل تھا۔ غلام محمد کے ساتھ سر آرچی بالڈ رولینڈز بھی گیا تھا، وہ ۱۹۴۶ء میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں وزیر خزانہ رہ چکا تھا، اور اب پاکستان کے گورنر جنرل کا مشیر مالیات تھا۔ کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا، اور یوں معلوم ہو رہا تھا کہ یہ ملاقات بھی ناکام ثابت ہوگی۔ اس مرحلے پر سردار پٹیل نے کہا: ”ایچ ایم پٹیل اور محمد علی نے باہم بیشتر مسائل کو حل کر لیا ہے۔ یہ دونوں ساتھ والے کمرے میں چلے جائیں اور اس وقت تک باہر نہ نکلیں، جب تک وہ اس مسئلے کو بھی طے نہ کر لیں۔“ اس ہدایت کے ساتھ ہم ساتھ والے کمرے میں چلے گئے اور پون گھنٹے میں ہمارے درمیان سمجھوتہ ہو گیا کہ نقد بقایا جات اور سٹرلنگ بقایا جات کے متنازعہ فیہ جزو اور مستزاد قومی قرضے میں پاکستان کا حصہ ۱/۶، ۱۷ فی صد ہوگا۔ ہم نے واپس آ کر اس سمجھوتے کا اعلان کر دیا۔ سردار پٹیل، غلام محمد اور دوسروں نے رضامندی ظاہر کر دی۔ ایک باقاعدہ معاہدہ مرتب

کیا گیا، جس پر دسمبر ۱۹۴۷ء کے اوائل میں ہندوستان اور پاکستان کے نمائندوں نے دستخط کر دیئے۔ ثالثی ٹربیونل سے جن معاملات میں رجوع کرنا تھا، وہ سب واپس لے لیے گئے۔

اس داستان کا ایک مابعد بھی ہے۔ پاکستان کے حصے میں نقد بقایاجات میں سے ۷۵ کروڑ روپے آئے۔ ۲۰ کروڑ روپے پہلے ہی ادا کیے جا چکے تھے اور باقی ۵۵ کروڑ روپے فوری طور پر ادا کیے جانے تھے۔ ہندوستان کی حکومت نے پاکستان کو یہ رقم ادا کرنے کے لیے ریزرو بنک آف انڈیا کو حکم دینے کا اقرار کیا۔ جب ہم کراچی واپس آئے تو ہم اپنے حساب میں اس رقم کے منتقل کیے جانے کے منتظر رہے مگر بے سود۔ ہمیں پتہ چلا کہ ہندوستان کی حکومت نے اس بہانے ادائیگی روک رکھی ہے کہ پاکستان اس رقم کو اُس جنگ کے لیے استعمال کرے گا، جو کشمیر میں جاری تھی۔ یہ سراسر مہمل اور شرمناک بہانہ تھا۔ کشمیر میں جنگ اکتوبر ۱۹۴۷ء کے آخری ہفتے سے جاری تھی۔ یہ جنگ اس وقت بھی ہو رہی تھی، جب دسمبر ۱۹۴۷ء کے اوائل میں سردار پٹیل نے نقد بقایاجات کے سمجھوتے پر دستخط کیے تھے۔ اس دوران میں کوئی بھی نئی بات نہیں ہوئی تھی، جسے ایک ایسے معاہدہ سے منحرف ہو جانے کا عذر بنایا جا سکتا، جو ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کے درمیان آزادانہ طور پر ہوا تھا۔

بیرونی ممالک کی طرف سے ہندوستان کی نئی حکومت کے خلاف بدعہدی کے الزامات سے گاندھی کو سخت پریشانی لاحق ہوئی۔ وہ اس مسئلے کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ ہندوستان کا موقف اخلاقی اعتبار سے بالکل بودا ہے۔ وہ اس وقت اپنی زندگی کے آخری اور بلند ترین [illegible] سے گزر رہا تھا اور اس نے اپنی ساری مساعی فرقہ وارانہ امن اور اتفاق بحال کرنے کے لیے وقف کر رکھی تھیں۔ ۱۳ جنوری ۱۹۴۸ء کو اس نے بلوہ زدہ دہلی میں قیام صلح و امن کی خاطر غیر معین عرصے کے لیے برت شروع کر دیا۔ جو لوگ اسے برت ترک کرنے کی ترغیب دیتے، وہ انہیں یہ جواب دیتا کہ "مقصد اس کی جان بچانا نہیں ــــ بلکہ ہندوستان اور اس کی عزت کو بچانا ہونا چاہیے۔ اس کے لیے یہ امر باعث اطمینان و افتخار ہو گا کہ ہندوستان کا مرتبہ و مقام گھٹنے نہ پائے جیسا کہ حالیہ واقعات سے ہوا ہے۔" جب سردار پٹیل نے یہ پیغام بھیجا کہ جو کچھ گاندھی چاہے، وہ اسے کرنے کو تیار ہے، تو گاندھی نے جواب دیا کہ "انڈین یونین کی حکومت نے پاکستان کے جو نقد اثاثہ جات روک رکھے ہیں، اس مسئلے کو اولین اہمیت دی جائے۔" سند اس طرح ۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو گاندھی کے دباؤ کے تحت ہندوستان کی حکومت نے پاکستان سے مالی معاہدے پر فوری عملدرآمد کا فیصلہ کیا اور روکے ہوئے بقایاجات واگزار کر دیئے۔ گاندھی کے سیرت نگار نے ذکر کیا ہے، "کابینہ کے پہلے فیصلہ کی تنسیخ پر پٹیل کو بڑا رنج ہوا تھا

اور جو لوگ پہلے ہی گاندھی سے اس وجہ سے ناراض تھے کہ ان کے خیال میں گاندھی مسلمانوں کی بے جا پاسداری کرتا تھا، وہ اور زیادہ برافروختہ ہو گئے۔[۵۱] اس رائے کی تائید سردار پٹیل کے سیرت نگار نے بھی کی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ گاندھی کے برت سے بڑی بے اطمینانی پیدا ہوئی جو بالآخر المناک نتائج کا باعث بنی ..... ہندو مہاسبھا اور اس کی ضمنی شاخ راشٹریہ سوایم سیوک سنگھ اس بات پر سخت برہم تھے کہ گاندھی جی نے برت کے سونٹے سے فسادی مسلم عناصر کو غیر مشروط پناہ دلوائی ہے اور پاکستان کو سرمایہ بہم پہنچایا ہے جسے وہ ہندوستان کی فوج کو ہلاک کرنے کے لیے استعمال کرے گا۔"[۵۲] المناک نتائج سے مراد ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو گوڈسے کے ہاتھوں گاندھی کے قتل سے ہے۔ جو جنگجو ہندو تنظیم راشٹریہ سوایم سیوک سنگھ کا رکن تھا۔

دوسرے کثیر التعداد مسائل پر جو مذاکرات اور فیصلے ہوئے ان کی مختصراً روداد کے لیے بھی بہت زیادہ صفحات درکار ہوں گے، مثلاً اثاثہ جات کی مالیت کا تعین، ادھار پٹہ کے تحت ملنے والی چاندی کے ذخائر کی واپسی کی ذمہ داری، دوہرے ٹیکس لگانے سے احتراز، ٹھیکوں کی ذمہ داری، کرنسی نوٹوں اور سکوں کی تبدیلی، ریزرو بنک آف انڈیا کے ساتھ عارضی قرضوں اور اسی طرح کے دوسرے معاملات کا انتظام، زرِ مبادلہ کی آمدنی کی علیحدگی، تجارت اور اقتصادی کنٹرول کے بارے میں پالیسی، محصولات، خارجہ تعلقات، معاہدے اور قومیت اور وطنیت کا تعین۔

ان میں بہت سے مسائل کا فیصلہ کرنے میں معاملہ فہمی سے کام لیا گیا۔ بعض کے بارے میں مشکلات پیدا ہوئیں، جنہیں حالات کے مطابق، جس طرح بہتر معلوم ہوا، دور کیا گیا۔ مثال کے طور پر جب تجارت اور اقتصادی کنٹرول سے متعلقہ مسائل کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ دونوں ڈومینیوں کی طویل المیعاد پالیسیوں پر صرف اس وقت ہی بات چیت ہو سکتی ہے جب نئی حکومتوں کو ان مسائل پر غور و فکر کرنے کی مہلت مل چکی ہو۔ سردست یہ فیصلہ کیا گیا کہ ۳۱ مارچ ۱۹۴۸ء تک حالات کو حتی الوسع جوں کا توں رکھا جائے اور کنٹرول میں رد و بدل دونوں حکومتوں میں صلاح مشورہ کے بغیر نہ کیا جائے۔ یہ بھی فیصلہ لیا گیا کہ نہ تو افراد کی نقل و حرکت پر کوئی پابندی عائد کی جائے گی، اور نہ ہی انہیں پاسپورٹ یا ویزا لینے کی ضرورت ہو گی۔

یہ فیصلہ کیا گیا کہ عبوری مدت میں دونوں ڈومینیوں کے درمیان محصولات کی باڑھ نہ لگائی جائے سامان کی آزادانہ نقل و حمل اور زرِ قوم کی ترسیل پر کوئی پابندی نہ ہو اور اس کا اطلاق سرمایہ اور مشینری پر بھی

کیا جائے، درآمد و برآمد کی موجودہ پالیسیاں برقرار رکھی جائیں۔ موجودہ کسٹمز اور ایکسائز کے محصولات میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔ یہ سب باتیں بڑی معقول تھیں، مشرق اور مغرب میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک ہزار میل سے بھی زیادہ لمبی سرحدوں پر محاصل کی باڑھ لگانا آسان بات نہ تھی۔ پاکستان نے یہ تجویز پیش کی کہ عبوری دور میں محاصل سے آمدنی ایک ہی جگہ جمع کی جائے اور منصفانہ بنیاد پر اسے تقسیم کر لیا جائے۔ ہندوستان نے یہ تجویز ماننے سے انکار کر دیا اور اپنے جمع کردہ محاصل کی آمدنی خود اپنے پاس رکھنے پر اصرار کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پٹ سن کی فصل کے نکاس کا واحد ذریعہ کلکتہ تھا جبکہ اس کی بیشتر پیداوار مشرقی بنگال میں تھی۔ مشرقی بنگال میں ایک ہی بندرگاہ چٹاگانگ تھی۔ اس وقت یہ ایک چھوٹی سی بندرگاہ تھی اور اس میں صرف پانچ لاکھ ٹن سالانہ سامان اتارنے چڑھانے کی گنجائش تھی۔ اس کی توسیع و ترقی کے لیے کئی سال درکار تھے۔ اس لیے پاکستان کی پٹ سن لازماً کلکتہ سے ہی گزرنی تھی اور ہندوستان اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھانے پر تلا ہوا تھا۔ ہندوستان کے اس رویے کے پیش نظر پاکستان کو ہندوستان سے آزادانہ تجارت کے متعلق اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرنی پڑی اور ہندوستان کو جانے والی پٹ سن پر برآمدی محصول عائد کرنا پڑا۔

کرنسی دونوں ڈومینینوں میں ۳۱ مارچ ۱۹۴۸ء تک مشترک رہنی تھی۔ اس سے اگلے چھ ماہ میں یعنی ۳۰ ستمبر ۱۹۴۸ء تک بھارت کے نوٹوں اور سکوں کی جگہ بتدریج پاکستانی کرنسی نے لینی تھی۔ ریزرو بنک آف انڈیا کو ہی یکم اکتوبر ۱۹۴۸ء تک کرنسی کے مشترک انتظام کا واحد ادارہ رہنا تھا اس کے بعد پاکستان نے اپنی کرنسی کا انتظام خود سنبھالنا تھا۔ بعد میں اس تاریخ کو یکم جولائی ۱۹۴۸ء میں تبدیل کر دیا گیا۔

تمام بین الاقوامی اداروں کی رکنیت اور اس رکنیت کے حقوق و فرائض سب کے سب بھارت کے حصے میں آئے، پاکستان کو رکنیت کے لیے از سر نو درخواست کرنی پڑی۔ جن بین الاقوامی معاہدوں میں غیر منقسم ہند ایک فریق تھا، دونوں ڈومینینیں ہی ان کے تحت حقوق و فرائض کی جانشین تھیں لیکن جو حقوق و فرائض علاقائی معاملات سے تعلق رکھتے تھے، ان کی ذمہ داری متعلقہ علاقہ کی حکومت پر تھی۔ اس طرح پاکستان کو شمال مغربی سرحد پر قبائل سے معاہدوں کے لیے گفت و شنید کرنی تھی۔

ہند میں اثاثہ جات کے علاوہ لندن میں بھی انڈیا آفس کے اثاثہ جات تھے، جن کا سارا بار ہند کے خزانہ نے اٹھایا تھا۔ ان اثاثہ جات کی تحقیقات ایک کمیٹی نے کی، جس میں برطانیہ، ہندوستان

اور پاکستان کے نمایندے شامل تھے۔ ان اثاثہ جات میں سب سے زیادہ قیمتی انڈیا آفس لائبریری تھی' اور ہے' یہ لائبریری ۰۰۰,۳۰۰,۲ مطبوعہ جلدوں اور ۰۰۰,۲۰ مخطوطات پر مشتمل ہے۔ برصغیر کے بارے میں کتب کا یہ دنیا بھر میں غالباً سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔ اس کے بارے میں طویل سہ رکنی مذاکرات اب تک جاری ہیں۔

افواج کی تقسیم غیر معمولی طور پر نازک اور پیچیدہ کام تھا۔ تقسیم ملک کے فیصلے اور دو آزاد و خود مختار مملکتوں کے قیام نے اسے ناگزیر بنا دیا تھا۔ وفادار اور قابلِ اعتماد افواج کے بغیر کوئی بھی مملکت اپنی آزادی کی حفاظت نہیں کر سکتی۔ لیکن ہند کی فوج کے ساتھ انگریز افسروں کی وابستگی از حد زیادہ تھی' ایک صدی سے زائد عرصے میں انہوں نے اسے ایک عظیم الشان جنگی مشین کا پیکر عطا کیا تھا چنانچہ برصغیر کی تقسیم کا سیاسی فیصلہ ہونے کے بعد بھی انہیں افواج کی تقسیم سے راضی برضا ہونا بہت مشکل معلوم ہوتا تھا۔ اس کے تصور سے ہی وہ دلگیر ہو جاتے' اور ان میں سے کئی ایک نے اس معاملے میں عقل و خرد سے کام لینا چھوڑ دیا تھا۔ انگریزوں کے جذبات کا اندازہ کسی قدر لارڈ اسمے کے خیالات سے ہو جاتا ہے' جو بالعموم ٹھنڈے دل و دماغ کا مالک اور معقول شخص تھا۔ وہ افواج کی تقسیم کو "سب سے بڑا جرم اور سب سے بڑا درد سر" کہتا تھا۔ اپنی خود نوشت یادداشتوں میں اس نے لکھا کہ اس نے کس قدر سر توڑ کوشش کی کہ

"مسٹر جناح اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے کے لیے آمادہ ہو جائیں ۰۰۰۰ میں نے انہیں یاد دلایا کہ فوج محض بندوقوں اور سنگینوں اور توپوں اور ٹینکوں کے ساتھ آدمیوں کا مجموعہ نہیں ہوتی' بلکہ یہ ایک ایسی زندہ ہستی ہوتی ہے' جس کا ایک دماغ' ایک دل اور ایک سلسلۂ اعضا ہوتا ہے ۰۰۰۰۰ لیکن جناح اپنی بات پر ڈٹے رہے اور انہوں نے کہہ دیا کہ اگر ان کے پاس مناسب تعداد اور قوت کی ایسی فوج نہ ہوئی' جس کا غالب حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہو' تو وہ ۱۵ اگست کو اقتدار سنبھالنے سے انکار کر دیں گے۔"[۱۵]

حقیقت یہ ہے کہ قائداعظم فرقہ وارانہ اساس پر افواج کی تقسیم پر اصرار نہیں کرتے تھے۔ وہ شہریت کو تقسیم کی اساس کے طور پر قبول کرنے کے لیے تیار تھے۔ اس موقع پر' اور ہر مناسب موقع پر' انہوں نے اس امر کا بادثوق اعلان کیا کہ پاکستان میں رہنے والے سب لوگوں کو بلالحاظ عقیدہ مساوی

حقوق حاصل ہوں گے۔ شہریت کی اساس پر پاکستان کی افواج میں غالب حیثیت لازماً مسلمانوں کو حاصل ہوتی' لیکن وہ صرف مسلمانوں پر ہی مشتمل نہ ہوتیں۔ بہرحال تقسیم کونسل نے سرکاری ملازمین کو یہ اجازت دینے کا جو فیصلہ کیا تھا' کہ وہ اپنی ملازمت کے لیے ڈومنین کا انتخاب کرنے کے مجاز ہیں' اس کا اطلاق اس استثنا کے ساتھ افواج پر بھی کیا گیا کہ پاکستان کے کسی مسلمان باشندے کو ہندوستان کی افواج میں شامل ہونے کا اختیار حاصل نہیں ہوگا' اور ہندوستان کے غیر مسلموں کو پاکستان کی افواج میں شمولیت کا حق انتخاب نہیں ہوگا۔

افواج کی تقسیم کے خلاف انگریز فوجی افسروں کے جو شدید جذبات تھے' ان کے بہت سے دیسی شاگرد اس میں ان کے ہم خیال تھے۔ انگریزوں نے بہت کوشش کی تھی کہ ہند کے فوجی افسروں کو برصغیر کے عوام کے سیاسی آرا و افکار سے الگ تھلگ رکھیں۔ اگرچہ یہ علیحدگی کبھی اتنی مکمل نہیں تھی کہ گردوپیش کی دنیا سے قطعاً کوئی تاثر قبول نہ کرتی' لیکن دیسی فوجی افسر بڑی حد تک اپنی ہی دنیا میں مگن رہتے تھے اور ان کا انداز فکر حیرت انگیز حد تک اپنے انگریز اعلیٰ افسروں کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ چنانچہ جب بریگیڈیئر کے' ایم کری آپا تقسیم کے ایام میں مجھے ملنے آیا' اور اس نے ہند کی افواج کی تقسیم کے خلاف دلائل کا انبار لگا دیا' تو مجھے اس بات پر خاص حیرت نہ ہوئی۔ وہ دیسی فوجی افسروں میں سب سے زیادہ سینیئر تھا اور بعد میں ہندوستان کا پہلا کمانڈر انچیف بنا۔ اس کے ساتھ ایک مسلمان افسر بھی آیا تھا' جو کری آپا کا ہم خیال تھا۔ ان کے خیال میں ہندوستان اور پاکستان کے سیاسی لیڈروں کی طرف سے غیر منقسم افواج پر مشترک کنٹرول ایک قابلِ عمل بات تھی' انہوں نے اشارۃً یہ بھی کہا کہ اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو پھر سیاسی لیڈر بھاڑ میں جائیں' اس سے بہتر یہ ہو گا کہ تقسیم ہونے کی جگہ فوج ہی دونوں ڈومینیوں کا انتظام خود سنبھال لے۔ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ آزاد و خود مختار مملکتوں کے سیاسی اور فوجی اعتبار سے کیا لوازمات ہوتے ہیں لیکن مجھے پورا یقین نہیں کہ میں انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہوا۔

میں اس سے پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ لیاقت علی خان نے اپریل ۱۹۴۷ء میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ افواج کو تقسیم کرنے کا منصوبہ مرتب کر لیا جائے' لیکن وزیر دفاع بلدیو سنگھ اور کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل آکنلک نے اس تجویز کی مخالفت کی تھی۔ اگر اس تجویز کو قبول کر لیا جاتا' تو بہت سا قیمتی وقت ضائع نہ ہوتا چنانچہ جب جون میں تقسیم کا فیصلہ ہوا تو کوئی بھی منصوبہ تیار نہیں تھا — حتیٰ کہ منصوبے کا خاکہ تک بھی

نہیں تھا۔ جس اساس پر افواج کی تقسیم ہونی تھی ابھی اسے طے کرنا باقی تھا۔ جولائی کے پہلے ہفتے میں کہیں اس کام کا سنجیدگی سے آغاز ہوا۔ تقسیم افواج کے عمل کو ۱۵ اگست تک مکمل کرنا قطعاً ناممکن تھا اور لازم تھا کہ ایک غیر جانب صاحب اختیار کے تحت اس تاریخ کے بعد بھی اس کام کو جاری رکھا جائے تاکہ مسلح تصادم کے خطرے سے بچا جا سکے اور فوجی ساز و سامان کے ذخائر کی منصفانہ بانٹ ہو سکے۔

کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکنلک کی صدارت میں افواج کی تشکیل نو کمیٹی قائم کر دی گئی۔ اس کمیٹی کے تین ارکان انگریز افسر تھے ــــ فضائیہ اور بحریہ کے کمانڈر انچیف اور فوج کا چیف آف سٹاف۔ کمیٹی کے دو سول رکن بھی تھے ــــ محکمۂ دفاع کا ایڈیشنل سیکرٹری جی ایس بھالجا اور راقم الحروف۔ اگرچہ میں سٹیرنگ کمیٹی کے کام میں بہت مصروف تھا، پھر بھی مجھے افواج کی تشکیل نو کمیٹی میں شامل ہونے کے لیے کہا گیا۔ اس کی ایک وجہ کام کی اہمیت تھی، مزید براں جنگ اور رسد کے مالیاتی مشیر کی حیثیت میں مجھے ان امور کا تجربہ بھی حاصل ہو چکا تھا۔ اس کمیٹی کی امداد کے لیے چار سب کمیٹیاں تھیں ــ ایک بری فوج کے لیے، دوسری بحریہ کے لیے اور تیسری فضائیہ کے لیے ــ چوتھی نے تقسیم افواج کے مالیاتی پہلوؤں کو طے کرنا تھا۔ ان سب کمیٹیوں میں مسلم اور غیر مسلم فوجی افسروں کے علاوہ اعلیٰ انگریز افسر بھی شامل تھے۔

افواج کی تقسیم کے لیے جو منصوبہ بھی بنایا جاتا اس پر عملدرآمد بھی لازم تھا۔ اس کام کو انتشار پیدا کیے بغیر اور افواج کے انضباط اور کارکردگی پر ناگوار اثر ڈالے بغیر سرانجام دینے کے لیے ضروری تھا کہ ہند میں موجودہ تمام افواج کا نظم و نسق ایک صاحب اختیار کے تحت ہو۔ یہ حیثیت آکنلک کو تفویض کی گئی، اور اسے سپریم کمانڈر بنا دیا گیا، تاکہ ہندوستان اور پاکستان کے کمانڈر انچیفوں کے مقابلہ میں اسے امتیازی مقام حاصل ہو جائے۔ سپریم کمانڈر اپنے فرائض مشترکہ دفاعی کونسل کے تحت سرانجام دیتا تھا۔ اس کونسل کا چیئرمین لارڈ ماؤنٹ بیٹن تھا، اور اس کے ارکان ہندوستان اور پاکستان کے وزرائے دفاع ــــ بلدیو سنگھ اور لیاقت علی خان ــــ اور آکنلک تھے۔ افواج کی تقسیم اور ان کی دو علیحدہ ڈومینیوں کی افواج کی صورت میں تشکیلِ نو، ان تمام امور میں مشترکہ دفاعی کونسل ہی آخری اور حتمی فیصلے صادر کرنے کی مجاز تھی۔ یہی کونسل افسروں اور جوانوں کی تقسیم اور تبادلوں اور نقل و حرکت کا انتظام کرتی تھی، اسی طرح آلات، مشینری، ساز و سامان اور ذخائر کی تقسیم اور نقل و حمل کا اہتمام بھی اسی کی تحویل میں تھا۔

علاوہ ازیں دونوں نئی مملکتوں میں سے ہر ایک کی افواج کے عام انتظام اور نظم وضبط سے بھی یہی کونسل عہدہ برآ ہوتی تھی۔ لیکن مشترکہ دفاعی کونسل کو کسی بھی ڈومنین کی افواج کی حربی کارروائی پر کوئی اختیار حاصل نہیں تھا، البتہ فساد زدہ علاقوں میں مشترکہ کمان کے تحت جو باؤنڈری فورس قائم ہوئی، وہ کونسل کے ماتحت تھی۔

فوجی دستوں کی تقسیم اور تشکیلِ نو کا کام یکم اپریل ۱۹۴۸ء تک مکمل کیا جانا تھا۔ اس تاریخ تک ہر نوآبادی نے اپنی افواج کے انتظام اور متعلقہ امور کی ذمہ داری خود سنبھال لینی تھی۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ مشترکہ دفاعی کونسل اور سپریم کمانڈر کے ماتحت تنظیم کی میعاد بھی یکم اپریل ۱۹۴۸ء تک ہوگی۔ مشترکہ دفاعی کونسل کی وساطت سے سپریم کمانڈر ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کے سامنے جوابدہ تھا۔ لیکن ۱۵ اگست کے بعد ہند میں رہ جانے والی تمام برطانوی فوج کی کمان اور انتظام کے لیے وہ براہِ راست حکومت برطانیہ کے سامنے جوابدہ تھا۔ برطانوی فوج کا انخلا چھ ماہ کے اندر ایک تدریجی پروگرام کے تحت عمل میں لایا جانا تھا۔

چونکہ لازم تھا کہ ۱۵ اگست کو پاکستان اور انڈین یونین کے پاس اپنے اپنے علاقے میں اور اپنے اپنے حکم کے تحت ایسی افواج ہوں جن کے غالب حصے علی الترتیب مسلمانوں اور غیر مسلموں پر مشتمل ہوں۔ اس لیے ضرورت پیش آئی کہ افواج کی تقسیم پر عملدرآمد دو مرحلوں میں کیا جائے۔ پہلے مرحلے میں موجودہ افواج کی کام چلاؤ تقسیم فرقہ وارانہ بنیادوں پر کی جانی تھی۔ چنانچہ مسلم اکثریت کے ایسے تمام یونٹوں کو پاکستان میں فوری طور پر منتقل کرنے کا پلان بنایا گیا۔ جو اس وقت پاکستانی علاقوں سے باہر تھے۔ اسی طرح پاکستانی علاقے سے ان تمام فوجی یونٹوں کو بھارت میں منتقل کرنے کا پروگرام بنایا گیا جو صرف غیر مسلموں پر یا زیادہ تر غیر مسلموں پر مشتمل تھے۔ دوسرے مرحلے میں ہر یونٹ سے افراد کو ان کی مرضی کے مطابق تبادلے کے لیے چھانٹا جانا تھا۔ ہر ڈومنین کے لیے اپنی فوجی انتظامی مشینری کا بھی بندوبست کر دیا گیا تاکہ وہ اپنی اپنی افواج کی ضروریات پوری کر سکیں۔ اوائل اگست میں دونوں ڈومنینوں کی افواج کے کمانڈر انچیف بھی مقرر کر دیئے گئے۔

آکنلک تقسیم ملک کے خلاف تھا۔ اسی وجہ سے کانگرسی لیڈر اس کے بڑے حامی تھے اور قائداعظم اور لیاقت علی خاں اس سے بدگمان تھے اور اس کی جگہ کسی دوسرے کو مامور کرنے کے خواہاں تھے۔ میں نے ان سے یہ گذارش کی کہ آکنلک کی ذاتی رائے خواہ کچھ بھی رہی ہو لیکن اس وقت جبکہ

اعلیٰ ترین سطح پر ایک سیاسی فیصلہ ہو چکا ہے' اسے جو بھی فرائض تفویض کیے جائیں گے' وہ ایک فرض شناس سپاہی کی طرح انہیں دیانتداری اور غیر جانبداری سے انجام دے گا۔ چنانچہ انہوں نے میری اس رائے کو قبول کر لیا۔

دونوں افواج کی متناسب طاقت کی اساس پر مشترکہ دفاعی کونسل نے یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستان اور پاکستان میں موجودہ فوجی سازو سامان کے ذخائر کا ایک تہائی حصہ پاکستان کو ملے گا' لیکن ہتھیاروں' گولہ بارود اور دوسرے فوجی ذخائر کا بیشتر حصہ ہندوستان میں واقع ڈپوؤں میں تھا۔ سولہ کی سولہ اسلحہ ساز فیکٹریاں بھی ہندوستان میں واقع تھیں' ان میں سے اکثر کو دوسری جنگ عظیم میں جدید مشینری سے لیس کیا جا چکا تھا۔ الغرض سازو سامان بھی ہندوؤں کے پاس تھا اور ہر تاخیر بھی ان کے حق میں مفید تھی۔ اور انہوں نے پاکستانی افواج کو اپنے جائز حصے کے سازو سامان اور ذخائر سے محروم کرنے کا پختہ تہیہ کر رکھا تھا۔ پاکستان کو ختم کرنے کی ان کی جو سکیم تھی' یہ بات اس کا ایک بہت اہم جزو تھی۔ کیونکہ ہتھیاروں اور گولہ بارود کے بغیر پاکستانی فوج کسی کام کی نہ ہوتی۔ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے دو بڑے حربے استعمال کئے فیصلے کرنے میں ہٹ دھرمی اور ان پر عمل درآمد میں رکاوٹیں افواج کی تشکیلِ نو کمیٹی کے جلسوں میں ہندوستان کا نمائندہ بجا بیجا بالعموم بہت ہی سخت اور غیر مصالحانہ رویہ اختیار کرتا تھا جو معدودے چند معاملات تقسیم کونسل کے سامنے پیش ہوئے۔ مثلاً اسلحہ ساز فیکٹریوں کا مسئلہ' ان کے بارے میں سردار پٹیل کا رویہ اس سے بھی زیادہ ضد اور ہٹ دھرمی پر مبنی تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ہرگز ہرگز وہ مشینری کے ایک پرزے تک کو ہندوستان سے لے جانے کی اجازت نہیں دے گا۔ ان رکاوٹوں کے باوجود یونٹوں اور ان کے اپنے سازو سامان کی نقل و حمل کا کام جاری رہا۔ لیکن ڈپوؤں سے فوجی سازو سامان کے ذخائر کے بیشتر حصے کی منتقلی ابھی باقی تھی کہ ۱۵ اگست کو انتقالِ اقتدار ہو گیا۔

حصولِ آزادی کے فوراً بعد ہندوستان نے حزم و احتیاط کا وہ چوغا اتار کے پھینک دیا جو برطانوی اقتدار کے انخلا سے پہلے اس نے پہن رکھا تھا۔ اس سے پہلے بھارتی لیڈر سپریم کمانڈر کا لحاظ کرتے تھے' لیکن اب انہوں نے اس کے خلاف بر سر بازار اور نجی محفلوں میں ایک زہریلی مہم شروع کر دی۔ آکنلک کو افواج کی جنگی کارروائی پر کوئی اختیار نہیں تھا۔ اسے صرف انتظامی میدان میں اختیارات حاصل تھے۔

اور وہ بھی مشترکہ دفاعی کونسل کی ہدایات کے تحت۔ اس کا اصلی کام افواج کی تشکیلِ نو کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا تھا تاکہ پاکستان اور ہندوستان دونوں کی تحویل میں متوازن مسلح افواج ہوں، اور وہ بہت ہی صبر آزما حالات میں اپنے اس فرض کو دیانت داری اور غیر جانبداری سے انجام دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ کام یکم اپریل ۱۹۴۸ء سے پہلے مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ سپریم کمانڈر کے خلاف زہریلے حملوں کا مقصد اسے دستبردار ہو کر چلے جانے پر مجبور کرنا تھا، تاکہ کوئی ایسا آزاد و با اختیار ادارہ باقی نہ رہے، جو پاکستان کو اس کے جائز حصے کے فوجی ذخائر دلوا سکے۔

۲۶ ستمبر ۱۹۴۷ء کو مونٹ بیٹن نے آکنلک کو لکھا کہ سپریم کمانڈر پر جو روز افزوں شدت سے حملے ہو رہے ہیں، وہ انہیں روکنے سے قاصر ہے۔ "بھارتی وزیر اس بات پر برہم ہیں کہ سپریم ہیڈ کوارٹر کا سربراہ آپ جیسی بلند مقام، با وقار اور نیک نام شخصیت ہے ...... ایک بہت معتدل مزاج اور سلیم الطبع وزیر نے حال ہی میں مجھ سے یہ شکایت کی کہ اس کے خیال میں آپ اپنے آپ کو پاکستان کے مفادات کا علمبردار تصور کرتے ہیں۔ یہ ہے بے لاگ غیر جانبداری کا صلہ"۔ اس خط میں آگے چل کر یہ کہا گیا تھا کہ اس کے خلاف بھارت میں جو تحریک ہو رہی ہے، اس کی پیش بندی کے طور پر آکنلک کو چاہیئے کہ وہ خود ہی سپریم ہیڈ کوارٹرز کو ختم کر دینے کی تجویز پیش کر دے۔ مونٹ بیٹن نے آکنلک کو یہ بھی اطلاع دی کہ وہ قبل ازیں ساری صورتِ حال سے وزیر اعظم ایٹلی کو مطلع کر چکا ہے اور "میں نے اس کی منظوری حاصل کر لی ہے، کہ اگر میں یہ سمجھوں کہ وقت اس کا متقاضی ہے تو میں اپنے اختیار سے مناسب اقدام کر سکوں"۔ دوسرے الفاظ میں بھارتی دباؤ کے تحت مونٹ بیٹن نے سپریم ہیڈ کوارٹرز کو بند کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا اور آکنلک کو وہ اپنے طور پر مستعفی ہونے کے لیے محض اس لیے کہہ رہا تھا کہ اس طرح آکنلک کا بھرم رہ جائے گا۔

۲۸ ستمبر کو آکنلک نے جو رپورٹ حکومت برطانیہ کو بھیجی، اس میں اس نے لکھا کہ:-

"میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کی موجودہ کابینہ بختہ تہیہ کر چکی ہے کہ جہاں تک اس کا بس چلے گا وہ پاکستان کو مضبوط بنیادوں پر قائم ہونے سے روکنے کے لیے کوئی کسر باقی نہیں رکھے گی ... بھارت کے لیڈروں، وزیروں، سول افسروں اور دوسروں نے افواج کی تقسیم کے کام میں روڑے

اٹکانے کی مسلسل کوشش کی ہے۔ مجھ پر اور میرے افسروں پر پاکستان کے حامی اور جانبدار ہونے کے مسلسل اور زہر آلود الزامات عائد کئے جاتے رہے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنے فرض کو غیر جانبداری سے، اور کسی رورعایت کے بغیر انجام دینے کی کوشش کی ہے۔۔۔۔ میرے لیے اور میرے افسروں کے لیے اپنے کام کو جاری رکھنا دن بدن ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ اگر ہمیں ہٹا دیا گیا، تو پھر اس بات کی کوئی امید نہیں کہ سابق افواج ہند کے منقولہ اثاثہ جات کی تقسیم منصفانہ طور پر ہو سکے گی۔ اس کے برعکس پاکستان کا رویہ اس دوران میں معقولیت اور تعاون کا آئینہ دار رہا ہے۔ موجودہ حالات میں یہ بات فطری ہے، کیونکہ عملاً پاکستان کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں ہے، اور جن چیزوں کی اسے ضرورت ہے وہ اپنی ذخائر سے حاصل کر سکتا ہے، جو اس وقت ہندوستان میں ہیں۔"[۳۶]

یہ واقعہ کئی پہلوؤں سے سبق آموز ہے۔ اوّل یہ کہ اس سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کے لیڈروں کو اپنے عہد و پیمان کی خلاف ورزی میں باک نہیں، اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے وہ ہر جائز و ناجائز طریقہ استعمال کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ثانیاً یہ کہ پاکستان سے ان کی دشمنی اتنی سنگدلانہ تھی کہ کسی طرح بھی اس کی تسکین نہیں ہوتی تھی۔ تیسرا پہلو ہندوستان کے لیڈروں سے مونٹ بیٹن کے تعلقات کی نوعیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ جب تک مونٹ بیٹن ان کے مقاصد کے لیے مفید ثابت ہوتا رہا، انہوں نے اسے سر آنکھوں پر بٹھایا، لیکن جب اس نے ان سے عدل و انصاف کی راہ پر گامزن ہونے کے لیے کہا اور وہ بھی ایک انگریز فیلڈ مارشل کی خاطر، تو مونٹ بیٹن کا ان پر اثر و رسوخ جھٹ کافور ہو گیا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ اپنی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے مونٹ بیٹن دوسروں کو قربان کرنے میں دریغ نہیں کرتا تھا۔ اس نے آکنلک کو مستعفی ہو جانے پر مجبور کیا، حالانکہ اس کا قصور محض یہ تھا کہ وہ اپنے فرائض پوری غیر جانبداری سے ادا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن مونٹ بیٹن کو ہندو لیڈروں سے یہ کہنے کی توفیق نہ ہوئی کہ وہ خود مستعفی ہو جائے گا، بجائے اس کے کہ "ہند کی تاریخ میں سب سے عظیم کمانڈر انچیف" کو ناحق باہر دھکیل دیا جاتے۔ (آکنلک کے بارے میں یہ الفاظ مونٹ بیٹن نے خود کہے تھے۔) اور بالآخر یہ کہ اس سے ہمیشہ کے لیے مونٹ بیٹن کا یہ دعوٰی باطل ثابت ہو جاتا ہے کہ اگر وہ پاکستان اور ہندوستان کا مشترک

گورنر جنرل ہوتا، تو وہ پاکستان کو اثاثہ جات کا جائز حصہ دلوا کے رہتا۔ وہ ہندوستان کی کابینہ کا منتخب اور معتمد گورنر جنرل تھا۔ اس حیثیت میں اسے پاکستان اور ہندوستان کے مشترک آئینی گورنر جنرل کے مقابلے میں ہندوستان کی کابینہ پر زیادہ اثر و رسوخ حاصل ہونا چاہیئے تھا۔ جب وہ اپنی اس حیثیت میں ہندوستان سے فوجی ذخائر کی تقسیم کے معاہدے کی پابندی نہ کرا سکا، تو مشترک آئینی گورنر جنرل کے طور پر وہ اس سے دوگنا بے بس ثابت ہوتا۔

اس طرح آزادی کے بعد صرف چھ ہفتوں کے اندر ہندوستان کی حکومت نے سپریم کمانڈر کے لیے ناممکن بنا دیا کہ وہ اپنے کام کی تکمیل کے لیے یکم اپریل ۱۹۴۸ء تک اپنے منصب پر برقرار رہے۔ ۲ر اکتوبر کو آکنلک نے مشترکہ دفاعی کونسل کے سامنے ایک تحریری یادداشت میں یہ تجویز پیش کی کہ ۳۰ر نومبر تک سپریم کمانڈر اور اس کے ہیڈ کوارٹرز ختم کر دیئے جائیں۔ اس تحریری یادداشت پر ۱۶ر اکتوبر کو لاہور میں مشترکہ دفاعی کونسل کے اجلاس میں غور و خوض کیا گیا۔ اجلاس کی صدارت ماؤنٹ بیٹن کر رہا تھا۔ ہندوستان کی نمائندگی بلدیو سنگھ اور وزیر بے محکمہ گوپال سوامی آئینگر کر رہے تھے۔ ان دونوں نے خندہ پیشانی سے سپریم کمانڈر کی اس تجویز کی حمایت کی، جبکہ لیاقت علی خان نے مخالفت کی اور اس امر پر اصرار کیا کہ اپنے کام کی تکمیل تک سپریم ہیڈ کوارٹرز کو برقرار رہنا چاہیئے۔ ہندوستان کے وزراء نے اپنی حکومت کی طرف سے یہ عہد کیا کہ پاکستان کو اس کے حصے کے ذخائر بہم پہنچائے جائیں گے۔ ان کے عہد و پیمان کو ذرا وقعت حاصل نہ تھی، کیونکہ انہوں نے خود ہی ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ پاکستان کو اس کے حصے کے ذخائر سے محروم کیا جا سکے۔ اس مسئلے پر اتفاق رائے نہ ہو سکا، اور اسے پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ جیسی کہ توقع کی جا سکتی ہے، دونوں حکومتوں میں بھی اتفاق رائے نہ ہوا۔ جب اس ضمن میں حکومت برطانیہ سے مشورہ کیا گیا تو اس نے ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں میں اتفاق رائے نہ ہونے کے پیش نظر سپریم ہیڈ کوارٹرز کے انگریز افسروں کو واپس بلانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس طرح پیشتر اس کے کہ ذخائر کا قابل ذکر حصہ منتقل کیا جاتا، بڑی تلخی کے ماحول میں سپریم کمانڈر کے ہیڈ کوارٹرز کو ختم کر دیا گیا اور بھارت نے اپنا مقصد حاصل کر لیا۔ اس کے بعد کچھ عرصے کے لیے زائد اور غیر مطلوب ساز و سامان مثلاً بہت بڑے سائز کے جوتے پاکستان پہنچتے رہے، پھر یہ نہایت خفیف سلسلہ بھی بند ہو گیا۔

اس نازک دور میں ایک اور اہم اقدام پنجاب بونڈری فورس کی تشکیل تھی جسے سکھوں کی طرف سے بغاوت کے خطرے کے پیش نظر قائم کیا گیا تھا۔ مارچ ۱۹۴۷ء کے پہلے ہفتے میں جب پنجاب میں خضر حیات ٹوانہ کی مخلوط وزارت مستعفی ہوئی، اور تقسیم کا امکان افق پر ابھرنے لگا۔ اس وقت سے ہی سکھ زور آوری سے ایک سکھ مملکت قائم کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ پنجاب کے چیف سیکرٹری نے اپنی رپورٹ بابت مارچ میں لکھا "ان کے منصوبے پنجاب میں ساری سکھ قوم پر حاوی ہیں۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سکھ ریاستیں بھی ان منصوبوں میں ملوث ہیں۔ سکھوں کی فوجی خطوط پر جتھہ بندی کی جا رہی ہے۔ اور اگر کہیں ان کے پاس پہلے سے ہتھیار نہیں ہیں تو انہیں اسلحہ سے لیس کیا جا رہا ہے، اور تحریری اور زبانی پروپیگنڈہ سے انہیں مشتعل کیا جا رہا ہے"۔ ۱۹۴۷ء ۳ جون کے منصوبے کے اعلان کے بعد سکھوں نے اپنی مساعی دو چند کر دیں۔ چیف سیکرٹری کی رپورٹ بابت جون میں بتایا گیا کہ شرومنی اکالی دل کے گشتی خط میں یہ کہا گیا ہے کہ پاکستان کا مطلب سکھ پنتھ کی پوری ہلاکت ہے، سکھوں نے ایک آزاد و خود مختار مملکت قائم کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے، جس کی سرحدیں ایک طرف چناب اور دوسری طرف جمنا تک ہوں گی۔ اس گشتی مراسلے میں سکھوں سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ شرومنی اکالی دل کے جھنڈے تلے اپنے نصب العین کے لیے لڑیں"۔ [۲۵]

سکھوں کی مرکزی تنظیم — شرومنی اکالی دل — کے ہاتھ میں سکھ گوردواروں کے انتظام کی باگ ڈور تھی، اور اس کے پاس کافی مالی وسائل تھے۔ سکھ فرقے کو نیم فوجی خطوط پر منظم کیا گیا تھا۔ ان کے جتھے تھے جو معروف جتھہ داروں کے تحت تھے۔ کرپان باندھنا ان کا ایک مذہبی فریضہ تھا۔ مہاراجہ پٹیالہ اور پنجاب میں ریاستوں کے دوسرے سکھ حکمرانوں کے اکالی لیڈروں سے تعلقات بہت گہرے تھے ان کے پاس اپنی ریاستی فوجیں بھی تھیں، اور وہ سرمایہ اور اسلحہ سے سکھوں کے منصوبے کی پشت پناہی کے لیے آمادہ و مستعد تھے۔ ہندو بھی سکھوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے، اور ہندوؤں کی جنگجو تنظیمیں مثلاً آر۔ ایس۔ ایس دنگا فساد میں سکھوں کا پورا ساتھ دیتی تھیں۔

سکھ لیڈروں کے افتاد طبع کی مناسبت سے سکھوں کا منصوبہ از حد بہیمانہ اور بے رحمانہ تھا۔ اس کے دو پہلو تھے، پہلا یہ کہ کانگریس سے اشتراک کے ساتھ انگریز حکمرانوں پر انتہائی دباؤ ڈالا جائے کہ مشرقی پنجاب کی سرحد حتی الوسع زیادہ سے زیادہ مغرب کی جانب ہونی چاہیئے۔ دوسرا پہلو یہ تھا کہ مشرقی پنجاب کی مسلم آبادی کو بزور شمشیر باہر دھکیل دیا جائے اور ان کی جگہ باقاعدہ منصوبے کے تحت مغربی

پنجاب سے سکھوں کو لا کر آباد کیا جائے۔ حکومت ہند میں کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ ایسا ادبیسی منصوبہ کامیاب ہو جائے گا۔ اس سے پہلے جو فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہے تھے، ان سے کہیں زیادہ قتل و غارت کا خدشہ تو تھا مگر کسی شخص کو یہ خیال نہیں تھا کہ مشرقی پنجاب اور اس کے قریبی علاقوں میں مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے اور زبردستی باہر دھکیل دینے کی ایک دانستہ منظم کوشش کی جائے گی۔ لیکن آبادی کا بالجبر تبادلہ ہی سکھوں کا مقصود تھا۔

سکھ لیڈر، گیانی کرتار سنگھ نے گورنر پنجاب سر ایوان جنکنز کو بتایا کہ "پنجاب میں بہت وسیع پیمانے پر تبادلہ آبادی لازم ہے۔ کیا انگریز اس پر عمل در آمد کے لیے تیار ہیں؟ اسے شبہ تھا کہ انگریز اس کے لیے تیار نہیں۔ اگر سکھوں کی سالمیت کا خیال نہ رکھا گیا تو پھر لڑائی ناگزیر ہے۔"[۵۶] اسمے نے لکھا ہے کہ موبیل اور اس کی "سکھ لیڈروں، ماسٹر تارا سنگھ اور گیانی کرتار سنگھ سے دو تین مرتبہ بات چیت ہوئی۔۔۔۔ ہم نے انہیں بتایا کہ اگر انہوں نے تقسیم سے پہلے یا بعد خون خرابے کا راستہ اختیار کیا تو ان سے بہت سختی سے سلوک کیا جائے گا لیکن ہمیں احساس ہوا کہ ہماری تنبیہہ کا ان پر ذرہ بھر اثر نہیں ہوا۔"[۵۷]

گورنر پنجاب جنکنز، مونٹ بیٹن کو بار بار انتباہ کرتا رہا کہ سکھ سخت آفت برپا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ایبل نے ۱۰ جولائی کو جنکنز سے پنجاب کی صورتِ حال پر بات چیت کرنے کے بعد مونٹ بیٹن کو اطلاع دی کہ "اس امر میں اب کوئی شک و شبہ نہیں کہ سکھوں کا رنگ ڈھنگ نہایت خطرناک ہے۔"[۵۸] ۱۳ جولائی کو جنکنز نے پھر ایک خط میں یہ انتباہ کیا کہ سکھ مسلح بغاوت کی دھمکی دے رہے ہیں۔[۵۹] اس عرصہ میں قائد اعظم اور لیاقت علی خان بار بار مونٹ بیٹن کی توجہ اس خطرے کی طرف مبذول کراتے رہے۔ قائد اعظم کا خیال تھا کہ جب تک اس سازش میں ملوث سکھ لیڈروں کو گرفتار نہیں کیا جائے گا امن و امان کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ مونٹ بیٹن نے وعدہ کیا کہ اگر سکھ لیڈر اپنے عزائم سے باز نہ آئے تو وہ ان کے خلاف بہت سخت اقدام کرے گا۔ لیکن جس بات کی ضرورت تھی اور جس کا قائد اعظم مطالبہ کر رہے تھے وہ محض گفتار نہیں تھی بلکہ فوری عمل تھا۔ مونٹ بیٹن گفتار کا تو دھنی تھا لیکن کسی موثر اقدام سے گھبرا رہا تھا۔

اپریل ۱۹۴۷ء میں ابوالکلام آزاد نے بھی مونٹ بیٹن کو انتباہ کیا تھا کہ اگر فرقہ وارانہ کشیدگی کی فضا میں ملک کو تقسیم کیا گیا تو خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔۔۔۔۔ اور قتل و غارت کی ذمہ داری انگریزوں

پر عائد ہوگی۔" ایک لمحے کے تامل کے بغیر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے یہ جواب دیا "کم از کم اس مسئلے پر میں آپ کو
مکمل یقین دلا سکتا ہوں، میں اس بات کا پورا انتظام کروں گا کہ کوئی کشت و خون اور ہنگامہ نہ ہو..... اگر
کسی وقت معمولی ایجی ٹیشن بھی ہوئی، تو میں شورش کو سر اٹھانے سے پہلے ہی کچل دینے کے لیے سخت ترین
اقدامات کروں گا۔"[۴۱]

وہ اس انداز میں گفتگو کرتا رہا لیکن عملاً کچھ نہ کیا۔ جولائی میں اس نے مہاراجہ پٹیالہ کو بہت سنگین نتائج
کی دھمکی دی اور سکھوں کے جو مختلف وفود اس سے ملنے کے لیے آئے، انہیں بھی تشدد سے احتراز کرنے کے
درس دیتا رہا۔ بڑے ہی ڈرامائی انداز میں اس نے یہ اعلان کیا کہ وہ تشدد کی ہر کوشش کو کچل دینے کے لیے
سلطنتِ برطانیہ کی تمام تر طاقت استعمال کر ڈالے گا، لیکن سکھ اس کی گیدڑ بھبکیوں کو بھانپ گئے تھے
اور اس کے اس شور و غوغا سے ذرا مرعوب نہ ہوئے۔ کیونکہ اسی دوران میں ماؤنٹ بیٹن کے عملے کے ارکان
بیچارے سکھوں سے اظہارِ ہمدردی میں مصروف تھے، جنہیں ان کے زعم میں منصوبۂ تقسیم سے سب سے زیادہ
نقصان پہنچ رہا تھا۔ اس لیے سکھوں کو یقین تھا کہ وہ کسی خاص رکاوٹ یا دقت کے بغیر اپنے منصوبے
کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں گے۔ سکھوں کے ایک وفد نے تو یہ کہہ کر بھی ماؤنٹ بیٹن کو اطمینان دلانے
کی کوشش کی کہ جب تک وہ وائسرائے ہوگا، اس وقت تک کوئی شورش نہیں ہوگی، اس سے ان کا
مطلب یہ تھا کہ آزادی کے بعد ہی وہ اپنے ہلاکت خیز پروگرام پر عمل درآمد کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

پنجاب میں جب قتل و غارت کا ہولناک سلسلہ پورے عروج پر تھا، ماؤنٹ بیٹن نے ۱۶ اگست
کو دو ہندو اخبار نویسوں کو پنجاب کے حالات کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا "سکھوں نے ٹھیک ..... اس طرح
حملہ کیا، جس طرح ۳ جون سے قبل گیانی کرتار سنگھ اور تارا سنگھ نے اسے بتایا تھا کہ وہ کریں گے۔ ماؤنٹ بیٹن
نے اس وقت انہیں سمجھایا بجھایا تھا۔ خاص طور پر یہ کہہ کر کہ انگریز تو جا چکے ہوں گے۔ اور اہلِ وطن خواہ مخواہ
آپس میں لڑ رہے ہوں گے۔ لیکن سکھ لیڈر اپنی بات پر اڑے رہے، بلکہ انہوں نے یہ کہا کہ وہ تو انگریزوں
کے رخصت ہو جانے کا ہی انتظار کر رہے ہیں۔ اب صورتِ حال ان کے بس میں نہیں رہی۔"[۴۲] اگر
صورتِ حال اب کسی کے بس میں نہیں رہی تھی، تو اس کی وجہ فقط یہ تھی کہ ماؤنٹ بیٹن نے اس وقت
سکھوں کے مجرمانہ منصوبوں کو روکنے کے لیے کچھ بھی نہ کیا، جبکہ اسے ان منصوبوں کا علم بھی تھا اور ان کو
ختم کرنے کی طاقت بھی تھی اور ذمہ داری بھی۔ اس نازک دور میں سکھ لیڈروں کے خلاف اقدام کرنے

اور انہیں مسلح ہونے سے روکنے میں مونٹ بیٹن نے جو کوتاہی کی، وہ فقید المثال قتل و غارت اور تاریخ میں سب سے بڑی نقل مکانی پر منتج ہوئی۔

۲۰ جولائی کو مونٹ بیٹن نے لاہور کا دورہ کیا، اور پنجاب کی صورتِ حال پر جنکنز اور پنجاب کی تقسیم کمیٹی سے بات چیت کی۔ دہلی واپس آکر دو دن بعد اس نے تقسیم کونسل کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ پنجاب میں امن و امان برقرار رکھنے کے لیے باؤنڈری فورس کا قیام عمل میں لانا چاہیے۔ یہ تجویز منظور کر لی گئی، اور تقسیم کونسل کی طرف سے ایک بیان جاری کیا گیا۔ کونسل میں خاص اس موقع کے لیے سکھوں کی طرف سے بلدیو سنگھ شامل تھا۔ اعلان یہ تھا:۔

"تقسیم کونسل کے ارکان مستقبل کی حکومتوں کی طرف سے یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ پرامن فضا قائم کرنے کا مصمم ارادہ کر چکے ہیں تاکہ تقسیم ملک کا عمل پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے اور انتظامی اور اقتصادی تشکیل نو کے بنیادی اہم کام شروع کئے جا سکیں۔ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے یقین دلایا ہے کہ انتقالِ اقتدار کے بعد اقلیتوں سے منصفانہ اور مساوی سلوک کیا جائے گا۔ مستقبل کی دونوں حکومتیں ان یقین دہانیوں کی دوبارہ تصدیق کرتی ہیں۔ وہ اپنے تمام شہریوں کے بلا امتیاز عقیدہ، ذات اور صنف جائز مفادات کا تحفظ کریں گی۔ اپنے عام شہری حقوق کے استعمال میں سارے باشندے برابر ہوں گے۔ دونوں حکومتیں اپنے اپنے علاقہ میں تمام لوگوں کو ایسی آزادیوں کی ضمانت دیں گی، مثلاً آزادیٔ تقریر، جماعتیں اور تنظیمیں بنانے کا حق، اپنے طریقے اور عقیدے کے مطابق عبادت کرنے کا حق، اور ان کی زبان و ثقافت کا تحفظ۔ مزید برآں دونوں حکومتیں یہ بھی عہد کرتی ہیں کہ ۱۵ اگست سے پہلے جو لوگ سیاسی مخالف رہے ہوں گے، ان کے خلاف کوئی امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔ دونوں حکومتوں کی طرف سے اپنے اپنے ملکوں کے باشندوں کو تحفظ کی جو ضمانت دی جا رہی ہے، اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ کسی علاقے میں کسی بھی شکل میں کسی قسم کے تشدد کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ دونوں حکومتیں اس بات کو

پورے زور سے واضح کر دینا چاہتی ہیں کہ اس عزم صمیم میں وہ پوری طرح متحد ہیں۔ انتقالِ اقتدار کے دوران میں پنجاب میں امن و امان کے تحفظ کی خاطر ...... دونوں حکومتوں نے باہمی طور پر اتفاق کیا ہے کہ یکم اگست سے ایک خاص فوجی کمان قائم کی جائے، جو سیالکوٹ، گوجرانوالہ، شیخوپورہ، لائل پور، منٹگمری، لاہور، امرتسر گورداسپور، ہوشیار پور، جالندھر، فیروزپور اور لدھیانہ کے اضلاع پر حاوی ہوگی۔ دونوں حکومتوں کی تائید سے میجر جنرل ریس کو اس مقصد کے لیے فوجی کمانڈر نامزد کر دیا گیا ہے، اور بریگیڈیر دگمبر سنگھ ہندوستان کی طرف سے اور کرنل ایوب خاں پاکستان کی طرف سے مشاورتی حیثیت میں اس سے منسلک کر دیئے گئے ہیں۔ ۱۵ اگست کے بعد مذکورہ بالا اضلاع میں دونوں نئی مملکتوں کی افواج حربی کارروائی کے لیے میجر جنرل ریس کے کنٹرول میں ہوں گی، اور وہ سپریم کمانڈر اور مشترکہ دفاعی کونسل کی وساطت سے دونوں حکومتوں کے سامنے جوابدہ ہو گا۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی، تو دونوں حکومتیں بنگال میں بھی ایسی تنظیم قائم کرنے میں تامل نہیں کریں گی۔"

پنجاب بونڈری فورس تقریباً پچاس ہزار افسروں اور سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ اس نے یکم اگست کو اپنے فرائض سنبھال لیے۔ یہ فورس زیادہ تر مخلوط فوجی یونٹوں پر مشتمل تھی، جن کی تقسیم ابھی عمل میں نہیں لائی گئی تھی اور ان میں انگریز افسروں کا تناسب کافی زیادہ تھا۔ اس فورس میں اکثریت غیر مسلموں کی تھی، لیکن مسلم ہوں یا غیر مسلم اس امر کا سخت خدشہ تھا کہ وہ بھی ماحول کے فرقہ وارانہ جذبات سے متاثر ہو جائیں گے۔ بونڈری فورس کے ڈھانچے میں یہ جبلی کمزوری بڑھتی چلی گئی، حتیٰ کہ یہ فورس بے سود ہو گئی اور ایک مہینہ کے اندر ہی اسے ختم کرنا پڑا۔

برطانوی فوجی دستوں کی غیر جانبداری پر انحصار کیا جا سکتا تھا، لیکن انہیں اس فورس میں شامل نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اپنے راج کے آخری ایام میں انگریزوں کی خواہش تھی کہ انگریزوں کی جان، ساکھ اور مقبولیت کو خطرے میں ڈالے بغیر برصغیر کے معاملات سے دستکش ہو جائیں جن لاکھوں کروڑوں لوگوں پر انہوں نے اس قدر طویل عرصہ کے لیے حکومت کی تھی، ان کی عافیت اور حفاظت کو ان کے منصوبوں میں کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ بلوائیوں کو گولی مارنا ایک بے صلہ

مذمت تھی۔ اس میں پڑ کر کیوں دونوں فریقوں کی لعن طعن مول لی جاتی؟ یہ عذر کہ کانگرسی لیڈر انگریز فوجیوں کے استعمال کو قبول نہ کرتے، اس لحاظ سے قابل تسلیم نہیں کہ ان کے سامنے ایسی کوئی تجویز پیش ہی نہیں کی گئی۔ یہ توقع عبث تھی کہ وہ خود انگریز فوجیوں کے استعمال کی درخواست کرتے۔ ایک انگریز مصنف کا اس معاملے میں منصفانہ تبصرہ بجز دوخوں کا مستحق ہے۔ لومبے نے لکھا ہے" ساری باتوں کے باوجود اس نتیجے کو مسترد کرنا آسان نہیں کہ حکومت برطانیہ اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو اس بات پر پورا اصرار کرنا چاہیئے تھا کہ جن علاقوں میں فسادات کا بہت زیادہ خطرہ ہے وہاں دونوں حکومتیں ایک حد تک برطانوی کنٹرول قبول کرلیں تا آنکہ ایسے علاقے نئے حالات کے لیے سازگار بن جائیں"[۳۶] اگر انگریزوں کی جانوں کو کوئی خطرہ لاحق ہوتا، تو یقیناً اس سے بہت مختلف نقطۂ نظر اختیار کیا جاتا۔ اگرچہ اس وقت برصغیر میں انگریزوں کے خلاف کوئی معاندانہ جذبہ نہیں تھا لیکن پھر بھی سپریم کمانڈر اور دوسرے انگریز افسر برصغیر میں انگریزوں کی حفاظت کے بارے میں بڑے فکرمند تھے، اور چاہتے تھے کہ برطانوی فوجیں ابھی ہند میں رکھی جائیں۔ فرقہ وارانہ امن وامان کی خاطر نہیں بلکہ انگریزوں کی جان اور مال کی حفاظت کے لیے۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ نہ تو پنجاب باؤنڈری فورس کی تشکیل موزوں تھی، اور نہ ہی اس بڑی مہم کو جو درپیش تھی، سر کرنے کے لیے وہ کافی طاقت رکھتی تھی۔ مزید برآں اسے سول حکام کی امداد کرنی تھی، خود اپنے طور پر انسدادی کارروائی کرنے کا اسے اختیار حاصل نہیں تھا۔ اس کی حیثیت بارود سے بھرے ہوئے کسی شہر میں یکہ وتنہا فائر بریگیڈ کی تھی، جو بارود کو ہٹا نہیں سکتا، لیکن جب کہیں آگ لگ جائے، تو اسے بجھانے کے لیے جیسی بھی دوڑ دھوپ ہو سکے کر سکتا ہے۔ دوسرے بہت سے معاملات کی طرح یہاں بھی ماؤنٹ بیٹن مسائل کو فی الواقع حل کرنے سے اتنی دلچسپی نہیں رکھتا تھا جتنی کہ حل کا تاثر پیدا کرنے سے۔ پنجاب میں اس مسئلے کے حقیقی حل کے لیے اسے سردار پٹیل ایسے کانگرسی لیڈروں کا مقابلہ کرنا پڑتا جو سکھوں کے پشت پناہ تھے، لیکن ماؤنٹ بیٹن اس کے لیے آمادہ نہیں تھا۔

پنجاب باؤنڈری فورس کے معرض وجود میں آنے سے پہلے ہی صورت حال بڑی ابتر ہو چکی تھی۔ کیونکہ سکھ لیڈر آزادانہ اپنے مجرمانہ مقاصد کے لیے سازش اور گٹھ جوڑ کر رہے تھے۔ کیمبل جانسن نے اپنی کتاب میں ۵ راگست ۱۹۴۷ء کو جو کچھ لکھا، اس سے نظر آجاتا ہے کہ حقائق کس قدر گھناؤنے تھے، اور ان کی روک تھام کے لیے عملی آمادگی بجز مفقود تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے خفیہ بات چیت میں سردار پٹیل، قائداعظم

اور لیاقت علی کو پنجاب کی صورتِ حال کے بارے میں بتایا۔

"خفیہ اطلاعات..... سکھ لیڈروں کو سبوتاژ کے کئی منصوبوں میں ملوث کرتی ہیں، بشمول ان کے اگلے ہفتے کراچی میں جشنِ آزادی کے موقع پر سرکاری جلوس کے دوران میں جناح کو قتل کر دینے کی سازش بھی ہے۔ جناح اور لیاقت نے ورزا تارا سنگھ اور دوسرے سکھ لیڈروں کو گرفتار کرنے کا مطالبہ کیا، لیکن پٹیل نے اس بات کی سخت مخالفت کی۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ جو بحران پہلے ہی قابو سے باہر ہے، اس طرح وہ اور شدت اختیار کر جائے گا۔ مونٹ بیٹن نے کہا کہ وہ گرفتاریوں کی حمایت کرنے پر تیار ہے بشرطیکہ مقامی حکام (یعنی جنکنز) یہ محسوس کریں کہ یہ ایک دانشمندانہ اقدام ہوگا۔"[۲۳]

۹ اگست کو جنکنز نے ۱۵ اگست سے پہلے سکھ لیڈروں کو گرفتار کرنے کی تجویز مسترد کر دی۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ گرفتاریوں سے موجودہ حالات کے بہتر ہونے کی بجائے مخدوش تر ہونے کا زیادہ احتمال ہے۔ چونکہ سرکاری جلوس میں مونٹ بیٹن نے بھی قائد اعظم کے ساتھ جانا تھا، اس لیے وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ اس فیصلے کو قبول کرنے میں اس کے لیے کوئی ذاتی وجہ ملامت نہیں۔

وجوہ خواہ کچھ بھی ہوں، نتیجہ بہر صورت وہی ڈھاک کے تین پات برآمد ہوا یعنی سکھ لیڈروں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی، حالانکہ مونٹ بیٹن کو پورے وثوق سے معلوم تھا کہ وہ قتل و غارت کی مہم منظم کرنے میں سرگرم ہیں۔ انتقالِ اقتدار سے صرف چھ دن پہلے سکھ لیڈروں کی گرفتاری شاید بے از وقت ہوتی، گو سردار پٹیل انہیں ۱۵ اگست کو آزاد کر دیتا۔ لیکن مونٹ بیٹن اگر ان کے اور جتھوں کے خلاف جون میں بلکہ جولائی میں بھی کارروائی کرتا تو اس کے نتائج یقیناً مفید ہوتے۔ گرفتاریوں سے اگر کوئی شورش پیدا ہوتی تو بعد کی نسبت جبکہ منظم تشدد کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں، بدرجہا زیادہ آسانی سے اس کا تدارک کیا جا سکتا تھا۔

تقسیم کے دنوں میں سب سے پہلے جو فیصلے کیے گئے، ان میں ایک فیصلہ پاکستان کے دارالحکومت کے طور پر کراچی کا انتخاب تھا۔ دفاعی اور دوسرے وجوہ کی بنا پر دارالحکومت صرف مغربی پاکستان کا ہی کوئی مقام ہو سکتا تھا۔ بنگال تقسیم کیا جا رہا تھا، اور مشرقی بنگال کو خود ڈھاکہ میں نیا دارالحکومت قائم

کرنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ کراچی پر جو سندھ کا دارالحکومت تھا، نگہِ انتخاب پڑنے کے کئی صریح وجوہ تھے مغربی پاکستان میں سندھ ہی واحد صوبہ تھا، جہاں مسلم لیگی وزارت برسرِ اقتدار تھی۔ پنجاب میں گورنر راج کا دور دورہ تھا، اور شمال مغربی سرحدی صوبہ میں کانگرسی وزارت برسرِ اقتدار تھی۔ حکومت سندھ نے از خود کراچی کو پاکستان کا دارالحکومت بنانے کی تجویز پیش کی تھی، اور گورنر ہاؤس، اسمبلی کی عمارت اور دوسری ضروری رہائش گاہیں مرکزی حکومت کی تحویل میں دینے کی پیشکش کی تھی۔

کراچی کے اور فوائد بھی تھے۔ یہ ایک صاف ستھرا جدید شہر تھا اور اس کی آب و ہوا معتدل تھی۔ ایک عمدہ بندرگاہ کے علاوہ فضائی اڈہ بھی موجود تھا، جن سے مشرقی پاکستان اور باہر کی دنیا کے ساتھ فوری طور پر ذرائع مواصلات بہم پہنچ رہے تھے۔ پھر یہ قائدِ اعظم کا مولد بھی تھا، اگرچہ کراچی کے انتخاب میں اس وجہ کو کوئی دخل نہیں تھا۔

لیکن جب ایک ٹیم کو اس مقصد کے لیے کراچی بھیجا گیا کہ وہ مرکزی حکومت کے لیے دفتری اور رہائشی ضروریات کا انتخاب و اہتمام کرے، تو بہت جلد مشکلات سامنے آگئیں۔ یہ بات ظاہر ہوئی کہ حکومت سندھ کی دریادلی گورنر ہاؤس اور اسمبلی کی عمارت کی پیشکش تک ہی محدود ہے۔ گورنر ہاؤس کو گورنر جنرل کی اقامت گاہ بنایا جانا تھا، اور اسمبلی کی عمارت کو آئین ساز اسمبلی کے علاوہ مرکزی سیکرٹریٹ کے ایک حصے کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا لیکن دفتری اور رہائشی ضروریات کے لیے بہت سی مزید عمارتیں درکار تھیں، اور اب سرکاری اختیار سے انہیں حاصل کرنا لازم تھا۔ عارضی نوعیت کی نئی عمارات بھی اگست کے اوائل تک جب عملے کی آمد شروع ہونے والی تھی، تیار نہیں ہو سکتی تھیں۔ کراچی بہت بڑا شہر نہیں تھا اور اس زمانے میں اس کی آبادی ساڑھے تین لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ بہت سی عمارتوں کو حکماً لینے سے اس کے شہریوں کو بڑی زحمت اٹھانی پڑتی، لیکن اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار بھی نہ تھا۔ مرکزی حکومت کے افسروں اور عملے کو بھی بڑی دشواریاں درپیش تھیں، اور جیسی بھی رہائش میسر تھی، انہیں اس میں گزر اوقات کرنی تھی۔ آمد کے وقت انہیں ٹھہرانے کے لیے خیموں کا ایک کیمپ نصب کیا جا رہا تھا، لیکن حتی الوسع جلد از جلد ان کے لیے بہتر بجلی اور رہائش کا انتظام کرنا ضروری تھا۔ حکومت سندھ نے اس معاملے میں کوئی مدد نہ کی۔ مرکزی حکومت کے وزیروں تک کے لیے مکان حاصل کرنے سے وہ قاصر تھے، اور انہیں اپنے گھروں میں بطورِ مہمان ٹھہرانے کی پیشکش کی!

وقت کا تقاضا روز بروز شدت پکڑ رہا تھا اور فوری اقدامات ضروری تھے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق تھا، تقسیم سے پیدا شدہ تمام امور میں (بشمول نئے دارالحکومت کے انتظامات کے) انتظامی معاملات کی ذمہ داری مجھ پر تھی۔ ان نازک حالات میں مَیں نے فوج کے جنرل ہیڈ کوارٹرز سے مدد چاہی، کہ وہ راولپنڈی میں منتقل ہونے کے لیے متبادل منصوبہ مرتب کریں، وہاں فوجی بیرکیں مل سکتی تھیں۔ لیکن متبادل منصوبے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ جب میں نے قائداعظم کے سامنے صورتِ حال بیان کی تو انہوں نے پُرزور انداز میں کہا کہ وہ وزرائے سندھ سے اپنا وعدہ پورا کرائیں گے۔ ان کی رائے میں سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ کراچی میں ایک بین الاقوامی فضائی اڈہ ہے، جس سے نہ صرف بیرونی دنیا تک رسائی آسان ہو گی بلکہ اس سے پاکستان کو دنیا کے نقشے پر جلوہ آرا کرنے میں بھی مدد ملے گی۔ سندھ کے وزیروں کو بلایا گیا اور قائداعظم نے انہیں تمام ضروری رہائشی اور دفتری سہولتیں بہم پہنچانے کا حکم دیا۔ اس سے مشکلات کافی حد تک دور ہو گئیں، اور کراچی کو حکومت پاکستان کا مستقر بنانے کے لیے مناسب تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ۱۵ اگست تک کسی نہ کسی طرح کراچی میں آنے والے ہزاروں کنبوں کے لیے رہائش کا انتظام ہو گیا، اور ہر وزارت اور محکمے کے دفاتر کے لیے بھی جگہ تلاش کر لی گئی یا بہ عجلت خام تعمیر کر دی گئی۔

عملے کی نقل و حرکت کی منصوبہ بندی اور انتظام کے لیے دہلی میں ایک دفترِ تبادلہ اور کراچی میں ایک دفترِ استقبالیہ قائم کر دیا گیا۔ دہلی سے تقریباً ۲۰ ہزار افراد اور ان کے ذاتی ساز و سامان کو سرکاری ریکارڈ اور ساز و سامان کے ساتھ منتقل کیا جانا تھا۔ تبادلے کے کام کا آغاز یکم اگست کو ہوا، اور روزانہ ایک سپیشل ٹرین روانہ کی جانے لگی۔

۲۰ اگست کو سپیشل ٹرین مشرقی پنجاب میں بھٹنڈہ جنکشن سے روانہ ہونے کے بعد پٹڑی سے اتر گئی۔ ریلوے لائن کو ڈائنامائیٹ سے اڑا دیا گیا تھا۔ تین گاڑیاں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں اور تین پٹڑی سے اتر گئیں۔ ریلوے لائن پر کئی بم رکھے گئے تھے، جو برقی تار سے منسلک تھے تاکہ ساری ٹرین کو بھک سے اڑا دیا جائے۔ لیکن خوش قسمتی سے صرف ایک ہی بم پھٹا اور نسبتاً کم جانی نقصان ہوا۔ ایک خاتون اور اس کا چار سالہ بچہ جان بحق ہو گئے اور ایک درجن کے قریب دوسرے مسافر زخمی ہوئے۔ حملہ کرنے کے لیے جو گروہ چھپے ہوئے تھے، محافظ فوجی دستے کی فوری کارروائی سے وہ مزید نقصان نہ پہنچا سکے۔ اس کے بعد ۲۴ اگست کو ایک اور واقعہ پیش آیا۔ اس وقت مشرقی پنجاب میں وسیع پیمانے پر

فسادات شروع ہو چکے تھے، چنانچہ حالات کے معمول پر آنے تک ریل گاڑی سے سفر کو بند کر دینے کا فیصلہ کیا گیا البتہ بی بی اینڈ سی آئی ریلوے کے ذریعے انتظامات کئے گئے۔ اس ریلوے کی مارواڑ سے حیدر آباد تک میٹر گاج پٹڑی تھی، لیکن ایک ہفتہ کے اندر اس انتظام کو بھی منقطع کرنا پڑا، کیونکہ اس ریلوے لائن کے علاقے میں بھی فسادات ہونے لگے، بہ حیثیت مجموعی ساڑھے گیارہ ہزار افراد نے ریل گاڑیوں سے سفر کیا۔

اب نقل و حمل کا واحد ذریعہ ہوائی جہاز رہ گئے تھے۔ ٹاٹا اور اورینٹ ایرویز نے طیارے بہم پہنچانا منظور کر لیا، لیکن ابھی انہوں نے ۱۰ پروازیں ہی کی تھیں کہ ہندوستان کی حکومت نے ان کے تمام ہوائی جہازوں کی خدمات حکماً اپنی تحویل میں لے لیں۔ اس کے بعد بی او اے سی سے رجوع کیا گیا، جس نے ۲۰ طیارے ہمارے لیے مخصوص کر دیئے۔ بی او اے سی کی پروازوں کو "آپریشن پاکستان" کا نام دیا گیا۔ اس کی پروازیں ۱۴ ستمبر کو شروع ہوئیں اور ۳۰ ہزار افراد نے ان کے ذریعے سفر کیا۔ اس زمانے میں دہلی بھی فسادات کی لپیٹ میں آ چکا تھا اور لوگوں کو شہر سے ہوائی اڈہ تک پہنچانے کے لیے سواری نایاب تھی، مسلمانوں پر روز روشن میں حملے کئے جاتے، اور انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ دہلی کے سول حکام کوئی مدد نہیں کرتے تھے اور ذرائع نقل و حمل مہیا کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ چنانچہ فوج کے جنرل ہیڈ کوارٹرز کی مدد سے فوجی ٹرک حاصل کئے گئے، اور کچھ مسلمان فوجی سپاہی مسافروں کی حفاظت کے لیے پہرہ دیتے تھے۔ ستمبر کے وسط میں جب دہلی سے مسلم مہاجرین کو پاکستان پہنچانے کے لیے خاص ریل گاڑیاں چلائی گئیں، تو ہزاروں سرکاری ملازمین نے بھی ان گاڑیوں کے ذریعے سفر کیا۔ بہت سی گاڑیوں پر سکھوں نے حملے کئے، اور کثیر تعداد میں مسافر شہید کر دیئے گئے۔

جن سرکاری ملازمین نے پاکستان کے حق میں فیصلہ کیا تھا۔ ہندوستان کے تمام حصوں سے ان کی بہت بڑی تعداد بمبئی پہنچ گئی۔ ان میں بیشتر ریلوے ملازمین تھے۔ بمبئی میں ایک علیحدہ دفتر تبادلہ قائم کر دیا گیا، جس نے ۲۰ ہزار پاکستانی ملازمین اور ان کے اہل و عیال کو کراچی پہنچانے میں خدمات سرانجام دیں، یہ کام اکتوبر ۱۹۴۷ء سے سال ختم ہونے تک جاری رہا۔

تقسیم کے مسائل میں ایک مسئلہ پاکستان کے لیے عبوری آئین کا مسودہ تیار کرنا بھی تھا۔ قانون آزادیٔ ہند ۱۹۴۷ء میں یہ شق رکھی گئی تھی کہ جب تک ہر ڈومینین کی آئین ساز اسمبلی کوئی اور قانون نہیں بنائے گی ہر ڈومینین اور اس کے تمام صوبوں اور دوسرے علاقوں میں حکومت کا کاروبار حتی الوسع گورنمنٹ
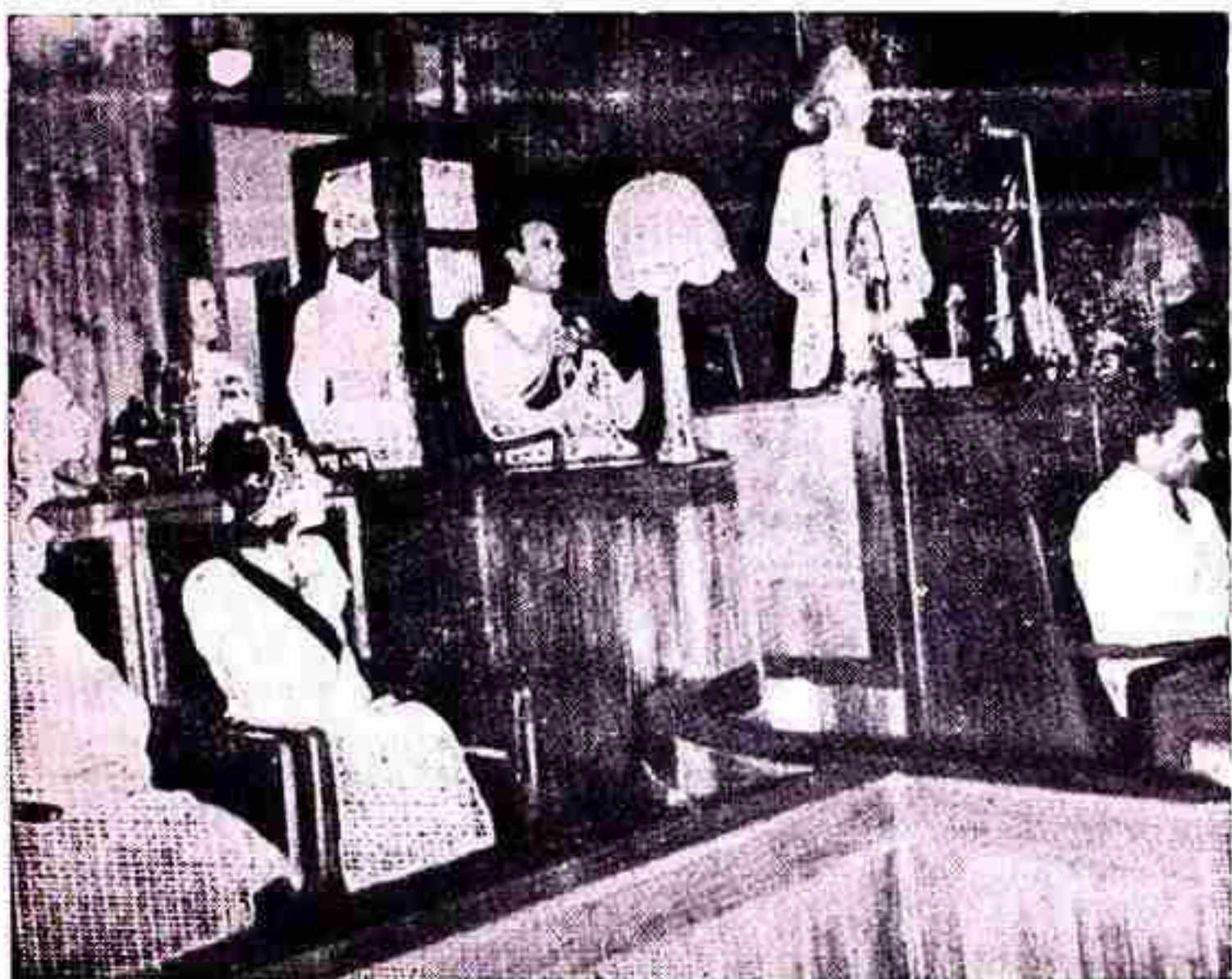
قائد اعظم اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن پاکستان کی دستور ساز اسمبلی
کے پہلے اجلاس سے خطاب کر رہے ہیں۔

آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے مطابق چلایا جائے گا" سوائے ان محذوفات، اضافہ جات، ترامیم اور تبدیلیوں کے جو ہر ڈومینین کے لیے علیحدہ علیحدہ ہوں گی اور جن کے لیے گورنر جنرل کی طرف سے فرمان جاری کئے گئے ہوں گے۔ اگرچہ ترمیم شدہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کو وائسرائے نے ہی نافذ کرنا تھا لیکن اس امر پر مفاہمت ہوگئی تھی کہ اس کی توثیق محض رسمی ہوگی، اور پاکستان کے لیے عبوری آئین کو اسی شکل میں نافذ کیا جائے گا جس کی سفارش قائداعظم کریں گے۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں ترمیم کے فرائض جسٹس محمد شریف کو تفویض کئے گئے، اور انہوں نے یہ کام زیادہ تر قائداعظم کی براہ راست رہنمائی میں کیا۔

عبوری آئین وفاقی نوعیت کا تھا، اور بھارت، کینیڈا اور آسٹریلیا کی طرز پر تھا۔ پاکستان کے پانچ صوبے تھے۔ مشرقی بنگال، مغربی پنجاب، سندھ، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں تقسیم اختیارات گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے ہی مطابق تھی۔

دوسری ڈومینیوں کی طرح پاکستان کا گورنر جنرل بھی آئینی سربراہ تھا۔ کیمبل جانسن کا یہ الزام بالکل بے بنیاد ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے نویں گوشوارہ کے تحت قائداعظم نے "ایسے آمرانہ اختیارات" مانگے اور لیے جو کہ کسی بھی آئینی گورنر جنرل کو حاصل نہیں تھے۔" حقیقت یہ ہے کہ پاکستان (عبوری آئین) آرڈر ۱۹۴۷ء میں گورنر جنرل کو کوئی خاص اختیارات نہیں دیئے گئے تھے اور نواں گوشوارہ تو حذف ہی کر دیا گیا تھا۔

پاکستان کی کابینہ وزیراعظم اور دوسرے وزیروں پر مشتمل تھی اور وفاقی مقننہ کے سامنے جوابدہ تھی۔ پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کو دوہری حیثیت میں فرائض ادا کرنے تھے۔ آئین ساز ادارہ کے طور پر اور وفاقی مقننہ کی حیثیت سے، ابتدا میں آئین ساز اسمبلی کے ارکان کی تعداد ۶۹ تھی، لیکن ریاستوں کے الحاق کے بعد یہ تعداد ۷۹ تک بڑھا دی گئی۔

۱۱ اگست کو قائداعظم آئین ساز اسمبلی کے صدر منتخب ہو گئے۔ ہندوستان میں گورنر جنرل اور آئین ساز اسمبلی کے صدر کے عہدوں پر دو مختلف افراد فائز تھے۔ قائداعظم آئین ساز اسمبلی کی صدارت کا مزید بار اٹھانے پر اس لیے رضامند ہو گئے تاکہ وہ آئین سازی کے انتہائی اہم کام کی رہنمائی اور نگرانی کر سکیں۔ لیکن امور مملکت کے بڑھتے ہوئے بار، مہاجرین کی آمد، کشمیر کے اہم واقعات اور

مئی ۱۹۴۸ء کے بعد خرابیٔ صحت کے باعث وہ اپنی زندگی میں اس کام کی طرف توجہ مبذول کرنے سے معذور رہے۔

پاکستان کے قومی پرچم کا ڈیزائن بھی متعین کرنا تھا۔ اس مسئلے پر کافی بحث ہوئی۔ ہورنٹ بیٹن پرچموں اور علامتی نشانات کے بارے میں سند ہونے کا دعویدار تھا۔ اس نے بھی اس مسئلے میں بڑی دلچسپی لی۔ مسلم لیگ کا سبز پرچم جس پر مسلمانوں کا روایتی نشان ہلال اور ستارہ تھا، جوں کا توں اختیار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اس طرح مملکت اور ایک خاص سیاسی پارٹی باہم یکساں ہو جاتیں۔ دوسری طرف یہ بات بھی تھی کہ قومی پرچم کی امتیازی خصوصیت مسلم لیگ کے پرچم سے ہی لی جانی تھی۔ بالآخر مسلم لیگ کے پرچم میں اقلیتوں کی نمایندگی کے لیے سفید دھاری کا اضافہ کرنے کا فیصلہ ہوا۔ ہورنٹ بیٹن کی تجویز پر ہلال اور ستارہ کا رخ بمقدار ۴۵ ڈگری گھما دیا گیا، تاکہ ہلال پرچم کی مشابہت نئے چاند سے اور زیادہ قرینِ حقیقت ہو جائے۔

باب ۱۰

ریڈکلف کا ایوارڈ

۳؍جون کے منصوبہ تقسیم میں یہ دفعہ رکھی گئی تھی کہ :-

"جونہی کسی ایک صوبہ (پنجاب اور بنگال) کی تقسیم کے بارے میں فیصلہ ہو جائے گا، گورنر جنرل ایک بونڈری کمیشن مقرر کرے گا، جس کی رکنیت اور شرائطِ کار کو متعلقہ لوگوں کے مشورہ سے طے کیا جائے گا۔ اس کمیشن کو مسلمانوں اور غیر مسلموں کی اکثریت کے متصلہ علاقوں کی اساس پر پنجاب کے دونوں حصوں کی سرحدوں کا تعین کرنے کی ہدایت کی جائے گی۔ اسے دوسرے عوامل کو بھی ملحوظ رکھنے کی ہدایت کی جائے گی۔ ایسی ہی ہدایات بنگال بونڈری کمیشن کو بھی دی جائیں گی۔ جب تک کسی بونڈری کمیشن کی رپورٹ پر عمل درآمد نہیں ہوگا ان عارضی سرحدوں سے ہی کام چلایا جائے گا۔ جن کی نشاندہی ضمیمے میں کی گئی ہے۔"

ضمیمے میں ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت

اضلاع کی فہرست دی گئی تھی۔

سرحدوں کا مسئلہ مشکلات اور فتنہ خیز امکانات سے معمور تھا۔ کسی اور بات سے اتنا مناقشہ اور جذبات میں ہیجان برپا نہیں ہوا تھا جتنا کہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم سے۔ ہر صوبے میں خطِ تقسیم نے گنجان آباد علاقوں سے گزرنا تھا اور لاکھوں افراد کی قسمت پر اثر انداز ہونا تھا۔ اس خط نے ایک ہم آہنگ معیشت اور سڑکوں اور ریلوں کے واحد نظام مواصلات کو دو حصوں میں کاٹ دینا تھا۔ پنجاب میں ان کے علاوہ وسیع نہری اور برقابی نظام کا مسئلہ بھی تھا۔ جلد بازی اور بے اصولی سے کھینچا ہوا خط بے پایاں اقتصادی نقصان اور شدید مشکلات کا باعث بن سکتا تھا۔ ایسی صورت میں عین ممکن تھا کہ کئی ایک گاؤں کے لوگ خود تو بین الاقوامی سرحد کے اس پار ہوں اور ان کے کھیت دوسری جانب ہوں۔ اس نوعیت کے لاتعداد مسائل پیدا ہونے کا امکان تھا۔ ایسے پیچیدہ اور مشکل کام کے لئے کئی مہینوں تک پوری احتیاط سے مطالعہ اور جائزہ درکار تھا۔ لیکن مونٹ بیٹن اور کانگرس کے لیڈروں کے درمیان زود تر انتقال اقتدار کا جو سودا ہو چکا تھا، اس کی وجہ سے یہ کام چند ہفتوں کے اندر پایۂ تکمیل تک پہنچایا جانا تھا۔

ہر بونڈری کمیشن ہندوستان اور پاکستان کے مساوی تعداد میں نمائندوں اور ایک یا ایک سے زائد غیر جانب دار ارکان پر مشتمل ہونا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کے دعاوی میں تصادم ناگزیر تھا اور اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ بونڈری کمیشن میں ہندوستان اور پاکستان کے نمائندے کسی باہمی فیصلے پر متفق ہو جائیں گے۔ یعنی فیصلے کا دارومدار ہر بونڈری کمیشن کے غیر جانبدار رکن یا ارکان پر ہونا تھا۔ اس لئے لازم تھا کہ غیر جانبدار ارکان عالی مرتبہ اور مسلمہ دیانت کے مالک ہوں۔ تاکہ سب لوگ ان پر اعتماد کر سکیں۔ ایک تجویز یہ تھی کہ "سرحدوں کے تعین کے اہم اور پریشان کن مسئلے کو اقوام متحدہ کے سپرد کر دیا جائے لیکن نہرو معترض ہوا کہ اس طرح نہ صرف بے ڈھب ضابطوں میں اُلجھنے کا امکان ہے۔ بلکہ تاخیر کا بھی۔ جو ہمیں منظور نہیں"۔[۲] قائداعظم کی خواہش تھی کہ بونڈری کمیشنوں میں برطانیہ کے تین لاء لارڈ غیر جانبدار ارکان کے طور پر مقرر کر دیئے جائیں۔ لیکن انہیں یہ جواب دیا گیا کہ لاء لارڈ بڑی عمر کے بزرگ

ہیں اور وہ برصغیر میں موسم گرما کی تیز تپش برداشت نہیں کر سکیں گے۔ اگر دو ماہ کے اندر انتقال اقتدار کا فیصلہ حائل نہ ہوتا تو قائداعظم اپنی تجویز پر اصرار کر سکتے تھے۔ چنانچہ مونٹ بیٹن نے انہیں ایک انگریز وکیل سر سیرل (اب لارڈ) ریڈکلف کو دونوں بونڈری کمیشنوں کا صدر مقرر کرنے پر راضی کر لیا اور اسے ثالثی فیصلہ (ایوارڈ) صادر کرنے کا اختیار دیدیا گیا۔ تقسیم کونسل نے اس تجویز کی توثیق کر دی۔ پنجاب بونڈری کمیشن میں پاکستان کی طرف سے دین محمد اور محمد منیر اور ہندوستان کی طرف سے مہر چند مہاجن اور تیجا سنگھ بطور ارکان مقرر ہوئے۔ بنگال بونڈری کمیشن میں پاکستان کے نمائندے ابو صالح محمد اکرم اور ایس اے رحمٰن، اور ہندوستان کے نمائندے سی سی بسواس اور بی۔ کے مکرجی تھے۔ یہ سب کے سب ہائی کورٹ کے جج تھے۔

ان کمیشنوں کی تشکیل جون کے آخر میں کی گئی۔ ریڈکلف ۸ جولائی کو پہنچا۔ ہر کمیشن کو "ہدایت کی گئی کہ وہ پنجاب / بنگال کے دونوں حصوں کی سرحدوں کا تعین مسلمانوں اور غیر مسلموں کی اکثریت کے متصل علاقوں کی اساس پر کرے اور اس سلسلے میں دوسرے عوامل بھی پیش نظر رکھے۔"

ہندوستان اور پاکستان دونوں نے تسلیم کیا کہ وہ بونڈری کمیشنوں کے ثالثی فیصلوں کو منظور اور نافذ کریں گے۔ تقسیم کونسل کے ۲۲ جولائی کے اجلاس میں پنجاب بونڈری کمیشن کی تشکیل کا اعلان کیا گیا۔ اس اجلاس میں سکھوں کی طرف سے بلدیو سنگھ شامل ہوا تھا۔ اجلاس کے بعد ایک سرکاری اعلان میں اس امر کی تصدیق کی گئی کہ :۔

> "دونوں حکومتوں نے بونڈری کمیشنوں کے ثالثی فیصلوں کو جو کچھ بھی وہ ہوں گے منظور کرنے کا عہد کیا ہے۔ بونڈری کمیشنوں کے اجلاس شروع ہو چکے ہیں۔ وہ اسی صورت میں اپنے فرائض سے تسلی بخش طور پر عہدہ برآ ہو سکتے ہیں کہ پبلک تقریروں یا تحریروں کے ذریعے معاً یا راست اقدام کی دھمکی دے کر یا کسی اور طرح ان کے کام میں مداخلت نہ کی جائے۔ دونوں حکومتیں اس مقصد کو کامیاب بنانے کے لئے مناسب کارروائی کریں گی اور جونہی ثالثی فیصلوں کا اعلان کیا جائے گا۔ دونوں حکومتیں منصفانہ طور پر فوراً انہیں نافذ کر دیں گی۔"

ریڈکلف نے کمیشنوں کے کھلے اجلاسوں میں کوئی حصّہ نہ لیا، اُن میں مسلم لیگ، کانگرس، سکھوں اور دوسرے متعلقہ فریقوں کے وکلا نے دلائل پیش کئے۔ اس نے کارروائیوں کے ریکارڈ اور پیش کردہ مواد کا مطالعہ کیا نقشوں کا بغور معائنہ کیا اور ہر کمیشن کے ارکان سے تبادلہ خیالات کیا۔ جیسا کہ توقع کی جاتی تھی کسی بھی کمیشن میں اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ "دوسرے عوامل" کی غیر معین اور مبہم اصطلاح نے مبالغہ آمیز دعاوی کو شہ دی اور اس کام کی ذاتی مشکلات کو اور بھی بڑھایا اور اس طرح پنجاب اور بنگال دونوں کے لئے ثالثی فیصلے ریڈکلف نے تنہا صادر کئے۔

بنگال میں (نقشہ نمبر ۲ دیکھئے) سب سے اہم مسئلہ کلکتہ کے عظیم شہر کے مستقبل سے متعلق تھا۔ یہ شہر صوبے کا دارالحکومت، اس کی واحد بڑی بندرگاہ اور اس کی صنعت، تجارت، مواصلات اور تعلیم کا مرکز تھا۔ اس شہر نے دیہی علاقوں کی ساری دولت کو جذب کر لیا تھا۔ دو صدیوں تک بنگال کے مسلمان کسانوں نے خون پسینہ ایک کیا اور ان کی محنتِ شاقہ کے سارے ثمرات کلکتہ چلے گئے۔ ہند کی بیشتر پٹ سن اور اس کی عمدہ اقسام کم و بیش تمام تر مشرقی بنگال ہی میں پیدا ہوتی تھیں لیکن پٹ سن کے سارے کارخانے کلکتہ میں یا اس کے قریب واقع تھے۔ کلکتہ کے بغیر مشرقی بنگال ایک "دیہاتی خستہ حال علاقہ" رہ جائے گا۔ یہ مثل ایک انگریز ٹائی سن نے کہی جو گورنر بنگال کا سیکرٹری تھا۔ پاکستان دو حصّوں میں منقسم تھا، جن کے درمیان ایک ہزار میل ہندوستان کا علاقہ حائل تھا۔ لہٰذا اس کے لئے بحری مواصلات کی ضرورت اور اس سلسلہ میں کلکتہ کی بندرگاہ کی اہمیت بیان سے باہر تھی۔ کلکتہ کی بدولت پاکستان مستقبل کی طرف پورے اعتماد سے گامزن ہو سکتا تھا اور اس کے بغیر پاکستان کی معاشی توانائی غیر یقینی تھی۔ اسی وجہ سے کانگرسی لیڈر پاکستان کو کلکتہ سے محروم کرنے پر تلے ہوتے تھے اور اسے ہندوستان میں ہی رکھنے پر مصر تھے۔ اس طرح کانگرس اور مسلم لیگ میں کلکتہ ہی سب سے بڑا متنازعہ فیہ امر تھا۔۔ ایک بہت بڑی نعمت جس کی دونوں ہی دل و جان سے خواہاں تھیں اور جس کے لئے وہ آخری حد تک کوشش کرنے کے لئے تیار تھیں۔ صرف ایک صورت تھی جس سے دونوں فریقوں کے دعاوی میں تصادم کی نوبت نہ آتی۔ گورنر بنگال سر فریڈرک بروز کلکتہ کو ایک آزاد بندرگاہ بنانے کا پُرزور حامی تھا جس کی سہولتیں مشرقی اور مغربی بنگال دونوں کو حاصل ہوتیں۔ لیکن ماؤنٹ بیٹن نے

بنگال تقسیم کے بعد
پاکستان وہندوستان کی سرحد
۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو
دارجلنگ
مغربی بنگال
کوچ بہار
دریائے برہم پتر
آسام
بہار
راجشاہی
مرشدآباد
سلہٹ
تری پورہ
ڈھاکہ
نادیہ
مغربی بنگال
جیسور
نواکھلی
کلکتہ
کھلنا
۲۴ پرگنا
چاٹگام
مدناپور
خلیج بنگال
Scale of Miles
0
50
100
150
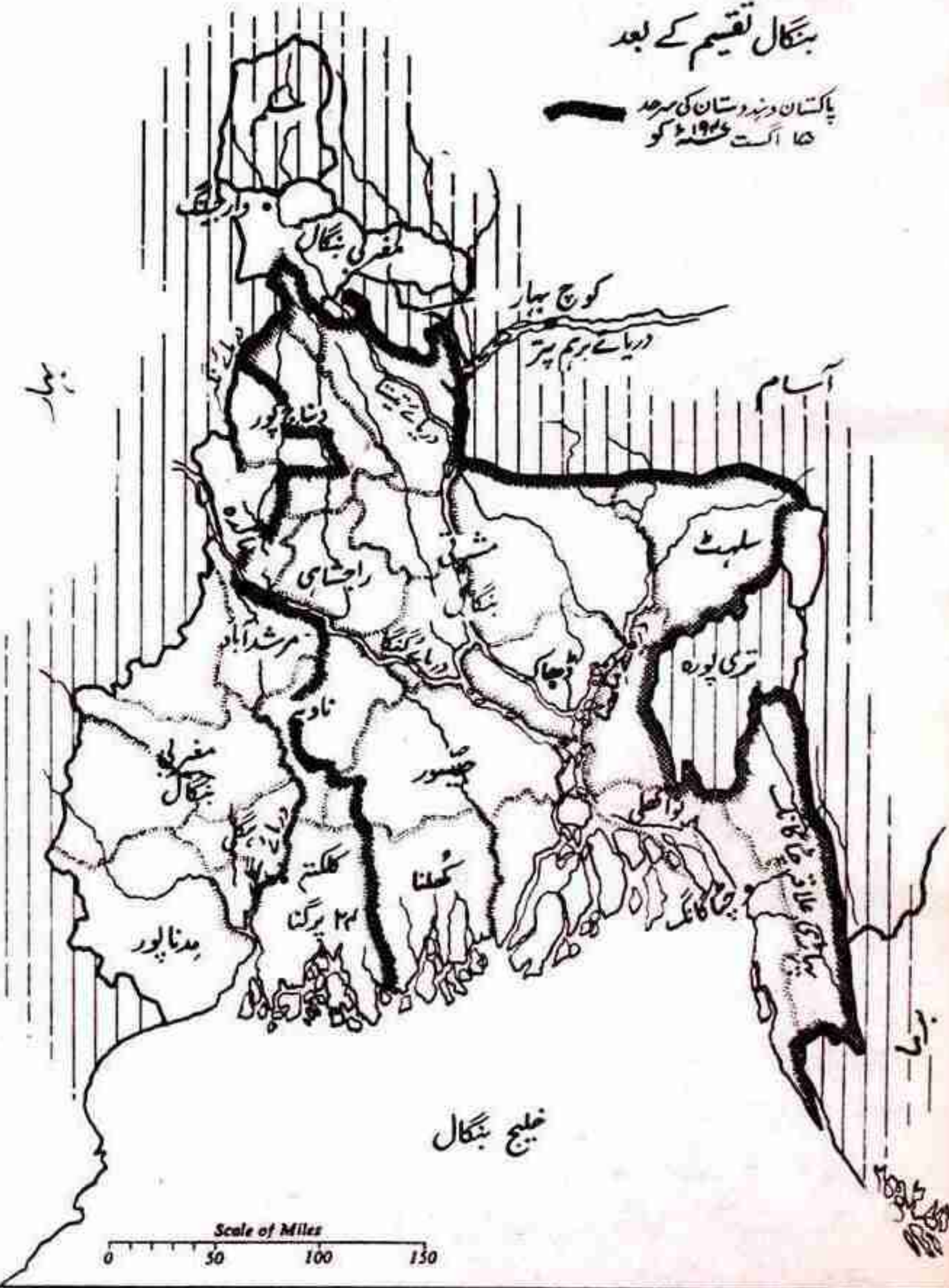
اس تجویز کو یکسر خارج از امکان قرار دیدیا۔

کلکتے میں مسلمانوں کی آبادی صرف ایک چوتھائی تھی، لیکن اس کا عقبی علاقہ جس پر بطور شہر اور بندرگاہ کے کلکتہ کا انحصار تھا، مسلم اکثریت کا علاقہ تھا۔ کلکتہ کی تعمیر و ترقی میں مشرقی بنگال کے وسائل کا بہت زیادہ حصّہ تھا۔ اس کے ملاح اور بندرگاہی مزدور بھی زیادہ تر مشرقی بنگال سے ہی آئے تھے۔ اس لئے آبادی کے لحاظ سے بھی کلکتہ اور اس کے گرد و نواح پر پاکستان کا دعویٰ بہت مضبوط تھا۔ کلکتہ پر مسلمانوں کے دعویٰ کا ایک اور اہم عنصر بھی تھا۔ کلکتہ کی آبادی کا بہت بڑا حصّہ اچھوتوں پر مشتمل تھا جو صوبائی اور کل ہند سیاسیات میں مسلم لیگ کے حلیف تھے۔ بنگال کے اچھوت لیڈر منڈل کو قائداعظم نے اکتوبر ۱۹۴۶ء میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں نامزد کیا تھا اور وہ عبوری حکومت میں مسلم لیگی بلاک کا رکن تھا۔ اگر کلکتے میں یہ فیصلہ کرانے کے لئے آزادانہ استصواب کرایا جاتا کہ کلکتے کو ہندوستان میں شامل ہونا چاہیے یا پاکستان میں، تو اس کا نتیجہ پاکستان کی فتح کی صورت میں برآمد ہوتا۔

مسلم لیگ کلکتہ کو جو اہمیت دیتی تھی۔ اور شہر کے متعلق اس کے مطالبے میں جو قوت تھی، ماؤنٹ بیٹن ان دونوں باتوں سے پوری طرح آگاہ تھا۔ کیمبل جانسن نے لکھا ہے کہ ۵ ۲ر اپریل کو اپنے عملے کے ایک اجلاس میں ماؤنٹ بیٹن نے "کلکتہ کے مستقبل کے بارے میں پیشگی اندیشہ کا اظہار کیا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ مسلمان اس کے لئے استصواب کا مطالبہ کرکے رہیں گے اور اس کی قسمت کا فیصلہ ایک بہت اہم مسئلہ بن جائے گا۔ لیکن اس کے خیال میں یہاں حق خود اختیاری کو عمل میں لانا بہت ناپسندیدہ ہوگا۔ کیونکہ اس سے غلط جواب حاصل ہونے کا احتمال ہے"۔ غلط جواب سے ظاہر ہے، ماؤنٹ بیٹن کا اشارہ مسلم لیگ کے حق میں فیصلہ سے تھا۔ اگر ماؤنٹ بیٹن فی الحقیقت غیر جانبدار ہوتا، تو بطور وائسرائے، اُسے اس بات سے سروکار نہیں ہونا چاہئے تھا کہ کلکتے کے لوگوں سے رجوع کرنے سے کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے؛ لیکن وہ غیر جانبدار نہیں تھا۔ اس کے برعکس، جیسا کہ بعد میں سردار پٹیل نے انکشاف کیا وہ کانگرس کے لیڈروں سے خفیہ معاہدہ کر چکا تھا کہ کلکتہ ہندوستان کو دیدیا جائے گا۔

۱۵۔ جولائی ۱۹۵۰ء کو کلکتہ میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے پٹیل نے کہا:

"ہم نے یہ شرط لگائی تھی کہ صرف اسی صورت میں ہم تقسیم پر رضامند ہوں گے کہ ہمیں کلکتہ سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ اگر کلکتہ جاتا ہے، تو پھر ہندوستان بھی نہیں رہتا"۔[۱۸] ظاہر ہے کہ یہ شرط مونٹ بیٹن سے ہی طے کی گئی تھی۔ حکومتِ برطانیہ کی منظوری حاصل کرنے کے لئے مونٹ بیٹن کے ابتدائی منصوبہ تقسیم کو لے کر اسمے ۲ر جولائی ۱۹۴۷ء کو لندن گیا تھا۔ اِسمے نے لکھا ہے کہ اس منصوبہ کے تحت "مشرقی بنگال اور مغربی پنجاب پاکستان کے حصے میں آنے تھے اور مغربی بنگال (جس میں کلکتہ شامل ہونا تھا) اور مشرقی پنجاب ہندوستان میں شامل کئے جانے تھے، سرحدوں کی حد بندی ایک بونڈری کمیشن کرے گا۔ جس کا صدر انگریز اور ایک ہندو اور ایک مسلمان رکن ہوں گے"۔[۱۹] مونٹ بیٹن کے منصوبہ تقسیم کے اس نہایت اہم حصے کو جس کے تحت کلکتہ کو ہندوستان کے حوالے کرنا تھا، مسلم لیگ سے پوشیدہ رکھا گیا۔ درحقیقت مونٹ بیٹن خوب جانتا تھا کہ مسلم لیگ ہرگز کسی ایسے منصوبہ تقسیم کو قبول نہیں کرے گی جس میں کانگرس کی یہ شرط کھلم کھلا شامل ہو کر کلکتہ ہندوستان کے حوالے کیا جائے۔ مسلم لیگ کو صرف یہ بتایا گیا کہ کلکتہ کے مسئلے کا فیصلہ بونڈری کمیشن پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ نہرو سرحدوں کی حد بندی کے مسئلے کو اقوام متحدہ کے سپرد کرنے کے کیوں خلاف تھا؟ اور مونٹ بیٹن نے قائداعظم کی یہ تجویز کیوں مسترد کر دی تھی کہ بونڈری کمیشن کے لئے برطانیہ سے تین لا۔ لارڈ مقرر کئے جائیں؟ ان سے یہ بات بھی جو پہلے ایک ناقابلِ توجیہہ حقیقت تھی واضح ہو جاتی ہے کہ ریڈکلف کی طرف سے فیصلہ صادر کئے جانے سے کئی دن پہلے کلکتے کی قسمت کھلے بازار معلوم تھی۔ اَین سٹیفنز نے، جو اس زمانے میں سٹیٹسمین کا ایڈیٹر تھا، ریڈکلف ایوارڈ کے وقتِ اعلان پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ ایک پہلے ہی افشار ہو گئی تھی اور وہ یہ تھی کہ کلکتہ ہندوستان کو دیا جانے والا ہے۔[۲۰] یہ بات کس طرح افشار ہوئی؟ بنگال بونڈری کمیشن کے پاکستان اور ہندوستان کے ارکان میں سمجھوتہ نہیں ہوا تھا اور انہیں کسی طرح ریڈکلف کے فیصلے کا علم نہیں ہو سکتا تھا اور یہ بات بھی ناقابلِ تصور ہے کہ ایسے اساسی معاملے میں ریڈکلف خود افشاء کا مرتکب ہوا ہو۔ ظاہر ہے کسی اور فریق کو پہلے سے ہی معلوم تھا کہ کیا ثالثی فیصلہ ہونے والا ہے اور یہ فریق کانگرس تھی، جیسا کہ ولبھ بھائی پٹیل نے انکشاف کیا۔

اپنے ثالثی فیصلے میں کلکتہ کے بارے میں ریڈکلف نے دو سوال کئے تھے:۔

"کس مملکت کو کلکتہ کا شہر دیا جائے یا کوئی ایسی صورت ممکن ہے کہ اس شہر کو دونوں مملکتوں میں تقسیم کر دیا جائے؟ اگر سارے کے سارا کلکتہ شہر کسی ایک مملکت کو دیا جانا ضروری ہو تو پھر وہ مملکت کیا ایسے علاقوں کی بھی حق دار ہوگی جن پر کلکتہ کی زندگی کا بحیثیت شہر اور بندرگاہ دار و مدار ہے مثلاً نادیہ کا سارا دریائی نظام یا اس کا ایک حصہ یا کلکتی ندیاں"

یہ سوالات زیر بحث امر سے پوری طرح متعلق تھے اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ریڈ کلف کو کلکتہ کی اہمیت کا پورا احساس تھا اور اس بنیاد کو بھی وہ پوری طرح سمجھتا تھا جس پر اس شہر کی تعمیر ہوتی تھی۔ لیکن اس نے یہ سوال پہلے سے متعین جواب دینے کے لئے کئے تھے۔ چنانچہ اس نے اپنے جواب کے حق میں کوئی دلائل دینے کی زحمت گوارا نہ کی۔

ریڈ کلف نے کلکتہ ہندوستان کے حوالے کر دیا اور کلکتے کے ساتھ اس نے مسلم اکثریت کا ضلع مرشد آباد سارے کا سارا اور مسلم اکثریت والے ضلع نادیہ کا بیشتر حصہ بھی ہندوستان کو عطا کر دیا اس طرح ۳۵ لاکھ آبادی والا قریباً ۲ ہزار مربع میل کا علاقہ جو عارضی طور پر پاکستان کا حصہ قرار دیا گیا تھا، پاکستان سے کاٹ لیا گیا اور مغربی بنگال کو منتقل کر دیا گیا۔ کلکتہ کا نقصان تو ناقابل تلافی تھا۔ البتہ اس کے عقبی علاقہ میں مسلم اکثریت کے اضلاع کاٹنے سے جو خسارہ پاکستان کو ہوا تھا اس کی تلافی کسی قدر ایک اور علاقے میں کر دی گئی۔ ریڈ کلف چٹاگانگ کے پہاڑی علاقوں کے بارے میں ایک مسئلہ زیر بحث لایا تھا: یہ ایسا علاقہ ہے، جس میں مسلم آبادی کا تناسب صرف ۳ فیصد ہے۔ لیکن اس علاقے کو کسی ایسی مملکت کو تفویض کرنا مشکل ہے، جو چٹاگانگ کے ضلع پر حاکمیت رکھنے والی مملکت سے مختلف ہو۔" چٹاگانگ کے پہاڑی علاقوں میں آبادی بہت ہی چھدری تھی اور کم و بیش بدھوں پر مشتمل تھی۔ ضلع چٹاگانگ میں زیادہ تر آبادی مسلمانوں کی تھی۔ ریڈ کلف نے چٹاگانگ کے پہاڑی علاقے پاکستان کو تفویض کرنے کا فیصلہ کیا۔

بنگال بونڈری کمیشن نے "ضلع سلہٹ کے مسلم اکثریت کے علاقوں اور آسام کے ملحقہ اضلاع کے متصلہ مسلم اکثریت والے علاقوں کی بھی حد بندی کرنی تھی"۔ بنگال بونڈری کمیشن میں پاکستان اور ہندوستان کے نمائندوں کے درمیان "آسام کے ملحقہ اضلاع" کی اصطلاح پر اختلاف

دائے پیدا ہو گیا۔ ریڈکلف نے ہندوستان کے نقطۂ نظر کو تسلیم کر لیا کہ اس سے مراد صرف وہ اضلاع ہیں جو ضلع سلہٹ سے ملحق ہیں۔ آبادی کی تقسیم اور مواصلات کی حالت ایسی تھی کہ ریڈکلف اس نتیجے پر پہنچا کہ قابلِ عمل تقسیم کے لئے کچھ علاقوں کا تبادلہ لازمی ہے۔" چنانچہ بعض غیر مسلم علاقے مشرقی بنگال میں شامل کر دیئے گئے۔ اور کچھ مسلم علاقے آسام ہی میں رہنے دیئے گئے۔ بعد میں مشرقی بنگال کو مغربی بنگال اور آسام سے علیحدہ کرنے والی سرحد پر تنازعہ ہو گیا۔ دسمبر ۱۹۴۸ء میں دہلی میں منعقدہ ایک مابین نوآبادیاتی کانفرنس میں یہ سمجھوتہ ہوا کہ اس تنازعہ کو رفع کرنے کے لئے ایک عدالتی ٹریبونل قائم کر دیا جائے۔ اس ٹریبونل کے ثالثی فیصلے پر ابھی تک ہندوستان نے پوری طرح عمل درآمد نہیں کیا۔ پاکستان اور ہندوستان کے وزرائے اعظم نے ۱۹۵۸ء میں ایک مشترکہ اعلان بھی کیا لیکن اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہندوستان کی حکومت اب تک بیرو باری یونین کو پاکستان کے حوالے کرنے سے انکار کر رہی ہے۔

پنجاب میں (نقشہ ۳ دیکھئے) کانگرس اور سکھوں نے مغرب کی طرف دریائے چناب تک سرحد لے جانے کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے اپنے اس مطالبے کی بنیاد زیادہ تر سکھوں کی خاص حیثیت پر رکھی اور مسلم اکثریت کے اضلاع گورداسپور، سیالکوٹ، گوجرانوالہ، لاہور، شیخوپورہ، منٹگمری اور لائل پور کو مشرقی پنجاب میں شامل کرنے کا دعویٰ کیا۔ ان کی نگاہ میں سکھ گوردواروں کو بہت اہمیت حاصل تھی، مثلاً ننکانہ صاحب جو ضلع شیخوپورہ میں واقع ہے۔ اسی بنا پر پاکستان سرہند، دہلی اور اجمیر کے لئے دعویٰ کر سکتا تھا۔ جہاں مسلمانوں کی بڑی متبرک زیارت گاہیں ہیں۔ سکھوں نے منٹگمری اور لائل پور کے زرخیز نہری اضلاع کا اس بنیاد پر مطالبہ کیا کہ سکھ نوآبادکاروں نے ان علاقوں کی ترقی میں بڑا حصہ لیا تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ مسلمان کاشت کاروں نے ان نئے سیراب ہونے والے علاقوں کو زیر کاشت لانے میں اُن سے بدرجہا زیادہ کام کیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فوجی خدمات کے صلے میں انگریزوں نے سکھوں کو بہترین زمینیں الاٹ کی تھیں۔ لیکن انصاف سے جائزہ لیا جائے تو ان علاقوں کی ترقی میں سکھوں کے مقابلے میں مسلمانوں کا حصہ بدرجہا زیادہ تھا کیونکہ ان اضلاع میں مسلمانوں کی زراعت پیشہ آبادی سکھوں سے چار گنا زیادہ تھی۔ اس حقیقت کو واضح کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوتی ہے کہ نہری علاقوں کی ترقی میں سکھوں کی کارکردگی
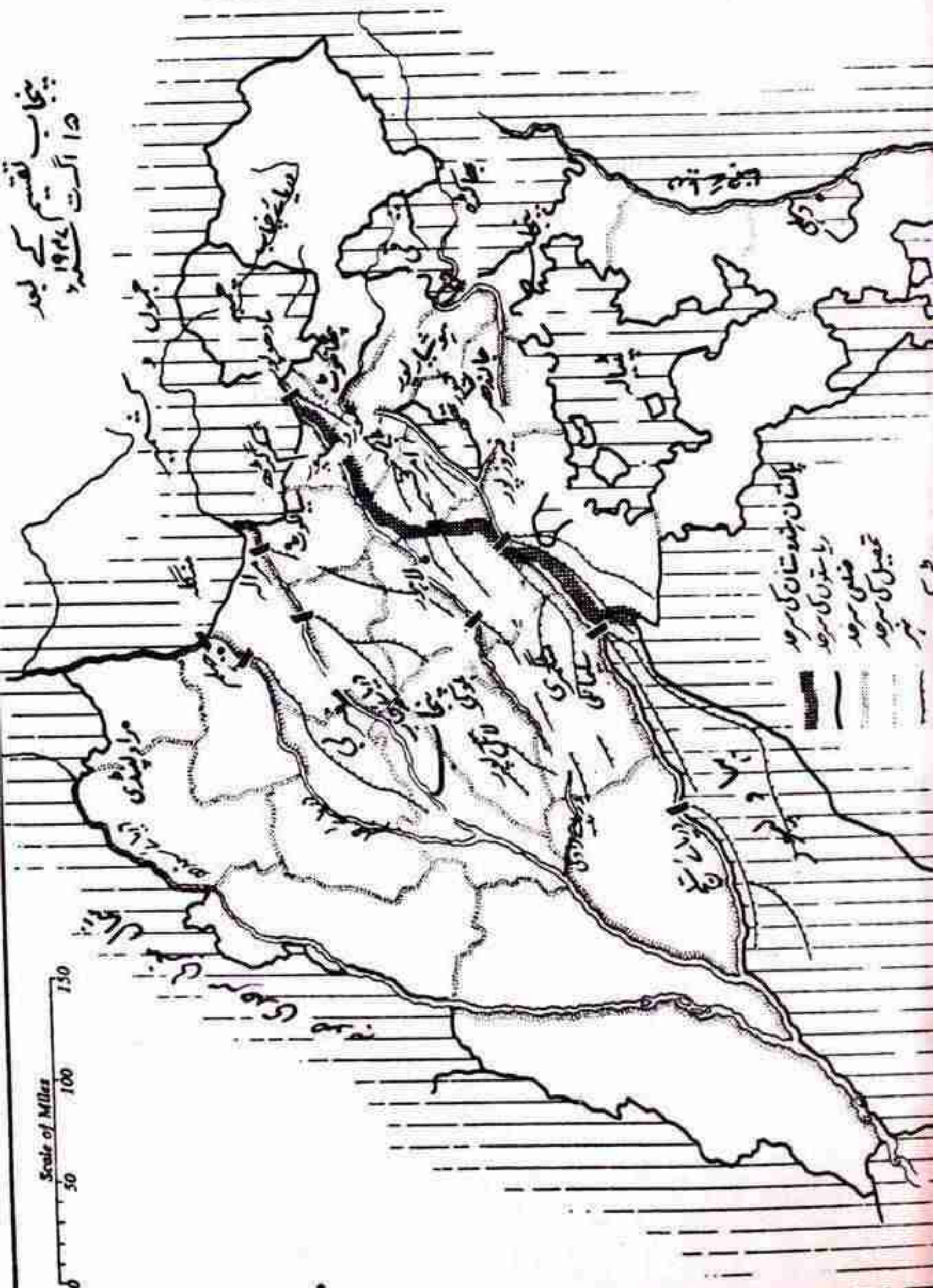
اکثر بہت بڑھا چڑھا کر بیان کی جاتی ہے۔ کانگرس اور سکھ لاہور کو بھی لینے پر اصرار کرتے تھے جو پنجاب کا دارالحکومت تھا۔ لاہور نہ صرف مسلم اکثریت کا شہر تھا بلکہ مسلم اکثریت کے ضلع میں واقع تھا اور مسلم اکثریت کے دوسرے علاقوں سے متصل بھی تھا۔ لیکن ہندو اور سکھ اپنے اس مطالبے پر اس قدر ہٹ دھرمی سے اڑے رہے کہ جب تک لاہور کی قسمت کے بارے میں ثالثی فیصلہ معلوم نہیں ہوگیا، انہوں نے مشرقی پنجاب کے لئے متبادل دارالحکومت کا انتظام نہیں کیا۔

سکھوں کی ہٹ دھرمی کو انگریزوں کے رویے نے بھی تقویت پہنچائی۔ ماؤنٹ بیٹن سے لے کر پنجاب میں انگریز افسروں تک سکھوں کو اپنے تقسیم پنجاب کے مطالبے کے نتائج سے بچانے کے لئے بڑے فکرمند تھے۔ ۴؍جون کو ماؤنٹ بیٹن کی پریس کانفرنس میں جب اس سے یہ سوال کیا گیا کہ سکھ قوم کی وحدت و سالمیت برقرار رکھنے کے لئے "منصوبہ تقسیم میں کیا اہتمام کیا گیا ہے"، تو اس نے جواب میں کہا:۔

> "انہوں نے (یعنی سکھوں نے) پنجاب کو مسلمانوں اور غیر مسلموں کی غالب آبادی پر مشتمل حصوں میں تقسیم کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ میں نے من وعن وہی کیا ہے، جس کے لئے سکھوں نے کانگرس [illegible] مجھ سے مطالبہ کیا تھا۔ اس مطالبے سے مجھے سخت صدمہ [illegible] کو پسند کرتا ہوں اور میں ان کا شائق ہوں اور ان کی فلاح [illegible] ہوں۔ میں نے ان کی امداد کے لئے سوچ کر کوئی ترکیب نکالنے کی [illegible] کی لیکن میں کوئی جادوگر نہیں ہوں"۔ ؂

"بیچارے سکھ! ہم ان کے لئے کیا کر سکتے ہیں؟" اس طرح کے کلمات [illegible] اور ماؤنٹ بیٹن کے عملے کے دوسرے لوگوں کی زبان پر جاری رہتے تھے۔ باؤنڈری کمیشن [illegible] کے بعد نائب وزیر مملکت برائے ہند آرتھر ہینڈرسن نے پارلیمنٹ میں [illegible] میں کہا کہ مشرقی اور مغربی پنجاب کے درمیان سرحد کا تعین کرنے میں [illegible] کمیشن کو ہدایت دے دی گئی ہے کہ وہ پنجاب میں سکھوں کے مذہبی مقامات کے محل وقوع کو ملحوظ رکھے۔ قائداعظم اور لیاقت علی خان نے اس بیجا مداخلت پر سخت احتجاج کیا، جس کا مقصد باؤنڈری کمیشن پر سکھوں

کے حق میں اثر ڈالنا تھا۔

سکھ لڑنے کی تیاریاں کر رہے تھے اور انگریزوں پر بدعہدی کا الزام دھر رہے تھے کہ انہوں نے سکھوں کی سالمیت کی حفاظت نہیں کی۔ گورنر پنجاب جنکنز نے مونٹ بیٹن کو سکھوں کے مطالبات کا لب لباب پیش کیا۔ یہ مطالبات اس کے سامنے ایک سرکردہ سکھ لیڈر گیانی کرتار سنگھ نے پیش کیے تھے:۔

"سکھ اسی طرح اپنی سرزمین کے حقدار ہیں، جس طرح ہندو یا مسلمان ہیں۔ انہیں ننکانہ صاحب میں اپنی مذہبی زیارت گاہ لازماً ملنی چاہئے۔ اسی طرح کم ازکم ایک نہری نظام بھی۔ اور سب سے آخر میں یہ کہ مغرب سے سکھ آبادی کا کم ازکم تین چوتھائی حصہ مشرقی پنجاب میں منتقل کرنے کا بندوبست ہونا چاہئے...... گیانی نے کہا کہ اگر اس امر کو تسلیم نہیں کیا گیا ..... کہ یہ سکھوں کی موت اور زیست کا مسئلہ ہے تو فساد ہوگا اور وہ لڑنے پر مجبور ہو جائیں گے"۔ [۸]

جنکنز کو خود بھی سکھوں سے بہت ہمدردی تھی۔ یہ بات اُس خط سے واضح ہو جاتی ہے۔ جو اس نے وائسرائے کو لکھا: "میرے خیال میں سکھوں کا یہ دعویٰ کہ مغرب کی نہری نوآبادیوں میں ان کو حصہ ملنا چاہئے۔ کافی وزن دار ہے۔ بلکہ مشرقی پنجاب کے دوسرے لوگوں کو بھی ایسے دعوے کا حق ہے۔ اور گیانی کا یہ خیال کہ ضلع منٹگمری مشرقی پنجاب کو دے دیا جائے ایسا مضحکہ خیز نہیں، جیسا کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے"۔ [۹] چنانچہ یہ مقام حیرت نہیں کہ جب تارا سنگھ نے سکھ اکثریت والے پنجابی صوبہ کے حصول کے لئے ۱۹۶۱ء میں مرن برت شروع کیا، تو اس نے برت توڑنے کے لئے یہ شرط پیش کی کہ حکومت ہندوستان جنکنز کو ثالث مقرر کر دے۔ اور اس بات پر تو کیا حیرت ہوگی کہ ہندوستان کی حکومت نے اس پیشکش کو قبول نہیں کیا۔ قدرتی طور پر مسلم لیگ چاہتی تھی کہ جہاں تک ممکن ہو سرحد مشرق کی طرف ہٹا دی جائے۔ اس نے سارے لاہور ڈویژن اور جالندھر ڈویژن کے ایک حصے کا دعویٰ کیا۔ مجموعی حیثیت سے مسلم لیگ کا مطالبہ متصلہ مسلم اکثریت کے علاقوں اور غیر مسلم اکثریت کے علاقوں کے مابین حدِ فاصل سے زیادہ متجاوز نہیں تھا۔ ریاست

بہاول پور ستلج ویلی پراجیکٹ کی نہروں سے سیراب ہوتی تھی۔ اسے بھی سرحد سے متعلق ثالثی فیصلہ سے گہری دلچسپی تھی۔ چنانچہ اس نے بھی پنجاب بونڈری کمیشن کے سامنے ایک عرضداشت پیش کی۔ بہاول پور مسلم اکثریت کی ریاست تھا۔ اس کا حکمران بھی مسلمان تھا اور اس کے مفادات مغربی پنجاب کے مفادات سے کلی طور پر ہم آہنگ تھے۔ ریاست بیکانیر نے بھی پنجاب بونڈری کمیشن کے سامنے عرضداشت پیش کی۔ یہ ہندو اکثریت کی ریاست تھی اور اس کا حکمران بھی ہندو تھا۔ اسے بھی دریائے ستلج سے نکلنے والی ایک نہر سیراب کرتی تھی۔

پنجاب میں ریڈکلف نے جو ثالثی فیصلہ دیا، اس میں متصلہ مسلم اکثریت کے متعدد علاقے پاکستان سے قطع کر دیئے، لیکن ہندوستان سے غیر مسلم اکثریت کا ایک بھی علاقہ نہ لیا گیا۔ اگر ان فیصلوں کا جواز "دوسرے عوامل" کے الفاظ میں تلاش کیا جائے، تو یہ بات بہت ہی حیرت انگیز ہے کہ دوسرے عوامل ہمیشہ یکسانی کے ساتھ ہندوستان کے حق میں اور پاکستان کے خلاف ہی بروئے کار آئے۔ ضلع گورداسپور میں متصلہ مسلم اکثریت کی دو تحصیلیں گورداسپور اور بٹالہ ایک اور تحصیل پٹھانکوٹ کے ساتھ ہندوستان کو دے دی گئیں تاکہ ہندوستان اور ریاست جموں وکشمیر میں رابطہ قائم ہو جائے۔ ضلع امرتسر میں مسلم اکثریت کی تحصیل اجنالہ بھی ہندوستان کے حوالے کر دی گئی۔ ضلع جالندھر میں دریائے ستلج اور بیاس کے زاویہ میں واقع مسلم اکثریت کی دو تحصیلیں نکودر اور جالندھر ہندوستان کا حصہ قرار دی گئیں۔ دریائے ستلج کے مشرق میں ضلع فیروزپور کی دو مسلم اکثریت کی تحصیلیں زیرہ اور فیروزپور بھی ہندوستان کو منتقل کر دی گئیں۔ مسلم اکثریت کے یہ سب علاقے مغربی پنجاب سے متصل تھے۔

ان میں سے بعض علاقوں کو پاکستان سے علیحدہ کرنے کے لئے ریڈکلف نے کوئی وجہ پیش کرنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ اس نے صرف یہ کہا کہ اسے "پورا احساس ہے کہ میرے اس فیصلے پر جائز طور پر تنقید کی جا سکتی ہے۔ میرا یہ خیال ہے کہ جو بھی خطِ تقسیم کھینچا جائے، اس پر تنقید کی جا سکتی ہے۔" لیکن بعض علاقوں کے بارے میں اس نے کچھ نہ کچھ وجہ پیش کرنی ضروری سمجھی۔ اس کے الفاظ کو من وعن نقل کرنا خالی از فائدہ نہ ہوگا:

"دریائے ستلج کے مشرقی جانب اور دریائے بیاس اور ستلج کے زاویہ

میں واقع مسلم اکثریت والے کافی وسیع علاقے کے بارے میں مجھے دیر تک تامل رہا ہے۔ لیکن مجموعی حیثیت سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مغربی پنجاب کو دریائے ستلج کے پار کچھ علاقہ دینا کسی بھی مملکت کے حقیقی مفاد میں نہیں ہوگا مزید براں ریلوے مواصلات کا انقطاع اور نہری نظام میں رخنہ اندازی ایسے عوامل ہیں کہ اس خاص معاملے میں انہیں متصلہ اکثریتوں کے مقدم حقوق پر فوقیت ملنی چاہیے۔"

ریڈکلف کی یہ وضاحت یکسر ناقابلِ یقین ہے۔ دریائے ستلج کی مشرقی جانب پاکستان کو کچھ علاقہ ملنے سے پاکستان کے حقیقی مفادات کو کس طرح گزند پہنچ سکتی تھی؟ اور ریڈکلف کیونکر پاکستان کے حقیقی مفادات کا اندازہ پاکستان کے اپنے نمائندوں سے بھی بہتر طور پر کر سکتا تھا؟ اس نے جو سرحدی خط کھینچا تھا وہ دریاؤں کے گذرگاہ کے متوازی نہیں تھا، بلکہ ان کے آرپار گزر رہا تھا۔ جہاں تک ریلوے مواصلات کا تعلق ہے؟ جس طرح بھی سرحدی خط کھینچا جاتا، ان کا منقطع ہونا لازمی تھا۔

متصلہ اکثریتوں کے حقوق کو پس پشت ڈالنے کی دوسری وجہ یعنی نہری نظام میں رخنہ اندازی سے احتراز اور بھی زیادہ بودی ہے۔ فیروز پور ہیڈ ورکس سے، جو اس نے بھارت کو بخش دیا کوئی بھی نہر مشرقی پنجاب کے غیر مسلم اکثریتی علاقوں کو سیراب کرنے کے لئے نہیں بنائی گئی تھی بیکانیر نہر ایسی ریاست کو پانی بہم پہنچاتی تھی جو طاس سندھ سے ماوراء تھی اور ریڈکلف کے حدود تفویض سے باہر تھی۔ جن وجوہ کو ریڈکلف نے پیش کیا ہے۔ انہی وجوہ کی بنا پر ہی تو یہ مسلم اکثریتی علاقے پاکستان کو ملنے چاہئیں تھے۔ یہ علاقے ہندوستان کو دے کر اس نے اسی نہری نظام کو درہم برہم کر دیا۔ جسے برقرار رکھنے کا وہ بظاہر خواہاں تھا۔ اس نے اس سے بھی زیادہ نقصان دہ حرکت کی۔ اس نے سرحدی خط اس طرح کھینچا کہ فیروز پور ہیڈ ورکس ہندوستان میں شامل ہوگیا، حالانکہ اس ہیڈ ورکس سے نکلنے والی نہروں سے زیادہ تر پاکستان کے علاقے سیراب ہوتے تھے۔

اسی طرح ریڈکلف نے اپنی ثالثی فیصلے سے نہر اپر باری دوآب کے انقطاع کے نتائج کو سنگین تر بنا دیا۔ یہ نہر ضلع گورداسپور کی غیر مسلم اکثریتی تحصیل پٹھانکوٹ میں واقع مادھوپور ہیڈ ورکس

ہے نکلتی تھی لیکن اس سے زیادہ تر مغربی پنجاب اور اس سے متصل مسلم اکثریتی علاقے سیراب ہوتے تھے۔ ریڈکلف نے ان میں سے متعدد علاقے بھارت کو عطا کر دیئے۔ اس کے باوجود وہ نہر اپر باری دوآب کا شیرازہ منتشر کرنے سے بچا نہ سکا۔ ثالثی فیصلے کی رپورٹ میں اس نے لکھا:

"میں نہر اپر باری دوآب کے نظام سیرابی کو تقسیم سے بچانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ یہ نہر پٹھانکوٹ تحصیل میں مادھوپور سے نکل کر ضلع لاہور کی مغربی سرحد تک پھیلی ہوئی ہے اگرچہ اس انقطاع کے نتائج کی شدت کم کرنے کے لئے میں نے لاہور۔ امرتسر کی ضلعی سرحد میں معمولی تبدیلیاں کی ہیں۔" اگر وہ ضلع گورداسپور کی مسلم اکثریتی تحصیلیں گورداسپور اور بٹالہ اور ضلع امرتسر کی تحصیل اجنالہ کو بھارت کے حوالہ نہ کرتا، تو نہر اپر باری دوآب کے نظام سیرابی میں رخنہ اندازی بدرجہا کم ہوتی۔

مشرقی پنجاب کے مقابلہ میں مغربی پنجاب کا آبپاشی کے لئے نہری نظام پر کہیں زیادہ انحصار تھا۔ یہ نہری نظام برصغیر میں انگریزوں کے مفید ترین رفاہی کارناموں میں سے تھا۔ جن پانچ دریاؤں سے پنجاب (پنج آب) نے اپنا نام پایا تھا ان کے حیات افروز پانی نے ایک بنجر اور خشک علاقے کو ہند کا اناج گھر بنا دیا تھا۔ ریڈکلف نے ثالثی فیصلے سے ستلج اور راوی دریاؤں کے بہت اہم ہیڈورکس کا انتظام بھارت کی تحویل میں چلا گیا اور اس طرح مغربی پاکستان کی اقتصادی زندگی کو سخت خطرہ لاحق ہو گیا۔ یہ محض قیاسی امکان نہیں۔ بھارت نے اپریل ۱۹۴۸ء میں باقاعدہ عہد و پیمان کے باوجود نہری پانی کی بہم رسانی روک کر اس خطرے کا عملی ثبوت بھی پیش کر دیا۔

ریڈکلف نے جس طرح ضلع گورداسپور کو تقسیم کیا۔ اس سے پاکستان کو شدید ترضرب لگی۔ اس ضلع کی چار تحصیلیں تھیں اور ان میں سے صرف ایک پٹھانکوٹ میں غیر مسلم اکثریت میں تھے۔ باقی تین یعنی تحصیلیں گورداسپور، بٹالہ اور شکرگڑھ میں مسلمان اکثریت میں تھے۔ بہ حیثیت مجموعی اس ضلعے میں غیر مسلم اکثریت بہت معمولی تھی۔ لیکن اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ تحصیل پٹھانکوٹ میں غیر مسلم اکثریت کا تناسب بہت زیادہ تھا۔ ضلع گورداسپور ریاست جموں و کشمیر سے متصل تھا۔ اس ضلع کے مشرق کی جانب ہندوستان کے علاقہ میں اونچے پہاڑ تھے اور صرف اس ضلع کے میدانی علاقوں سے ہی ریل اور سڑک کے ذریعے ہندوستان کی رسائی جموں اور کشمیر تک ہو سکتی تھی۔ اگر ریڈکلف ہندوستان کو صرف غیر مسلم اکثریتی تحصیل پٹھانکوٹ دیتا تو ہندوستان پھر بھی جموں اور کشمیر تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس تحصیل کے جنوب میں مسلم اکثریت کی تحصیلیں بٹالہ اور گورداسپور سدِ راہ بن

جائیں۔ یہ دونوں مسلم اکثریتی تحصیلیں بھارت کے حوالے کرکے ریڈ کلف نے ریاست جموں و کشمیر سے ہندوستان کے رابطہ کی صورت پیدا کر دی اور اس طرح ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تلخ ترین تنازع کی راہ کھولدی۔

۴ جون ۱۹۴۷ء کو مونٹ بیٹن سے پریس کانفرنس میں یہ پوچھا گیا تھا کہ ۳ جون کے منصوبۂ تقسیم سے متعلق اُس نے گذشتہ شام کو جو نشری تقریر کی تھی' اس میں کیونکہ اُس نے دو ٹوک انداز میں یہ کہا تھا کہ "آخری سرحدوں کا تعین ایک بونڈری کمیشن کرے گا اور آخری سرحدیں یقیناً وہ نہیں ہوں گی جو عارضی طور پر اختیار کی گئی ہیں"۔ مونٹ بیٹن نے بلا توقف یہ جواب دیا۔ "میں نے یہ بات محض اس وجہ سے کہی تھی کہ میرے خیال میں پنجاب کے ضلع گورداسپور میں مسلم اکثریت ۵۰.۴ فیصد اور غیر مسلم ۴۹.۶ فیصد ہے۔ جیسا کہ آپ خود فوراً سمجھ جائیں گے۔ یہ قرین قیاس نہیں کہ صرف ۰.۸ فیصد کے فرق کی بنا پر بونڈری کمیشن اس سارے ضلع کو مسلم اکثریتی علاقوں میں شامل کر دیگا"۔ درحقیقت اس ضلع میں مسلم آبادی کا تناسب ۵۱.۱۴ فیصد تھا۔ لیکن یہ بات اسقدر اہم نہیں۔ جو بات اہم اور قابلِ ذکر ہے۔ وہ یہ ہے کہ مونٹ بیٹن نے ضلع گورداسپور کی آبادی کے اعداد و شمار کا بطورِ خاص گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس کی تقسیم پر زور دیا تھا۔ خواہ کس زاویہ سے دیکھا جائے، مونٹ بیٹن کا یہ بیان حد درجہ نامناسب تھا۔ اس کا مقصد ایک نازک مسئلے کے بارے میں پنجاب بونڈری کمیشن کے ایسے فیصلہ پر اثر انداز ہونا تھا' جو کشمیر کی قسمت کے لئے بے حد اہم تھا۔

بونڈری کمیشن کے قیام سے چند دن پہلے مونٹ بیٹن نے (جون ۱۹۴۷ء میں) کشمیر کا دورہ کیا تاکہ ریاست کے الحاق کے مسئلہ پر اس ریاست کے مہاراجہ کو کوئی فیصلہ کرنے کے لئے تاکید کر سکے۔ وی۔ پی۔ مینن نے لکھا ہے: "مونٹ بیٹن نے مہاراجہ کو یقین دلایا کہ ۱۵ اگست سے پہلے اگر اُس نے ایک یا دوسری ڈومینین سے الحاق کا فیصلہ کر لیا' تو اس سے کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی، کیونکہ وہ جس ڈومینین سے بھی الحاق کرے گا۔ وہ اپنے علاقے کے ایک حصّے کے طور پر اسے مضبوطی سے اپنی حفاظت میں لے لیگی"۔ لیکن کشمیر کے دفاع کے معاملے میں ہندوستان اور پاکستان مساوی نہیں تھے بلکہ ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کشمیر کے تمام مواصلات مغربی پاکستان کی جانب تھے اور ہندوستان کے ساتھ کوئی ربط و تعلق نہیں تھا۔ جب تک ضلع گورداسپور کو اس طرح تقسیم نہ کیا جاتا جس سے کشمیر تک ہندوستان کی رسائی ہو جاتی۔ ہندوستان نہ ریاست کو اپنی حفاظت میں لے سکتا تھا اور نہ اس کے دفاع کی ذمہ داری قبول کر سکتا تھا۔ افواج ہند کے ایک بڑے آزمودہ کار افسر لارڈ برڈ وڈ نے یہ خیال ظاہر کیا

ہے کہ "مسلم اکثریت کی تحصیلوں گورداسپور اور بٹالہ کو ہندوستان کے حوالے کرنے کا جو ثالثی فیصلہ ریڈکلف نے کیا اسی کی وجہ سے ہندوستان اپنی فوج کو جموں میں رکھ سکا۔ اس فوج کا بنیادی اڈہ پٹھانکوٹ کا آخری ریلوے سٹیشن تھا۔ اور اسی نے ہندوستان کو اس قابل بنایا کہ اُوڑی سے لے کر جرب میں سرحد پاکستان تک سارے علاقے میں اپنے دفاعی انتظامات مستحکم کر سکے"۔ [۲۱] یقیناً جو بات لارڈ برڈوڈ پر واضح تھی وہ لارڈ مونٹ بیٹن ایسے عظیم فوجی کمانڈر سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ اگر ریڈکلف کے ثالثی فیصلہ سے کافی عرصہ پہلے مونٹ بیٹن کشمیر کے مہاراجہ کو یہ یقین دلا رہا تھا کہ ہندوستان بھی پاکستان کی ہی طرح کشمیر کے دفاع کا تحفظ کر سکتا ہے تو کیا یہ بات بعید از امکان ہے کہ وہ ضلع گورداسپور کے متعلق بھی کانگرس کے لیڈروں سے اسی طرح سمجھوتہ کر چکا تھا جس طرح اس نے کلکتہ کے بارے میں کیا تھا؟

پنجاب میں ریڈکلف کا ثالثی فیصلہ کچھ اس نوعیت کا تھا کہ معاً خارجی مداخلت کا شبہ ابھر آیا۔ صرف مونٹ بیٹن اور اُس کے عملے کے ارکان ہی ریڈکلف پر اثر انداز ہونے کی حیثیت میں تھے۔ مونٹ بیٹن اس بات پر مصر تھا کہ وہ اور اس کے عملے کے ارکان ریڈکلف سے بالکل الگ تھلگ رہتے ہیں۔ ۴ جون کو مونٹ بیٹن نے اپنی پریس کانفرنس میں کہا "بونڈری کمیشن میں سب پارٹیوں کے نمایندے شامل ہوں گے۔ جہاں تک انسانی بس میں ہے حکومتِ برطانیہ کی طرف سے نہ کوئی مداخلت کی جائے گی اور نہ کوئی فیصلہ ٹھونسا جائے گا"۔ [۱۳] کیمبل جانسن نے لکھا ہے کہ مونٹ بیٹن نے اپنے عملہ کے ارکان کو بہت واضح الفاظ میں ہدایات دی تھیں کہ وہ ریڈکلف سے کوئی ربط و تعلق نہ رکھیں۔ [۱۴] لیکن چونکہ ریڈکلف کی اقامت گاہ اور دفتر کے لئے وائسرائے کے ایوان کے ہی ایک حصے میں انتظام کیا تھا، باہر کے کسی آدمی کے علم میں آئے بغیر اس کے ساتھ ساتھ محتاط ربط و تعلق برقرار رکھنا ممکن تھا۔ ایسے ربط و تعلق کی قطعی شہادت محض اتفاق سے مل گئی۔

گورنر پنجاب جنکنز نے جو کاغذات پیچھے چھوڑے ان میں پنجاب کے بارے میں ریڈکلف کے ثالثی فیصلہ کا خاکہ اتفاقاً اس کے جانشین سر فرانسس موڈی کے ہاتھ لگ گیا۔ یہ خاکہ وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری جارج ایبل نے جنکنز کی درخواست پر ۸ اگست ۱۹۴۷ء کو تیار کیا تھا۔ جنکنز پنجاب کی سرحدوں کے بارے میں ثالثی فیصلہ کے اہم خطوط معلوم کرنے کا خواہاں تھا تاکہ وہ ضروری انتظامی اور حفاظتی انتظامات کر سکے۔ یہ خاکہ بونڈری کمیشن کے سیکرٹری سے موصولہ اطلاعات کی بنیاد پر ایک

نقشے کی صورت میں مرتب کیا گیا تھا۔ اس خاکے کے مطابق فیروز پور اور زیرہ کی تحصیلیں پاکستان کا حصہ تھیں۔ لیکن ریڈکلف کے ثالثی فیصلے مورخہ ۱۲، اگست ۱۹۴۷ء میں یہ تحصیلیں ہندوستان میں شامل کر دی گئیں۔ ظاہر ہے کہ پاکستان کے لئے یہ نقصان دہ تبدیلی ان دو تاریخوں یعنی ۸، اگست اور ۱۲، اگست کے درمیانی وقفے میں ہوئی۔

بعض مورخین کے نزدیک اس خاکے کی دُرستی محلِ نظر ہے۔ کیونکہ یہ خاکہ جارج ایبل اور بونڈری کمیشن کے سیکرٹری کے مابین ٹیلیفونی گفتگو کی بنیاد پر بنایا گیا تھا۔ اس طرح انہوں نے اس خاکے اور ثالثی فیصلے کے درمیان تفاوت کی اہمیت گھٹانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس خاکے کا مقصد پوری صحت کے ساتھ ایک ایک گاؤں اور کھیت تک سرحد کا تعین کرنا نہیں تھا۔ اس کی ضرورت ایک انتظامی مقصد کے تحت محسوس کی گئی تھی۔ اس مقصد کے لئے وسیع انتظامی علاقوں مثلاً ان تحصیلوں کی نشاندہی کافی تھی جو ایک یا دوسری ڈومینین کا حصّہ بننے والی تھیں۔ رہی یہ بات کہ اس کی اساس ٹیلی فون کی گفتگو پر تھی۔ تو اس سے یہ خاکہ کسی صورت ناقابلِ اعتبار نہیں بن جاتا۔ لیکن اس امر کی تصدیق کے لئے مزید شہادت بھی موجود ہے کہ ریڈکلف نے اصل میں فیروزپور اور زیرہ کی تحصیلیں پاکستان میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر بعد میں اس نے خارجی مداخلت کے تحت اپنا ارادہ بدل دیا۔ پنجاب بونڈری کمیشن کے ایک رکن جسٹس دین محمد نے حکومتِ پاکستان کو اطلاع دی کہ جب ان تحصیلوں کا معاملہ پنجاب بونڈری کمیشن کے سامنے پیش ہوا اور کمیشن کے پاکستانی ارکان نے اپنے دلائل شروع کئے تو ریڈکلف نے یہ کہہ کر انہیں روک دیا کہ ایسے اظہر من الشمس موقف کے بارے میں دلائل پیش کرنا غیر ضروری ہے۔ اپنے ثالثی فیصلے میں ریڈکلف نے اعتراف کیا ہے کہ "دریائے ستلج کے مشرقی جانب اور بیاس و ستلج دریاؤں کے زاویہ میں واقع مسلم اکثریت والے کافی وسیع علاقوں کے بارے میں دیر تک تامل رہا"۔ سوال یہ ہے کہ بعد میں یہ تامل کیوں پیدا ہوا، جب کہ ریڈکلف نے خود ہی پہلے اسے ایک اظہر من الشمس موقف قرار دیا تھا؟ اور کس کی مداخلت اس تامل کا سبب بنی جس نے اس کے سابقہ فیصلے کو بالکل اُلٹ دیا؟

۹، اگست ۱۹۴۷ء کو میں قومی قرضہ کے بارے میں ہندوستان کی تجاویز پر قائداعظم اور لیاقت علی خان سے مشورہ کی خاطر ایک دن کے لئے کراچی گیا۔ کراچی سے دہلی واپس روانہ ہونے

سے قبل لیاقت علی خان نے مجھے بتایا کہ قائد اعظم کو پنجاب کی سرحدوں علی الخصوص ضلع گورداسپور کے بارے میں اغلب فیصلے کے متعلق بہت تشویشناک اطلاعات موصول ہوئی ہیں۔ امرتسر اور جالندھر کے اضلاع میں بھی متصلہ مسلم اکثریت کے علاقوں کو ہندوستان کے حوالے کئے جانے کا اندیشہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ دہلی واپس پہنچنے پر میں لارڈ اسمے سے ملوں اور اُسے قائد اعظم کی طرف سے یہ پیغام دوں کہ اگر سرحدیں درحقیقت وہی ہوئیں، جن کی ان اطلاعات میں پیش بینی کی گئی ہے تو اس بات کا پاکستان اور برطانیہ کے تعلقات پر شدید اثر پڑے گا، کیونکہ یہ برطانیہ کی صدقِ نیت اور آبرومندی کا معاملہ ہے۔
دہلی پہنچ کر میں ہوائی اڈے سے سیدھا وائسرائے کے ایوان میں گیا، جہاں لارڈ اسمے کام کرتا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ لارڈ اسمے اور ریڈکلف بند کمرے میں بات چیت کر رہے ہیں۔ میں نے اسمے کے فارغ ہونے تک انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد جب میں اُس سے ملا، تو میں نے اسے قائد اعظم کا پیغام دیا۔ جواب میں اسمے نے سرحد کے متعلق ریڈکلف کے آرا و افکار سے یکسر لاعلمی ظاہر کی اور دوٹوک الفاظ میں کہا کہ نہ ماؤنٹ بیٹن نے اور نہ اس نے خود کبھی ریڈکلف کے ساتھ اس سوال پر تبادلۂ خیالات کیا ہے۔ فیصلہ کلیتاً ریڈکلف کے ہاتھ میں ہے اور کسی قسم کا مشورہ نہ اسے دیا گیا ہے اور نہ کبھی دیا جائے گا۔ جب میں نے اسمے کو ان تفاصیل سے آگاہ کیا، جن کی اطلاعات ہمیں موصول ہوئی تھیں، تو اس نے کہا کہ میری باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آئیں۔ کمرے میں ایک نقشہ آویزاں تھا، میں نے اسے نقشہ کی طرف آنے کا اشارہ کیا تاکہ اس کی مدد سے میں اسے صورتِ حال سمجھا سکوں۔ پنجاب کے نقشہ پر پنسل سے ایک خط کھینچا ہوا تھا۔ یہ خط اس سرحد کے عین مطابق تھا، جس کی اطلاع قائد اعظم کو دی گئی تھی۔ میں نے کہا کہ اس کے بعد میری طرف سے کوئی مزید وضاحت غیر ضروری ہے کیونکہ وہ خط پہلے ہی نقشہ پر کھنچا ہوا ہے۔ جس کے بارے میں میں بات کر رہا ہوں۔ اسمے کا رنگ زرد پڑ گیا، اور بڑی گھبراہٹ میں اس نے یہ پوچھا کہ اس کے نقشے کو کون چھیڑتا رہا ہے؟ یہ خط آخری فیصلہ سرحد سے صرف ایک لحاظ سے مختلف تھا۔ ضلع فیروزپور کی مسلم اکثریت کی تحصیلیں فیروزپور اور زیرہ ابھی تک پاکستان کی جانب تھیں، جس طرح کہ جنکشن کے چھوڑے ہوئے خاکہ میں تھیں۔
ان تبدیلیوں کی اہمیت کے بارے میں قدرے وضاحت کی ضرورت ہے۔ فیروزپور اور زیرہ کی تحصیلوں میں سکھ اقلیت معتدبہ تھی، اس علاقے میں سکھ آبادی کا تناسب پنجاب میں

ان کے اوسط تناسب ۲ : ۱۳ سے قریب قریب دوگنا تھا۔ مونٹ بیٹن، اسمے اور وائسرائے کے عملے کے دوسرے ارکان سکھوں کی دلداری کے بہت خواہاں تھے۔ اس کی ایک وجہ تو افواج ہند میں ان کی سابقہ خدمات کا لحاظ تھا اور دوسرے اُن فسادات کے خطرے کو کم کرنا مقصود تھا جن کی سکھ دھمکیاں دے رہے تھے۔ جولائی ۱۹۴۷ء میں جب اِسمے لندن گیا تو واپسی پر میجر شارٹ کو اپنے ساتھ لے آیا جو سکھوں کے مقاصد کا دل وجان سے حامی تھا۔ پنڈرل مون اواخر جولائی میں دہلی میں میجر شارٹ سے ملا تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ موخر الذکر نے :۔

"فوراً یہ محسوس کر لیا کہ سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت کرانے کا وقت گزر گیا ہے۔ اب وہ سکھوں کی خاطر صرف یہی کر سکتا تھا کہ خط تقسیم کو کافی حد تک مغرب کی جانب کھینچنے کی پُر زور وکالت کرے تاکہ کچھ نہ کچھ نہری آبادیاں بھی ہندوستان کے اندر آجائیں۔ سکھوں سے تمام تر ہمدردی کے باوجود میرے خیال میں استحقاق کی بنا پر ایسا کام نہیں کیا جا سکتا تھا۔۔۔۔۔ دہلی میں شارٹ اور وی پی مینن سے مختلف موقعوں پر میری جو بات چیت ہوئی، اس میں میں اپنے اس نقطہ نظر پر جما رہا۔ مینن یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ سرحدی خط کو گھما پھرا کر آیا پنجاب میں فسادات کے خطرے کو کم کیا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں اس کا جواب نفی میں تھا۔"[15]

یہ بات یاد رہنی چاہئے کہ جس وقت میجر شارٹ مغرب کی جانب سرحدی خط کھینچنے کی پُرزور وکالت کر رہا تھا اور وی پی مینن اسے گھمانے پھرانے کی سوچ بچار کر رہا تھا۔ اس وقت سرحد کا مسئلہ کلیتہً ریڈکلف کے ہاتھ میں تھا اور سکھوں کی مدد ریڈکلف پر اثر ڈال کر ہی کی جا سکتی تھی۔ سکھوں کی دلداری کی یہ امیدیں کس قدر بے بنیاد تھیں۔ اس کا مظاہرہ پنجاب میں عام قتل وغارت سے ہو گیا جو سرحد کے بارے میں ثالثی فیصلہ کی اشاعت سے پہلے ہی شروع ہو گیا۔

کئی سال بعد جب میں لندن میں دولتِ مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس میں شریک ہوا تو ۱۰ ڈاؤننگ سٹریٹ میں منعقدہ ایک مجلسی تقریب میں ریڈکلف کا مجھ سے تعارف کرایا گیا۔ اتفاقاً اُس نے مجھ سے یہ پوچھا کہ میرا تعلق کس جگہ سے ہے؟ میں جواب میں یہ کہے بغیر نہ رہ سکا "میرا تعلق بٹالہ

اور تبلیغ دریاؤں کے زاویہ میں اس مسلم اکثریت کے علاقے سے ہے۔ جسے کسی جائز وجہ کے بغیر ہندوستان کے حوالے کرنے سے پہلے آپ متامل رہے تھے۔"

ماؤنٹ بیٹن نے یہ وعدہ کیا تھا کہ بونڈری کمیشن کے ثالثی فیصلے ۱۵ اگست سے کافی پہلے شائع کر دیئے جائیں گے تاکہ سرحد کے دونوں جانب انتظامی اور حفاظتی اقدامات کے لئے کافی مہلت مل جائے۔ اگر اس وعدہ کو ہی پورا کر دیا جاتا تو اس سے بھی پنجاب میں ہونے والے فسادات کم کرنے میں مدد مل سکتی تھی۔ جیسی کہ بقول این سٹیفنز، کلکتہ کی قسمت کے افشاء سے اس پرآشوب شہر میں فسادات سے بچنے میں مل گئی تھی۔[۵۵] کیمبل جانسن نے لکھا ہے کہ سرحدوں کے بارے میں ثالثی فیصلوں کی اشاعت کے متعلق ماؤنٹ بیٹن نے ۹ اگست کو کہا: "اگر اس کا بس چلا تو وہ اس بات کو ترجیح دے گا کہ ان فیصلوں کو منظر عام پر لانے کا کام یوم آزادی کی تقریبات کے بعد تک ملتوی کر دیا جائے.... جب ان کے اثرات یوم آزادی کی شان کو برباد نہیں کر سکیں گے"۔[۵۶] جب ماؤنٹ بیٹن نے یہ بات کہی، اس سے پہلے ہی پنجاب میں فسادات شروع ہو چکے تھے۔ لاکھوں انسانوں کی جانوں کو سخت خطرہ تھا۔ انسانی اقدار کا یہ عجیب پیمانہ تھا جو جشنِ یوم آزادی کے سُبک سر جذبات کو لوگوں کی جان اور عزت سے ارفع قرار دیتا تھا۔ بند ٹوٹنے کو تھا۔ بطور وائسرائے یہ ماؤنٹ بیٹن کی ذمہ داری تھی کہ وہ حتی الوسع حفاظتی اور احتیاطی اقدامات کرتا۔ اس کے برعکس انگریزی راج کے ان آخری دنوں میں اسے فکر تھی تو یہ کہ فسادات کا سیلاب اس وقت تک نہ پھوٹ بہے جب تک وہ وائسرائے ہے اور ذمہ داری انگریزوں پر ہی عائد ہوتی ہے۔

پنجاب اور بنگال کے متعلق اپنی رپورٹوں پر ریڈکلف نے ۱۲ اگست کو اور سلہٹ کی رپورٹ پر ۱۳ اگست کو دستخط ثبت کئے۔ ماؤنٹ بیٹن نے ۱۶ اگست کی سہ پہر کو ان کا اعلان کیا۔ اُس دن لیاقت علی خان اور میں پنجاب میں وحشت اثر صورتِ حالات پر بات چیت کرنے کے لئے دہلی گئے ہوئے تھے۔ وہاں ہی ہمیں ریڈکلف کی رپورٹیں دی گئیں۔ اور بہت دل گرفتہ ہو کر ہم نے انہیں پڑھا۔ اُسی دن شام کو وائسرائے کے ایوان میں ایک اجلاس ہوا، جس میں نہرو، سردار پٹیل، بلدیو سنگھ، لیاقت علی خان، راقم الحروف اور دوسرے لوگ موجود تھے۔ ماؤنٹ بیٹن نے ریڈکلف کے ایوارڈ کی بات چھیڑی۔ نہرو اور پٹیل تو خاموش رہے لیکن بلدیو سنگھ نے سکھوں سے ناانصافی کی شکایت کی جن

کے مقدس مقامات پاکستان میں رہ گئے تھے۔ جواب میں میں نے پاکستان سے متصل مسلم اکثریت کے اُن وسیع علاقوں کا ذکر کیا جو کسی وجہ کے بغیر ہندوستان کے حوالے کر دیئے گئے تھے۔ میں نے بلدیو سنگھ سے پوچھا کہ کیا وہ پنجاب میں غیر مسلم اکثریت کے کسی ایک بھی ایسے علاقے کی نشاندہی کر سکتا ہے۔ جسے پاکستان کا حصّہ قرار دیا گیا ہے؟ اس سوال کا بلدیو سنگھ کوئی جواب نہ دے سکا۔ میں نے اس کے بعد یہ کہا کہ سرحدی خط کسی صورت بھی مقدس مقامات کے مطابق نہیں ہو سکتا تھا۔ مسلمانوں کے کئی متبرک مقامات ہندوستان میں رہ گئے ہیں۔

ریڈکلف ایوارڈ پر تبصرہ کرتے ہوئے قائدِ اعظم نے ایک نشری تقریر میں کہا:۔

"ہند کی تقسیم اب قطعی اور ناقابلِ تنسیخ ہو چکی ہے۔ اس میں شک و شبہ نہیں کہ اس عظیم آزاد مسلم مملکت کی تشکیل میں ہمیں سخت ناانصافیوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ جہاں تک ممکن تھا۔ ہمیں سکیڑ دیا گیا ہے اور جو آخری ضرب ہمیں لگائی گئی ہے، وہ بونڈری کمیشن کا ثالثی فیصلہ ہے۔ یہ ثالثی فیصلہ نامنصفانہ، ناقابلِ فہم بلکہ کج رائے ہے۔ یہ غلط سہی، غیر منصفانہ سہی، کج رائے سہی عدالتی نہیں بلکہ سیاسی سہی لیکن ہم نے اسے قبول کرنے کا عہد کر رکھا ہے اور ہم اس کے پابند ہیں۔ باعزّت قوم کی طرح ہمیں لازماً اس کی پابندی کرنی ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہو تو ہو لیکن اس ایک اور ضرب کو بھی ہمیں استقامت، ہمّت اور امید کے ساتھ برداشت کرنا چاہیئے۔" [۳۱]

باب ۱۱

ریاستوں کا الحاق

ہند میں ریاستوں کی تعداد ۵۶۲ تھی، وہ ہند کے کم و بیش ایک تہائی رقبہ اور ایک چوتھائی آبادی پر مشتمل تھیں۔ اور برطانوی ہند کے انتظامی ڈھانچے سے باہر تھیں، ان کے حکمران مقامی راجے اور نواب تھے، جنہوں نے برطانیہ کو مقتدر اعلیٰ کے طور پر قبول کیا ہوا تھا۔ اکثر ریاستیں بہت چھوٹی تھیں، ان کے اختیارات اور دائرہ حکم بھی محدود تھے۔ لیکن ۱۴۰ ریاستیں پورے طور پر مختار تھیں۔ ان میں سب سے بڑی ریاستیں مثلاً حیدرآباد، میسور اور کشمیر رقبہ اور آبادی کے اعتبار سے برطانوی ہند کے صوبوں کی ہم پلہ تھیں۔

ریاستوں کے حکومت برطانیہ کے ساتھ تعلقات معاہدوں اور سمجھوتوں پر استوار تھے، جو ہند میں برطانوی راج کی بتدریج توسیع کے زمانے میں گفت و شنید کے ذریعہ کیے گئے تھے یا ٹھونس دیے گئے تھے۔ لیکن تمام ریاستوں کے خارجہ تعلقات اور خارجی و داخلی تحفظ کی ذمہ داری مقتدر اعلیٰ طاقت پر تھی۔ اور اسے بدنظمی کی صورت میں ریاستی حکمرانوں کے خلاف تادیبی کارروائی کرنے کا بھی اختیار حاصل تھا۔ ریاستوں کے ساتھ تعلقات کے ضمن میں وائسرائے برطانوی تاج کے نمائندہ کی حیثیت سے فرائض ادا کرتا تھا، اور ان کے امور و معاملات کے انتظام کے لیے ایک پولیٹیکل محکمہ براہ راست اس کے ماتحت تھا۔ بڑی ریاستوں

پولٹیکل محکمے کے افسروں کو بطور ریزیڈنٹ مامور کیا جاتا تھا۔ چھوٹی ریاستوں کے حلقے بنا دیئے گئے تھے اور ہر ایک حلقہ کی نگرانی ایک پولٹیکل ایجنٹ کے ذمے تھی۔ ریلوے، ڈاک اور تار اور کرنسی نے ریاستوں کو مختلف طریقوں سے برطانوی ہند کے ساتھ مربوط کر دیا تھا۔ اور وہ حکومت کے ماتحت اقتصادی نظام کا ایک حصہ بن گئی تھیں لیکن اپنے داخلی معاملات کے انتظام میں ریاستوں کے حکمران معاہدات اور مقتدر اعلیٰ کی قائم کردہ حدود کے اندر آزاد تھے۔

اگرچہ ریاستوں کے حکمران جانتے تھے کہ اپنے خاندانی سلسلوں اور اپنے حقوق اور مراعات کو برقرار رکھنے میں ان کے مفادات مشترک ہیں، لیکن حق تقدم، خطابات اور دیگر معاملاتِ آداب میں ایک دوسرے کے حسد کے باعث وہ باہم متفق نہیں تھے۔ اور اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کی نسبت باہمی مسابقت کا سودا ان کے سروں پر زیادہ سوار رہتا تھا۔ تاہم یہ احساس و شعور بھی بڑھ رہا تھا کہ برطانوی ہند میں حالات کی رفتار سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

چیمبر آف پرنسز کی تنظیم ۱۹۲۱ء میں ہوئی۔ لیکن بعض سب سے بڑی ریاستیں اس میں شامل نہیں ہوئیں لندن میں ۳۲-۱۹۳۰ء میں جو گول میز کانفرنسیں منعقد ہوئی تھیں ان میں ریاستوں کے بعض نمائندے اور حکمران بھی شامل ہوئے تھے، اور انہوں نے ہند کے مجوزہ وفاق میں شامل ہونے پر آمادگی بھی ظاہر کی تھی۔ لیکن برطانوی ہند کے برعکس وفاق سے ہر ریاست کا الحاق اس کے حکمران کی اپنی مرضی پر تھا۔ وفاقی مجلسِ قانون ساز میں الحاق کرنے والی ریاستوں کے نمائندوں کی نامزدگی کا حق بھی حکمران کے ہاتھ میں تھا۔ علاوہ ازیں ہر ریاست کے حکمران نے جس دستاویز الحاق پر دستخط کرنے تھے اس میں اُن معاملات کی تصریح کی جانی تھی جو وفاق کے دائرۂ اختیار میں آنے تھے۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت وفاقِ ہند قائم ہونا تھا اور اس میں ریاستیں بھی شامل تھیں۔ لیکن اس دفعہ پر عملدرآمد صرف اُسی وقت ہو سکتا تھا، جب ریاستوں کی ایک معین مقدار وفاق سے الحاق کر لے۔ ریاستوں کے ساتھ دستاویز الحاق پر گفت و شنید ابھی مطالبات اور جزوی رعایات اور مزید مطالبات کے چکر میں ہی تھی کہ دوسری جنگِ عظیم شروع ہو گئی اور سردست بات چیت ختم ہو گئی۔

جنگ کے بعد صورتِ حال اور ہی تھی۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں پیش کردہ وفاقی سکیم بے کار ہو چکی تھی۔ آزادیٔ ہند کی منزل نظر آنے لگی تھی۔ حکومتِ برطانیہ نے بہت جلد اہلِ ہند کے ہاتھوں میں

اقتدار منتقل کرنے کا واشگاف اعلان کر دیا تھا۔ برطانوی ہند کی آزادی کے بعد ہند میں برطانوی فوجیں نہیں رہ سکتی تھیں۔ اور حکومت برطانیہ کے لئے اقتدارِ اعلیٰ کے اختیارات استعمال میں لانا غیر ممکن تھا۔

۱۲ مئی ۱۹۴۶ء کو چیمبر آف پرنسز کے نام ایک یادداشت میں کابینہ مشن نے ریاستی حکمرانوں کو "ان کے اپنے مفاد میں اور بہ حیثیت مجموعی ہند کے مفاد میں" یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ نئے آئین کی تشکیل میں کماحقہ حصہ لیں، اور موزوں صورتوں میں "ایسی انتظامی وحدتوں کی تشکیل کریں یا اُن میں شامل ہو جائیں جو اس قدر بڑی ہوں کہ انہیں آئینی ڈھانچے میں مناسب جگہ مل سکے۔" حکمرانوں کو یہ نصیحت بھی کی گئی کہ "ان کی انتظامیہ اعلیٰ ترین معیاروں کے مطابق ہونی چاہیئے اور نمائندہ اداروں کی وساطت سے انہیں اپنی ریاستوں میں رائے عامہ سے گہرا اور مستقل رابطہ قائم کرنا چاہیئے۔"[۱]

نیکوکاری کی یہ تلقین بہت بعد از وقت تھی۔ حکمرانوں کو خارجی جارحیت اور داخلی تخریب سے تحفظ کی ضمانت دیگر انگریزوں نے ان کی سلطنتِ برطانیہ سے غیر متزلزل وفاداری تو حاصل کر لی تھی، لیکن ان کی اخلاقی سیرت کو کمزور کر دیا تھا۔ ریاستی حکمران زمانہ طفولیت سے عیش و عشرت اور ذلیل چاپلوسی کے خوگر ہو جاتے تھے اور بہ حیثیت مجموعی چند معزز مستثنیات سے قطع نظر ایک انحطاط پذیر طبقہ بن گئے تھے وہ اپنی رعایا سے زیادہ اپنے محلات میں منہمک رہتے تھے اور معاشرتی و سیاسی اصلاحات اور معاشی تعمیر و ترقی کی طرف بہت کم توجہ کرتے تھے۔ ان کے علاقوں میں انتظامیہ اور تعلیم کے معیار برطانوی ہند سے فروتر تھے۔ ریاستوں میں شہری آزادیاں نہ ہونے کے برابر تھیں اور قانون کی عملداری کی جگہ حکمران کی مرضی کا سکہ رواں تھا۔ لیکن جمہوری نظریات کا ہیجان برطانوی ہند سے ریاستوں میں بھی آہستہ آہستہ نفوذ کر رہا تھا۔

۱۹۲۷ء میں آل انڈیا سٹیٹس پیپلز کانفرنس معرضِ وجود میں آئی۔ جس کا مقصد ریاستوں میں ان کے حکمرانوں کے زیر سرپرستی نمائندہ اداروں کے ذریعہ عوام کے لئے ذمہ دارانہ حکومت کا حصول تھا۔ اس صدی کے تیسرے عشرے میں کشمیر اور بعض دوسری ریاستوں میں شدید سیاسی بے چینی کے مظاہرے ہوئے اور جبر و تشدد کے باوجود کچھ نہ کچھ ترقی ہوئی۔ کئی ریاستوں میں محدود اختیارات سے بہرہ ور قانون ساز اسمبلیاں قائم کر دی گئیں اور اگرچہ ریاستوں میں شخصی حکومت کا نظام برقرار رہا۔ لیکن یہ بات واضح ہو گئی کہ بے لگام مطلق العنانیت کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں۔

ریاستوں کی آبادی برطانوی ہند کے متعلقہ آبادی کے علاقوں سے ملتی جلتی تھی، شمال مغرب کی ریاستوں میں آبادی کی اکثریت مسلمان تھی، باقی ہند کی ریاستوں میں ہندو اکثریت میں تھے۔ تاریخ کے حوادث نے بعض اوقات

ایسی مسلمان ریاستوں پر ہندو حکمرانوں کو شکمن کر دیا تھا۔ اور حیدر آباد ایسی ہندو اکثریت کی ریاستوں پر مسلمان حکمرانوں کو۔ اس بات نے ریاستوں میں جمہوری اداروں کے قیام کے مسئلہ کو اور زیادہ پیچیدہ بنا دیا تھا۔

کافی عرصہ تک ہند میں سیاسی جماعتوں کی سرگرمیاں صرف برطانوی ہند تک محدود رہیں اور انہوں نے شاذونادر ہی ریاستوں کے معاملات میں مداخلت کی۔ لیکن گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی منظوری کے بعد اس علیحدگی کی دیواریں مسمار ہونے لگیں۔ اس قانون نے ایک وفاقِ ہند کا راستہ کھول دیا، جس میں ریاستیں بھی شامل ہو ئی تھیں۔ اور اگر اس قانون کی وفاقی دفعات پر عملدر آمد تک نوبت پہنچ جاتی تو ریاستیں اور مرکزی مجلسِ قانون ساز میں ان کے نمائندے لازماً کل ہند سیاسیات کے اکھاڑے میں اترنے پر مجبور ہو جاتے۔ لیکن ابھی یہ نوبت نہیں آئی تھی کہ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں اکثر صوبوں میں کانگرس کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ اس سے کانگرس میں اپنی قوت کا زعم اتنا بڑھ گیا کہ سارے برصغیر میں جس میں ریاستیں بھی شامل تھیں، وہ صرف اپنے آپ کو ہی برطانوی اقتدار کی واحد جانشین سمجھنے لگی۔

۱۹۳۸ء میں کانگرس نے ایک قرار داد منظور کی، جس میں ریاستوں کو ہند کا جزوِ لاینفک قرار دیا۔ اور ریاستوں میں بھی ہند کے باقی حصّوں جیسی سیاسی، معاشرتی اور معاشی آزادی کا مطالبہ کیا۔ جواہرلال نہرو نے کہا "آج ریاستوں سمیت سارے ہند میں ایک غیر معمولی بیداری انگڑائی لے رہی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس بیداری کی نشو و نما کریں، اسے دل و جان سے عزیز رکھیں اور اپنے آپ کو منظم کریں"۔ اس طرح کانگرس اور آل انڈیا سٹیٹس پیپلز کانفرنس میں گہرا ربط قائم ہو گیا اور یہ جماعت بھی گاندھی کی قیادت میں آگئی۔ [۳۰]

دسمبر ۱۹۳۸ء میں گاندھی نے ریاستوں کو انتباہ کیا کہ ان کے معاملات میں کانگرس کی عدم مداخلت کی پالیسی ترک بھی کی جا سکتی ہے۔ اور اس نے ریاستی حکمرانوں کو مشورہ دیا کہ وہ ایک ایسی تنظیم سے دوستانہ تعلقات استوار کریں جو عنقریب مقتدرِ اعلیٰ طاقت کی جگہ لینے کو ہے۔ [۳۱]

۱۹۳۹ء میں نہرو کو آل انڈیا سٹیٹس پیپلز کانفرنس کا صدر منتخب کر لیا گیا، اور یہ جماعت کانگرس کی ایک ذیلی تنظیم بن کر رہ گئی ــــ ریاستوں میں جو ایجی ٹیشن ہوئی تھی، اس میں کانگرس کے سرکردہ ارکان بھی حصہ لیتے تھے۔ گاندھی نے اپنی جائے پیدائش کی ریاست راجکوٹ میں سول نافرمانی کی ایک تحریک کی خود رہنمائی کی۔

۱۹۳۹ء تک کانگرس اور مسلم لیگ کی باہمی کشمکش نے ملک گیر وسعت اختیار کر لی تھی۔ کانگرس

ریاستوں میں اپنی سرگرمی اور اثر و نفوذ بڑھانے کے لئے جو مساعی کر رہی تھی۔ مسلم لیگ اسے نظرانداز نہیں کر سکتی تھی۔ آل انڈیا سٹیٹس پیپلز کانفرنس کے خطوط پر ۱۹۳۹ء میں ایک آل انڈیا سٹیٹس مسلم لیگ قائم کی گئی، جس کا مطمح نظر ریاستوں میں مسلمانوں کے حقوق و مفادات کا تحفظ و فروغ تھا۔

۱۹۴۰ء میں جب مسلم لیگ نے مسلم اکثریت کے علاقوں کے لئے پاکستان کا مطالبہ پیش کیا۔ تو ریاستیں بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ پاکستان میں "ک" کا حرف ریاست کشمیر کا آئینہ دار ہے۔ ریاستوں سمیت ہند کے تمام علاقوں کے مسلمان پاکستان کی جدوجہد میں شامل ہو گئے۔ ان میں اولین صف کے جری مجاہد حیدر آباد کے بہادر یار جنگ تھے، جو آل انڈیا سٹیٹس مسلم لیگ کے صدر تھے۔ وہ تمام ہند کے عظیم ترین خطیب تھے۔ ۱۹۴۴ء میں اس شریف النفس اور عالی مرتبت انسان کی وفات سے تحریک پاکستان کو بڑا نقصان پہنچا۔

جن ریاستوں میں حکمران کا مذہب رعایا کی اکثریت کے مذہب سے مختلف تھا وہاں عوام اور حکمران کے باہمی تنازع نے فرقہ وارانہ نوعیت اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ برطانوی ہند کے ہمسایہ علاقوں کے لوگ بھی میدان میں اتر آئے تھے۔ ان حالات کے باعث مسلم لیگ ریاستوں کے معاملات میں روزافزوں دلچسپی لینے لگی۔ عام طور پر مسلم لیگ کی پالیسی کانگرس کی طرح جارحانہ نہیں تھی، ریاستی حکمران کانگرس سے اور بالخصوص اس کے بائیں بازو سے بدرجہا زیادہ خائف تھے۔

یہ تھی وہ صورت حال، جب جنگ ختم ہونے کے بعد کابینہ مشن ہند پہنچا۔ کابینہ مشن نے اپنے ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء والے بیان میں یہ سفارش کی کہ" برطانوی ہند اور ریاستوں دونوں پر مشتمل ایک اتحادیہ ہند ہونا چاہیئے۔ جس کے سپرد حسب ذیل معاملات ہوں، امور خارجہ، دفاع اور مواصلات"۔

ریاستوں اور برطانوی ہند کے مابین تعلقات کے بارے میں اعلان کیا گیا کہ "اقتدار اعلیٰ نہ تاج برطانیہ رکھ سکتا ہے اور نہ ہی اسے نئی حکومت کو منتقل کیا جا سکتا ہے ...... ہمیں یقین دلایا گیا ہے کہ ریاستیں ہند کی نئی تعمیر و ترقی میں کام کرنے کے لئے آمادہ اور رضامند ہیں۔ ریاستوں کا تعاون عین کونسی شکل اختیار کرے گا؟ یہ مسئلہ آئینی ڈھانچے کی تشکیل کے دوران گفت و شنید سے طے کرنے کا ہے۔ لیکن اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں کہ یہ شکل تمام ریاستوں کے لئے یکساں ہوگی"۔

کابینہ مشن منصوبہ کے بارے میں ریاستی حکمرانوں کا مستند ردعمل بمبئی میں حکمرانوں کی کانفرس میں طے ہوا۔ ۲۹ جنوری ۱۹۴۷ء کو اس کانفرنس میں ایک قرارداد منظور کی گئی۔ جس میں کہا گیا کہ اتحادیہ ہند میں ریاستوں کی شمولیت باہمی گفت و شنید کی بناء پر ہونی چاہیئے۔ آخری فیصلہ ہر ریاست کی مرضی پر ہونا چاہیئے۔ اور ایسا فیصلہ نئے آئین کی عملی شکل

صورت دیکھنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ سارے اختیارات ریاستوں کے پاس رہیں گے۔ سوائے ان کے جو وہ اتحادِ ہند کو تفویض کر دیں۔ آئین ساز اسمبلی کو ریاستوں کے داخلی انتظامی امور یا ان کے اپنے دساتیر سے کوئی سروکار نہیں ہوگا اور نہ ہی کسی ریاست کی آزادانہ رضامندی کے بغیر اس کی موجودہ سرحدوں میں کوئی رد و بدل کیا جائے گا۔

حکومتِ برطانیہ کے ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کے جس بیان میں اہلِ ہند کو انتقالِ اقتدار کے لئے جون ۱۹۴۸ء کی تاریخ کا اعلان کیا گیا، اس میں ریاستوں کے متعلق اس موقف کا اعادہ کیا گیا کہ اقتدارِ اعلیٰ برطانوی ہند کی کسی بھی حکومت کو منتقل نہیں کیا جائے گا اور اقتدارِ اعلیٰ کے خاتمے پر ہر ریاست آزاد و خود مختار ہو جائے گی۔ کانگرسی لیڈر اس تصور سے سخت متوحش تھے کہ مبادا بلقان کی طرح ہند ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور وہ حتی الوسع زیادہ سے زیادہ ریاستوں کو آئین ساز اسمبلی میں لانے کے آرزومند تھے۔ وہ ریاستی حکمرانوں کی حب الوطنی سے بھی اپیل کرتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ریاستوں میں عوامی ایجی ٹیشن کی دھمکی بھی دیتے تھے۔ یہ ایک شدید دھمکی تھی کیونکہ ذاتی عیش و عشرت میں پڑ کر عوامی فلاح و بہبود کو نظر انداز کر کے ریاستی حکمران اپنی رعایا کی وفاداریاں کھو بیٹھے تھے۔ ریاستی حکمرانوں سے لوگوں کو جو بھی تعلق تھا وہ محبت اور وفا شعاری کے خالص جذبات سے کہیں زیادہ رسم و رواج کا مرہونِ منت تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ جاگیردارانہ نظام حوادثِ زمانہ کے پہلے تھپیڑے سے ریزہ ریزہ ہونے کو تھا لیکن نہ حکمرانوں کو اور نہ ان کے مخالفین کو پوری طرح علم تھا کہ یہ کتنا بوسیدہ ہو چکا ہے۔

آئین ساز اسمبلی اور چیمبر آف پرنسز نے مذاکرات کمیٹیاں قائم کر دیں۔ فروری اور مارچ ۱۹۴۷ء میں ان کے مشترکہ اجلاس ہوتے رہے، لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ ریاستی حکمران متحد نہیں تھے۔ چیمبر آف پرنسز کے چانسلر نواب بھوپال کی پختہ رائے تھی کہ ریاستوں کا مفاد اسی میں ہے کہ اکٹھے مل کر سودا کریں، اس لئے انہیں فرداً فرداً آئین ساز اسمبلی میں نہیں شامل ہونا چاہیے، بلکہ آپس میں سمجھوتہ کرنے کے بعد ہی یہ اقدام کرنا چاہیے۔ لیکن سارے ریاستی حکمران ان کی پیروی پر آمادہ نہیں ہوئے۔ بعض ہندو اور سکھ حکمران مثلاً بڑودہ، بیکانیر اور پٹیالہ یہ محسوس کرتے تھے کہ کانگرس سے مصالحت کر لینے اور اس کے دائیں بازو کو مستحکم کرنے میں ہی ان کی عافیت ہے۔ وہ قدامت پرست سردار پٹیل کو اپنا بہترین دوست سمجھتے تھے۔ یہ حکمران محسوس کرتے تھے کہ فیصلے میں لیت و لعل کرنے اور آئین ساز اسمبلی میں شامل نہ ہونے سے وہ کانگرس کو ناراض کریں گے۔ یہ محض خیالی ڈر نہیں تھا۔ ۱۸ اپریل ۱۹۴۷ء کو گوالیار میں آل انڈیا سٹیٹس پیپلز کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے نہرو نے کھلم کھلا دھمکی دی تھی کہ "جو ریاست آئین ساز اسمبلی میں شامل نہیں ہوگی اہلِ وطن اسے اپنا دشمن قرار دیں گے۔ اور ایسی ریاست کو اس کے نتائج بھگتنے پڑیں گے"[5]
اگرچہ لیاقت علی خان نے ریاستوں سے کہا وہ کانگرس کی دھمکیوں کو نظر انداز کر دیں۔ کیونکہ کانگرس کو انہیں مجبور کرنے کا

کوئی حق حاصل نہیں ہے، لیکن متعدد ریاستی حکمرانوں نے ان دھمکیوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا، تاہم کثریت ثابت قدم رہی، اور جو حکمران آئین ساز اسمبلی میں شامل ہو گئے، انہوں نے بھی الحاق کرنے کی حتمی ذمہ داری قبول نہ کی۔ اس طرح آزادی سے عین پہلے کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کی جانشین حکومتوں اور ریاستوں کے درمیان تعلقات کیا شکل اختیار کریں گے۔؟

انتقالِ اقتدار کے لئے ۳ر جون کے منصوبۂ تقسیم میں کہا گیا تھا کہ کابینہ مشن کی ۱۲ر مئی ۱۹۴۶ء کی یادداشت میں ریاستوں کے بارے میں جو پالیسی درج کی گئی تھی، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس یادداشت کا لب لباب اس کی آخری سطور میں یوں بیان کیا گیا تھا: "ریاستیں اپنے جن حقوق سے مقتدرِ اعلیٰ کے حق میں دستبردار ہوئی تھیں وہ سب کے سب ریاستوں کو واپس مل جائیں گے۔ اس طرح ایک طرف ریاستوں اور دوسری طرف تاجِ برطانیہ اور برطانوی ہند کے مابین سیاسی سمجھوتے ختم ہو جائے گا۔ اس سے جو خلا پیدا ہو گا ریاستوں کو اسے برطانوی ہند میں جانشین حکومت یا حکومتوں کے ساتھ وفاقی تعلقات کے ذریعے پُر کرنا ہو گا۔ یا بصورت دیگر انہیں ایسی حکومت یا حکومتوں کے ساتھ سیاسی نوعیت کے سیاسی سمجھوتے کرنے ہوں گے۔"

اِس پالیسی کے مطابق قانونِ آزادیٔ ہند ۱۹۴۷ء میں بھی ایک دفعہ شامل تھی، جس کے تحت ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کو حکومتِ برطانیہ اور ریاستوں کے حکمرانوں کے درمیان تمام معاہدے اور سمجھوتے ختم ہو جانے تھے۔ البتہ محاصل راہ داری اور مواصلات، ڈاک اور تار اور اس نوعیت کے دوسرے معاہدوں کے تحت تعلقات اس وقت تک نافذ العمل رہنے تھے۔ جب تک ریاستوں کے حکمران یا متعلقہ جانشین کی حکومت کی طرف سے انہیں منسوخ نہیں کیا جاتا یا مابعد کے معاہدے ان کی جگہ نہیں لیتے۔

۳ر جون کو ماؤنٹ بیٹن نے منصوبۂ تقسیم کے مضمرات ریاستوں کو سمجھائے۔ اگلے دن ایک پریس کانفرنس میں اس نے کہا کہ ریاستوں کی حیثیت آزاد مملکتوں کی تھی جنہوں نے انگریزوں کے ساتھ معاہدے کر رکھے تھے۔ اقتدارِ اعلیٰ کے اختتام پر ریاستیں اپنی آزاد حیثیت حاصل کر لیں گی اور وہ دفعۃً آزاد ہوں گی کہ ایک آئین ساز اسمبلی میں شامل ہوں یا دوسری میں یا کوئی اور بندوبست کریں۔

ریاستوں کا مسئلہ پاکستان کی نسبت ہندوستان کے لئے بدرجہا بڑا تھا۔ ۵۶۲ ریاستوں میں سے صرف چودہ پاکستان سے متصل تھیں، اگرچہ ان میں کشمیر جیسی ریاست بھی شامل تھی جو پاکستان کے لئے انتہائی اہمیت رکھتی تھی باقی سب ریاستیں جغرافیائی طور پر ہندوستان سے ملحق تھیں۔ بایں ہمہ پاکستان بعض اور ریاستوں کے حشر سے بے نیاز نہیں

رہ سکتا تھا۔ بالخصوص ریاست حیدر آباد، جو ہند کی سب سے بڑی ریاست تھی، مُغل سلطنت کے ایام سے ایک مسلمان خاندان اس ریاست کا حکمران چلا آرہا تھا، چنانچہ اس ریاست کو اسلامی ہند کے جذبات میں خاص مقام حاصل تھا۔

وائسرائے نے ۱۳ جون کو ایک اجلاس میں ریاستوں کے مسئلے پر بات چیت کی۔ اس میں کانگرس کی طرف سے نہرو، سردار پٹیل اور کرپلانی، اور مسلم لیگ کی طرف سے قائد اعظم، لیاقت علی خاں اور سردار عبدالرب نشتر شامل ہوئے سکھوں کی نمائندگی بلدیو سنگھ نے کی۔ پولٹیکل مشیر سرکونراڈ کورفیلڈ بھی موجود تھا۔ اس اجلاس میں یہ طے پایا کہ ہر دو نئی حکومتیں اپنا اپنا محکمہ ریاست قائم کریں گی، جو ریاستوں کے مسائل سے عہدہ برآ ہوگا۔ پولٹیکل محکمہ ریکارڈ کی چھان بین کرے گا، اور وہ دستاویزات جو حکمرانوں کی نجی زندگیوں اور ریاستوں کے داخلی معاملات کے بارے میں ہوں گی برطانوی ہائی کمشنر کی تحویل میں دیدیگا۔

اس سوال پر اختلاف رائے پیدا ہو گیا کہ کیا ریاستیں آزاد ہو سکیں گی ؟ نہرو کا موقف یہ تھا کہ ریاستوں کے پاس چونکہ نہ بین الاقوامی تعلقات قائم کرنے اور نہ جنگ کرنے کے وسائل ہیں، اس لئے وہ حاکمیت سے بہرہ ور آزاد و خود مختار ریاستیں نہیں بن سکتیں، اور انہیں لازماً کسی ایک ڈومینین حکومت کے سیاسی ڈھانچہ میں شامل ہو جانا چاہیے۔ قائد اعظم نے کہا کہ اس معاملے میں ریاستوں پر کوئی جبر نہیں کرنا چاہیے۔ ریاستیں اپنے لئے آپ فیصلہ کرنے میں آزاد ہیں، لیکن یہ بات ریاستوں اور ڈومینین حکومتوں کے باہمی مفاد میں ہے کہ وہ حسب ضرورت ایک دوسرے کے ساتھ سمجھوتے کریں۔ اس لئے یہ طے ہوا کہ ہندوستان اور پاکستان کے لیڈروں اور ریاستوں کے نمائندوں کا ایک اجلاس منعقد ہونا چاہیے۔

کانگرس اور مسلم لیگ کے نقطہ ہائے نظر میں یہ اختلاف بہت جلد منظر عام پر آگیا۔ ۱۴ جون کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے ایک قرارداد منظور کی جس میں کہا گیا کہ اقتدار اعلیٰ کے ختم ہو جانے سے ریاستیں آزاد و خود مختار نہیں ہو جائیں گی کیونکہ وہ باقی ہند سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتیں اور سلطانیٔ جمہور کی بنا پر عوام ہی اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ گاندھی نے کہا کہ ریاستی حکمرانوں کی طرف سے آزادی کے اعلانات "ہند کے کروڑوں آزاد لوگوں کے خلاف اعلانِ جنگ کے مترادف ہیں"۔ ۵

اس کے برعکس قائد اعظم نے ۱۸ جون کو ایک بیان میں کہا کہ اقتدار اعلیٰ کے خاتمے کے ساتھ آئینی اور قانونی طور پر ریاستیں آزاد و خود مختار مملکتیں بن جائیں گی، اور اپنی صوابدید کے مطابق جو راستہ چاہیں اسے اختیار کرنے میں آزاد ہوں گی۔

بادی النظر میں یہ محسوس ہو گا کہ کم از کم ریاستوں کے معاملے میں تو کانگرس اور مسلم لیگ کے مفادات ایک

ہی مربوط اور ہم آہنگ پالیسی کے متقاضی تھے۔ یہ بات ہندوستان اور پاکستان دونوں کے فائدہ کی تھی کہ وہ متعلقہ ریاستوں کو اپنے اپنے حلقے میں لے آئیں اور متحدہ اقدام سے دونوں کے مقاصد کی کامیابی کا زیادہ امکان تھا۔ اگر دونوں کے درمیان ریاستوں کے الحاق کے بارے میں ایک مشترکہ پالیسی پر اتفاق ہوجاتا اور اس پالیسی کی بنیاد برطانوی ہند کی تقسیم کے اصول پر رکھی جاتی تو بعد میں جو بہت سی مشکلات پیدا ہوئیں، ان سے بچاؤ کی صورت نکل آتی۔ لیکن کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان اختلافی خلیج اتنی گہری ہوچکی تھی اور ایک دوسرے کے عزائم کے بارے میں ان کے شکوک وشبہات اتنے شدید تھے کہ ان میں بے لاگ اور نفع مند تبادلۂ خیالات ناممکن ہوگیا تھا۔ مزید برآں دو سب سے بڑی ریاستوں، کشمیر اور حیدرآباد پر ان کے مفادات میں واقعی تصادم تھا۔ کشمیر کی ریاست پاکستان سے متصل تھی، اس میں مسلمان اکثریت میں تھے۔ لیکن اس کا حکمران ہندو تھا۔ اس کے برعکس حیدرآباد کی ریاست بھارت سے متصل تھی۔ اس میں ہندو اکثریت میں تھے۔ لیکن اس کا حکمران مسلمان تھا، ہندوستان، کشمیر اور حیدرآباد دونوں کو ہتھیانے کے درپے تھا۔ کشمیر مسلمانوں کے نظریۂ پاکستان کا جزو لاینفک تھا اور مسلم لیگ کے لیڈروں کو حیدرآباد کی خواہشِ آزادی۔ سے گہری ہمدردی تھی۔

طریقِ کار کے مسئلے پر بھی رجحانات مختلف تھے۔ ریاستوں کا الحاق حاصل کرنے کے لئے کانگرس دباؤ اور جبر کا ہر ذریعہ استعمال کرنے کیلئے تیار تھی، جبکہ مسلم لیگ پوری سختی سے قانونی اور آئینی طریقوں پر کاربند تھی۔ جون اور جولائی ۱۹۴۷ء میں قائدِ اعظم نے کئی مواقع پر کہا "قانونی پوزیشن یہ ہے کہ انگریزوں کی طرف سے انتقالِ اقتدار کے ساتھ اقتدارِ اعلیٰ ختم ہوجائیگا اور سب ریاستوں کی آزاد و خود مختارانہ حیثیت از خود بحال ہوجائے گی۔ لہٰذا ریاستوں کو آزادی ہے کہ وہ ایک ڈومنین میں شامل ہوں یا دوسری میں یا آزاد و خود مختار رہیں۔ مسلم لیگ ہر ریاست کے اس حق کو تسلیم کرتی ہے کہ وہ اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کی مجاز ہے۔ مسلم لیگ کسی ریاست کو کوئی خاص راہِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔" [۵]

یہ محض قائدِ اعظم کا آئین پسندی کا میلانِ خاطر ہی نہیں تھا، جس کے تحت وہ یہ اعلانات کر رہے تھے، بلکہ ان کا ایک مقصد حیدرآباد کی آزادی کا تحفظ بھی تھا۔ اس انداز کے اعلانات سے ممکن تھا کہ پاکستان کے ساتھ کشمیر کا الحاق مخدوش ہو جائے، لیکن یہ کوئی بڑا خطرہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔

نظری اعتبار سے ہر ریاست کے سامنے تین امکانی راستے کھلے تھے۔ اول وہ ایک یا دوسری آئین ساز اسمبلی میں شریک ہو سکتی تھی اور ہندوستان یا پاکستان سے الحاق کر سکتی تھی، دوم آزاد و خود مختار مملکت ہونے کا اعلان کر سکتی تھی، لیکن اس راستے پر صرف بڑی ریاستیں ہی گامزن ہو سکتی تھیں، سوم بعض ریاستیں باہم مل کر ایک آزاد بلاک کی تشکیل کر سکتی تھیں کئی ریاستیں مثلاً بڑودہ، بیکانیر اور پٹیالہ پہلے ہی ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی میں شامل ہوچکی تھیں، حیدرآباد اور ٹراونکور نے

آزاد ہونے کا اعلان کردیا۔ نواب بھوپال ریاستوں کا ایک علیحدہ بلاک بنانے کے حامی تھے۔ وہ چیمبر آف پرنسز کی چانسلری سے مستعفی ہوگئے تاکہ اپنی اس سکیم کے لئے کام کر سکیں۔ ان کی جگہ مہاراجہ پٹیالہ اس منصب پر فائز ہوا جو اس سے پہلے پرو چانسلر تھا۔

جولائی کے اوائل میں ہندوستان اور پاکستان کے ریاستی محکمے قائم کر دیئے گئے۔ ہندوستان میں یہ محکمہ سردار پٹیل کے ماتحت تھا اور وی۔ پی مینن کو اس محکمے کا سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ اس کے ساتھ وہ گورنر جنرل کے آئینی مشیر کے طور پر بھی اپنے فرائض ادا کرتا رہا۔ پاکستان کی طرف سے اس محکمہ کے وزیر عبدالرب نشتر تھے۔ اور اکرام اللہ سیکرٹری مقرر ہوئے۔

کابینہ مشن کے منصوبہ کے تحت ریاستوں نے صرف تین معاملات سے مرکزی حکومت کے حق میں دستبردار ہونا تھا۔ یعنی دفاع، امور خارجہ اور مواصلات اور ان کے باقی تمام اختیارات برقرار رہنے تھے۔ کابینہ مشن نے اپنی ۱۲ رمئی ۱۹۴۶ء کی یادداشت میں یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ مشترکہ مفاد کے معاملات میں تمام موجودہ انتظامات، بالخصوص معاشی اور مالیاتی شعبوں میں فی الحال جاری رہنے چاہئیں۔ اس بنا کے پیش نظر وی۔ پی مینن نے ایک دستاویز الحاق برائے دفاع، امور خارجہ اور مواصلات مرتب کی اور ایک اقرار نامہ مرتب کیا۔ جس کے تحت محاصل، کرنسی اور اسی نوعیت کے معاملات کے موجودہ انتظامات جوں کے توں برقرار رکھے جانے تھے۔ ۵؍جولائی کو سردار پٹیل نے ایک بیان جاری کیا۔ جس کا ایک حصہ یوں تھا۔ "ہم ریاستوں کے ان تین معاملات کے الحاق کے سوا اور کوئی تقاضا نہیں کرتے، جن کا ملک کے مفادات سے گہرا تعلق ہے۔ دوسرے معاملات میں ہم ان کے خود مختارانہ وجود کا پوری دیانتداری سے احترام کریں گے۔" ؂

یہ سکیم سادہ اور مدبرانہ تھی۔ ریاستوں سے فرداً فرداً طویل اور پیچیدہ گفت وشنید میں الجھنے کے بجائے ہر ریاست کو دو معیاری دستاویزیں پیش کر دی گئیں، جن سے اختلاف و انحراف کی کسی صورت میں بھی اجازت نہیں تھی۔ بیشتر ریاستوں کا صریح مفاد یہ تھا کہ وہ جوں کا توں اقرار نامہ قبول کر لیں۔ لیکن انہیں بتا دیا گیا کہ دستاویز الحاق کے بغیر جوں کا توں اقرار نامہ انہیں میسر نہیں ہو سکتا۔ سردار پٹیل اور وی۔ پی مینن نے جس مضبوطی اور ہنرمندی کے ساتھ ریاستی حکمرانوں سے دست آزمائی کی وہ ان کے لئے باعث صد اعزاز ہے۔ لیکن فی الحقیقت یہ مونٹ بیٹن کی سیاست گری کا کمال تھا جو ریاستی حکمرانوں کو گھیر گھار کر دستاویز الحاق قبول کرنے کی راہ پر لے آیا۔

مونٹ بیٹن نے جو ہندوستان کی سب سے بڑی خدمت کی وہ ہندوستان کے ساتھ ریاستوں کے الحاق کا بندوبست تھا۔ اس طرح اس نے ہندوستان کے حصے بخرے ہونے کا خطرہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ جمہوری سیاسیات اور انقلابی تغیرات کی نئی اور ہنگامہ خیز دنیا میں ریاستی حکمران اپنے آپ کو گم گشتہ اور حیران و پریشان پاتے تھے اور اپنی رہنمائی اور حفاظت کے لئے ان کی نظریں وائسرائے کی جانب اٹھتی تھیں۔ تاج برطانیہ کے نمائندے سے وفاداری ریاستی حکمرانوں

کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اور یہ وائسرائے تو برطانیہ کے شاہی خاندان کا رکن ہونے کے باعث اُن کے لیے اور بھی زیادہ قابلِ احترام تھا۔ کانگرسی لیڈروں نے حکمرانوں کے ان جذبات سے پُورا فائدہ اٹھانے کے لئے ریاستوں کو ہندوستان میں شامل کرنے کا کام مونٹ بیٹن کے سپرد کر دیا۔ مونٹ بیٹن ریاستی حکمرانوں کو بات چیت میں یہ تاثر دیتا تھا کہ وہ ان کی فلاح و بہبود کا تہ دل سے خواہاں ہے۔ اور اپنی دُور اندیشی سے دیکھ سکتا ہے کہ ریاستی حکمرانوں کا اصل مفاد کس چیز میں ہے؛ اس نے خانوادۂ شاہی کی چمک دمک سے اُن کی آنکھیں خیرہ کر دیں اور اپنی شخصیت کے طلسم سے انہیں مسحور کر دیا۔ مسلسل ترغیب سے اور بے رحم دباؤ سے، دوستانہ مشورے سے اور وائسرایانہ فہمائش سے اس نے ریاستی حکمرانوں کو وہ کچھ قبول کرنے پر آمادہ کر لیا، جس سے ان کے اقتدار کا خاتمہ یقینی تھا۔ دفاع، امورِ خارجہ اور مواصلات کے معاملات میں الحاق کے بعد ریاستی حکمران کانگرس کے رحم و کرم پر تھے۔ ایک طرف عوامی ایجی ٹیشن کا ڈر تھا۔ دوسری طرف داخلی تحفظ کے نام سے مرکزی حکومت کی مداخلت کا۔ بیچارے ریاستی حکمران ان دو پاٹوں کے درمیان پس کر رہ گئے۔ ان کی ریاستیں متصلہ صوبوں یا دوسری ریاستوں میں مدغم کر دی گئیں۔ اور بھارت کا نقشہ از سرِ نو مرتب کر دیا گیا۔ ان کے نام تک نہ باقی چھوڑے گئے اور ان کا وجود ہمیشہ کیلئے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ حکمرانوں کو معقول پنشنیں دے کر سبکدوش کر دیا گیا، جن میں کسی نہ کسی عنوان مسلسل تخفیف جاری ہے۔ غالباً ویسے بھی ریاستی حکمرانوں کے مقدر میں نابود ہو جانا لکھا تھا۔ لیکن اس منظر کا دردانگیز پہلو یہ ہے کہ جس نگہبان پر وہ سب سے زیادہ اعتماد کرتے تھے، وہی بہلا پھسلا کر انہیں مذبح کی طرف ہانک کرلے گیا۔

۲۵ جولائی کو مونٹ بیٹن نے نمائندۂ تاج کی حیثیت سے چیمبر آف پرنسز سے خطاب کیا۔ اس نے پُوری وردی زیبِ تن کر رکھی تھی۔ تمغوں اور اعزازی نشانوں کی صف آرائی کے ساتھ۔ اس کا مقصد شان و شوکت کے دلدادہ شہزادوں کو مبہوت کرنا تھا۔ اس نے اپنے اسلحہ خانہ کا ہر ہتھیار انہیں قائل کرنے کے لئے استعمال کیا[۱۱]

مونٹ بیٹن نے اس بات پر زور دیا کہ اگرچہ حکمرانوں کو قانونی لحاظ سے اس بات کی آزادی ہے کہ وہ دونوں میں سے جس ڈومینین سے چاہیں الحاق کر لیں۔ لیکن بعض ایسی جغرافیائی مجبوریاں ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ قریب قریب ۵۶۵ ریاستوں میں سے بھاری اکثریت ان کی ہے جو جغرافیائی اعتبار سے ہندوستان کی ڈومینین سے لامحالہ مربوط ہیں، جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے۔ ریاستیں اپنی جگہ اہم ہونے کے باوجود تعداد میں اس قدر زیادہ نہیں ہیں اور پاکستان کے آئندہ گورنر جنرل مسٹر جناح ہر ریاست کے ساتھ علیحدہ اور انفرادی طور پر معاملے کرنے کے لئے تیار ہیں لیکن ہندوستان کے معاملے میں، جس کے ساتھ ریاستوں کی غالب اکثریت کا واسطہ ہے، یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ ہر ایک ریاست سے علیحدہ علیحدہ گفت و شنید خارج از بحث ہے۔" مونٹ بیٹن نے تفصیل سے بتایا کہ دستاویزِ الحاق کے مسودہ میں

دفاع، امورِ خارجہ اور مواصلات کے جن تین معاملات میں الحاق کی شرط ہے ان میں ریاستوں پر کوئی مالی ذمہ داری عائد نہیں ہوگی۔ نیز دستاویز میں یہ دفعہ صراحتاً موجود ہے کہ کسی اور معاملے میں مرکزی حکومت کو ریاست کی داخلی خود مختاری یا حاکمیت اعلیٰ میں مداخلت کرنے کا اختیار نہیں۔" اس بندوبست میں ریاستوں کو جو مفاد حاصل ہوگا اس کی توضیح کرنے کے بعد مونٹ بیٹن نے کہا: "لیکن مجھے آپ پر یہ بات واضح کر دینی چاہیئے، کہ ابھی مجھے ہندوستان کی حکومت کو یہ بندوبست قبول کر لینے پر آمادہ کرنا ہے اگر آپ سب میرے ساتھ تعاون کریں گے، اور الحاق پر رضامندی ظاہر کریں گے، تو مجھے یقین ہے کہ میری مساعی کامیاب ہو جائیں گی۔" مونٹ بیٹن نے حکمرانوں کو یاد دلایا کہ انتقالِ اقتدار اب بہت قریب ہے۔ اس کے بعد وہ نمائندۂ تاج نہیں رہے گا، اور اگر وہ الحاق کے لئے تیار ہیں تو انہیں ۱۵ اگست سے پہلے یہ کر ڈالنا چاہیئے۔ لارڈ مونٹ بیٹن نے اپنی تقریر ان الفاظ پر ختم کی "میری سکیم کے تحت جہاں آپ کو ہر ممکن العمل آزادی حاصل ہے۔ وہاں آپ کو ان امور کی ذمہ داری سے بے نیاز کر دیا گیا ہے۔ جو آپ کے بس کے نہیں ہیں۔ جس طرح آپ اپنی رعایا سے، جس کی فلاح و بہبود کے آپ ذمہ دار ہیں، راہِ فرار اختیار نہیں کر سکتے۔ اسی طرح آپ اپنے ہمسایہ ڈومنین حکومت سے بھی راہِ فرار اختیار نہیں کر سکتے۔"[11]

لیکن مونٹ بیٹن نے صرف اس پر اکتفا نہ کیا۔ اس نے چیمبر آف پرنسز کے اجلاس سے پہلے اور بعد بھی ایک ایک حکمران کو رام کرنے کی کوشش کی۔ ریاست ٹراونکور نے ۲۵ جولائی کے اجلاس میں اپنا نمائندہ بھیجنے سے انکار کر دیا تھا، کیونکہ اس نے آزاد رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ریاست کے دیوان (وزیر اعظم) سر سی۔ پی راما سوامی آئر پر کانگرسی لیڈروں نے بڑی سخت لے دے کی اور ٹراونکور سٹیٹ کانگرس نے یکم اگست سے راست اقدام کی مہم شروع کرنے کی دھمکی دی۔ مونٹ بیٹن نے دیوان کو بلا بھیجا۔ پہلے پہل تو وہ اپنی بات پر اڑا رہا، لیکن مونٹ بیٹن سے مزید ملاقات کے بعد اس نے تسلیم کر لیا کہ الحاق ناگزیر ہے۔ جب دیوان واپس ٹراونکور پہنچا، تو اس پر حملہ کر کے اسے زخمی کر دیا گیا۔ مہاراجہ نے بعجلت تمام الحاق کی تار بھیج دی۔ بقول وی۔ پی مینن اس اعلان کا ان دوسرے حکمرانوں پر نمایاں اثر ہوا، جو ابھی تک متذبذب تھے[12]

۲۹ جولائی کو لارڈ مونٹ بیٹن نے ریاستی حکمرانوں کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دعوت دی، جس کے متعلق وی۔ پی مینن نے لکھا ہے: "اس دعوت کی نوعیت ایسی ہی تھی جیسے پولنگ بوتھ کے قریب ووٹروں کو قائل کرنے کی آخری کوشش کی جاتی ہے۔ جن حکمرانوں نے ابھی تک الحاق کے بارے میں اپنے ارادے کا واضح اظہار نہیں کیا تھا، اے ڈی کانگ یکے بعد دیگرے انہیں دوستانہ بات چیت کے لئے لارڈ مونٹ بیٹن کے پاس لے جاتے۔ جب وہ ان سے فارغ ہو جاتا تو سب لوگوں کے سامنے وہ انہیں میرے پاس بھیج دیتا، اور اپنی باری آنے پر میں انہیں کمرے سے گزار کر دوسری طرف سردار پٹیل کے پاس لے جاتا۔ اس کا ان حکمرانوں پر بہت اچھا نفسیاتی اثر پڑا جو وہاں حاضر تھے۔"[13]

الغرض ریاستوں کا ہندوستان سے الحاق کرانے میں موِنٹ بیٹن نے وہ سب کچھ کیا، جو اس کے بس میں تھا۔ اس کے برعکس اس نے پاکستان کے لئے کچھ بھی نہ کیا، حالانکہ نمائندۂ تاج کی حیثیت سے دونوں ڈومنینوں کی طرف سے اس پر یکساں فرض عائد ہوتا تھا۔ اس سے بھی بدتر بات یہ تھی کہ ہر متنازعہ فیہ معاملہ میں اُس نے اپنا سارا وزن ہندوستان کے پلڑے میں ڈالا۔ اس کی واضح ترین ناقابلِ معافی مثال اس کا وہ کردار ہے، جو اس نے مسلم اکثریت کی ریاست جموں و کشمیر پر ہندوستان کے فوجی قبضہ کے سلسلے میں ادا کیا۔ اس سے کمتر معروف مثال جودھ پور اور جیسلمیر کی ریاستوں کی ہے۔ جن سے پاکستان سے الحاق کو روکنے کے لئے اُس نے مداخلت کی۔ یہ ریاستیں پاکستان سے متصل تھیں، اگرچہ ان کی آبادی کی اکثریت ہندو تھی اور ان کے حکمران بھی ہندو تھے۔ لیکن وہ پاکستان سے الحاق کے خواہاں تھے، کیوں وہ محسوس کرتے تھے کہ پاکستان میں ان کے مفادات کی بہتر حفاظت ہو سکے گی۔ وی۔ پی۔ مینن کو ان کی قائدِ اعظم سے ملاقات کی بھنک پڑ گئی، وہ فوراً دوڑا دوڑا گیا اور لارڈ موِنٹ بیٹن کو مطلع کیا۔ موِنٹ بیٹن نے مہاراجہ جودھ پور کو کہا کہ خالصتہً قانونی اعتبار سے وہ پاکستان سے الحاق کر سکتا ہے لیکن اس کے نتائج بہت سنگین ہوں گے، کیونکہ وہ خود بھی ہندو ہے اور اس کی ریاست کی غالب اکثریت بھی ہندو ہے اور اس کی ہمسایہ ریاستوں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اس کا یہ اقدام تقسیم ہند کے اساسی اصول سے متصادم ہوگا، اور ریاست میں شدید فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑنے کا احتمال ہوگا [۵] اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جودھ پور اور جیسلمیر دونوں نے ہندوستان سے الحاق کر لیا۔

لیکن موِنٹ بیٹن نے کپور تھلہ کا ہندوستان سے الحاق منظور کرتے وقت تقسیم ہند کے اساسی اصول کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ اس ریاست کا حکمران سکھ تھا، لیکن نہ صرف اس کی آبادی میں مسلمانوں کو ۶۴ فیصد اکثریت حاصل تھی، بلکہ یہ ریاست مغربی پنجاب کے مسلم اکثریتی علاقہ سے متصل بھی تھی۔ بعد ازاں ریڈکلف نے کسی جواز کے بغیر یہ علاقے ہندوستان کو دے دیئے، لیکن جب موِنٹ بیٹن نے ریاست کپور تھلہ کا الحاق منظور کیا تھا، اس وقت تک ریڈکلف کا ثالثی فیصلہ اسے موصول نہیں ہوا تھا۔

چند ریاستوں نے ہندوستان سے الحاق کیا، ان میں بعض کے حکمران مسلمان تھے۔ مثلاً بھوپال اور رام پور۔ رام پور کی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب کافی زیادہ تھا اور وہ ہندوستان سے الحاق کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، لیکن نواب کی درخواست پر ہندوستان کی حکومت نے وہاں فوج بھیج دی جس نے مسلمانوں کو کچل کر رکھ دیا۔ جنرل ٹکر کا بیان ہے:۔

"سردار (ولبھ بھائی پٹیل) نے تہیہ کر رکھا تھا کہ کسی بھی ریاست کو خواہ وہ مسلم ہو یا دوسری ہندوستان کی ڈومنین سے علیحدہ نہیں ہونے دیا جائے گا۔ اس لئے چند گھنٹوں کے اندر ہی ہمیں

براہ راست تاکیدی حکم ملا کہ فوراً ریاست رام پور میں فوجیں بھیج دی جائیں۔ ہم نے چھٹی جاٹ رجمنٹ کو بھیج دیا۔ یہاں علم بغاوت بلند کرنے والے مسلمان تھے، جن کی یہ خواہش تھی کہ وہ اپنی قسمت کا خود فیصلہ کریں گے۔ نواب کی درخواست پر جس عجلت کے ساتھ فوج بھیجی گئی، بعد میں ہم نے اُس کا مقابلہ اپنی اُن اپیلوں سے کیا، جو ہم نے الور اور بھرت پور کی ہندو ریاستوں میں بدقسمت مسلمانوں کی امداد کو فوجیں بھیجنے کے لئے بار بار کی تھیں۔ ان ہندو ریاستوں میں مسلمانوں کا نام و نشان مٹایا جا رہا تھا۔ لیکن ہماری اپیلوں کا کوئی جواب تک نہ دیا گیا۔ [16]

۱۵ اگست تک ہندو اکثریت کی پانچ سو سے کچھ زائد ریاستیں سب کی سب ہندوستان سے الحاق کر چکی تھیں۔ صرف دو کے سوا جو کہ حیدر آباد اور جونا گڑھ تھیں۔ ایک مسلم اکثریت کی ریاست یعنی کپورتھلہ بھی ہندوستان سے الحاق کر چکی تھی۔ مسلم اکثریت کی دوسری ریاستوں (بشمول کشمیر) کے الحاق کا ابھی کوئی فیصلہ نہ ہوا تھا۔ جونا گڑھ، حیدر آباد اور کشمیر کی داستان چودھویں باب میں بیان کی جائے گی۔

ہندوستان سے ریاستوں کے دھڑا دھڑ الحاق کے بالکل برعکس کسی بھی ریاست نے ۱۵ اگست سے پہلے پاکستان سے الحاق نہ کیا۔ دس ایسی ریاستیں مغربی پاکستان سے متصل تھیں، جن کی آبادی میں اکثریت مسلمانوں کی تھی اور جن کے حکمران بھی مسلمان تھے۔ یہ ریاستیں بہاولپور، خیر پور، قلات، لس بیلہ، خاران اور مکران، اور سرحدی ریاستیں دیر، سوات، امب اور چترال تھیں۔

ان دس ریاستوں میں آبادی اور وسائل کے لحاظ سے بہاولپور سب سے بڑی تھی۔ لیکن یہ ریاست بھی اتنی چھوٹی تھی کہ آزاد و خود مختار رہنے کی اہل نہیں تھی۔ اس کی آبادی ۲۰ لاکھ سے بھی کم تھی، ان میں ۸۳ فیصد مسلمان تھے۔ اس ریاست کی خوشحالی کا دارومدار ستلج ویلی پراجیکٹ پر تھا، جو دراصل مغربی پنجاب کے نظامِ انہار کی توسیع تھی۔ مغربی پاکستان اور بہاولپور کے معاشی مفادات ایک دوسرے سے بہت مربوط تھے، اس کا ایک ثبوت یہ تھا کہ پاکستان کے وکیل ظفر اللہ خان ہی بہاولپور کی طرف سے پنجاب بونڈری کمیشن کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ نارتھ ویسٹرن ریلوے جس کے ذریعے شمال مغربی سرحدی صوبہ اور مغربی پنجاب کا رابطہ کراچی سے قائم تھا۔ اس کا کافی طویل حصہ ریاست بہاولپور سے گزرتا تھا۔ ریاست بہاولپور کے تحفظ و دفاع کو اگر کوئی داخلی یا خارجی خطرہ لاحق ہوتا تو لامحالہ اسے حفاظت کے لئے پاکستان سے رجوع کرنا پڑتا۔

ان سلسلہ ہائے ربط کا لازمی تقاضا تھا کہ اس ریاست کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہو جائے۔ بایں ہمہ نواب بہاولپور اور ان کے وزیر اعلیٰ مشتاق احمد گورمانی کی طرف سے نیم آزادانہ حیثیت برقرار رکھنے کی [17] خواہش کے تحت پس و پیش اور

تاخیر کی جا رہی تھی۔ اور مذاکرات [illegible] تک کو مضبوط بنانے کے بھی خواہاں تھے۔ ۱۵ اگست کو نواب نے جلالۃ الملک اعلیٰ حضرت نواب بہاولپور کا [illegible]۔ اختیار کرلیا۔ یہ خطاب آزادانہ مقام و مرتبہ کا مظہر تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی میں اپنے نمائندے بھیجنے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ اس کی کارروائی میں حصہ لیں، اور مناسب وقت پر پاکستان اور ریاست کے درمیان تسلی بخش آئینی تصفیہ کیا جا سکے۔ لیکن حالات اتنی تیزی سے بدل رہے تھے کہ اس طرح کی تعویق کی گنجائش نہیں تھی۔ اگست ۱۹۴۷ء کے آخری دو ہفتوں میں پنجاب کے فسادات کا سیلاب بہاولپور کی طرف بڑھ نکلا اور اگرچہ ریاستی حکام نے غیر مسلم اقلیت کے تحفظ کیلئے بڑی مستعدی سے پُرزور اقدامات کئے، لیکن ستمبر کے آخر تک نصف سے زیادہ ریاست سے ہندوؤں اور سکھوں کا کم و بیش مکمل انخلاء ہو چکا تھا۔ ۳ اکتوبر کو بہاولپور نے پاکستان سے الحاق کر لیا۔

خیرپور نے بہاولپور کی پیروی کی۔ اگلے چند ماہ کے دوران میں سرحدی ریاستوں چترال، سوات، دیر اور امب نے بھی پاکستان سے الحاق کر لیا اور صرف چار بلوچستانی ریاستیں قلات، خاران، مکران اور لسبیلہ رہ گئیں، جنہوں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔

بلوچستانی ریاستیں رقبہ کے لحاظ سے تو بہت وسیع و عریض تھیں۔ لیکن ان کی آبادی بڑی چھدری تھی۔ اور ان میں ترقی و تعمیر برائے نام تھی۔ ان کی مجموعی آبادی ۵ لاکھ کے لگ بھگ تھی، اور ان کے مالی وسائل انتہائی محدود تھے۔ خان آف قلات آزادی کا دعوےٰ کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ایک انگریز ڈگلس فیل کو بطور وزیر خارجہ ملازم رکھ لیا تھا۔ اور اطلاع ملی تھی کہ فیل غیر ملکی کمپنیوں سے تیل کی تلاش کے سلسلے میں بات چیت کر رہا ہے اور شاید ان کی وساطت سے بیرونی اعانت کا طلبگار ہے۔ یہ بھی بیان کیا جاتا تھا کہ خان آف قلات کے بھائی اور چچا نے کابل سے مدد مانگی تھی۔ الحاق کے لئے بات چیت طول پکڑتی گئی۔ حالانکہ خان آف قلات قائداعظم کے بے حد احترام کا دم بھرتے تھے۔ اس اثنا میں لسبیلہ، مکران اور خاران کے حکمران بےتاب ہو گئے۔ ان پر خان آف قلات کسی نوعیت کی حاکمیت اعلیٰ کے دعویدار تھے۔ لیکن انہوں نے اوائل مارچ ۱۹۴۸ء میں براہ راست پاکستان سے الحاق کرنے کی پیشکش کی۔ ان کا الحاق منظور ہونے سے ریاست قلات الگ تھلگ ہو کر رہ گئی۔ اب یہ ریاست چاروں طرف سے پاکستان کے علاقہ میں گھر گئی تھی۔ ان حالات میں خان آف قلات کو بھی راہِ عمل نظر آ گئی، اور انہوں نے مارچ ۱۹۴۸ء کے اختتام سے پہلے پاکستان سے الحاق کر لیا۔

باب ۱۲

پاکستان ــــ منصۂ شہود پر

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو لارڈ مونٹ بیٹن نے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کو خطاب کیا۔ اس کا کراچی آنے کا مقصد ملک معظم اور اپنی طرف سے پاکستان کی نئی ڈومینین کو تہنیت پیش کرنا تھا، اس سے پہلی شام کو لارڈ اور لیڈی مونٹ بیٹن کے اعزاز میں جو سرکاری دعوت دی گئی، اس میں قائدِ اعظم نے حکومتِ برطانیہ کی بڑی گرم جوشی سے تعریف کی۔ جس نے دو آزاد و خود مختار ڈومینیوں کو مکمل اقتدار دے کر "ایک عظیم نصب العین پایۂ تکمیل تک پہنچایا تھا" اس نصبُ العین کا مظہر دولتِ مشترکہ کی تشکیل تھی، جس کا علی الاعلان مقصود یہ ہے کہ سلطنت برطانیہ جن اقوام اور ممالک پر مشتمل ہے' وہ سب خود مختار اور کسی غیر قوم کے تسلط سے قطعی آزاد ہو جائیں۔

آئین ساز اسمبلی سے اپنے خطاب کے دوران میں لارڈ مونٹ بیٹن نے قائدِ اعظم کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا: "میں محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے درمیان گہرا ذاتی رابطہ اور اس سے پیدا شدہ باہمی اعتماد و تفاہم آئندہ کے اچھے تعلقات کے لیے بہترین شگون ہے"۔ نیم فلسفیانہ انداز میں مونٹ بیٹن نے کہا "پاکستان کا قیام تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ ہم لوگ جو تاریخ کا حصہ ہیں اور اس کی تخلیق میں شریک ہیں، اگر ہم چاہیں جب بھی ہم اس مقام پر نہیں کہ بخوبی اس واقعہ کے اخلاقی پہلوؤں پر رائے زنی کر سکیں یا بنظرِ واپسیں ماضی کے

پاکستان
روس
افغانستان
کابل
دریائے کابل
پشاور
اسلام آباد
راولپنڈی
جہلم
ڈیرہ اسمٰعیل خاں
قندھار
لاہور
دریائے راوی
ملتان
کوئٹہ
ڈیرہ غازی خاں
مغربی پاکستان
بہاول پور
قلات
جیکب آباد
ایران
ہندوستان
دریائے سندھ
بیلہ
تربت
حیدر آباد
کراچی
جوناگڑھ اور مناودار
35
30
25
65
70
75

نیپال
بھوٹان
دریائے برہم پتر
ہندوستان
رنگ پور
دریائے گنگا
مشرقی پاکستان
سلہٹ
25
ہندوستان
ڈھاکہ
جیسور
کلکتہ
کھلنا
دریائے کرنافلی
چٹاگانگ
کاکس بازار
خلیج بنگال
90

Scale for both maps
100 200 300 Miles

25

اس سلسلہ کا جائزہ لے سکیں جو اس منزل تک لانے کا موجب بنا ہے۔ اب پیچھے دیکھنے کا وقت نہیں، اب فقط آگے کی طرف نگاہ دوڑانے کا وقت ہے"۔ [1]

آئین ساز اسمبلی سے خطاب کے بعد قائداعظم اور لارڈ مونٹ بیٹن سرکاری جلوس میں ایک ساتھ گورنر جنرل کے ایوان کی طرف روانہ ہوئے۔ سکھوں کی جانب سے قاتلانہ حملے کی کوشش کا جو خدشہ تھا جلوس اس کے بغیر خیر و خوبی سے گزر گیا۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء رمضان المبارک کے آخری جمعہ کا بابرکت اور مقدس دن تھا۔ اس مبارک دن قائداعظم نے پاکستان کے گورنر جنرل کا منصب سنبھالا اور کابینہ نے حلف اٹھایا۔ ستارہ و ہلال والا قومی پرچم لہرایا گیا۔ پاکستان منصۂ شہود پر آگیا۔ یعنی دنیا بھر میں آبادی کے لحاظ سے پانچویں اور سب سے بڑی اسلامی مملکت معرض وجود میں آگئی۔ (نقشہ ۴ دیکھیے)

پاکستان کا ظہور جمہوری نظریہ کی ظفریابی تھی۔ پاکستان میں عوام کے یقین محکم نے اس نظریہ کو ممکن کر دکھایا۔ قائداعظم کی قیادت کو برضا و رغبت قبول کر کے انہوں نے اس منزل کو جا لیا۔ قائداعظم کے وسائل اپنے دل و دماغ کی قوتیں، اپنا عزم و ایمان اور ان کی قیادت پر عوام کا اعتماد تھا اور یہی وہ ذہنی اور اخلاقی اسلحہ تھے جن کی بدولت انہوں نے اپنی قوم کے لیے پاکستان حاصل کر لیا۔ ملت دل و جان سے ان کی ممنون تھی۔ وہ بابائے قوم اور قائداعظم تھے۔ اس مقام و مرتبہ کا رسمی اعتراف ۱۲ اگست کو کیا گیا، جب آئین ساز اسمبلی نے ایک قرارداد منظور کی کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد انہیں تمام سرکاری کارروائی، دستاویزوں، مراسلات اور خط و کتابت میں قائداعظم محمد علی جناح، گورنر جنرل پاکستان کے طور پر مخاطب کیا جائے۔

پاکستان کے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہونے پر گھر گھر خوشی منائی گئی۔ اس ہمہ گیر مسرت نے وقتی طور پر مشرقی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتل عام کے رنج و الم کو محو کر دیا۔ مستقبل کی آغوش میں پاکستان کے لوگوں کے لیے خواہ کیسی بھی آزمائشیں اور مصیبتیں ہوں، بہر حال ایک آزاد و خود مختار مسلم مملکت کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو گیا تھا۔ اب وہ اپنی سرزمین کے مالک تھے۔ جسے انہوں نے ایک مضبوط اور جدید جمہوری مملکت کے طور پر فروغ و استحکام دینا تھا۔ اس اہم اور کٹھن کام کی بے پایاں وسعت سے وہ ہرگز مرعوب نہیں تھے، بلکہ اس سے ان کے دل میں ملک و ملت کی بے لوث خدمت کا قومی جذبہ موجزن تھا۔ ان کے دشمنوں اور دوسرے لوگوں نے جو دہشت انگیز پیش گوئیاں کر رکھی تھیں کہ پاکستان بہت جلد نیست و نابود

ہوجائے گا، انہوں نے الٹا اثر کیا اور مزید جدو جہد کے لیے مہمیز کا کام دیا۔ وہ یقین کی دولت سے مالا مال تھے، اور پاکستان کو اسلامی تصورات حیات کا شایانِ شان مظہر بنانے کے لیے تمام مشکلات سے نبرد آزما ہونے کا عزم صمیم رکھتے ہیں

فتح و کامرانی کی اس گھڑی میں نہ ہندوؤں، جنہوں نے پاکستان کی مخالفت اس قدر ہٹ دھرمی سے کی تھی، کوئی کینہ یا عناد تھا نہ کسی اور کے خلاف۔ انگریزوں کے لیے تشکر اور دوستی کا جذبہ تھا۔ اب سب عزائم اور قوتیں پاکستان کی تعمیر و ترقی کی عظیم مہم کے لیے وقف تھیں، اور اس مقصد کے لیے ہر چیز سے زیادہ امن و امان، دیانتداری، جفاکشی اور بے لوث خدمت کی ضرورت تھی۔

۱۵ اگست کو قائدِ اعظم نے اہلِ پاکستان کے نام اپنے پیغام میں کہا "اس عظیم موقع پر مجھے سب سے زیادہ وہ بہادر مجاہد یاد آ رہے ہیں، جنہوں نے ہمارے نصب العین کی خاطر سب کچھ حتیٰ کہ جانیں بھی خوشی سے قربان کر دیں تاکہ پاکستان کا قیام عمل میں آجائے"۲؎ ہندوستان میں رہنے والے چار کروڑ مسلمانوں کے لیے خیر خواہی تھی اور مسلسل تشویش بھی۔ جیسا کہ قائدِ اعظم نے کہا "ہمارے ان بھائیوں کو جواب ہندوستان میں اقلیت میں ہیں، پورا یقین ہونا چاہیے کہ ہم کبھی نہ انہیں نظر انداز کریں گے اور نہ فراموش۔ مجھے تسلیم ہے کہ یہ اس برصغیر کے مسلم اقلیتی صوبے ہی ہیں، جنہوں نے سبقت کی اور ہمارے دل و جان سے عزیز نصب العین پاکستان کے حصول کا پرچم سربلند رکھا"۳؎ اب انہیں نئے اور مشکل حالات سے مطابقت کرنی پڑے گی، کیونکہ پاکستان کی حمایت کرنے کے باعث وہ ہندوؤں کی نگاہ میں مبغوض تھے۔ قائدِ اعظم نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ جس مملکت میں ہیں، اس کے غیر متزلزل طور پر وفادار رہیں۔

یہ حقیقت کبھی ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ تقسیم سے دونوں طرف اقلیتیں باقی رہ جائیں گی۔ دونوں ڈومینینوں کا بہترین مفاد امن اور فرقہ وارانہ مصالحت میں مضمر تھا۔ قائدِ اعظم نے بار بار اس بات کا اعادہ کیا کہ پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں کو وہی حقوق اور مراعات حاصل ہوں گی، جو مسلمانوں کو حاصل ہوں گی۔ انہوں نے ۱۱ اگست کو آئین ساز اسمبلی سے جو پہلا خطاب کیا، اس میں انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں ان جذبات پر اس طرح مہر تصدیق ثبت کی:

> "ایک حکومت کی اوّلین ذمہ داری امن و امان کو برقرار رکھنا ہوتا ہے، تاکہ مملکت کی طرف سے اپنے باشندوں کی جان، مال اور مذہبی عقائد کی پوری حفاظت

قائد اعظم پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی
حیثیت سے حلف اٹھا رہے ہیں ۔

کی جا سکے۔ اس تقسیم میں ایک یا دوسری ڈومینین میں اقلیتوں کا باقی رہنا ناگزیر تھا۔
ہمیں اپنی ساری توجہ لوگوں بالخصوص عوام اور غریبوں کی بہبود پر مرکوز کر دینی چاہیے۔
آپ کا تعلق کسی بھی مذہب یا ذات یا عقیدہ سے ہو۔ اس کا کاروبارِ مملکت سے کوئی
سروکار نہیں۔ ہم اس بنیادی اصول سے آغاز کار کر رہے ہیں کہ ہم سب ایک مملکت
کے شہری اور مساوی شہری ہیں۔ میرے خیال میں اب ہمیں اس بات کو بطور
نصب العین پیشِ نظر رکھنا چاہیے، اور وقت گزرنے پر آپ دیکھیں گے کہ ہندو،
ہندو نہیں رہیں گے، اور مسلمان، مسلمان نہیں رہیں گے، مذہبی لحاظ سے نہیں کیونکہ وہ
ہر فرد کا ذاتی عقیدہ ہے بلکہ مملکت کے شہریوں کے طور پر سیاسی لحاظ سے"[۱۳۵]

ان الفاظ کا مطلب اس قدر واضح ہے کہ کسی بھی قسم کا شک و شبہ باقی نہیں رہنا چاہیے۔ تاہم نظریاتی نوعیت کے سوالات اٹھائے گئے ہیں اور خاصی گرما گرم بحث چل نکلی ہے۔ یہ پوچھا جاتا ہے کہ کیا پاکستان کے حصول کے ساتھ ہی قائداعظم دو قومی نظریہ سے دستبردار ہو گئے تھے، اور انہوں نے اس کے تمام شہریوں کو مسلم ہوں یا غیر مسلم یکساں دعوت دی تھی کہ وہ علاقائی قومیت کی اساس پر مملکت کے لیے شانہ بشانہ کام کریں؟ اگر یہی بات تھی تو پھر پاکستان کی علت غائی کیا تھی، اور اس مملکت کی امتیازی خصوصیت کیا ہوگی؟ کیا دو قومی نظریہ محض چوب بست دار تھا جسے مکان بن جانے پر اتار پھینکنا تھا؟ دوسرے لوگوں نے قائداعظم کے ان الفاظ کی یہ تعبیر کی ہے کہ یہ ایک دور دراز منزل مقصود ہے۔ جس کی طرف وقت گزرنے کے ساتھ پاکستان کے عوام بڑھیں گے۔

جس بات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان کسی لشکر کشی سے حاصل نہیں ہوا تھا بلکہ یہ نتیجہ تھا برصغیر کی تقسیم پر ایک سمجھوتے کا جو ہندو اور مسلم فرقوں کے نمائندوں کے درمیان گفت و شنید سے طے ہوا۔ اس سمجھوتے کا ایک واضح اور لازمی حصہ یہ تھا کہ دونوں مملکتوں میں اقلیتوں کو مساوی حقوق اور قانون کے تحت مساوی تحفظات حاصل ہوں گے۔ اس سیاق و سباق میں قائداعظم اس بنیادی اصول پر زور دیتے ہیں بالکل حق بجانب تھے کہ "ہم سب ایک مملکت کے شہری اور مساوی شہری ہیں"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مملکت کو "اپنے باشندوں کی جان، مال اور مذہبی معتقدات کی پوری حفاظت کرنی چاہیے اور اپنی ساری توجہ لوگوں بالخصوص عوام اور غریبوں کی بہبود پر مرکوز کر دینی چاہیے"۔ سیاسی تدبر کے یہ عملی فرائض صرف اسی وقت بحسن و خوبی ادا کیے جا سکتے ہیں کہ سب شہریوں کو مساوی حقوق اور مساوی ذمہ داریوں سے بہرہ ور کیا جائے۔ لیکن اس سے

نہ اس حقیقت کی نفی ہوتی ہے کہ پاکستان کے باشندوں کی بھاری اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے اور نہ ہی مسلم قوم کو قیادت کی ذمہ داری سے سبکدوش کیا جا سکتا ہے۔ اگر قیادت اپنے قول و فعل میں مخلص ہو اور اس کا قلب و نظر حقیقی معنوں میں اسلامی ہو، تو پھر ملک کی حکمرانی کے اصول لازماً اسلام کی بنیاد پر استوار ہوں گے۔ ایسی قیادت ساری قوم کی تخلیقی قوتوں کو ابھارنے کے لیے انتھک محنت کرے گی، اور ان قوتوں کو پاکستان کے استحکام اور خوشحالی کے لیے بروئے کار لائے گی، قائدِ اعظم نے اس تعمیری کام کے متعلق کہا کہ یہ "سماجی انصاف اور اسلامی سوشلزم کی پختہ بنیادوں پر قائم ہے جو مساوات اور اخوتِ انسانی پر زور دیتی ہیں"۔

اپنے اس پہلے خطاب میں قائدِ اعظم نے ان برائیوں کی بڑے صاف اور واشگاف انداز میں نشاندہی بھی کی، جن میں ہندوستان اور پاکستان جیسے پسماندہ ملک مبتلا ہیں۔ انہوں نے کہا:

"ہند جن بڑی لعنتوں سے دوچار ہے، ان میں ایک رشوت اور بد دیانتی ہے میں یہ نہیں کہتا کہ دوسرے ملک اس سے مصئون ہیں، لیکن میرے خیال میں ہماری حالت بد رجہا ابتر ہے ـــــ یہ یقیناً ایک زہر ہے۔ میں کسی بھی نوعیت کی بد دیانتی اور اقربا نوازی سے درگزر نہیں کروں گا، اور نہ ہی کسی ایسے اثر اور دباؤ کو برداشت کروں گا، جو مجھ پر براہ راست یا بالواسطہ ڈالا جائے گا۔ جہاں کہیں مجھے معلوم ہو گا کہ ایسی کوئی خرابی رائج ہے یا اعلیٰ یا ادنیٰ سطح پر کہیں بھی موجود ہے، میں یقیناً اسے روا نہیں رکھوں گا"[۵]

عوام اور انتظامیہ نے ان اعلیٰ وارفع جذبات کو تہِ دل سے قبول کیا۔ رشوت ستانی اور بد دیانتی کے واقعات بہت کم ہو گئے۔ ریل گاڑیوں میں بلا ٹکٹ سفر ہند کی ریلوں پر عموماً پایا جاتا تھا۔ اب لوگ خود ہی اس بدعنوانی کی مذمت کرنے لگے۔ فضا میں ہر طرف اخلاقی حمیت اور تعاون کی روح چھا گئی۔ عوام اور حکومت میں بُعد کا احساس ختم ہو گیا، سب ایک ہی نصب العین کے لیے رفیقِ کار تھے۔

پاکستان کی پہلی کابینہ جس نے ۱۵ اگست کو حلف اٹھایا حسبِ ذیل اصحاب پر مشتمل تھی:

لیاقت علی خان، وزیرِ اعظم۔ وہ دو محکموں کے بھی سربراہ تھے ـــ امورِ خارجہ و تعلقاتِ دولتِ مشترکہ اور دفاع۔ آئی آئی چندریگر، تجارت، صنعت اور تعمیرات۔ غلام محمد، خزانہ۔ عبدالرب نشتر، مواصلات۔ غضنفر علی خان خوراک، زراعت اور صحت۔ جوگندر ناتھ منڈل قانون اور محنت۔ فضل الرحمٰن، امورِ داخلہ، اطلاعات اور تعلیم۔ لیاقت علی خان کا وزیرِ اعظم ہونا نہ صرف ایک فطری امر تھا بلکہ صحیح اور موزوں بھی تھا۔ وہ کئی سال تک

کابینہ پاکستان کا پہلا اجلاس

(دائیں سے بائیں) سامنے کی قطار میں۔ مسٹر عثمان علی ڈپٹی سیکرٹری کابینہ، چوہدری محمد علی سیکرٹری جنرل، مسٹر لیاقت علی خان وزیر اعظم، آئی۔ آئی چندریگر، مسٹر فضل الرحمان وزیر تعلیم، جوگندر ناتھ منڈل وزیر صنعت، راجہ غضنفر علی خان وزیر صحت

آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری رہے تھے۔ ہند کی مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے ڈپٹی لیڈر تھے۔ پھر وہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں وزیر خزانہ اور مسلم لیگ بلاک کے لیڈر بھی رہے تھے۔ چندریگر، نشتر، غضنفر علی خان اور منڈل وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں ان کے ساتھی تھے۔ غلام محمد حکومت ہند کے محکمہ خزانہ میں نمایاں خدمات سرانجام دے چکے تھے اور ریاست حیدرآباد میں وزیر خزانہ بھی رہے تھے۔ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ عظیم صنعتی شرکت ٹاٹا میں ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے۔ فضل الرحمٰن بنگال میں وزیر رہ چکے تھے۔

کچھ ہی عرصہ بعد محمد ظفر اللہ خان کو وزیر خارجہ مقرر کر دیا گیا۔ وہ اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کے قائد کی حیثیت سے نیویارک گئے ہوئے تھے۔ کابینہ کے اجلاس میں ان کی نشست وزیر اعظم کے بعد آتی تھی۔ محکمہ دفاع وزیر اعظم کی تحویل میں ہی رہا۔ ظفر اللہ خان وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن بھی رہ چکے تھے، اور اس کے بعد برطانوی ہند میں فیڈرل کورٹ کے جج مقرر ہوئے تھے۔

ستمبر ۱۹۴۷ء میں جب مہاجرین کے مسئلے نے بے پایاں وسعت اختیار کر لی، تو وزارت بحالیات مہاجرین کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ وزارت بنگال کے سابق وزیر اعلیٰ ایس۔ ایچ سہروردی کو پیش کی گئی۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ پہلے یہ کام فضل الرحمٰن کو سپرد کیا گیا اور بعد میں راجہ غضنفر علی خان کو۔ مئی ۱۹۴۸ء میں جب چندریگر سفیر بن کر کابل چلے گئے، تو مشرقی بنگال سے خواجہ شہاب الدین بطور وزیر داخلہ کابینہ میں شامل کیے گئے۔ اور فضل الرحمٰن وزارت تجارت کے سربراہ مقرر ہو گئے۔ جولائی ۱۹۴۸ء میں غضنفر علی خان ایران میں سفیر بنا دیے گئے اور ان کی جگہ پیرزادہ عبدالستار نے لی۔ ریاستوں اور قبائلی علاقوں کی نئی وزارت جولائی ۱۹۴۸ء میں قائم کی گئی۔ اس کی نگرانی براہ راست قائد اعظم خود کرتے تھے۔ جنوری ۱۹۴۹ء میں امور کشمیر کی ایک جداگانہ وزارت بنائی گئی اور مشتاق احمد گورمانی اس کے سربراہ مقرر ہوئے، وہ اس وقت ریاست بہاولپور کے وزیر اعلیٰ تھے۔

جون اور جولائی ۱۹۴۷ء میں متعدد افسروں نے حکومت پاکستان کی تنظیم کے لیے سکیمیں مرتب کی تھیں۔ میں نے بھی ایک منصوبہ پیش کیا تھا۔ اس منصوبے کے مطابق اٹھارہ انتظامی محکموں کی آٹھ وزارتوں میں گروپ بندی کی جانی تھی، بعض وزارتوں کے کام کو شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ یہ منصوبہ جسے منظور کر لیا گیا، اس نوعیت کی دوسری سکیموں کی طرح حکومت ہند کے نمونہ پر مرتب کیا گیا تھا، البتہ پاکستان کے حالات کی مناسبت سے اس میں کچھ تبدیلیاں کر دی گئی تھیں۔ لیکن میں نے ایک بالکل نئی تجویز بھی پیش کی

تھی۔ جنگ اور امن کے زمانوں میں مجھے حکومتِ ہند کے امور کا جو علم ہوا تھا۔ اس سے مجھے پختہ یقین ہو گیا تھا کہ ہند میں اعلیٰ انتظامیہ کو ہم آہنگی کے فقدان نے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ وائسرائے کی سطح کے ماسوا کوئی اور ایک بھی نقطہ ماسکہ نہیں تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے آخری دنوں میں جب اس ضرورت کو بالاصرار نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا تو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے لیے کابینہ سیکرٹری کا ایک عہدہ قائم کیا گیا جس کی بدولت اس کمی کو کسی حد تک پورا کیا جا سکا۔ برطانوی حکومت میں بھی اگرچہ خزانہ کا فرسٹ سیکرٹری سول سروس کا سربراہ ہوتا تھا، اور اس طرح بہت حد تک اِنتظامی ہم آہنگی کے لیے ذمہ دار ہوتا تھا، لیکن کابینہ سیکرٹری ایک علیحدہ افسر ہوتا تھا اور مختلف وزارتوں کے اہم شعبوں میں ربط و ہم آہنگی کی ذمہ داری اس پر بھی عائد ہوتی تھی۔ پاکستان میں ہمارا مطمح نظر ایک مربوط، فعال اور نسبتاً مختصر تنظیم تھا۔ ایک نئے دارالحکومت میں ایک نئی انتظامیہ کا قیام بجائے خود ازحد دشوار کام تھا اور اس کی بقا کے لیے فیصلہ کرنے میں سرعت، عمل درآمد میں مستعدی اور کارکردگی کی اطلاع رسانی میں برق رفتاری ازحد ضروری تھی۔ اس لیے میں نے یہ تجویز پیش کی کہ سیکرٹری جنرل کا نیا عہدہ قائم کیا جائے، جسے مختلف وزارتوں کے کام میں ربط و ہم آہنگی کا فرض سپرد کیا جائے، اور یہ کہ سیکرٹری جنرل ہی کابینہ کا سیکرٹری بھی ہو اور حکومت کے عملے کا سربراہ بھی۔

ان باہم مربوط فرائض کو ایک ہی شخص کی تحویل میں دینے سے ایک طرف کابینہ اور دوسری طرف انتظامیہ کے مابین موثر رابطہ ممکن ہو جائے گا۔ چونکہ اس پر وزارتوں کے کام میں ربط و ہم آہنگی کی ذمہ داری عائد ہوگی۔ اس لیے سیکرٹری جنرل نہ صرف مختلف محکموں کے اختلافات رفع کر سکے گا بلکہ ان کے فرائض میں حدِ فاصل بھی قائم رکھ سکے گا۔ اور اس امر کا ضامن ہو گا کہ انتظامی مشینری خوش اسلوبی سے کام کرے۔ حکومت کے عملہ کا سربراہ ہونے کے باعث افسروں کے تقرر اور تبادلے کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہوگی، اور وہ مرکز یا صوبہ کے کسی شعبہ کے عملے میں شدید کمی نہیں ہونے دے گا، اور جو جوہرِ قابل میسر تھا اس کی مختلف محکموں میں منصفانہ تقسیم کر سکے گا۔ یہ کوئی سربستہ راز نہیں تھا کہ تمام وزارتوں اور محکموں کے عملہ کے لیے پاکستان کے پاس کافی تعداد میں قابل افسر نہیں تھے۔ ان حالات میں یہ بات غیر متوقع نہیں تھی کہ قابل افسروں کے لیے چھینا جھپٹی شروع ہو جائے گی، اور خواہ کسی دوسری جگہ ضرورت اہم ترکیوں نہ ہو۔ صاحبِ اہلیت آدمی کو وہاں نہ بھیجنے کا رجحان عام ہو گا۔ جس افسر کی اولین ذمہ داری یہ ہو کہ اس کے اپنے محکمہ کے فرائض خوش اسلوبی سے سرانجام پانے چاہئیں۔ اگر وہ بے لاگ نظر سے سارے قومی منظر کا جائزہ نہ لے تو اسے موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔

سیکرٹری جنرل وزیرِ اعظم کے سامنے جوابدہ ہوگا۔ اس کے فرائض سے یہ لازم آتا تھا کہ جس طرح وزیرِ اعظم اپنے رفقائے کار میں سرفہرست ہوتا ہے، اسی طرح سیکرٹری جنرل بھی اپنے مساوی مرتبہ کے عہدے داروں یعنی مختلف وزارتوں کے سیکرٹریوں میں سرفہرست ہوگا۔

میں نے سیکرٹری جنرل کے عہدہ کی تخلیق کے لیے یہ تجویز حکومتی انتظام کے عام اصولوں کی بنیاد پر پیش کی تھی۔ اس میں خاص طور پر وہ حالات بھی مدِنظر رکھے گئے تھے، جو پاکستان کے منصۂ شہود پر آنے کے وقت موجود تھے۔ میں نے براہِ راست یا بالواسطہ کوئی اشارہ تک نہیں کیا کہ اس منصب پر کس شخص کو مامور کیا جائے۔ آیا یہ منصب قائم کرنا چاہیے یا نہیں اور اس منصب پر کس شخص کو فائز کرنا چاہیے؟ یہ دونوں فیصلے قائدِ اعظم کو اپنے وزیروں کے مشورہ سے کرنے تھے۔ قائدِ اعظم نے اس تجویز کو شرفِ قبولیت بخشا اور مجھے اس منصب پر فائز کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں پورے خلوص کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر کسی اور شخص کو اس منصب پر فائز کر دیا جاتا، تو بھی مجھے یکساں طمانیت ہوتی۔

یہ بات بیان کرنے کی میں اس لیے ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ بعد میں یہ منصب میرے ساتھ اتنے گہرے طور پر منسوب ہوگیا کہ بعض لوگوں نے خیال کیا کہ یہ خاص طور پر میرے لیے تخلیق کیا گیا تھا۔ اس تاثر کو اس وقت اور تقویت پہنچی، جب اکتوبر ۱۹۵۱ء میں مجھے وزیرِ خزانہ مقرر کیا گیا تو اس منصب پر کسی دوسرے شخص کا تقرر نہ کیا گیا، اور اس طرح یہ منصب ہی ختم ہوگیا۔

وزیرِ اعظم لیاقت علی خان کی پُرالم شہادت سے ملک میں جو ہنگامی حالت پیدا ہوئی، اس میں کابینہ اس فیصلہ پر پہنچی کہ گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین وزیرِ اعظم بن جائیں اور وزیرِ خزانہ غلام محمد کو گورنر جنرل مقرر کر دیا جائے۔ اس کے بعد خواجہ ناظم الدین اور غلام محمد دونوں کے علاوہ کابینہ کے دوسرے وزیروں نے بھی مجھ پر زور دیا کہ میں وزیرِ خزانہ کا عہدہ قبول کرلوں۔ میری ذاتی رائے یہ تھی اور اس پر میں نے اصرار بھی کیا کہ مجھے سیکرٹری جنرل کے طور پر ہی اپنے فرائض ادا کرتے رہنا چاہیے اور کسی دوسرے شخص کو وزیرِ خزانہ مقرر کر دینا چاہیے۔ لیکن اس بات کو منظور نہ کیا گیا، اور سیکرٹری جنرل کے منصب پر کسی اور کو فائز نہ کیا گیا، کیونکہ کوئی موزوں شخص نہ مل سکا۔

سیکرٹری جنرل کا منصب چار سال تک قائم رہا اور اس دوران میں اس کا قیام پوری طرح حق بجانب ثابت ہوا۔ چونکہ میں براہِ راست وزیرِ اعظم کے سامنے جوابدہ تھا، اور ان کے ساتھ میرا روزانہ اور مسلسل رابطہ رہتا تھا، میں مستعدی کے ساتھ فیصلے کر سکتا تھا، اور حسبِ ضرورت حکومت کی منظوری حاصل کر لیتا تھا۔ مشکلوں

اور رکاوٹوں پر کڑی نگرانی رکھتا تھا۔ مختلف وزارتوں کے سیکرٹریوں کے ساتھ ہفتہ وار اجلاس کرتا تھا جس میں مختلف مسائل پر تبادلۂ خیالات کے بعد فیصلے کیے جاتے تھے۔ ایک لحاظ سے ہمارے یہ ہفت روزہ اجلاس انتظامی سطح پر کابینہ کے اجلاسوں کی طرح ہوتے تھے۔ شاذونادر ہی کوئی وزارت کسی خاص مسئلہ کے حل کی یکہ و تنہا ذمہ دار ہوتی ہے۔ عام طور پر حکومت کا کاروبار اتنا پیچیدہ ہوتا ہے کہ کسی اہم مسئلہ کا تعلق دو یا تین وزارتوں سے ہوتا ہے۔ ان ہفت روزہ اجلاسوں میں، چونکہ تمام سیکرٹری موجود ہوتے تھے، جن وزارتوں کے مسائل بحث و تمحیص کے لیے پیش ہوتے تھے، انہیں ایک دوسرے کا نقطۂ نظر سمجھنے میں مدد ملتی تھی، اور جن دوسری وزارتوں کا براہِ راست سروکار نہیں ہوتا تھا، وہ بھی تازہ ترین صورتِ حال سے باخبر رہتی تھیں۔ نئے اور کٹھن مسائل مسلسل پیدا ہو رہے تھے، اس حد تک کہ خود قائدِ اعظم کو اکثر کابینہ کے اجلاسوں کی صدارت کرنی پڑتی تھی۔ سیکرٹریوں کے ہفت روزہ اجلاسوں سے ان مسائل پر تبادلۂ خیالات کرنے اور کابینہ کو بہترین مشورہ پیش کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ اس سے کابینہ کے کام میں بڑی آسانی پیدا ہو گئی، میں جو رپورٹیں پیش کرتا تھا کابینہ انہیں گہری توجہ کا مستحق سمجھتی تھی، اور میں جو مشورہ پیش کرتا تھا اسے بالعموم قبول کر لیا جاتا تھا۔ ان ہفت روزہ اجلاسوں کے علاوہ جب بھی کسی اہم مسئلہ پر تبادلۂ خیالات کی ضرورت محسوس ہوتی، میں مختلف وزارتوں کا مشترکہ اجلاس بلا لیتا تھا اور انتظامی سطح پر اختلافات رفع کر دیے جاتے تھے۔ اگر ضرورت ہوتی تو میں وزیرِ اعظم سے براہِ راست یا کابینہ کی وساطت سے احکام حاصل کر لیتا تھا۔ میں یہاں پورے تشکر و امتنان سے ضبطِ تحریر میں لانا چاہتا ہوں کہ قائدِ اعظم، وزیرِ اعظم، کابینہ اور میرے رفقائے کار نے مجھ پر جو اعتماد کیا، اس کی بدولت میں بہت ہی مشکل اور بحرانی دور میں انتظامی مشینری کی تنظیم اور اس میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا فرض سرانجام پا سکا۔

چونکہ صوبوں کے اکثر دوروں میں وزیرِ اعظم مجھے ساتھ لے جاتے تھے، مجھے صوبوں کے مسائل اور مشکلات سے براہِ راست آگاہ ہونے کا بھی موقع ملتا رہا، جس کی بدولت موقع پر ہی یا کراچی واپس آنے کے بعد ان مسائل اور مشکلات کو حل کرنے میں مدد ملتی رہی۔ اس طرح مرکزی حکومت اور صوبوں میں ربط و ہم آہنگی پیدا کرنے میں بڑی آسانی ہو گئی۔ اسی طرح اعلیٰ فوجی افسروں کے ساتھ میرے جو ذاتی روابط تھے، اور حکومتِ ہند کے مالیاتی مشیر برائے جنگ و رسد کے طور پر کام کرنے سے مجھے دفاعی مسائل کا جو علم و تجربہ حاصل ہوا تھا، اس سے مجھے سول اور فوجی انتظامیہ کے کام میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں مدد ملی۔

سیکرٹری جنرل کا دفتر مختلف وزارتوں اور مرکزی حکومت اور صوبوں کے درمیان معلومات کے

تب دل کے مرکز کے طور پر بھی خدمات سر انجام دیتا تھا۔ محکموں کے باہمی رابطہ کے ابھی تک ناکافی وسائل پر بھروسہ کرنے کی نسبت سیکرٹری جنرل سے زیادہ جلدی اور سہولت کے ساتھ معلوم ہوجاتا تھا کہ کوئی خاص مسئلہ کس منزل پر ہے یا کیا فیصلہ ہوا ہے۔ دوسری طرف اس سے مجھے مختلف منصوبوں کی رفتارِ ترقی سے مطلع ہونے اور رکاوٹوں کی دریافت میں مدد ملتی تھی۔ ان ابتدائی ایام میں حادثات اور واقعات پے در پے ہو رہے تھے۔ اور صورتِ حال بالکل زمانۂ جنگ کی سی تھی، صرف اس لحاظ سے ہی نہیں کہ جہد للبقا جاری تھی بلکہ تنازعہ کشمیر کے پھوٹ پڑنے سے فی الواقع جنگ کے حالات پیدا ہو گئے تھے اور مرکزِ حکومت سے فوری رابطہ ناگزیر ہو گیا تھا تاکہ بروقت فیصلے ہو سکیں۔ ایک نہ ایک صورت میں مختلف النوع مسائل ___ انتظامی، اقتصادی اور دفاع اور خارجہ پالیسی کے امور ___ میری میز پر آپہنچتے تھے۔ اگرچہ میری بنیادی ذمہ داری اور کوشش حکومت کے ڈھانچے کی ترتیب تھی اور اس کا تقاضا تھا سلسلۂ مواصلات میں باقاعدگی اور مسلمہ معمولاتِ کار ___ لیکن واقعات کا سیلاب ضابطۂ معمول کو درہم برہم کرتا رہتا تھا۔ مفصل رودادیں لکھنے اور یادداشتیں مرتب کرنے کے لیے وقت میسر نہیں تھا۔ عام حالات میں جن فیصلوں پر پہنچنے کے لیے کئی دن بلکہ کئی ہفتے درکار ہوتے ہیں، وہ اکثر اوقات اسی ساعت طے کرنے پڑتے تھے۔ میرا دفتر ایک مرکز تھا۔ جہاں مواصلات کے کئی سلسلے آکر ملتے تھے۔ اس زمانے میں حکومت ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بڑی کثرت سے مراسلات جو زیادہ تر تاروں کی شکل میں ہوتے تھے، آجا رہے تھے۔ یہ مراسلات اکثر ایک وزیرِ اعظم سے دوسرے وزیرِ اعظم کے نام ہوتے تھے۔ ان کا موضوع جملہ اقسام کے معاملات تھے ___ تارکینِ وطن کی نقل و حرکت، امن و امان، جونا گڑھ اور کشمیر سے پیدا ہونے والے مسائل وغیرہ وغیرہ۔ بسا اوقات یہ ہوتا تھا کہ ایسے تار براہِ راست کابینہ کے سامنے پیش کر دیے جاتے تھے اور کابینہ کا اجلاس ختم ہونے سے پہلے ہی ان کا جواب بھی مرتب کر دیا جاتا تھا۔ میرے دائرۂ فرائض میں یہ بھی شامل تھا کہ ان مسائل کا جائزہ لیتا رہوں اور وزارتوں کی طرف سے مابعد اقدامات کی پیروی بھی کرتا رہوں۔

جوں جوں نئے مسائل پیدا ہوتے گئے اور کسی خاص جہت میں کام کا زور بڑھتا گیا، نئے انتظامی دفتروں کا قیام بھی ضروری ہوتا گیا۔ ایسی تبدیلیوں اور تقاضوں کی پیش بینی اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے سفارشات پیش کرنا بھی میری ذمہ داری تھی۔ مثال کے طور پر تقسیمِ ملک کے وقت نقل مکانی کا جو روز افزوں سلسلہ شروع ہوا اور اس کی وجہ سے بےشمار کام بڑھا وہ کسی بھی موجودہ وزارت کے دائرہ کار میں نہیں آتا تھا، چنانچہ اوائل ستمبر میں وزارتِ مہاجرین و بحالیات کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جب تنازعۂ کشمیر کا آغاز ہوا

اور قبائلی لشکروں اور دوسرے رضا کاروں کی میدانِ جنگ میں آمدورفت کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوا، تو بہت سے ضروری اور اہم مسائل پیدا ہوئے جن کا تعلق پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کی حکومتوں کے ساتھ تھا۔ مزید براں نئی قائم شدہ آزاد کشمیر حکومت کے ساتھ تعلقات کا مسئلہ بھی تھا اور آزاد کشمیر کے لوگوں کے لیے خوراک اور شہری رسد کی بہم رسانی کا مسئلہ بھی۔ کسی نہ کسی طرف سے یہ مسائل میرے سامنے آرہے تھے اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان سے مقامی طور پر عہدہ برآ ہونے کے لیے راولپنڈی میں حکومتِ پاکستان کے کسی معتمد نمائندہ کا تقرر ناگزیر ہے۔ وزیرِ اعظم نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور مجھے موزوں اصحاب کے نام پیش کرنے کے لیے کہا۔ مجھے خیال آیا کہ لاہور ہائیکورٹ کے سبکدوش جج جسٹس دین محمد جو اس وقت ریاست بہاولپور کے چیف جسٹس کے طور پر کام کر رہے تھے، اس کام کے لیے موزوں ہوں گے۔ وزیرِ اعظم نے اسے منظور کر لیا اور مجھے ہز ہائی نس نواب بہاولپور کی منظوری حاصل کرنے کے لیے بذریعہ ہوائی جہاز بہاولپور بھیجا گیا۔ میں ہز ہائی نس کو بہت مدت سے جانتا تھا۔ انہوں نے ہمارے پیشِ نظر کام کے لیے جسٹس دین محمد کو فارغ کرنے پر بجوشی آمادگی ظاہر کی، بلکہ جب نواب صاحب کو معلوم ہوا کہ میں کسی سنگین تر مسئلہ کی وجہ سے بہاولپور نہیں آیا تھا، تو انہوں نے بڑے سکھ کا سانس لیا۔

کراچی میں میں نے ایک ڈپٹی سیکرٹری اور ایک انڈر سیکرٹری پر مشتمل تنظیم قائم کر دی تا کہ وہ مسئلہ کشمیر کے مختلف پہلوؤں پر کام کر سکے۔ یہ تنظیم براہ راست میرے ماتحت کام کرتی تھی، اور ایک سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد ایک علیحدہ وزارتِ امورِ کشمیر قائم کی گئی۔

مجھے گاہے گاہے بات چیت کے لیے دہلی یا مسئلہ کشمیر کے لیے اقوام متحدہ بھی جانا پڑتا تھا۔ میری عدم موجودگی میں وزارتِ خارجہ کے سیکرٹری اکرام اللہ سیکرٹری جنرل کے طور پر کام کرتے تھے۔ اسی طرح جب کبھی وہ باہر جاتے تھے، تو میں وزارتِ خارجہ کے سیکرٹری کے فرائض بھی سرانجام کرتا تھا۔ تجربہ کار افسروں کی شدید کمی کے باعث ہر سطح پر اسی نوعیت کا دوہرا کام ایک عام معمول تھا۔ اس بندوبست کو قابلِ عمل بنانے کے لیے میں اور اکرام اللہ مستقل طور پر آپس میں رابطہ قائم رکھتے تھے۔ یہ سلسلہ اس وقت بھی جاری رہتا تھا، جب ہم دونوں کراچی میں ہوتے تھے۔ کراچی میں متعینہ سفیروں سے مراسم برقرار رکھنا بھی میری ذمہ داری میں شامل تھا۔

جولائی ۱۹۴۸ء میں ایک سلیکشن بورڈ قائم کیا گیا، جس کے ذریعہ وزارتوں کے لیے افسروں مثلاً سیکرٹریوں، جوائنٹ سیکرٹریوں اور ڈپٹی سیکرٹریوں کا انتخاب اور محکموں اور دوسرے دفتروں کے سربراہوں کو

نامزد کیا جاتا تھا۔ بعد میں جب کراچی میں حکومتِ پاکستان قائم ہو گئی تو ایک تنظیم تو کمیٹی کی تشکیل عمل میں لائی گئی جسے ہر وزارت اور اس کے محکموں میں اہلکاروں کی تعداد اور مرتبہ کے بارے میں سفارشات پیش کرنے اور عملہ میں زیادتی اور کمی کا تعین کرنے کا کام سپرد کیا گیا۔ ہند کے طول و عرض سے مختلف النوع تجربہ رکھنے والے سرکاری ملازمین کی کثیر تعداد نے پاکستان کی ملازمت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان حالات میں اگر فنی محکموں مثلاً ریلوے میں ہر اسامی کے لیے ضروری تعداد میں تجربہ کار افراد مل جاتے، تو یہ معجزہ ہی ہوتا۔ حقیقت یہ تھی کہ بعض شعبوں میں عملہ فاضل تھا اور بعض میں ضرورت سے کم۔ سب سے زیادہ ضرورت آزمودہ کار منتظمین کی تھی۔ بعض شعبوں میں یہ خلاء انگریز افسروں کے تقرر سے پورا کیا گیا، حکومتِ پاکستان کے پانچ سیکرٹری انڈین سول سروس کے سبکدوش انگریز افسر تھے۔ انہوں نے سرگرمی اور خلوص کے ساتھ اپنے فرائض ادا کیے۔

تین صوبوں کے گورنر بھی انگریز تھے۔ سر فریڈرک بورن مشرقی بنگال کا گورنر تھا، سر فرانسس موڈی مغربی پنجاب کا اور سر جارج کننگھم شمال مغربی سرحدی صوبہ کا۔ صرف سندھ کے گورنر غلام حسین ہدایت اللہ پاکستانی تھے۔ سول انتظامیہ کی نسبت افواج میں انگریز افسروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ تینوں کمانڈر انچیف انگریز تھے۔ جنرل سر فرینک میسروی پاکستان کی بری فوج کا پہلا کمانڈر انچیف تھا۔ چند ماہ کے بعد اس کی جگہ جنرل سر ڈگلس گریسی کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ ایئر وائس مارشل پیری کین پاکستانی فضائیہ کا کمانڈر انچیف تھا۔ اور ایئر (بعد میں وائس) ایڈمرل جیفورڈ پاکستانی بحریہ کا کمانڈر انچیف مقرر ہوا۔ فنی خدمات کے لیے انگریز سپاہیوں کو بھی ملازم رکھا گیا۔

ابتدائی دور میں مشکلات زیادہ تر عملہ، عمارات، دفتری ریکارڈ اور ساز و سامان اور مواصلات میں کمی کے باعث پیدا ہوئیں۔ بعجلت تمام ٹین سے تعمیر شدہ عارضی عمارتوں سے بیشتر دفتری ضروریات پوری کی گئیں۔ پانچ یا چھ افسر اور ان میں بہت اونچے مرتبہ کے افسر بھی ہوتے تھے، اکثر ایک ہی چھوٹے سے کمرے میں کام کرتے تھے۔ رہائشی مشکلات بھی اسی طرح بہت زیادہ تھیں، اور ان کی وجہ سے بڑی دقت محسوس ہوئی۔ حکومتِ ہند کے قواعد و ضوابط کے تحت سول انتظامیہ کے افسر سرکاری رہائش کے حقدار نہیں تھے، اور رہنے سہنے کے لیے انہیں خود ہی انتظام کرنا پڑتا تھا۔ لیکن کئی مقامات پر بالخصوص نئی دہلی میں حکومت نے مختلف زمروں کے افسروں کے لیے مکانات تعمیر کرائے تھے اور یہ بہت اہم سہولت

معمولی کرائے پر بہم پہنچائی جاتی تھی۔ کراچی میں اتنے لوگوں کے امنڈ کر آنے سے اکثر سرکاری ملازمین کو جائے سکونت ملنا بڑا دشوار تھا۔ اور اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ سرکاری اختیار کے تحت مکانات لیے جائیں اور جہاں کہیں ممکن ہو مکانات کے حصے کر کے رہائش کی سہولتیں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو بہم پہنچائی جائیں۔ ان حالات میں افسروں اور عام شہریوں دونوں کو معتدبہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

سٹینوگرافروں اور ٹائپسٹوں کی ضرورت دستیابی سے بدرجہا زیادہ تھی۔ حکومتِ ہند کے دفتری ساز و سامان اور فرنیچر میں پاکستان کا حصہ ۱۵ اگست تک پورے کا پورا نہ ملا۔ اور جو کچھ ملا وہ بھی سارا فسادات اور مواصلات میں تعطل کے باعث کراچی منتقل نہ کیا جا سکا۔ مقامی طور پر جو کچھ مل سکا خرید لیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود بے حد کمی تھی۔ ٹائپ رائٹر اور ٹیلی فون اور بعض اوقات بہت ہی معمولی ضروریات از قسم قلم اور پن بھی آسانی سے دستیاب نہیں ہوتی تھیں۔ علاوہ ازیں ساری متعلقہ فائلیں اور ریکارڈ کی نقول دہلی سے کراچی نہیں لائی جا سکی تھیں۔ دہلی اور ہندوستان کے دوسرے مقامات سے تمام عملہ بھی کراچی نہیں پہنچا تھا۔ کسی بھی دفتر میں عملے کے ارکان ایک دوسرے سے واقف نہیں تھے، اور سب کو نئے ماحول اور حالات سے مطابقت پیدا کرنی تھی۔ مرکزی حکومت کے اندر اور صوبائی حکومتوں کے ساتھ سلسلہ ہائے مواصلات بھی ابھی پوری طرح کام نہیں کر رہے تھے۔

لیکن ان گوناگوں مشکلات کے باوجود کام لگاتار ہوتا رہا۔ آغازِ کار میں بالکل بے سرو سامانی سے انتظامیہ کو جو چیلنج درپیش تھا۔ ہمت اور توانائی نے بڑھ کر اس کا شاندار مقابلہ کیا۔ اس چیلنج کی بدولت تمام مشکلات پر قابو پانے کے لیے بے پایاں جوش اور کوہ شکن عزم ابھر آیا۔ اسی نے ہنرمندی اور کاروانی کو چمکایا جنہوں نے نئے نئے طریقوں سے مسائل کی گتھیاں سلجھائیں۔ اگرچہ بعض افسر ایسے بھی تھے، جو ایک خاص ڈگر پر چلنے کے خوگر تھے، اور ان کے ذہن ایک مقررہ معمول کے مطابق کام کرنے سے زنگ آلود ہو چکے تھے، وہ بیچارے حیران و پریشان تھے لیکن دوسروں کے لیے یہ چیلنج مہمیز ثابت ہوا۔ کام کرنے کے فرسودہ طریقے ترک کر دیے گئے۔ جتنا بھی عملہ میسر تھا اسے بہترین طریق سے کام میں لایا گیا۔ اعداد و شمار کے گوشواروں کا از سرِ نو جائزہ لیا گیا، اور یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ ان میں سے ایک کثیر تعداد بے مقصد تھی۔ فیصلہ کرنے یا مستقبل کا اندازہ کرنے کے لیے انہیں کبھی استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ بعض صورتوں میں گزشتہ فائلوں کی عدم دستیابی بھی زحمت کے بھیس میں رحمت ثابت ہوئی۔ اس لیے کہ نظائر کے بارے سے نجات مل گئی

اور موجودہ حالات کی روشنی میں فیصلے کیے گئے۔ فیصلے اس کثرت سے کرنے پڑتے تھے کہ لمبے چوڑے طریق کار پر عملدرآمد کی فرصت نہیں تھی۔ مسائل کا انبار تھا جو ایک سے ایک بڑھ کر توجہ کا مستحق تھا۔ مجبوراً طریق ہائے کار سادہ کرنے پڑے۔ جدوجہد کی اس شدت میں بے شک بعض غلطیاں ہوئیں لیکن نظر دالیں سے دیکھیے تو بھی وہ عام پرسکون زمانے کے مقابلے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں ہوتیں۔

ہمارے دشمن اور بعض غیر جانبدار مبصر بھی بڑے وثوق سے پیش گوئی کرتے تھے کہ پاکستان میں نظم و نسق کا شیرازہ چند ماہ کے اندر بکھر جائے گا۔ لیکن پاکستان کے کارکنوں نے اپنی اہلیت، کارکردگی، ثابت قدمی، حوصلہ مندی اور فرض شناسی سے ان کی اس توقع کو غلط ثابت کر دیا۔ ساری کی ساری قوم پاکستان کو کامیاب بنانے کے پُرخلوص جذبہ سے سرشار تھی، اور سرکاری ملازمین میں بھی یہی قوی جذبہ کارفرما تھا۔ وہ بخوشی دن رات محنت کرتے تھے اور ہر قسم کی تکلیفیں خندہ پیشانی سے برداشت کرتے تھے۔ کسی کو اپنے ذاتی مفاد کا خیال تک نہیں تھا، دُھن تھی تو یہی کہ قوم کی کیسے خدمت کی جائے۔ تاکہ پاکستان جلد از جلد مستحکم ہو جائے۔ ساری انتظامیہ ایک منظم جماعت کی طرح کام کر رہی تھی۔ تمام چھوٹے اور بڑے سرکاری ملازموں نے اپنے علم و تجربہ اور جسمانی و ذہنی صلاحیتوں کو پاکستان کی خدمت و بہبود کے لیے وقف کر دیا تھا۔ جن لوگوں کو قیام پاکستان کی جدوجہد میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا، ان کی یہ خوش بختی آنے والی نسلوں کو میسّر نہیں آسکتی۔ کیونکہ انہیں ایک فقیدالمثال تجربہ میں حصّہ لینے کی سعادت نصیب ہوئی۔

معرضِ وجود میں آنے کے فوراً بعد پاکستان نے اقوام متحدہ میں داخلے کے لیے درخواست پیش کر دی سلامتی کونسل نے پاکستان کی درخواست سے خصوصی سلوک کیا، اور یہ سفارش کی کہ پاکستان کو رکنیت فوراً عطا کر دینی چاہیے تاکہ پاکستان جنرل اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں شریک ہو سکے۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان اقوام متحدہ کا رکن بن گیا۔ پاکستان دوسرے بین الاقوامی اداروں اور ایجنسیوں کا بھی رکن بن گیا مثلاً عالمی ادارہ خوراک و زراعت، عالمی ادارہ محنت، عالمی ادارہ صحت، عالمی بنک اور بین الاقوامی مالیاتی فنڈ۔ اپنے قیام کے پہلے سال کے دوران میں ہی پاکستان نے کئی اہم بین الاقوامی کانفرنسوں میں حصّہ لیا۔ جاپان کے ساتھ صلحنامہ پر مشاورت کے لیے کینبرا میں جو کانفرنس ہوئی، اس میں حصّہ لینے کے لیے پاکستان سے ایک وفد بھیجا گیا۔ جنیوا میں عالمی ادارہ خوراک و زراعت کی کانفرنس میں بھی پاکستان شریک ہوا۔ ہوانا میں تجارت اور روزگار کے متعلق جو اہم کانفرنس ہوئی، پاکستان کے نمائندوں نے اس میں بھی حصّہ

لیا۔ اسی طرح عالمی ادارہ محنت کے علاقائی اجلاس اور ایشیا و مشرق بعید کے اقتصادی کمیشن کے اجلاس میں پاکستان شریک ہوا۔

برطانوی دولت مشترکہ کے ممالک اور دوسرے ملکوں کے ساتھ سفارتی تعلقات کے قیام کی طرف بھی فوراً توجہ مبذول کی گئی۔ برطانیہ اور ہندوستان سے ہائی کمشنروں کا تبادلہ کیا گیا، اور اس کے بعد بہت جلد کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور سیلون کے ساتھ بھی۔ امریکہ، مصر، ایران، برما، افغانستان، ترکی، روس، چین اور دوسرے ملکوں میں سفارت خانے قائم کر دیے گئے۔

پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کے لیے کراچی میں سندھ اسمبلی کے ایوان میں انتظام کیا گیا۔ فیڈرل کورٹ لاہور میں قائم کی گئی جہاں وہ ہائیکورٹ کے دفاتر اور کتب خانہ کی سہولتوں سے استفادہ کر سکتی تھی۔

مشرقی بنگال میں ڈھاکہ میں ایک نئی صوبائی حکومت کی تنظیم کرنی تھی۔ تقسیم کے وقت بنگال کے وزیر اعلیٰ ایچ۔ ایس سہروردی تھے۔ خواجہ ناظم الدین نے بطور وزیر اعلیٰ مشرقی بنگال اُن کی جگہ سنبھالی۔ کلکتہ جہاں سہروردی کو خاص اثر و رسوخ حاصل تھا۔ اب ہندوستان کا حصہ تھا۔ خواجہ ناظم الدین ڈھاکہ کے رہنے والے تھے اور مشرقی بنگال کی صوبائی اسمبلی میں اُن کے حامیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ سہروردی نے قائد اعظم سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ ان دونوں میں سے ایک کو مرکزی کابینہ میں لے لیا جائے، اور دوسرے کو بلا مقابلہ مشرقی بنگال کا وزیر اعلیٰ بننے دیا جائے۔ لیکن قائد اعظم نے یہ فیصلہ کیا کہ اسمبلی کے ارکان کو اپنا لیڈر چننے کا جمہوری حق استعمال کرنے دیا جائے۔ چنانچہ خواجہ ناظم الدین لیڈر منتخب ہو گئے۔ اور وہ مشرقی بنگال کے وزیر اعلیٰ بن گئے۔ ۱۲ اگست ۱۹۴۷ء کو سہروردی نے گاندھی کی یہ دعوت قبول کر لی کہ وہ ان کے ساتھ مل کر کلکتہ میں فرقہ وارانہ منافرت کے شعلوں کو ٹھنڈا کریں۔ ان کی مشترکہ مساعی بارآور ہوئیں۔ اور پنجاب میں جو ستم ڈھائے گئے کلکتہ اور بنگال ان سے بچ گئے۔

مشرقی بنگال کو بہت سے مشکل مسائل درپیش تھے۔ اسے ڈھاکہ میں ایک نیا دارالحکومت قائم کرنا تھا اور ایک نئی انتظامیہ کی داغ بیل ڈالنی تھی۔ ۱۹۰۵ء میں پہلی تقسیم بنگال کے دوران میں جب ڈھاکہ کو مشرقی بنگال اور آسام کے نئے صوبے کا دارالحکومت بنایا گیا تھا، تو وہاں صوبائی حکومت کے لیے کئی عمارتیں بشمول گورنر ہاؤس تعمیر کی گئی تھیں۔ یہ عمارتیں اب کام آئیں، لیکن پھر بھی مزید تعمیرات کی ضرورت تھی۔ سرکاری اہلکاروں کی کمی اس سے بھی کہیں زیادہ مشکلات کا باعث بنی۔ بیشتر افسر ہندو تھے اور

انہوں نے مغربی بنگال چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ عدلیہ اور انتظامیہ کے افسروں کی شدید کمی کے باعث ۵۰ فیصد سے زائد دیوانی اور فوجداری عدالتیں بند پڑی تھیں۔ اعلیٰ سرکاری ملازمتوں میں بنگال سے مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ دوسرے صوبوں سے جو مسلمان افسر پاکستان آئے تھے، انہیں صوبائی انتظامیہ کی خدمت کے لیے مشرقی بنگال بھیجا گیا۔ اسی طرح ہندوستان کے جن ریلوے ملازمین نے پاکستان کی خدمت اختیار کی تھی ان کی معتدبہ تعداد کو مشرقی بنگال ریلوے کا انتظام سنبھالنے کے لیے بھیجا گیا۔ زبان اور طرزِ معاشرت کے اختلافات بعض غلط فہمیوں کا موجب بنے، جن کی کوکھ سے بعد میں کئی سیاسی تنازعات نے جنم لیا۔ لیکن اس زمانہ میں انتظامیہ کو قائم کرنے اور چلانے کے کام کو باقی سب باتوں پر فوقیت حاصل تھی، اور جہاں کہیں سے بھی قابل افراد میسر آسکے، ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا گیا۔ مشرقی بنگال کی تجارت اور بنکاری میں ہندوؤں کی اجارہ داری تھی، ان کی کافی تعداد چھوڑ کر چلی گئی جس سے صوبہ کی اقتصادی حالت پر بُرا اثر پڑا اور کچھ عرصے کے لیے مغربی بنگال سے اشیاءِ ضرورت کی درآمد تقریباً بند ہو گئی۔

مغربی پنجاب میں خان آف ممدوٹ کو جو صوبائی مسلم لیگ کے صدر تھے، بلا مقابلہ وزیرِ اعلیٰ منتخب کر دیا گیا۔ مغربی پنجاب کو یہ فائدہ تو ہوا کہ لاہور جو غیر منقسم پنجاب کا دارالحکومت تھا، اس کے پاس رہا، لیکن مشرقی پنجاب، دہلی اور ہمسایہ ریاستوں سے لاتعداد مسلم مہاجرین کی آمد اور مغربی پنجاب سے ہندوؤں اور سکھوں کے عام کوچ کے باعث اتنے بڑے اور پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے کہ پوری طرح منظم اور مستحکم حکومت کے لیے بھی ان سے پوری طرح عہدہ برآ ہونا ممکن نہ تھا۔ ان سے بھی زیادہ سنگین معاملہ کشمیر کے تنازعہ کا تھا جو تقسیم کے جلدی بعد پھوٹ پڑا۔ قائدِ اعظم اور مرکزی حکومت کو یہ مسائل حل کرنے کے لیے بہت محنت اور وقت صرف کرنا پڑا۔

شمال مغربی سرحدی صوبہ میں ڈاکٹر خان صاحب کی کانگرسی وزارت ۱۵ اگست کو بھی برسرِ اقتدار تھی۔ قائدِ اعظم ماضی کے سیاسی اختلافات سے قطع نظر تعمیرِ پاکستان کے لیے سب شہریوں کے وفادارانہ تعاون کے خواہاں تھے۔ اس پالیسی کے تحت ڈاکٹر خان صاحب اور ان کے وزراء اپنے عہدوں پر فائز رہ سکتے تھے لیکن انہوں نے پرچمِ پاکستان کو سلامی دینے سے انکار کیا اور پاکستان کے خلاف اپنی پہلی روش کو نہ چھوڑا۔ اس لیے ۲۲ اگست کو گورنر نے قائدِ اعظم کے حکم پر ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو برطرف کر دیا اور خان عبدالقیوم خان وزیرِ اعلیٰ بن گئے۔

سندھ میں پہلے سے ہی مسلم لیگی وزارت قائم تھی۔ کراچی کے نظم و نسق کے بارے میں کچھ دشواری محسوس ہوئی۔ یہ شہر اب پاکستان کا دارالحکومت تھا لیکن ہنوز صوبہ سندھ کا حصہ تھا۔ لازم تھا کہ مرکزی حکومت کو اپنے دارالخلافہ پر پورا اختیار حاصل ہو۔ مئی ۱۹۴۸ء میں گرما گرم بحث کے بعد آئین ساز اسمبلی کے مشورہ کے ساتھ ایک قرارداد منظور کی گئی کہ "کراچی سے متعلق تمام عاملہ اور انتظامیہ اختیارات مرکزی حکومت کو حاصل ہوں گے اور حکومتِ پاکستان کے فرمان سے یا اس کی جانب سے عمل میں لائے جائیں گے اور قانون سازی کا اختیار وفاقی مجلس قانون ساز کو ہوگا۔ اس حکم کا اطلاق کراچی کے قرب وجوار کے ایسے علاقوں پر بھی ہوگا جو مرکزی حکومت کی رائے میں پاکستان کے دارالحکومت کے لیے درکار ہوں گے"۔ سندھ مسلم لیگ کے لیڈر کراچی کی علیحدگی کے خلاف ایجی ٹیشن کر رہے تھے۔ انہوں نے اس بارے میں قائدِ اعظم سے رجوع کیا۔ قائدِ اعظم نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ آئین ساز اسمبلی کے فیصلہ کو خوش دلی اور خوش اسلوبی سے قبول کر لیں، کیونکہ یہ" پاکستان کا بلند ترین اور سب سے اعلیٰ ادارہ ہے"۔ اس طرح یہ مخالفانہ تحریک ختم ہو گئی۔ قائدِ اعظم کو بذاتِ خود پورا یقین تھا کہ یہ فیصلہ پاکستان اور سندھ کے بہترین مفاد میں ہے۔ ۲۳ جولائی ۱۹۴۸ء کے حکم پاکستان (وفاقی دارالحکومت کا قیام) کے تحت دارالحکومت کراچی کے ۵۶۶ مربع میل علاقہ کی حد بندی کر دی گئی اور اسے مرکزی حکومت کے ماتحت کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ تک حکومت سندھ نے کراچی میں ہی اپنے صدر دفاتر رکھے لیکن بعد میں وہ حیدرآباد منتقل ہو گئی۔

بلوچستان پوری طرح ایک باقاعدہ صوبہ نہیں تھا اور اس میں کوئی منتخب اسمبلی یا وزیر نہیں تھے۔ اس کا انتظام گورنر جنرل کے ہاتھ میں تھا" جو اپنی صوابدید کے مطابق جس طرح مناسب سمجھے' اپنے مامور کردہ چیف کمشنر کی وساطت سے اقدامات کرتا تھا"۔ قائدِ اعظم بلوچستان کی ترقی میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ یہ کئی لحاظ سے پاکستان کا سب سے زیادہ پسماندہ حصہ تھا لیکن اس میں ترقی و تعمیر کے وسیع امکانات تھے۔ قائدِ اعظم نے بلوچستان کو اپنی خاص ذمہ داری اور توجہ کا مستحق قرار دینے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے گورنر جنرل کی ایک مشاورتی کونسل قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ" وہ عوام کو اپنے صوبے کے انتظام اور کاروبارِ حکومت میں پورا حصہ لینے کے قابل بنائے"۔[۶]

شمال مغربی سرحدی صوبہ، پنجاب اور بلوچستان سے ملحق قبائلی علاقے ہیں۔ غیر منقسم حکومتِ ہند کے ان علاقوں میں آباد قبائل کے ساتھ جو تعلقات تھے، اگرچہ بین الاقوامی کی رُو سے ان کی کوئی قطعی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ لیکن ان کا دارومدار بہ حیثیت مجموعی ڈیڑھ سو کے لگ بھگ معاہدوں اور تصفیوں پر تھا۔ ان

معاہدوں کے تحت قبائل نے یہ ذمہ داری قبول کی تھی کردہ ہمسایہ علاقوں کے امن وامان میں خلل نہیں ڈالیں گے اورخوش اسلوبی سے رہیں گے، اس کے معاوضے میں انہیں تعلیم اور تعمیر و ترقی کے لیے مالی امداد اور وظائف ملتے تھے۔ قانون آزادی ہند کی ساتویں دفعہ میں مندرج تھا کہ یہ سب معاہدے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ختم ہوجائیں گے۔ لیکن بعض معاملات میں موجودہ انتظامات جوں کے توں رہیں گے تاآنکہ ان کو منسوخ نہیں کیا جاتا یا ان کے بجائے نیا معاہدہ نہیں ہوجاتا۔ قبائلی علاقے اور جرگے کسی لحاظ سے بھی باقاعدہ حکومتوں کے مترادف نہیں تھے۔ حکومت برطانیہ نے ان کے ساتھ جو معاہدے کیے تھے، وہ بین الاقوامی معاہدوں کی نوعیت کے نہیں تھے، اور ان کا تمامتر انحصار باہمی خیرخواہی پر تھا۔ پاکستان کو قبائل کی خیرخواہی حاصل کرنے اور سابقہ انتظامات کو برقرار رکھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ حکومت پاکستان نے ایک نہایت دانشمندانہ اور جرأت مندانہ فیصلہ بھی کیا جو بہت دوررس اہمیت کا حامل تھا۔ قبائل کی سخت ناراضگی کے باوجود انگریزوں نے قبائلی علاقے کے عین قلب میں متعدد قلعے اور فوجی چوکیاں قائم کر رکھی تھیں۔ ان قلعہ بندیوں اور سلسلۂ مواصلات پر آزادی پسند قبائل وقتاً فوقتاً حملے کرتے رہتے تھے۔ وہ ایک غیر مسلم طاقت کے تسلط کو ہرگز گوارا نہیں کرتے تھے۔ انگریزوں کو آگے بڑھنے کی پالیسی پر گاہے گاہے عملدرآمد کرنے کے باعث کئی سرحدی جنگیں لڑنی پڑی تھیں۔ ان مہموں کا مقصد ڈیورنڈ لائن —— برطانوی ہند اور افغانستان کے مابین بین الاقوامی سرحد —— تک انگریزوں کے مکمل اثر و اقتدار کی توسیع تھا۔ اس میں شک نہیں اور کہ اس پالیسی کی وجہ سے انگریزوں کو اپنی فوج کو عملاً جنگی تربیت دینے کا موقع ملتا تھا، لیکن اس سے قبائل کے ساتھ مستقل آویزش بھی پیدا ہوگئی تھی۔ چونکہ پاکستان ایک مسلم مملکت ہے قبائلی علاقوں میں اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ اس کا رویہ بنیادی طور پر انگریزوں سے مختلف تھا۔ پاکستان ان کے داخلی معاملات میں مداخلت کا ہرگز خواہاں نہیں تھا بلکہ اقتصادی تعمیر اور تعلیمی ترقی کی سکیموں کے لیے مدد دینے کا صدق دل سے خواہاں تھا، جس حد تک کہ قبائل خود بطیب خاطر چاہیں۔ چنانچہ رزمک اور وزیرستان کے دوسرے مقامات سے فوجیں واپس بلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس فیصلہ کا قبائل پر ازحد خوشگوار اثر ہوا، انہوں نے اس اعتماد کا جواب دوستی اور احترام سے دیا۔ افغانستان نے اپنے ایجنٹوں مثلاً فقیر ایپی کی وساطت سے رخنہ اندازی کی جو کوششیں کیں، وہ قبائل کو پاکستان کے خلاف صف آرا کرنے میں یکسر ناکام ثابت ہوئیں۔ امن وامان اور باہمی اعتماد کی فضا میں آہستہ آہستہ فطری رفتار سے انجذاب کا عمل جاری ہے۔

باب ۱۳

قتلِ عام اور بحالیٔ مہاجرین

فرقہ وارانہ فسادات نے ہر زمانے میں برصغیر کی تاریخ کے دامن کو داغدار کیا ہے۔ لیکن عام طور پر ان فسادات کی نوعیت مقامی ہوتی تھی، وہ چند دن کے لیے پھوٹ نکلتے تھے اور پھر دب جاتے تھے ان کے بعد بھی آبادی کا تناسب وہی رہتا تھا جو پہلے تھا۔ ۱۹۴۶ء میں بہار کے مسلمانوں کا قتلِ عام ایک وسیع علاقہ میں اپنے مخالفوں کے استیصال کی پہلی منظم کوشش تھی۔ لیکن تباہ کاری کی اس بدمستی میں کوئی طویل المیعاد منصوبہ پیشِ نظر نہیں تھا اور اس کی شدت بہت جلد ختم ہو گئی۔ لیکن پنجاب میں سکھوں نے قتلِ عام کا جو منصوبہ بنایا، وہ نہ صرف بدرجہا زیادہ وسیع پیمانے پر تھا بلکہ ایک لحاظ سے تمام سابقہ فسادات سے مختلف بھی تھا۔ سکھوں کے سامنے ایک واضح سیاسی مقصد تھا اور اس کے حصول کے لیے بے لگام تشدد اور دہشت ناکی کو استعمال کیا گیا۔ سکھوں نے فوجی خطوط پر ایک مہم منظم کی، جو صرف حصولِ مقصد کے بعد ہی ختم ہونی تھی۔ ہندو اور سکھ ریاستوں کی تربیت یافتہ مسلح افواج اُن کے پاس تھیں۔ ان کا منصوبہ اس وقت قتلِ عام شروع کرنے کا تھا، جب مشرقی اور مغربی پنجاب کی انتظامیہ اپنے آپ کو ازسرِ نو منظم کرنے کی الجھن میں گرفتار ہو گی، اور اس لیے کسی

مُؤثر اقدام کی اہل نہیں ہو گی۔ یہ آخری عامل فیصلہ کن تھا۔

مونٹ بیٹن اور کانگرس کے درمیان انتقالِ اقتدار کی تاریخ کو یکم جون ۱۹۴۸ء سے بہت پہلے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء میں تبدیل کرنے کی جو خفیہ سودا بازی ہوئی تھی' اس میں کانگرس کا اصلی منشا یہ تھا کہ پاکستان کو اپنی انتظامیہ کو منظم اور مستحکم کرنے کی مہلت نہ ملے۔ اس کا ایک ناگزیر نتیجہ یہ تھا کہ ۱۵ اگست تک نہ مشرقی پنجاب اور نہ مغربی پنجاب کی صوبائی حکومت ٹھیک طور پر اپنی تنظیم نو کر سکی تھی۔ مشرقی پنجاب کی انتظامیہ کی حالت اور بھی ابتر تھی کیونکہ سکھوں اور ہندوؤں نے اس ڈر کے مارے مشرقی پنجاب میں متبادل دارالحکومت قائم کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ لاہور کے بارے میں ان کا باطل دعویٰ کہیں اور کمزور نہ ہو جائے۔ اگر یکم جون ۱۹۴۸ء کی اصل تاریخ برقرار رہنے دی جاتی' تو مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب دونوں کی صوبائی حکومتوں کو اپنی قیامِ امن کی انتظامی مشینری کو منظم کرنے کے لیے دو کی بجائے گیارہ ماہ مل جاتے۔ امن و امان کا قیام ہی ہر حکومت کی اوّلین ذمہ داری ہوتی ہے۔ ایک انگریز گورنر نے جو عمر بھر ہند میں برسرِ کار رہا' پنجاب میں فسادات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

> "یہ فسادات بھی مونٹ بیٹن کی اس غیر دانشمندی کا نتیجہ تھے جو اس نے یک لخت تقسیم کی تاریخ کو بہت آگے بڑھانے میں کی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اگر پنجاب کے ہندو اور مسلمان ملازمین کی مناسب طور پر تقسیم اور تنظیم کے لیے آٹھ یا نو مہینوں کی مہلت مل جاتی تو پھر اگست ستمبر اکتوبر میں جو ہولناک قتلِ عام ہُوا' وہ ہرگز اس حالت کے قریب بھی نہ پہنچتا۔"

صوبائی پولیس اور مال کے محکموں میں مشرقی اور مغربی پنجاب دونوں میں مسلم اور غیر مسلم ملے جلے تھے۔ یہی محکمے امن و امان کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور انہی محکموں کا دیہی آبادی سے براہِ راست واسطہ ہوتا ہے۔ سردار پٹیل نے ہر سرکاری ملازم کو حقِ انتخاب دینے پر جو اصرار کیا تھا' اس کی وجہ سے ان محکموں کی نوعیت یکسر بدل گئی۔ مشرقی پنجاب کے ہندو اور سکھ افسروں نے ۱۵ اگست سے کئی دن پہلے مشرقی پنجاب میں پولیس کے مسلمان اہلکاروں سے اسلحہ واپس لینے شروع کر دیئے' اس کے لیے انہوں نے یہ بہانہ تراشا کہ ممکن ہے یہ لوگ نوکری چھوڑ کر اپنے اسلحہ سمیت پاکستان چلے جائیں۔ اس طرح پولیس کی جمیعت میں صرف ہندو اور سکھ ہی باقی رہ گئے۔

پنجاب بونڈری فورس کے ایک انگریز افسر نے لکھا ہے کہ ایک بھی ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ کسی ہندو یا سکھ پولیس والے نے مسلمان کے سوا کسی اور پر گولی چلائی ہو۔" ۲۸

ریاستوں کے ہندو اور سکھ حکمرانوں نے اس ہولناک المیہ میں نہایت ذلیل کردار ادا کیا۔ پنجاب کی ریاستوں پٹیالہ، کپور تھلہ وغیرہ میں اور الور اور بھرت پور میں، ایک ہی داستان دہرائی گئی۔ ریاستی فوجوں نے ہندو اور سکھ جتھوں کے ساتھ مل کر مسلم آبادی کو بڑے منظم طریقے سے تہ تیغ کیا۔ الور اور بھرت پور کی ریاستیں ایسٹرن کمانڈ کے علاقہ میں تھیں۔ جنرل ٹکر نے لکھا ہے کہ "ان کی ریاستی فوجوں کو مسلح ہندو بلوائیوں کے پہلو بہ پہلو بیمانہ قتل عام کے لیے استعمال کیا گیا۔ ہندو بلوائیوں کو مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کو موت کے گھاٹ اتارنے اور ان کی لاشوں کا حلیہ بگاڑنے کی کھلی چھٹی دے دی گئی۔" جنرل ٹکر نے پنجاب بونڈری فورس کے ایک افسر کی رپورٹ سے اقتباس دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "کپور تھلہ اور پٹیالہ کی ریاستوں نے حملہ آور سکھ جتھوں کو پناہ گاہیں بہم پہنچا دی ہیں اور محفوظ اڈے بھی جہاں سے وہ تاخت و تاراج کی مہموں پر نکلتے ہیں" ۲۹

وسطی پنجاب میں، جو ان فسادات کا مرکز و منبع تھا، جولائی کے اواخر میں ہی سکھ جتھوں کے منظم حملے شروع ہو گئے تھے، اور ان کی رفتار اور شدت میں تیزی سے اضافہ ہوتا رہا، حتیٰ کہ ۱۵ اگست تک اس سارے علاقہ میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔

مشرقی پنجاب میں کیا ہو رہا تھا! — اس کا کچھ اندازہ لندن ٹائمز کے نامہ نگار آئن مورلین کی ایک رپورٹ سے ہو جاتا ہے، جو اس نے ۲۴ اگست کو جالندھر سے بھیجی تھی، اس رپورٹ کے مطابق

"مشرقی پنجاب میں اس وقت جو قتل عام ہو رہا ہے، اس کے متعلق تجربہ کار انگریز اور مقامی افسروں کی متفقہ رائے یہ ہے کہ "ہم نے جنگ کے دوران میں جو کچھ دیکھا یہ اس سے کہیں زیادہ ہولناک ہے۔" سکھ مشرقی پنجاب کو مسلمانوں سے خالی کرنے میں سرگرم ہیں، وہ ہر روز بے دردی سے سینکڑوں افراد کو تہ تیغ کرتے ہیں اور ہزاروں کو مغرب کی جانب بنوکِ شمشیر بھگا دیتے ہیں وہ مسلمانوں کے دیہات اور گھروں کو نذر آتش کر رہے ہیں، اور بعض دفعہ جوش جنون میں ساتھ ہی اپنے گھر بھی جلا دیتے ہیں۔ اس ظلم و تشدد کو سکھوں کی اعلیٰ ترین سطح

کی قیادت نے منظم کیا ہے، اور یہ خوفناک کام بڑے معین طریقے سے علاقہ بہ علاقہ کیا جا رہا ہے"۔ ؎۷

اس بہیمانہ قتلِ عام کا ہدف صرف دیہی علاقے نہیں تھے، شہروں میں اس سے بھی بدتر واقعات ہو رہے تھے۔ ۱۵ اگست کو یوم آزادی پنجاب میں بڑے عجیب طریقے سے منایا گیا۔ سرپھرے سکھوں کے ایک ہجوم نے برہنہ مسلمان عورتوں کا امرتسر کے گلی کوچوں میں جلوس نکالا، ان کی عصمت لوٹی، اور پھر بعض کو کرپانوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، اور بعض کو زندہ جلا دیا۔ ؎۸ لندن ٹائمز نے اپنی ۲۰ اگست کی اشاعت میں لکھا "گذشتہ پچاس برس کے شہری فسادات میں جتنے افراد ہلاک ہوئے ان سے کہیں زیادہ ہند کے لوگ پچھلے ایک ماہ کے مختصر عرصہ میں موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے ہیں۔ لاکھوں افراد بے گھر کر دیئے گئے ہیں۔ یورپ میں جنگ عظیم میں جو تبادلۂ آبادی ہوا تھا اس سے کئی گنا بڑا تبادلۂ آبادی جبراً دو ایسی حکومتوں پر ٹھونسا جا رہا ہے جو نہ اسے چاہتی ہیں اور اس سے عہدہ برآ ہونے کی سکت رکھتی ہیں"۔

مشرقی پنجاب سے جونہی مسلمان مہاجرین کا لاہور اور مغربی پنجاب کے دوسرے مقامات میں تانتا بندھا، اور انہوں نے اپنا دکھڑا رویا، تو ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف فوراً جوابی کارروائی شروع ہو گئی۔ ان بے گھر، زخموں سے نڈھال اور دست و پا بریدہ انسانوں کو دیکھ کر لوگوں کے جذبات اس قدر مشتعل ہو گئے کہ قائد اعظم اور دوسرے لیڈروں نے لوگوں سے تحمل سے کام لینے اور انتقامی کارروائی سے احتراز کرنے کی جو اپیلیں کیں، وہ وقتی طور پر کارگر نہ ہوئیں۔ یہ اندھے طیش کا جبلّی ردعمل تھا۔ لیکن مشرقی پنجاب کے برعکس تشدد کے ان اِکادُکا فوری مظاہروں میں نہ کوئی منصوبہ تھا اور نہ ہی باقاعدہ تنظیم۔ جیسا کہ ایسے مواقع پر اکثر ہوتا ہے، جرائم پیشہ عناصر کو لوٹ مار اور املاک کو تباہ کرنے کا موقع مل گیا، اور وہ بھی اس ہنگامے میں کود پڑے۔ ان جوابی حملوں کا ہدف زیادہ تر سکھ تھے، لیکن ہندوؤں کو بھی نقصان پہنچا۔ جلد ہی دوسری سمت ہندو اور سکھ تارکین وطن کا دھارا شروع ہو گیا۔

۱۷ اگست کو میں لیاقت علی خان کے ساتھ دہلی گیا تاکہ ماؤنٹ بیٹن اور ہندوستان کی حکومت کے ساتھ پنجاب کے فسادات پر بات چیت کی جا سکے۔ آکنلک نے مشترکہ دفاع کونسل

کے سامنے صورتِ حال کے بارے میں جو رپورٹ پیش کی وہ سخت دہشت انگیز تھی۔ دونوں جہتوں میں تارکینِ وطن کی نقل و حرکت ابھی ابتدائی مرحلوں میں تھی، لیکن روزانہ اطلاعات سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس نقل و حرکت میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ پنجاب بونڈری فورس کو مزید کمک پہنچانے کا فیصلہ کیا گیا، علاوہ ازیں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ دونوں وزیر اعظم نہرو اور لیاقت علی خان پنجاب میں خطِ تقسیم کی دونوں جانب دورہ کریں اور امن و امان بحال کرنے کے لیے پوری کوشش کریں۔ اس دورے میں مَیں بھی ان کے ساتھ تھا انہوں نے مشرقی پنجاب میں انبالہ کے مقام پر ایک کانفرنس منعقد کی، جس میں مشرقی اور مغربی پنجاب دونوں کے گورنروں اور وزیروں کے علاوہ پنجاب بونڈری فورس کے کمانڈر میجر جنرل ریس اور دوسرے افسر بھی شریک ہوئے۔ حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ جب میں نے میجر جنرل ریس سے صورت حال کا بے لاگ جائزہ پیش کرنے کے لیے کہا تو اس کے جواب سے یہ ڈھارس نہیں بندھتی تھی کہ وہ قتل و غارت کے اس سیلاب کو روک سکے گا۔ دونوں وزیر اعظموں نے امن اور اتحاد بحال کرنے کی ضرورت پر بڑا زور دیا اور سازگار فضا پیدا کرنے کے لیے فوری انتظامی اور نفسیاتی اقدامات کی اہمیت واضح کی۔ مشرقی اور مغربی پنجاب کی حکومتوں نے حامی بھری کہ وہ تارکینِ وطن کو ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں جانے کے لیے زیادہ سے زیادہ مدد دیں گی اور ہندوستان اور پاکستان کی مرکزی حکومتوں نے ریل گاڑیوں کی آمد و رفت برقرار رکھنے کی ضمانت دی۔ ایک کمیٹی مقرر کی گئی، جس میں ہر دو صوبائی حکومتوں سے دو دو وزیر لیے گئے۔ اس کمیٹی کو دونوں صوبوں میں اقدامات کو ہم آہنگ کرنے کا کام سپرد کیا گیا۔ لاہور اور امرتسر ہر دو شہروں میں دو افسر مقرر کئے گئے۔ ایک مشرقی پنجاب سے اور ایک مغربی پنجاب سے۔ ان کے ذمے پنجاب بونڈری فورس اور سول انتظامیہ کے ساتھ رابطہ قائم رکھنا تھا۔ کانفرنس اس نتیجہ پر پہنچی کہ دونوں ڈومنینوں کی حکومتیں جن اضلاع کی ذمہ داری سنبھال لیں ان سے پنجاب بونڈری فورس ہٹ جائے اور اس طرح پنجاب بونڈری فورس کے زیرِ عمل علاقہ میں بتدریج کمی کر دی جائے۔

۲۹ر اگست کو مشترکہ دفاع کونسل کا ایک اجلاس لاہور میں منعقد ہوا، جس میں مونٹ بیٹن اور قائدِ اعظم بھی شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں پنجاب بونڈری فورس کو توڑ دینے کا فیصلہ کیا گیا اور یہ کہ ہر ڈومنین کی حکومت کو اپنے اپنے علاقہ میں امن و امان کی ذمہ داری سنبھال لینی چاہیے۔

باؤنڈری فورس کو یکم ستمبر ۱۹۴۷ء کو ختم کر دیا گیا۔ آکنلک نے اپنے الوداعی خط میں میجر جنرل ریس کا اس اعلیٰ کارکردگی پر شکریہ ادا کیا، جو اس نے اور اس کے افسروں اور جوانوں نے "انسانیت اور حفظ امن کے لیے" کی تھی اس خط میں آکنلک نے یہ بھی لکھا:

"باؤنڈری کمیشن کی طرف سے ثالثی فیصلہ کے اعلان سے بھی پہلے امرتسر میں عام قتل و غارت، آتش زنی اور بدامنی کا جو سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اس کا سرحد کے تعین یا اس سے متعلقہ کسی بات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اس ساری تحریک کا منصوبہ بہت پہلے سے بنایا گیا تھا، اور اس کا بہت جلد مغربی پنجاب میں بھی وہ ردِ عمل ہوا جو ناگزیر تھا۔ اس طرح آپ کو اور آپ کے فوجی دستوں کو ایک ایسا مسئلہ درپیش آیا جو نہ صرف آپ کے فرائض سے یکسر مختلف تھا بلکہ آپ کی بساط سے بالکل باہر تھا"[۱۵]

لاہور میں اجلاس کے بعد نہرو اور لیاقت علی خان نے متاثرہ علاقوں کا چار روزہ مشترکہ دورہ کیا۔ میں بھی اس دورہ میں ان کے ہمراہ تھا۔ دونوں وزیر اعظم بحالیٔ امن کا پختہ تہیہ کیے ہوئے تھے اور تہ دل سے چاہتے تھے کہ فسادات ختم ہو جائیں۔ ان کے اخلاص کا ہر ایک معترف تھا ہم نے سرحد کے دونوں طرف کئی مقامات کا دورہ کیا۔ مثلاً امرتسر، بٹالہ، ہوشیارپور، لاہور اور شیخوپورہ۔ نام نہاد مہاجر کیمپ لاتعداد مرد، عورتوں اور بچوں سے بھرے ہوئے تھے۔ کیمپوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ خوراک، پانی، سایہ، صحت، صفائی اور طبی امداد کا انتظام از حد ناکافی تھا یا سرے سے تھا ہی نہیں۔ برسات کا موسم تھا لیکن کئی کیمپ آسمان کی کھلی چھت کے نیچے تھے، ان میں دھوپ اور بارش سے بچنے کے لیے کہیں کہیں درخت تھے۔ جو کیمپ عمارتوں میں بنائے گئے تھے، ان میں گنجائش سے کئی گنا زیادہ لوگ ٹھونس دیے گئے تھے۔ تارکین وطن کی ایک ہی پکار تھی کہ انہیں نکال کر دوسری طرف پہنچا دیا جائے۔

اس دورے کے بعد دونوں وزرائے اعظم نے ۳ ستمبر کو لاہور میں ایک کانفرنس منعقد کی، جس میں انہوں نے "دونوں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے اس عزم صمیم کا اعادہ کیا کہ امن و امان فوراً بحال کرنا چاہیے، ہر قسم کی قانون شکنی کو کچل دینا چاہیے اور اس کے مرتکب عناصر کو سزا دینی چاہیے"۔ لیکن کانفرنس کے صرف ایک دن بعد ہندوستان کے دارالحکومت دہلی میں قیامت صغریٰ بپا ہو گئی۔

اگرچہ دہلی صدیوں تک مسلم حکمرانی کے دور میں دارالخلافہ رہا تھا لیکن اس کی آبادی میں مسلمان اقلیت میں تھے۔ دہلی اور اس کے مضافات مثلاً قرول باغ میں مسلمانوں کے مکانوں پر نشان لگائے گئے' اور پھر سکھوں اور راشٹریہ سوایم سیوک سنگھیوں نے ان پر باقاعدہ منصوبہ کے تحت حملہ کیا۔

۴ ستمبر تک بھارت کے دارالحکومت میں صورت حال اس قدر سنگین ہوگئی کہ مونٹ بیٹن سے' جو اس وقت شملہ میں تھا' ہندوستان کابینہ نے فی الفور دہلی واپس آنے اور معاملات کو اپنے ہاتھ میں لینے کی درخواست کی۔ وہ ۶ ستمبر کو دہلی پہنچا' اور فوراً سرگرم عمل ہوگیا۔ گاندھی بھی ۹ ستمبر کو دہلی پہنچ گیا اور اس نے "فرقہ وارانہ مصالحت اور مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کے لیے سرتوڑ کوشش کی۔" یہی کچھ نہرو نے کیا' لیکن ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے:

> "سردار پٹیل کا رویہ جواہر لال نہرو اور میرے طرزِ فکر سے مختلف تھا۔ اس سے مقامی انتظامیہ متاثر ہو رہی تھی اور یہ بات واضح ہو رہی تھی کہ افسر دو دھڑوں میں بٹ گئے ہیں۔ افسروں کا بڑا دھڑا وزیر داخلہ کے طور پر سردار پٹیل کی طرف دیکھتا تھا' اور ان کی دانست میں جس طرح وہ خوش ہو سکتا تھا' وہ اس کے مطابق اقدام کرتے تھے۔ ایک چھوٹا دھڑا' جواہر لال اور میری طرف مائل تھا اور جواہر لال کے احکام پر عمل درآمد کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ سردار پٹیل وزیر داخلہ تھا اور اس طرح دہلی کی انتظامیہ براہ راست اس کے ماتحت تھی جب قتل و غارت اور آتش زنی کا سلسلہ طویل سے طویل تر ہو گیا تو گاندھی جی نے پٹیل کو بلا بھیجا اور اس سے پوچھا کہ اس قتل و غارت کو روکنے کے لیے وہ کیا کر رہا ہے؟ سردار پٹیل نے گاندھی جی کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ جو اطلاعات انہیں موصول ہو رہی ہیں' ان میں بڑی مبالغہ آرائی ہے۔ بلکہ سردار پٹیل یہاں تک کہہ گزرا کہ مسلمانوں کے لیے شکایت یا اظہارِ خوف کی کوئی وجہ ہی نہیں۔"[۴]

مسلمانوں کے لیے پرانا قلعہ' مقبرہ ہمایوں اور دوسرے مقامات پر مہاجر کیمپ قائم کر دیے گئے۔ اسمے نے پرانے قلعہ کا دورہ کیا۔ وہاں پاکستان کی ملازمت اختیار کرنے والے

مسلمان افسر اور ان کے اہل و عیال بھی پناہ گزین تھے۔ اس نے لکھا کہ "ہزاروں مسلمان اس قلعہ کی فصیل کے اندر ٹھونس دیئے گئے تھے۔ نہ وہاں سایہ کا کوئی انتظام تھا اور نہ کسی ڈاکٹر کا۔ نہ صحت و صفائی کا بندوبست تھا اور نہ ہی کوئی ذرائع مواصلات تھے"۔ ۳۸

ہندوستان کی حکومت پاکستان کے سرکاری ملازمین کے انخلاء میں بھی روڑے اٹکا رہی تھی، چنانچہ انہیں کراچی لانے کے لیے بی۔ او۔ اے۔ سی کے طیارے چارٹر کرنے پڑے۔ دہلی میں پاکستان کے ہائی کمشنر زاہد حسین کی طرف سے جو رپورٹیں موصول ہوتی تھیں، ان میں ہندوستان کے حالات کی نہایت وحشت انگیز تصویر پیش کی جاتی تھی، لاکھوں کی تعداد میں مسلم مہاجرین کو حتی الوسع جلد از جلد پاکستان پہنچانے کے انتظامات کئے جا رہے تھے۔ ۱۰ ستمبر کو یہ اطلاع ملی کہ صرف جالندھر ڈویژن میں ۱۰ لاکھ مہاجرین ترکِ وطن کے لیے انتظامات کے منتظر ہیں۔ ریلوے گاڑیوں اور قافلوں پر سکھوں کے حملے اُن کے انخلاء میں سدِ راہ بنے ہوئے تھے اور تارا سنگھ یہ اعلان کر رہا تھا کہ "یہ جنگ ہے جنگ"۔ لیاقت علی خان نے کہا "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج ہم پاکستان میں ہر طرف سے گھرے ہوئے ہیں اور ہمارا محاصرہ ایسی قوتوں نے کر رکھا ہے، جو ہمیں تباہ و برباد کرنے پر تُلی ہوئی ہیں"۔

۱۱ ستمبر کو اسمے کراچی آیا۔ اس کا مقصد قائد اعظم کو دہلی کے حالات سے آگاہ کرنا اور حکومتِ ہندوستان کی نیک نیتی کا یقین دلانا تھا۔ اِسمے نے لکھا ہے:۔

"قائد اعظم نہایت پُر وقار اور بہت [illegible] نظر آتے تھے، اُن کی باتوں سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ بالکل ناامید ہو چکے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ لڑنے مرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں"۔ ہم ان کے مطالعہ کے کمرہ میں چلے گئے، اور وہ پھوٹ بہے۔ کہنے لگے، کوئی بھی شخص کس طرح یقین کر سکتا ہے کہ حکومتِ ہندوستان امن و امان کی بحالی اور اقلیتوں کی حفاظت کے لیے حتی الوسع زیادہ سے زیادہ کوشش کر رہی ہے؟ اس کے برعکس گزشتہ تین ہفتوں کے واقعات سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان کے پیدا ہوتے ہی وہ اس کا گلا گھونٹ دینے کے درپے ہیں"۔ ۳۹

فی الحقیقت صورتِ حال سخت وحشت ناک تھی۔ پاکستان میں قائد اعظم اور حکومت

امن وامان برقرار رکھنے کے لیے پوری کوشش کر رہے تھے۔ پاکستان کے دارالحکومت کراچی میں کوئی فسادات نہیں ہوئے تھے۔ بعد میں جنوری ۱۹۴۸ء میں ایک مختصر سی جھڑپ ہوئی جسے بہت جلد دبا دیا گیا۔ یہ درست ہے کہ دہلی پنجاب سے قریب تھا، جہاں ہر طرف قتلِ عام کے مناظر دیکھنے میں آرہے تھے، لیکن کراچی بھی مہاجرین سے اسی طرح پر تھا جیسے دہلی۔ تمام غیر جانبدار گواہ اس رائے پر متفق ہیں، کہ مغربی پنجاب میں جو فسادات ہوئے، وہ مشرقی پنجاب میں قتلِ عام کے ردِ عمل کے طور پر ہوئے جنرل ٹکر کے ایک سٹاف افسر نے، جو دو مرتبہ پاکستان بھی آیا تھا، ستمبر میں یہ رپورٹ دی کہ "اس امر میں ذرہ بھر شک وشبہ نہیں کہ مشرقی پنجاب کے سکھ بدرجہا زیادہ انتقام جو ہیں، وہ گاڑیوں کو پٹڑیوں سے اتارنے اور قافلوں پر کرپانوں اور نیزوں سے حملہ آور ہونے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، اور سول حکام میں ان ہتھیاروں کو ضبط کرنے کی جرأت نہیں ہے۔ مغربی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کے قافلوں پر جو حملے ہو رہے ہیں، وہ زیادہ تر ان حملوں کے جواب میں ہیں، جو مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قافلوں پر ہو رہے ہیں"۔ [۵۱]

ہندوستانی پریس نے پاکستان کے خلاف زہریلے پروپیگنڈے کی بھرپور مہم جاری کر رکھی تھی۔ حتیٰ کہ گاندھی بھی اس ہیجان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ سر فرانسس ٹکر نے لکھا ہے کہ ۲۶ ستمبر کو گاندھی نے اپنی پرارتھنا کی مجلس میں کہا کہ وہ ہر قسم کی جنگ بازی کا مخالف رہا ہے۔ لیکن پاکستان سے حق رسی کا اگر کوئی اور طریقہ نہیں ہے، اور اگر پاکستان اپنی مسلم الثبوت غلطی کو نہ ماننے پر اصرار کرتا رہا، اور اسے کم سے کم کر کے دکھاتا رہا، تو پھر حکومتِ ہندوستان کو اس کے خلاف جنگ کرنی پڑے گی۔ [۵۲]

اس طرح ستمبر کے اواخر میں ہندوستان اور پاکستان میں جنگ کا خطرہ بڑھتا نظر آرہا تھا۔ ۲۸ ستمبر کو سپریم کمانڈر مارشل آکنلک نے وزیر اعظم اور چیفس آف سٹاف کو لندن میں جو رپورٹ بھیجی، اس میں یہ سفارش کی کہ:-

"اگر ہندوستان اور پاکستان کی افواج میں کھلم کھلا جنگ تک نوبت پہنچ جائے جس کا کافی امکان ہے تو ان افواج میں ملازم تمام انگریز افسروں اور دوسرے عملے کو یہ حکم دینا ناگزیر ہو جائے گا کہ وہ ان افواج کی کمان اور

انتظام سے فی الفور کنارہ کش ہو جائیں۔ اس حکم پر مختصر نوٹس پر عملدرآمد کرنے کے لیے انتظامات کر لئے گئے ہیں اور متعلقہ کمانڈروں کو مطلع بھی کر دیا گیا ہے۔
دونوں حکومتوں کو بھی مشترکہ دفاع کونسل کی وساطت سے سرکاری طور پر اس موقف سے آگاہ کر دیا گیا ہے"[۱۲]

ان سخت پریشانی کے ایام میں جب مشرقی پنجاب اور دہلی میں مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ رہی تھی، ملک بھر میں نسل کی ہولناکیاں جاری تھیں اور جنگ سر پر منڈلا رہی تھی حکومت پاکستان امن وامان برقرار رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہی تھی، اور اپنے لوگوں کو یہ بات پوری طرح ذہن نشین کرا رہی تھی کہ پاکستان کی عزت اور مفاد دونوں ہی امن اور اقلیتوں کے تحفظ کے متقاضی ہیں۔ فضا میں جذبات کی بجلیاں کوند رہی تھیں اور الزامات اور جوابی الزامات کی بارش ہو رہی تھی۔ حکومت پاکستان کا اپنا ضمیر صاف اور مطمئن تھا۔ بایں ہمہ اس نے باہر سے مشورہ اور امداد طلب کی تاکہ غیر جانبداری سے سارے منظر کا معائنہ کیا جا سکے لیکن ایک نہ ایک بہانے سے حکومتِ ہندوستان اس تجویز سے متفق نہ ہوئی۔ ستمبر کے آخری ہفتے میں حکومتِ پاکستان نے حکومتِ برطانیہ سے کہا کہ وہ کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقہ بلکہ ہندوستان کی ڈومینین حکومتوں کو مطلع کر دے کہ پاکستان کی نگاہ میں برصغیر کن حالات سے دو چار ہے تاکہ ان سنگین مشکلات کو دُور کرنے کے ذرائع اور تدابیر پر غور و خوض کیا جائے۔ دوستانہ امداد اور مشورہ کے لیے یہ اپیل صدا بصحرا ثابت ہوئی کیونکہ حکومتِ ہندوستان اس کے برخلاف تھی۔

اکتوبر کے وسط تک پنجاب میں تشدد کا زور کم ہونے لگا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ جو تشدد کا ہدف تھے ان کی تعداد گھٹتی جا رہی تھی۔ لیکن یہ بات واضح تھی کہ مشرقی اور مغربی پنجاب اور بعض ہمسایہ علاقوں کے مابین تقریباً مکمل تبادلۂ آبادی ہو کے رہے گا۔ اس لیے اصل مسئلہ حتی الوسع جلد از جلد اور باقاعدہ انخلا اور مہاجرین کی آباد کاری کا بندوبست تھا۔

تاریخ عالم میں عظیم ترین تبادلۂ آبادی ہو رہا تھا۔ صرف چند ہفتوں کے اندر ایک کروڑ بیس لاکھ سے زائد افراد نے اپنے گھروں کو خیرباد کہہ دیا، اور دوسری ڈومینین میں پناہ اور حفاظت کی تلاش میں پیدل، بیل گاڑی پر، ریلوے، کار اور ہوائی جہاز سے روانہ ہو گئے۔ ۴ ستمبر ۱۹۴۷ء کے شمارہ میں لندن ٹائمز نے مسلمانوں کے ایک بیس میل لمبے قافلے کے بارے میں اطلاع شائع کی، اس قافلہ میں

بیس ہزار سے زائد افراد تھے، اور ان میں سے اکثر پیدل ہی پاکستان کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ایڑیاں تکان سے چور، بھوکوں کے مارے، سفر کی صعوبتوں سے نڈھال، ستر لاکھ مہاجرین گرتے پڑتے پاکستان پہنچے۔ وہ بالکل بے سروسامان تھے، ان کے پاس تن کے کپڑوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اور ان کپڑوں کی بھی اکثر دھجیاں اڑی ہوئی تھیں۔ یہ دردکشان بلا تھے، جنہوں نے معصوم بچوں کا قتل، لاشوں کی قطع و برید، اور عورتوں کی بے حرمتی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ راستے میں ہر قدم پر موت ان کی گھات میں تھی۔ ان میں ہزاروں بھوک اور بیماری سے راستے میں ہی جاں بحق ہو گئے یا سکھوں کے خون آشام جتھوں نے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بہت سے پاکستان کی سرحد پر پہنچتے ہی ابدی نیند سو گئے۔

۱۰ دسمبر ۱۹۴۷ء تک چار مہینوں میں ۴۰ لاکھ ۸۰ ہزار مہاجرین مغربی پنجاب میں پہنچے۔ ان میں سے ۲۹ لاکھ ۲۰ ہزار کو لانے کا انتظام فوجی تنظیم انخلا نے کیا۔ اس تنظیم کا قیام ۲۸ اگست کو لاہور میں عمل میں لایا گیا تھا۔ ہندوستان نے بھی اس نوعیت کی ایک تنظیم قائم کی تھی۔ فوجی انخلا کی دونوں تنظیموں میں مسلسل تعاون کے لیے ہندوستانی تنظیم نے اپنا پیش رو ہیڈ کوارٹرز پاکستان کی تنظیم کے پہلو بہ پہلو لاہور میں قائم کیا اور پاکستان کی تنظیم کا پیش رو ہیڈ کوارٹرز جالندھر میں تھا۔

خالصتاً انتظامی نقطۂ نظر سے ان لاکھوں افراد کے لیے خوراک، لباس، رہائش اور بحالی کا کام ناممکن العمل حد تک مشکل تھا۔ تشدد کے بھونچال نے معاشی نظام تہس نہس ہو گیا تھا۔ نئی انتظامیہ جو ابھی بمشکل قائم ہوئی تھی، اس پر ناقابلِ برداشت بار پڑ گیا تھا اور مواصلات کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ بیشتر تجارت پیشہ لوگ ہندو تھے اور وہ جا چکے تھے۔ دکانیں خالی پڑی تھیں۔ سکھوں نے منظم منصوبہ کے تحت اپنے انخلا کا انتظام کیا تھا اور وہ اپنے ساتھ مویشی اور اناج بھی لے گئے تھے۔ یہ صرف عوام کی اولوالعزمی اور قائد اعظم کی قیادت میں ان کا یقینِ محکم تھا جس نے صورتِ حال کو سنبھالنے کا معجزہ کر دکھایا۔

لاہور اور مغربی پنجاب کے دوسرے مقامات میں جونہی مہاجرین کی آمد شروع ہوئی، مقامی لوگوں نے آگے بڑھ کر خوراک اور کپڑے سے ان کی خاطر داری کی، ہر طرح کی مدد بہم پہنچائی اور ان کے مصائب کے ازالے میں مخلصانہ جوش کا مظاہرہ کیا۔ مقامی آبادی نے فراخدلی سے قربانیاں کیں اور مہاجرین کو بحال کرنے کے لیے خوشی سے تکالیف برداشت کیں۔ یہ درست ہے کہ بعض خود غرض اور سنگدل افراد نے افراتفری سے فائدہ اٹھا کر متروکہ املاک ناجائز طور پر ہتھیا لیں، لیکن ابتدائی مرحلہ میں

ایسے لوگ بہت کم تھے۔ اس وقت آبادی کے سارے طبقوں میں اپنے مہاجر بھائیوں کی امداد کا جذبہ سرایت کیے ہوئے تھا۔ بعد میں اخلاقِ عامہ کا معیار ضرور پست ہو گیا۔ قائد اعظم نے ایک امدادی فنڈ قائم کیا جس میں بڑی فیاضی سے عطیات دیے گئے، اور اس سے مہاجرین کو آڑے وقت پر ضروری اعانت میسر آئی۔

ستمبر کے اوائل میں حکومتِ پاکستان نے مہاجرین و بحالیات کی وزارت قائم کی، اور کابینہ کی ایک ہنگامی کمیٹی کا قیام بھی عمل میں لایا گیا۔ اگلے ماہ وزیر اعظم نے عارضی طور پر اپنا صدر دفتر لاہور میں منتقل کر دیا تاکہ مہاجرین کی آباد کاری کے بے حد و حساب کام میں صوبائی انتظامیہ کی مدد اور نگرانی کی جا سکے۔ قائد اعظم بھی مختصر وقفوں کے بعد بار بار لاہور کا دورہ کرتے رہے۔ ان ایام کے اندوہناک حوادث اور انتھک محنت نے قائد اعظم اور وزیر اعظم دونوں کی صحت پر برا اثر ڈالا لیکن ایک ایسے عزمِ صمیم کے ساتھ جو کبھی سستانے کا نام نہیں لیتا تھا وہ تمام نامساعد حالات سے مردانہ وار نبرد آزما ہوتے رہے۔

وسط اکتوبر تک ضرورت محسوس کی گئی کہ مرکزی حکومت اور مغربی پنجاب کی ایک مشترکہ تنظیم قائم کی جائے۔ مہاجرین کا مسئلہ سب سے زیادہ مغربی پنجاب کو درپیش تھا چنانچہ پاکستان پنجاب مہاجر کونسل کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کے صدر وزیر اعظم تھے اور اس میں مغربی پنجاب کا گورنر، وزیر اعلیٰ، مرکز اور صوبے کے وزرائے مہاجرین شامل تھے۔ ابتدائی مرحلوں میں اس کونسل کے کئی اجلاسوں میں مَیں بھی شریک ہوا۔ اس کونسل نے پالیسی کی تشکیل و ترتیب اور مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی سرگرمیوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں بڑی مفید خدمات ادا کیں۔ بعد میں شمال مغربی سرحدی صوبہ اور سندھ کے لیے بھی انہی خطوط پر مشترکہ مہاجر کونسلیں قائم کی گئیں۔

پاکستان پنجاب مہاجر کونسل کے امور ایک مشترکہ سیکرٹریٹ کے ذریعہ سرانجام ہوتے تھے، اس کے دائرہ کار میں کافی مختلف قسم کے مسائل آتے تھے۔ متروکہ املاک کی حفاظت کے لیے قانون سازی کی ضرورت تھی۔ متروکہ املاک کے کسٹوڈین اور کمشنر بحالیات مامور کرنے تھے۔ کیمپوں کے نظم و نسق اور مہاجرین کو مختلف علاقوں میں لے جانے اور آباد کرنے کے انتظامات اور ان کی نگرانی کی تدابیر کرنی تھیں۔ اراضی کی تقسیم، صنعتی اداروں، دکانوں، سینما گھروں اور مکانوں کو الاٹ کرنے اور کرایہ کی

شرحِ متعین کرنے کے اصول وضع کرنے تھے۔ اشیائے ضرورت کی رسد ' ریلوں اور سڑکوں پر آمدورفت کو معمول پر لانے اور بنکاری' تجارت اور زراعت کے احیاً کے ذریعے اقتصادی زندگی کی بحالی کے لیے اقدامات کرنے تھے۔ ہندوستان کے ساتھ مل کر مغویہ عورتوں اور مذہب تبدیل کرنے والوں کی بازیابی کا بندوبست کرنا تھا۔ علاوہ ازیں قیدیوں' بنکوں کے محفوظ کھاتوں' اور پراویڈنٹ فنڈ کے تبادلہ کے لیے انتظامات کرنے تھے اور مقدس مقامات کی حفاظت بھی کرنی تھی۔ الغرض اس وسیع' غیر منظم' اور اضطراری تبادلۂ آبادی کے باعث جو لاتعداد مسائل پیدا ہو گئے تھے' ان سب کو حل کرنا تھا۔

گورنر مغربی پنجاب سر فرانسس موڈی بہت آزمودہ کار منتظم تھا۔ اس نے شبانہ روز بڑے خلوص کے ساتھ کام لیا۔ یہی حالت تمام درجوں کے سرکاری ملازمین کی تھی۔ لیکن ہر محکمے میں عملے کی شدید کمی محسوس کی جاتی تھی۔ تمام ہندو اہلکار رخصت ہو چکے تھے۔ پاکستان کی ملازمت اختیار کرنے والے مسلمانوں یا مہاجرین کے ذریعہ ان کی جگہیں پُر کرنا کوئی مکانیکی کام نہیں تھا بلکہ اس کے لیے کامل تنظیمِ نو درکار تھی' لیکن اس کی فرصت کہاں تھی۔ مغربی پنجاب کی وزارت میں آغازِ کار سے ہی ناچاقی اور نااتفاقی کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ مختلف وزارتوں کے مابین حدودِ کار کے تعین میں جھگڑے پیدا ہو گئے تھے۔ وزیرِ صنعت اس بات پر مصر تھا کہ متروکہ صنعتی اداروں سے متعلق ہر کام اس کے دائرہ اختیار میں آتا ہے۔ متروکہ اراضی کے بارے میں تمام مسائل پر وزیرِ مال سے مشورہ کرنا ضروری تھا اور کئی معاملات میں بحالیات کی تجاویز کی بنا بھی اسی نے ڈالی تھی اور آخری فیصلے بھی خود ہی صادر کر دیئے۔ مکانوں اور دکانوں کی تقسیم کی انتظامی مشینری وزیرِ اعلیٰ مغربی پنجاب نے اپنے ماتحت رکھی تھی۔ ایک اور پیچیدگی یہ ہوئی کہ متروکہ املاک کی حرص نے اضلاع میں کئی سرکردہ لوگوں کے ایمان متزلزل کر دیئے اور یہ غاصب کسی نہ کسی وزیر کے دامن میں پناہ ڈھونڈتے تھے۔ تقسیمِ اختیار کے یہ جھگڑے تھے جو ایک حد تک مغربی پنجاب کے وزیرِ مہاجرین میاں افتخار الدین کے مستعفی ہونے کا باعث بنے۔ مختلف وزارتوں کے فرائض و اختیارات کے بارے میں اس انتشار سے یہ آفت آئی کہ ہر ڈپٹی کمشنر نے اپنے ضلع میں کسی باقاعدہ قانون کے بغیر جو چاہا کر ڈالا۔ پاکستان پنجاب مہاجر کونسل کو بہت زور لگانا پڑا تاکہ یہ افراتفری ختم ہو جائے اور کام باضابطگی سے چلے۔

کئی مقامات پر کیمپ قائم کئے گئے' جہاں نو وارد مہاجرین کا خیر مقدم کیا جاتا اور جہاں خوراک

اور لباس کے علاوہ مریضوں اور زخمیوں کے لیے طبی امداد کا اہتمام بھی کیا جاتا تھا۔ مقامی رضاکاروں کے پہلو بہ پہلو غیر ملکی مشنری سوسائٹیوں بالخصوص برطانیہ اور امریکہ کی مشنری سوسائٹیوں کے رضاکاروں نے ان کیمپوں میں بڑی گراں قدر خدمات سر انجام دیں۔ ابتدا میں مہاجر کیمپ محض عبوری کیمپ سمجھے جاتے تھے۔ بیشتر مہاجرین کاشت کار تھے۔ اور سب سے زیادہ فوری اہمیت کا مسئلہ انہیں ہندوؤں اور سکھوں کی متروکہ اراضی الاٹ کرنا تھا تاکہ کھڑی فصلیں وقت پر کاٹی جا سکیں اور گندم کاشت کرنے کی تیاری کی جا سکے۔

لیکن مغربی پنجاب سے جتنے تارکین وطن گئے تھے ان سے ۱۱ لاکھ زائد مہاجرین کو اس صوبے میں بسایا جانا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ نئے آنے والے مہاجرین کے لیے میسر زمینوں، فیکٹریوں اور دکانوں میں کمی ہوتی گئی۔ جنوری ۱۹۴۸ء کے بعد خوراک کی شدید کمی سے شہر اور دیہات سب کے سب متاثر ہوئے، اور بحالیات کی مساعی میں بھی رکاوٹ پیش آئی۔ اس طرح یہ کیمپ کم و بیش مستقل حیثیت اختیار کر گئے اور ان میں مقیم افراد کی تعداد اپریل ۱۹۴۸ء میں ساڑھے سات لاکھ تک جا پہنچی۔ انتھک کوششوں سے چند ماہ بعد یہ تعداد گھٹ کر پانچ لاکھ ہو گئی۔ کیمپوں میں طویل عرصہ تک قیام طبائع کو پست ہمت بنا دیتا تھا اور بھک منگوں کی سی ذہنیت پیدا ہو جاتی تھی۔ مہاجرین کے عزم و حوصلہ کو بلند رکھنے کے لیے خاص اہتمام کرنا پڑا۔ بچوں اور بالغوں کے لیے سکول کھولے گئے اور پیشہ ورانہ تربیت کی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔ بایں ہمہ بحالی کے کام کی رفتار کو بڑھانا از حد ضروری تھا۔ اکثر مہاجرین ضلعی اساس پر آباد ہونے کے سخت آرزو مند تھے تاکہ مشرقی پنجاب میں دیہی برادریوں کی سماجی زندگی اور اقتصادی تعاون کو جوں کا توں برقرار رکھا جا سکے لیکن اس کے لیے کیمپوں میں جن وسائل اور تنظیم کی ضرورت تھی، وہ مغربی پنجاب کی انتظامیہ کی بساط سے باہر تھے۔ اس لیے جوں جوں مہاجرین آتے رہے، جس طرح بھی ممکن ہوا، انہیں آباد کیا جاتا رہا۔ اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

مغربی پنجاب کے مختلف حصوں میں زمین کی پیداواری صلاحیت میں بڑا فرق ہے۔ لائل پور اور منٹگمری کے نو آباد علاقے، جو نہروں سے سیراب ہوتے ہیں، مغرب کی جانب بارانی علاقہ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ زرخیز ہیں۔ ہر شخص ان نو آباد اضلاع میں الاٹمنٹ کا خواہاں تھا لیکن اتنی زمین مہیا نہیں تھی چنانچہ منٹگمری میں پولیس اور مہاجرین کے ایک گروہ کے درمیان خاصی شدید

جذب ہوئی۔ یہ مہاجرین زبردستی ان زمینوں پر آباد ہونا چاہتے تھے' جو ان سے پہلے آنے والوں کو الاٹ کی جا چکی تھیں۔

گندم' کپاس اور دوسری اجناس کی تمام تر تجارت ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی اور دیہی قرضہ کا غالب حصہ بہم پہنچایا کرتے تھے۔ مسلمانوں کے بعض دیہات میں امداد باہمی کی سوسائٹیوں اور چند کوآپریٹو بینکوں کے سوا قرضہ دینے کے تمام ادارے مثلاً تجارتی بنک سب کے سب ہندوؤں کی تحویل میں تھے اور وہی انہیں چلاتے تھے۔ روئی کے کارخانے اور دوسرے صنعتی ادارے بھی زیادہ تر ہندوؤں کی ملکیت میں تھے۔ جب وہ ترکِ وطن کر گئے' تو اس بات کا سخت خدشہ تھا کہ کہیں مغربی پاکستان کی معیشت ڈھیر نہ ہو جائے۔ تقسیم سے پہلے سارا برصغیر ایک ہی منڈی کی حیثیت رکھتا تھا اور مغربی پنجاب کے تجارتی دھارے زیادہ تر مشرق کی سمت بہتے تھے۔ امرتسر ایک بہت بڑا تجارتی مرکز تھا۔ گندم اور کپاس ہی دو بڑی فصلیں تھیں۔ گندم مشرقی پنجاب' دہلی اور ان سے بھی آگے جنوبی علاقوں کو برآمد کی جاتی تھی۔ کپاس ریل کے ذریعہ بمبئی اور احمد آباد کے پارچہ بافی کے کارخانوں میں بھیجی جاتی تھی۔ ان اجناس کے عوض صنعتی مراکز سے کپڑا اور دوسری مصنوعات مغربی پنجاب میں آتی تھیں۔ پنجاب میں کایا پلٹ سے یہ دھارے معطل اور مسدود ہو گئے۔

صرف کراچی ہی مغربی پاکستان کی واحد بڑی بندرگاہ تھی۔ اور اب سب درآمدات و برآمدات کے لیے کراچی کا ہی رخ کیا جاتا تھا۔ کراچی کی منڈی بھی زیادہ تر سندھی ہندوؤں کے قبضہ میں تھی' جو اپنی کاروباری فراست کے لیے معروف ہیں۔ بعض مقامات پر شاذ و نادر حادثات کے علاوہ' جن پر بہت جلدی قابو پا لیا گیا تھا' سندھ میں امن و امان کو کوئی گزند نہیں پہنچا تھا۔ لیکن پاکستان کی معیشت کو مفلوج کرنے کی سوچی سمجھی کوشش کے تحت سندھی ہندوؤں کو پاکستان چھوڑ دینے پر آمادہ کر لیا گیا۔ انہیں یہ امید دلائی گئی کہ چند ماہ کے اندر اندر پاکستان کا شیرازہ بکھر جائے گا اور وہ اپنے گھروں واپس آ سکیں گے۔

اس زمانے میں کانگرس کا صدر سندھ نژاد کرپلانی تھا' اور سندھ میں اس کا کافی اثر و رسوخ تھا۔ وہ اکھنڈ بھارت کا علمبردار تھا۔ جب کانگرس کے تقسیم کے منصوبہ کو منظور کر لیا تو اس نے کانگرس پارٹی کو دعوت دی کہ اسے ہندوستان کو ایک مضبوط' خوشحال' جمہوری اور سوشلسٹ مملکت بنانا چاہیئے۔ اور یہ اعلان کیا کہ: "ایسا ہی ہندوستان اپنے علیحدہ ہونے والے بچوں کو دوبارہ اپنی آغوش میں

واپس لا سکتا ہے کیونکہ جو آزادی ہم نے حاصل کی ہے، وہ اکھنڈ بھارت کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی" مسٹر کرپلانی ستمبر کے تیسرے ہفتہ میں کراچی آیا اور قائداعظم سے ملاقات کی۔ قائداعظم نے اسے یقین دلایا کہ حکومتِ پاکستان امن بحال رکھنے، اقلیتوں کی پوری حفاظت کرنے اور انہیں مساوی حقوق دینے کا مصمم ارادہ رکھتی ہے۔ اس کے باوجود کرپلانی نے ہندوؤں میں بددلی پھیلانے کی مساعی جاری رکھیں، اور اس مقصد کے لیے ان کی اس وقت کی مشکلات کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا اور یہ ڈراؤنی پیشین گوئی کی کہ اگر وہ جلد ہی پاکستان سے نکل کر چلے نہ گئے، تو ان کا مستقبل بہت تاریک ہو گا۔ پرامن حالات کے دور دورہ اور قائداعظم کی طرف سے اقلیتوں کے لیے مساوی حقوق اور حفاظت کی بار بار یقین دہانیوں کے باوجود ہندوؤں کا عام انخلا شروع ہو گیا، جس سے تارکینِ وطن اور پاکستان دونوں کو نقصان پہنچا۔

پاکستان کے خلاف ان معاندانہ تدابیر کو عوام کے ناقابلِ تسخیر عزم نے ناکام بنا دیا، وہ پاکستان کو مضبوط اور خوشحال بنانے کا تہیہ کئے ہوئے تھے۔ ہندومت سے اسلام قبول کرنے والے چند کاروباری طبقوں کے سوا، برصغیر میں تمام تر تجارت ہمیشہ سے ہندوؤں کے ہاتھوں میں چلی آ رہی تھی۔ مسلمانوں کے لیے بالعموم تجارت کا راستہ بند تھا اور ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا یہ اعتقاد تھا کہ مسلمان تجارت کے لیے طبعاً نااہل ہیں۔ اب ہندوؤں کے کوچ کر جانے سے یہ باطل نفسیاتی رکاوٹ یک قلم اٹھ گئی۔ مسلمان آگے بڑھے اور ہندوؤں کے انخلا سے پیدا ہونے والے خلا کو پُر کر دیا اس نئے میدان میں انہوں نے اس ہمت اور مستعدی کا مظاہرہ کیا کہ خود انہیں بھی حیرت ہوئی، جو وار ایک ضربِ کاری بن سکتا تھا، وہ نعمتِ مستور ثابت ہوا۔ تجارت و صنعت میں مسلمانوں کی نااہلی کا طلسم ہمیشہ کے لیے پاش پاش ہو گیا، اور ہندوؤں کو پاکستان کی معیشت پر جو گرفت حاصل ہو سکتی تھی، وہ ان کے اپنے غلط اندازوں سے زائل ہو گئی۔

حکومت نے تجارت کی بحالی میں ہر ممکن مدد بہم پہنچائی لیکن یہ لوگوں کی اپنی جد و جہد تھی، جس نے یہ کارنامہ سر انجام کیا۔ جہاں تک قرضے کی سہولتوں کا تعلق تھا، حکومت کی طرف سے براہ راست مساعی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ کاشت کار مہاجرین کو زرعی ضروریات کے لیے قرضے دیئے گئے۔ ہندوؤں کے تجارتی بنک بند ہونے سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا، اسے پُر کرنے کے لیے کوآپریٹو بنک تجارتی قرضے کے منفعت بخش میدان میں اتر آئے۔ یہ سراسر اچھائی کی بات نہیں تھی کیونکہ کوآپریٹو بنکوں کا

بنیادی مقصد جو زراعت کے لیے سرمایہ بہم پہنچانا تھا' اسے نقصان پہنچا۔ مہاجر دست کاروں کی اعانت کے لیے حکومت پاکستان نے تین کروڑ روپے کے سرمایہ سے مہاجرین بحالیاتی مالیاتی کارپوریشن قائم کی دست کاروں کو خاص نو آبادیوں میں بسانے کی کوشش کی گئی ——— مثلاً پانی پت کے بافندوں کو جو اونی مصنوعات تیار کرنے میں خاص مہارت رکھتے تھے' ایک ساتھ جھنگ میں آباد کیا گیا۔

مہاجرین کی آباد کاری کا زیادہ تر بار مغربی پنجاب کو برداشت کرنا پڑا۔ یہ بات ناگزیر بھی تھی کیونکہ مہاجرین کے راستے میں مغربی پنجاب ہی سب سے پہلے آتا تھا۔ لیکن جوں جوں ہندوستان میں فسادات کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا اور دہلی کے بعد صوبجات متحدہ کے شمالی اضلاع اور ملحقہ ریاستیں اور علاقے بھی فسادات سے متاثر ہوتے گئے' تو یہ بات واضح ہو گئی کہ فقط مغربی پنجاب کی آغوش میں سب کے سب مہاجرین نہیں سما سکیں گے اور جب تک مغربی پاکستان کے دوسرے صوبے بھی اس بار کو برداشت کرنے میں حصہ نہیں لیں گے' از حد سنگین حالات پیدا ہو جائیں گے۔

شمال مغربی سرحدی صوبہ سے کم و بیش تمام غیر مسلم ہندوستان چلے گئے تھے۔ لیکن اکثر و بیشتر ان کی متروکہ املاک پر مقامی لوگوں نے قبضہ کر لیا تھا' اور صوبائی حکومت نے شور و غوغا سے ڈرتے ہوئے انہیں بے دخل نہیں کیا تھا۔ جو مہاجرین اس صوبے میں گئے انہیں واپس لوٹا دیا گیا۔ سندھ سے غیر مسلموں کا انخلا اتنا کامل نہیں تھا تاہم وہاں متروکہ اور غیر مزروعہ اراضی کے بڑے وسیع رقبے تھے' جن پر مہاجرین کو آباد کیا جا سکتا تھا۔ لیکن قائد اعظم کے ارشاد کے باوجود حکومت سندھ نے ڈیڑھ لاکھ سے زائد مہاجرین کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

ان حالات میں مرکزی حکومت کو مہاجرین کی آباد کاری کے لیے خاص اختیارات لینے پڑے اس مقصد کے لیے گورنر جنرل نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء (مروجہ پاکستان) کی دفعہ ۱۰۲ کے تحت ایک فرمان جاری کیا۔ یہ فرمان ۲۷ اگست ۱۹۴۸ء کو جاری کیا گیا' اور اس میں کہا گیا "ہر گاہ کہ پاکستان میں کثیر آبادی کی نقل مکانی سے جو صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے اس سے پاکستان کی اقتصادی زندگی کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ اس لیے ہنگامی حالات کا اعلان کیا جاتا ہے"۔ اس سے اگلے دن یہ فیصلہ کیا گیا' کہ مغربی پنجاب کے کیمپوں میں جو مہاجرین بڑی بے تابی سے آباد کاری کے منتظر ہیں' ان میں سے ۲ لاکھ کو سندھ میں آباد کرنا چاہیئے۔ ایک لاکھ کو شمال مغربی سرحدی صوبہ میں اور ایک لاکھ کو بہاولپور'

خیرپور اور بلوچستان ایجنسی میں۔ اور مغربی پنجاب کو سعیٔ مزید سے ایک لاکھ اور مہاجر آباد کرنے چاہئیں، بایں ہمہ مرکزی حکومت کی مساعی جزوی طور پر ہی کامیاب ہوئیں۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق سندھ میں ۹ لاکھ تارکینِ وطن کے مقابلے میں آباد ہونے والے مہاجرین کی تعداد ۵۰,۴۰۰۰ تھی۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ سے اگرچہ ۲,۶۹,۰۰۰ غیر مسلم چلے گئے تھے، ان کی جگہ صرف ۵۱,۰۰۰ مہاجرین آباد کئے گئے۔

جب تبادلۂ آبادی شروع ہوا، تو اس وقت بہت سے لوگ اسے ایک عارضی حادثہ سمجھتے تھے۔ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ خانہ جنگی کا ہیجان جب فرو ہو جائے گا اور حالات معمول پر آجائیں گے، تو تارکینِ وطن اپنی اپنی املاک پر واپس چلے جائیں گے۔ اس اثنا میں دونوں ڈومینیوں کی حکومتیں متروکہ املاک کو اپنی تحویل میں لے لیں گی۔ اور تارکینِ وطن کی طرف سے ان کی دیکھ بھال کریں گی۔ لاہور میں ۲۹ اگست ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماونٹ بیٹن کی صدارت میں مشترکہ دفاع کونسل کا جو اجلاس ہوا، اس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہر ڈومینین کو ایک کسٹوڈین برائے متروکہ املاک مقرر کرنا چاہیئے، اور دونوں کسٹوڈینوں میں قریبی رابطہ ہونا چاہیئے۔ ۳ ستمبر ۱۹۴۷ء کو ہندوستان اور پاکستان کے وزرائے اعظم نے بھی ایک مشترکہ اعلان جاری کیا، جس میں یہ کہا گیا کہ "املاک پر ناجائز قبضہ کو تسلیم نہیں کیا جائے گا اور دونوں حکومتیں تارکینِ وطن کی املاک کی دیکھ بھال کے لیے اور حقیقی مالکوں کو انہیں بحال کرنے کے لیے اقدامات کریں گی۔" چنانچہ حکومتِ مغربی پنجاب نے ایک کسٹوڈین برائے متروکہ املاک مقرر کر دیا اور ۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو ایک آرڈیننس نافذ کر دیا، جس میں یہ کہا گیا کہ "اس آرڈیننس کی دفعات کے تحت کسٹوڈین پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ جو علاقہ اس کی تحویل میں دیا گیا ہے، وہ اس میں تارکین وطن کی املاک اور ساز و سامان کو اپنے قبضہ میں لے لے گا اور ان املاک اور ساز و سامان کی حفاظت کے لیے جو اقدامات اس کی دانست میں ضروری یا مفید ہوں گے، کرے گا۔" ایسے ہی اقدامات حکومت مشرقی پنجاب نے بھی کئے۔

املاک کی بعض اقسام مثلاً جوائنٹ سٹاک کمپنیوں کے اثاثہ جات اور بنکوں میں جمع رقوم کو کسٹوڈینوں کے حدِ اختیار سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ بحالیات کے یہ سب اقدامات عارضی اور عبوری شمار کئے جاتے تھے تاآنکہ اس مسئلہ کا پائیدار حل تلاش کر لیا جائے۔ لیکن بہت جلد یہ حقیقت عیاں ہو گئی کہ آبادی کا تبادلہ مستقل ہے، جولائی ۱۹۴۸ء میں بعض مہاجرین کی واپسی سے گھبرا کر

حکومت ہندوستان نے یک طرفہ طور پر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان پرمٹ سسٹم جاری کر دیا۔ مغربی پاکستان سے کوئی شخص اب پاکستان میں متعینہ ہندوستانی ہائی کمشنر کی اجازت لیے بغیر ہندوستان واپس نہیں جا سکتا تھا۔

اس پابندی کے بعد دوسری ڈومنین میں خود اپنی چھوڑی ہوئی جائداد پر مہاجر کا حق ملکیت کمزور اور مبہم سا ہوتا گیا اور بالآخر بالکل ختم ہو گیا۔ اب وہ فقط یہ دعویٰ کر سکتا تھا کہ یہاں کی متروکہ املاک میں سے اسے معاوضہ دیا جائے لیکن یہ دعویٰ علی الاطلاق نہیں تھا، جسے تمام و کمال پورا کیا جانا تھا ــــ مہاجرین کے دعاوی کس حد تک پورے کئے جائیں؟ اس کا تعین تارکین وطن کی املاک کی مالیت، ڈومنین میں آنے والے مہاجرین کی تعداد، قومی معیشت کی کیفیت اور عام پالیسی کے قابل لحاظ امور کو پیش نظر رکھنے کے بعد ہی کیا جا سکتا تھا۔

میری یہ رائے تھی کہ ہمیں اس تغیر عظیم سے فائدہ اٹھا کر زرعی اصلاحات کے لیے کچھ نہ کچھ اقدامات کرنے چاہئیں، اور زرعی ملکیتوں کی زیادہ سے زیادہ اور کم از کم رقبہ کی حد مقرر کر دینی چاہیئے۔ زیادہ سے زیادہ ملکیت کی حد سے متعلق تجویز ــــ یہ علاقہ بہ علاقہ پیداواری شرح کے مطابق مختلف تھی ــــ کو قبول کر لیا گیا، اور اس کا اطلاق مہاجرین کو الاٹ کی جانے والی اراضی پر کیا گیا، لیکن ساڑھے بارہ ایکڑ نہری زمین کی کم از کم حد کو قبول نہ کیا گیا، جو معاشی طور پر خود کفیل زرعی یونٹ بن سکتی تھی۔ اس کے بجائے فقط ملکیت کی بنا پر مستقل الاٹمنٹیں کر دی گئیں، خواہ وہ کتنی ہی کم کیوں نہ ہوں پنجاب کی خوشحالی کا دارومدار اس کے کاشتکار زمینداروں پر تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ زرعی رقبوں کی تقسیم اور حصے بخرے ہونے سے انفرادی ملکیتیں گھٹتے گھٹتے معاشی طور پر خود کفیل نہیں رہی تھیں۔ اگر نہری زمین کے لیے ساڑھے بارہ ایکڑ کی کم از کم حد مقرر کر دی جاتی تو معاشی طور پر خود کفیل زرعی ملکیتیں معرض وجود میں آ جاتیں، اور مغربی پاکستان کی دیہی معیشت مضبوط اساس پر قائم ہو جاتی۔

مغربی پاکستان میں تارکین وطن نے ۹۶ لاکھ ایکڑ زرعی زمین چھوڑی تھی۔ اس کا کچھ حصہ بنجر اور بے آباد تھا اور کچھ حصہ مقامیوں کے قبضہ میں تھا۔ مہاجرین کے حصے میں ۷۵ لاکھ ایکڑ اراضی آئی جو ۱۵ لاکھ کاشتکار مہاجر کنبوں کے لیے ازحد ناکافی تھی۔ مہاجرین کی مناسب آبادی کے لیے مزید آبپاشی کے منصوبوں کی ضرورت تھی جنہیں زرعی ترقی کے اس جامع پروگرام کا لازمی جزو بنانا

چاہیے تھا۔

شہروں میں بعض پہلوؤں سے اور زیادہ مشکل تھی۔ تقریباً چار لاکھ مکانات دستیاب ہوئے تھے جبکہ شہری علاقوں میں آباد ہونے والے کنبوں کی تعداد کم و بیش چھ لاکھ تھی۔ مہاجرین کراچی، لاہور اور لائل پور ایسے بڑے شہروں میں حصولِ روزگار کی امید پر جوق در جوق آ رہے تھے۔ بالخصوص کراچی میں مہاجرین کے لیے بڑی کشش تھی۔ کراچی نہ صرف دارالحکومت تھا بلکہ صنعتی مرکز بھی تھا۔ تقسیم کے وقت اس کی آبادی تقریباً ساڑھے تین لاکھ تھی۔ پانچ سال کے اندر اس کی آبادی پانچ گنا بڑھ گئی۔ چنانچہ اس شہر میں رہائش، آب رسانی، بجلی اور دوسری تمدنی سہولتوں کے وسائل پر بار بہت بڑھ گیا۔ کئی نئی آبادیاں مثلاً لالو کھیت، ناظم آباد، لانڈھی وغیرہ تعمیر کی گئیں، لیکن ضرورت پھر بھی پوری نہ ہوئی۔ مہاجرین کے علاوہ پاکستان کے دوسرے حصوں سے بھی لوگ روزگار کی تلاش میں کراچی آتے گئے اور اس کی آبادی بڑھاتے گئے۔

مہاجرین کی آباد کاری کے کثیر اخراجات پورے کرنے کے لیے حکومتِ پاکستان نے کئی شکلوں میں بحالیاتی ٹیکس عائد کیے۔ ان ٹیکسوں سے حاصل شدہ آمدنی کا کچھ حصہ مرکزی حکومت نے خرچ کیا اور کچھ حصہ صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء کے دوران میں ہندوستان اور پاکستان کے مابین کئی کانفرنسیں بھی منعقد ہوئیں تاکہ تبادلۂ آبادی سے پیدا شدہ مسائل کا تصفیہ کیا جا سکے۔ مثلاً دونوں جانب متروکہ املاک کی مالیت کا تعین، املاک کے ریکارڈ کا تبادلہ، منقولہ املاک کے لیے بندوبست اور ان علاقوں کے بارے میں مفاہمت جہاں تارکینِ وطن سے متعلق قوانین نافذ کیے جانے تھے۔ بالآخر جنوری ۱۹۴۹ء میں کراچی میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں دونوں ملکوں کے درمیان ایک معاہدہ طے ہوا۔ اس کانفرنس میں جو فیصلے کیے گئے، ان کا تعلق زرعی املاک، شہری غیر منقولہ املاک اور منقولہ املاک سے تھا۔ زرعی املاک سے متعلق فیصلے کا اطلاق دونوں جانب جس علاقے پر ہونا تھا، وہ ایک طرف مغربی پاکستان پر مشتمل تھا، اور دوسری طرف ہندوستان میں مشرقی پنجاب، دہلی، ہماچل پردیش، پٹیالہ و مشرقی پنجاب کی ریاستی یونین اور بھرت پور، الور اور بیکانیر کی ریاستوں پر مشتمل تھا۔ شہری غیر منقولہ املاک کے سلسلے میں ہندوستان کے مزید علاقے بھی شامل کر دیے گئے۔ یعنی اجمیر، مارواڑ، صوبجات متحدہ کے چار شمالی

اضلاع، راجستھان یونین، اور بعض ریاستیں مثلاً دھولپور، جے پور، اور جودھ پور۔ یہ علاقے "متفق علیہ علاقے" کہلانے لگے۔ ان علاقوں میں فسادات کے باعث عام ترکِ وطن تک نوبت پہنچی تھی۔ زرعی املاک کے متعلق محکمہ مال کے ریکارڈ کا تبادلہ کیا جانا تھا۔ جس ڈومینین میں زرعی اور شہری غیر منقولہ املاک تھیں، ان کا لگان اور کرایہ اسی ڈومینین کو جمع کرنا تھا اور بعد میں باہمی حساب فہمی کی جانی تھی۔ بعض شرائط کے تحت شہری غیر منقولہ املاک کے تارکِ وطن مالکوں کو اپنی املاک فروخت کرنے یا ان کا تبادلہ کرنے کا بھی حق دیا گیا تھا۔ منقولہ املاک کے بارے میں یہ تصفیہ ہوا کہ (خاص اور معین معاملات کے سوا) اسے فروخت کیا جا سکتا ہے یا اس ڈومینین میں منتقل کیا جا سکتا ہے جہاں تارکِ وطن نے سکونت اختیار کرلی ہے۔

ہندوستان کی حکومت کو یہ پختہ یقین تھا کہ مغربی پاکستان میں جو املاک غیر مسلم چھوڑ کر گئے ہیں، وہ مالیت میں ان املاک سے بدرجہا زیادہ ہیں، جو مسلمان ہندوستان کے "متفق علیہ علاقوں" میں چھوڑ کر آئے ہیں۔ جنوری ۱۹۵۰ء میں ہندوستان کی وزارتِ بحالیات نے متروکہ املاک کے بارے میں ایک پمفلٹ شائع کیا، جس میں یہ تسلیم کیا گیا کہ "حقیقی اعداد و شمار کا حصول بہت مشکل ہے۔" لیکن لگے ہاتھوں یہ مضحکہ خیز دعویٰ بھی کر ڈالا کہ "جو بھی مختلف اندازے لگائے گئے ہیں، ان کے مطابق ہندوستان میں مسلمانوں کی متروکہ املاک کے مقابلے میں پاکستان میں غیر مسلموں کی متروکہ املاک کی مالیت چھ سے دس گنا ہے۔" ہندوستان کا یہ دعویٰ نہایت ہی مشکوک اعداد و شمار پر مبنی تھا لیکن اس سے متاثر ہو کر حکومتِ ہندوستان نے بلا شک و شبہ غیر اخلاقی روش اختیار کی۔ اس فرضی عدم توازن کی تلافی کرنے کے لیے اور ہندوستان تارکینِ وطن کی خاطر مسلمانوں کی متروکہ املاک میں اضافہ کرنے کے لیے تارکینِ وطن سے متعلقہ قوانین کا اطلاق یک طرفہ کارروائی سے مغربی بنگال اور آسام کے سوا سارے ہندوستان پر کر دیا گیا۔ جنوری ۱۹۴۹ء میں کراچی میں جو کانفرنس ہوئی تھی، اس میں ہندوستان کے نمائندوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ تارکینِ وطن سے متعلق قوانین کا اطلاق سارے ہندوستان پر کر دیا جائے۔ پاکستان کے نمائندوں نے اس بنا پر اس تجویز کی مخالفت کی کہ "متفق علیہ علاقوں" سے باہر وسیع پیمانہ پر فسادات نہیں ہوئے، جو اس توسیع کا جواز بن سکیں۔ چنانچہ یہ تجویز ترک کر دی گئی تھی۔ معاہدۂ کراچی میں "متفق علیہ علاقوں" کا پوری وضاحت سے تعین کیا گیا تھا، لیکن اس

معاہدے کے چھ ماہ کے اندر ہی حکومتِ ہندوستان نے اپنی صوبائی حکومتوں کو تارکینِ وطن سے متعلق قوانین نافذ کرنے کی ہدایت کر دی۔ ان قوانین کے تحت مغربی بنگال اور آسام کے سوا ہندوستان کے طول و عرض میں متروکہ املاک کے کسٹوڈین مقرر کر دیئے گئے، اور انہوں نے ہندوستان میں مسلم شہریوں کی املاک کو ہتھیانے کی باقاعدہ مہم شروع کر دی۔

اکتوبر ۱۹۴۹ء میں ہندوستان میں تارکینِ وطن کی ایک نئی قسم ـــ عازمِ ترکِ وطن ـــ کا اضافہ کر دیا گیا۔ جن مسلمانوں کو "عازمِ ترکِ وطن" قرار دیا جاتا تھا، انہیں نہ صرف اپنی املاک سے بلکہ ہندوستان میں روزگار کے تمام ذرائع سے بھی محروم کر دیا جاتا تھا۔ کیونکہ انہیں سرکاری طور پر بالقوۃ غیر وفادار شہری قرار دے دیا جاتا تھا۔ جب اس طرح کسی مسلمان کو پاکستان میں پناہ لینے کے لیے اپنے گھر سے زبردستی نکال دیا جاتا، تو ہندوستان کے حکام اس کے رخصت ہونے پر بڑے فخر سے یہ اعلان کر سکتے تھے کہ انہوں نے اسے "عازمِ ترکِ وطن" قرار دینے کا جو فیصلہ کیا تھا، وہ کس قدر درست تھا۔ ان اقدامات کے باعث ہندوستان سے مسلمانوں کا نئے سرے سے انخلا شروع ہو گیا۔ ہندوستان سے یہ زبردستی دھکیلے جانے والے لوگ زیادہ تر صحرائے سندھ کو پیدل عبور کر کے سرحدی سٹیشن کھوکھرا پار کے راستے سے پاکستان میں داخل ہوتے تھے۔ ۱۹۵۰ء کے دوران میں اس راستے سے ۹۹۸،۴۴،۰ مہاجرین پاکستان میں داخل ہوئے، بالآخر ان کی تعداد بڑھتے بڑھتے ۷ لاکھ تک پہنچ گئی۔

مغربی بنگال اور آسام کو ہندوستان نے [illegible] وطن سے متعلق قوانین سے مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کے مفاد میں مستثنیٰ رکھا تھا، جن کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ تھی۔ اگر ان قوانین کا اطلاق مغربی بنگال اور آسام پر بھی کیا جاتا، تو ان کے تحت اپنے گھروں سے نکالے جانے والے مسلمانوں کے لیے مشرقی پاکستان میں پناہ لینے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ ہوتا۔ پھر انہی خطوط پر مشرقی پاکستان میں بھی قوانین کا نفاذ ناگزیر ہو جاتا، اور اس سے مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کو نقصان پہنچتا۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق سات لاکھ مسلم مہاجرین، جن میں سے بیشتر صوبۂ بہار کے رہنے والے تھے، مشرقی بنگال میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ وہاں کوئی متروکہ املاک نہیں تھیں، جو ان مہاجرین کی بحالی کے لیے انہیں دی جا سکتیں۔ بایں ہمہ حکومت پاکستان نے، اپنے ہندو شہریوں کے مفاد کا خیال رکھتے ہوئے،

تارکین وطن سے متعلق قوانین مشرقی پاکستان میں نافذ نہ کیے۔

مشرقی پاکستان میں ہندو ایک چوتھائی آبادی پر مشتمل تھے۔ اعلیٰ ذات کے ہندو اگرچہ اچھوتوں کے مقابلہ میں تعداد کے لحاظ سے کم تھے، لیکن ہندو معاشرہ میں انہیں ہی غلبہ حاصل تھا، اور یہ اعلیٰ ذات کے ہندو ہی تھے، جو قیام پاکستان سے بالخصوص متاثر ہوئے تھے۔ غیر منقسم بنگال میں انگریزی راج کے زمانے میں وہ مسلسل بالاتر مراتب اور مراعات سے بہرہ ور رہے تھے۔ رئیس زمیندار بھی وہی، تعلیم یافتہ ذی اثر بھی وہی اور سرمایہ دار بھی وہی تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ اپنے آپ کو سیاسی طور پر بے اختیار اور اقتصادی طور پر غیر محفوظ محسوس کرنے لگے، اور بالعموم انہیں نئے حالات سے مطابقت کرنی مشکل نظر آئی۔ سرکردہ ہندوؤں کے ایک وفد نے ۱۹۴۹ء میں وزیر اعظم کے دورہ مشرقی پاکستان میں ان سے ملاقات کی۔ میں نے خود انہیں وزیر اعظم سے یہ کہتے ہوئے سنا: "ہمارے جسم تو پاکستان میں ہیں لیکن ہمارے دل ہندوستان میں ہیں"۔ بیشتر ہندو تعلیم یافتہ نوجوانوں نے پاکستان میں سرکاری ملازمت اختیار کرنے سے گریز کیا۔ جب مرکزی حکومت نے مختلف سرکاری ملازمتوں کے لیے صوبائی بنیادوں پر حصے مقرر کر دیئے، تو میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ مشرقی بنگال سے بہت کم ہندو مقابلہ کے امتحانوں میں شریک ہو رہے ہیں۔ میں نے ہندو لیڈروں کو دوستانہ طور پر سمجھایا بجھایا کہ سرکاری ملازمتوں میں ہندوؤں کے زیادہ تناسب سے اقلیت کا دل زیادہ مطمئن ہو جائے گا لیکن اس مشورے کا چنداں اثر نہ ہوا۔ امیر ہندوؤں میں سے بعض نے تو اپنا سرمایہ سمیٹا اور مغربی بنگال میں جا بسے۔ دوسروں کو کلکتہ کی کشش نے نہ چھوڑا جہاں انہیں ماضی کی طرح تعلیم، روزگار اور تجارت کے بہتر مواقع دکھائی دیئے۔ اس طرح مشرقی پاکستان میں پُر امن حالات کے دور دورہ اور حکومت کی طرف سے اقلیتوں کے ساتھ منصفانہ اور مساوی سلوک کے باوجود ۱۹۵۰ء میں ہندو کثیر تعداد میں ترکِ وطن کر کے مغربی بنگال جاتے رہے۔ پاکستان آئین ساز اسمبلی کے ایک ممتاز ہندو رکن راج کمار چکرورتی نے یہ رائے ظاہر کی کہ ہندوؤں کے انخلا کے اسباب نفسیاتی ہیں۔ لیکن اس سے ہندوستانی لیڈر مطمئن نہ ہوئے اور ہندوستان کے پریس کا رویہ تو بہت ہی مخاصمانہ تھا۔

اپریل ۱۹۵۰ء میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک کانفرنس کلکتہ میں منعقد ہوئی، جس میں مشرقی بنگال اور مغربی بنگال میں اقلیتوں کی حیثیت پر تبادلۂ خیالات کیا گیا۔ اس کانفرنس میں

اقلیتوں کی جان و مال کی حفاظت کرنے، اپنے گھروں میں تارکینِ وطن کی واپسی کے لیے سہولتیں بہم پہنچانے، ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں پر مشتمل صوبائی اقلیتی بورڈ قائم کرنے اور فرقہ وارانہ جذبات کو مشتعل کرنے والے پروپیگنڈا کو روکنے کے بارے میں اقدامات پر اتفاق ہو گیا۔ اگلے چند ماہ کے دوران میں دونوں طرف سے ہی اس معاہدہ پر عمل درآمد میں کوتاہیاں ہوئیں۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں ہندوستان اور پاکستان کے وزرائے اعظم نے اس موضوع پر ایک دوسرے کو کئی ایک تار بھیجے۔ سردار پٹیل نے اپنے مخصوص انداز میں ۴ر نومبر ۱۹۴۸ء کو ناگپور کے ایک عام جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "اگر پاکستان مشرقی بنگال سے ہندوؤں کو زبردستی نکال دینے کا تہیہ کر چکا ہے، تو پھر پاکستان کو ہمیں کافی زمین بھی دینی ہو گی، جس پر ہم انہیں آباد کر سکیں۔" ہندوستان میں مسلم اقلیت کے تحفظ میں ناکام رہنے کے باوجود وہاں کے لیڈر مشرقی بنگال میں ہندوؤں کی مناسب حفاظت نہ کرنے پر پاکستان کو بار بار دھمکیاں دیتے رہے۔ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی نسبت پاکستان میں ہندو اقلیت کی فلاح و بہبود کے لیے بدرجہا زیادہ متشوش تھے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی وفاداری ان کی نگاہ میں مشکوک تھی، اور انہیں ہر طرح سے ستایا جا رہا تھا اور روزگار، اور اقتصادی ترقی کے مواقع سے محروم کیا جا رہا تھا۔

دسمبر ۱۹۴۸ء میں دونوں مملکتوں کے درمیان ایک اور کانفرنس نئی دہلی میں منعقد ہوئی۔ اس میں جو سمجھوتہ ہوا وہ بیشتر معاہدۂ کلکتہ کی اساس پر تھا لیکن اس میں معاہدہ پر عمل درآمد کے لیے مشینری کا انتظام بھی کر دیا گیا اور صوبائی اقلیتی بورڈوں کے علاوہ بین مملکتی اطلاعات مشاورتی کمیٹی کا قیام بھی عمل میں لایا گیا۔

۱۹۵۰ء کی پہلی سہ ماہی میں پاکستان اور ہندوستان میں کشیدگی بہت بڑھ گئی۔ کسی حد تک یہ اس اقتصادی جنگ کا نتیجہ تھی جو ہندوستان نے پاکستان کے خلاف اس لیے شروع کی تھی کہ اس نے کرنسی کی قیمت میں کمی کرنے کے معاملے میں ہندوستان کی پیروی کیوں نہیں کی۔ لیکن اس میں بہت زیادہ شدت ان فرقہ وارانہ فسادات سے پیدا ہو گئی جن کا آغاز کلکتہ میں ہوا، اور پھر مشرقی پاکستان اور ہمسایہ علاقے بھی ان کی لپیٹ میں آ گئے اور ایک طرف مشرقی بنگال اور دوسری طرف مغربی بنگال، آسام اور تری پورہ سے تارکینِ وطن کی نقل و حرکت شروع ہو گئی۔ سردار پٹیل

اور ہندوستان کے دوسرے لیڈر کھلم کھلا پاکستان کے خلاف جنگ کا پرچار کرنے لگے ۱۵ء

لیاقت علی خاں کے مدبرانہ اقدام سے یہ بحران ٹل گیا۔ انہوں نے دہلی جا کر نہرو سے گفت وشنید کے ذریعہ ایک معاہدہ طے کیا۔ میں بھی وزیر اعظم کے ہمراہ تھا، اور مذاکرات دراصل ہندوستان کی وزارتِ امورِ خارجہ کے سیکریٹری جنرل گرجا شنکر باجپائی اور میرے درمیان ہوئے۔ بات چیت کے شروع میں ہی میں نے باجپائی کو یہ پیشکش کی کہ وہ مشرقی بنگال میں ہندو اقلیت بلکہ پاکستان میں کسی بھی جگہ کسی بھی اقلیت کی حفاظت کے لیے جو بھی تجویز پیش کرے گا، میں اسے قبول کرنے کو تیار ہوں، بشرطیکہ ویسے ہی تحفظات سے ہندوستان کے مختلف صوبوں مثلاً مغربی بنگال، آسام، صوبجات متحدہ، بہار وغیرہ میں مسلمانوں کو بھی بہرہ ور کیا جائے۔ لیکن باجپائی اس مسئلہ کو صرف مغربی بنگال اور آسام تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ یہ معاملہ دونوں وزرائے اعظم کے سامنے پیش کیا گیا، لیکن ان میں بھی اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ میں نے ہندوستان کے وزیر تعلیم ابوالکلام آزاد سے مدد چاہی۔ وہ دونوں طرف اقلیتوں سے منصفانہ اور مساوی سلوک میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ اب تک انہیں نہرو پر کافی اثر و رسوخ حاصل تھا، لیکن سردار پٹیل کی مخالفت کے باعث وہ بھی نہرو کو آمادہ کرنے میں ناکام رہے۔ تعطل کئی دن جاری رہا۔ آخر کار اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کے سلسلے میں دونوں حکومتوں کی ذمہ داری سے متعلق ایک عمومی اعلان پر ہی ہمیں قناعت کرنی پڑی۔

یہ معاہدہ ۸ راپریل ۱۹۵۰ء کے لیاقت نہرو معاہدہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا آغاز ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کی طرف سے اس ذمہ داری کو باضابطہ طور پر قبول کرنے سے ہوا کہ ان میں سے ہر ایک اپنے ملک کے ہر حصے میں اقلیتوں کے لیے مکمل طور پر مساوی شہریت اور بلاامتیازِ مذہب، ان کی جان، ثقافت، مال اور عزت کی حفاظت کی ضمانت دے گا۔ ہر ملک کے اندر نقل و حرکت کی آزادی کے علاوہ قانون اور اخلاق کے تحت پیشہ، تقریر اور عبادت کی آزادی کی بھی ضمانت دے گا۔" اس معاہدہ میں مشرقی بنگال، مغربی بنگال، آسام اور تری پورہ سے نقل مکانی کرنے والوں کی حفاظت اور ان علاقوں میں حسبِ معمول حالات کی بحالی اور معاہدہ پر عمل درآمد کرنے کے لیے مشینری کا بھی اہتمام کیا گیا۔

بحالیات کے کام کے ایک حصہ کا تعلق مغویہ عورتوں اور بچوں کی بازیابی، بحالی اور

دیکھ بھال سے تھا۔ نومبر ۱۹۴۹ء میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک معاہدہ ہوا، جس میں اس امر کی ضرورت تسلیم کی گئی کہ اس بارے میں دونوں ملکوں میں خاص قوانین نافذ کیے جائیں۔ اس معاہدہ کے تحت جو قوانین وضع کیے گئے، ان کی رو سے اغوا شدہ عورتوں اور بچوں کو اغوا کرنے والوں کے اثر و رسوخ سے اس طرح علیحدہ اور دور کیا جانا تھا کہ وہ کسی قسم کا خوف محسوس نہ کریں، انہیں اپنے رشتہ داروں اور فرقہ کے ساتھ رابطہ کی اجازت بھی دی جاتی تھی تاکہ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں آزادانہ طور پر اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کر سکیں۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں بازیابی کے دفاتر اور عبوری کیمپ قائم کیے گئے۔ مخلص سماجی کارکنوں نے نہ صرف مغویہ افراد کی بازیابی کے لیے بلکہ ان کی نفسیاتی بحالی میں بھی گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء تک پاکستان میں برآمد ہونے والی غیر مسلم عورتوں اور بچوں کی تعداد ۸،۳۲۶ تھی، جبکہ ہندوستان سے ۱۶،۹۱۹ عورتوں اور بچوں کو برآمد کیا گیا۔

مغربی پاکستان میں آنے والے مہاجرین کی تعداد بالآخر نوے لاکھ تک پہنچ گئی اور وہ آبادی کے ایک چوتھائی حصہ پر مشتمل تھے۔ ان میں سے اکثر کو آباد کیا جا چکا ہے۔ لیکن ملک کی سماجی اور معاشی زندگی میں ان کے جذب ہونے کا عمل ابھی پوری طرح پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا۔ کئی وجوہ کے باعث بحالی اور آبادکاری کے کام کی رفتار ناواجب حد تک سست رہی ہے۔ اور اس کام کا دامن نااہلی اور بددیانتی سے بھی داغدار ہے۔ شاید اس کی سب سے بڑی وجہ بحالیات و آبادکاری کی تنظیم کے لیے عملہ مامور کرنے کی پالیسی ہے۔ یہ عملہ تقریباً تمام تر عارضی سرکاری ملازموں پر مشتمل ہے، جن کا ذاتی مفاد اپنی ملازمت کے عرصہ کو طویل سے طویل تر کرتا ہے۔ کلیموں کے حتمی تصفیہ میں تاخیر کے باعث عارضی بنیادوں پر الاٹ ہونے والے مکانوں اور کارخانوں کی دیکھ بھال میں غفلت برتی گئی۔ علاوہ ازیں خام مال اور فالتو پرزوں کو فوری منافع حاصل کرنے کی خاطر فروخت کر دیا گیا۔ اس تاخیر سے سیاسی دباؤ، جھوٹے کلیموں اور مقدمہ بازی کے لیے بھی زیادہ وسیع مواقع بہم پہنچے۔ لیکن مہاجرین کی آبادکاری کے لیے جس قدر کام سرانجام ہوا ہے، اس کا استخفاف بھی نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ مسئلہ بے پایاں تھا، اور ہندوستان

کے مقابلے میں پاکستان پر اس کی وجہ سے کہیں زیادہ بار پڑا۔ اس زمانہ میں یہ پیشگوئی کرنے والوں کی کمی نہ تھی کہ اس مسئلہ کو حل کرنا پاکستان کے معاشی اور انتظامی وسائل سے باہر ہے اور یہ کہ پاکستان مہاجرین کے سیلاب میں گھر کر رہ جائے گا۔ بایں ہمہ پاکستان نے نہ صرف ان عظیم مشکلات پر قابو پالیا، بلکہ اس جبری تبادلۂ آبادی کی آزمائش سے زیادہ مضبوط و مستحکم اور زیادہ متحد ہو کر نکلا۔

باب ۱۴

جوناگڑھ، حیدرآباد اور کشمیر

جوناگڑھ، حیدرآباد اور کشمیر کی ریاستوں نے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء تک ہندوستان یا پاکستان سے الحاق نہیں کیا تھا۔ بعد میں یہ تینوں ریاستیں ہندوستانی جارحیت کا شکار ہوئیں۔

جوناگڑھ ایک چھوٹی سی ساحلی ریاست تھی جو کراچی سے ۳۰۰ میل جانب جنوب واقع تھی۔ اس کا رقبہ ۳۳۳۷ مربع میل اور آبادی تقریباً ۷ لاکھ تھی۔ اس کی آبادی کی اکثریت ہندو تھی لیکن اس کا حکمران مسلمان تھا۔ یہ ریاست پاکستان کے ساتھ بحری راستے سے سلسلہ مواصلات برقرار رکھ سکتی تھی۔ آزادی کے فوراً بعد اس نے پاکستان سے الحاق کرنے کی پیشکش کی۔ جوناگڑھ سے ملحق اور اس سے بھی چھوٹی ریاست مناودار کے حکمران نے بھی پاکستان سے الحاق کر لیا۔ قائد اعظم نے ۵ ستمبر ۱۹۴۷ء کو ان دونوں ریاستوں کا الحاق منظور کر لیا۔ ہندوستان کی حکومت کو بھی مطلع کر دیا گیا۔ ہندوستان کا ردِ عمل فوری اور شدید تھا۔ ہندوستان کے گورنر جنرل نے پاکستان کے گورنر جنرل کو تار دیا "حکومتِ ہندوستان کی نگاہ میں پاکستان کا ایسے الحاق کو منظور کرنا ہندوستان کی خود مختاری اور علاقائی سالمیت میں مداخلت کے مترادف ہے اور ان دوستانہ تعلقات کے بھی منافی ہے جو دونوں ڈومینیونز کے مابین قائم رہنے چاہئیں۔

یہ اقدام ان اصولوں کے بھی صریحاً خلاف ہے جن کی بنا پر تقسیم ہند کا تصفیہ اور عمل در آمد ہوا تھا۔"

"جن اصولوں کی بنا پر تقسیم ہند کا تصفیہ اور عمل درآمد ہوا تھا" وہ یہ تھے کہ متصلہ مسلم اکثریت کے علاقے متصلہ غیر مسلم اکثریت کے علاقوں سے علیحدہ کر دیے جائیں تاکہ علی الترتیب پاکستان اور ہندوستان کی دو مملکتوں کا قیام عمل میں آسکے۔ ہندوستان کا استدلال یہ تھا کہ چونکہ جوناگڑھ ہندو اکثریت کی ریاست ہے اور ہندوستان سے متصل ہے، اس لیے اسے پاکستان سے الحاق نہیں کرنا چاہیے تھا۔ حکومتِ ہندوستان اس بات پر مصر تھی کہ الحاق کے سوال کا فیصلہ استصواب کے ذریعے ہونا چاہیے، جو ہندوستان اور جوناگڑھ کی حکومتوں کی مشترکہ نگرانی میں ہو لیکن پاکستان کا اس سے کوئی تعلق نہ ہو۔

ان رسمی احتجاجوں کے ساتھ ہی ساتھ حکومتِ ہندوستان نے اس مسئلے کو دوسرے یعنی حربی ذرائع سے حل کرنے کے لیے بھی اقدام کیے۔ کاٹھیاواڑ کے لیے ایک دفاعی فوج منظم کی گئی۔ اور ہندوستانی فوجوں کے ساتھ مل کر کاٹھیاواڑ کی ان ہندو ریاستوں کی فوجوں نے جوناگڑھ کا محاصرہ کر لیا جو اس کے ارد گرد واقع تھیں اور ہندوستان سے الحاق کر چکی تھیں۔ اس علاقے کے ایک سرکردہ ہندو حکمران جام صاحب آف نواں نگر نے حکومتِ ہندوستان پر زور دیا کہ وہ فوری طور پر ایسے موثر اقدامات کرے، جن سے کاٹھیاواڑ کی ریاستوں کے تحفظ کی ضمانت مل سکے۔[1] اس کے نزدیک جوناگڑھ کے پاکستان سے الحاق کے باعث ان ریاستوں کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ جوناگڑھ کا اقتصادی مقاطعہ شروع کر دیا گیا۔ ہندوستان سے ریلوے مواصلات منقطع کر دیے گئے۔ ان اقدامات کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسٹم اور ریلوے کی مد ول سے جوناگڑھ کے وسائلِ آمدنی بہت کم ہو گئے، اور خوراک کی کمی بھی سنگین صورت اختیار کر گئی۔ بمبئی میں گاندھی کے ایک بھتیجے سمل داس گاندھی کی صدارت میں جوناگڑھ کی ایک عبوری حکومت قائم کر دی گئی "عبوری حکومت" نے اپنے صدر دفاتر جوناگڑھ سے قریب تر راج کوٹ میں منتقل کر لیے، اس نے رضاکار بھرتی کیے اور جوناگڑھ کی حدود میں حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔

ستمبر اور اکتوبر کے دوران میں ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کے مابین جوناگڑھ کے مسئلے پر بہت خط و کتابت ہوئی اور مشترکہ دفاع کونسل کے کئی اجلاسوں میں بھی اس موضوع پر تبادلۂ خیالات کیا گیا۔ ایک پیچیدگی یہ تھی کہ جوناگڑھ ریاست کے بعض حصے یا زیرِ اقتدار علاقے مملکتِ ہندوستان سے گھرے ہوئے تھے۔ ان علاقوں کی آئینی حیثیت پر بہت بحث مباحثہ ہوا لیکن پاکستان اس مسئلے پر

غیر جانبدارانہ قانونی رائے لینے کے لیے تیار تھا۔ پاکستان اس بات پر بھی رضامند تھا کہ جہاں الحاق متنازعہ ہو وہاں استصواب کرالینا چاہیئے۔ ۴ ۲ اکتوبر کو وزیر اعظم پاکستان نے وزیر اعظم ہندوستان کو یہ تجویز پیش کی کہ دونوں حکومتوں کو شرائط استصواب پر تبادلۂ خیالات کر کے انہیں طے کر لینا چاہیئے۔

لیکن حکومتِ ہندوستان اس معاملے کو بزورِ طاقت طے کرنے پر تُلی ہوئی تھی۔ محاصرے اور حملوں نے اکتوبر ۱۹۴۷ء کے اخیر تک جونا گڑھ میں اتنی افراتفری پیدا کر دی کہ نواب اپنے خاندان کے ساتھ کراچی آنے پر مجبور ہوگیا۔ یکم نومبر کو ہندوستانی فوجوں نے بابریاواد اور منگرول کے گھرے ہوئے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ اس سے چند دن پہلے ہندوستان نے مناودار پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ ۹ نومبر کو بیس ہزار سپاہیوں کی ایک "آزاد فوج" جو بکتر بند گاڑیوں اور جدید ہتھیاروں سے لیس تھی، جونا گڑھ میں داخل ہوگئی۔ یہ فوج بیشتر تربیت یافتہ فوجیوں پر مشتمل تھی جنہیں حکومتِ ہندوستان کے حکم سے منظم اور مسلح کیا گیا تھا۔ دو دن کے بعد ہندوستان نے ساری ریاست کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس وقت پاکستان کسی طرح جونا گڑھ کا دفاع نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی افواج تنظیم کے مرحلے سے گزر رہی تھیں۔ بری فوج ان لاتعداد مسائل کے حل میں مصروف تھی جو مہاجرین کی نقل و حرکت سے پیدا ہو گئے تھے۔ بحریہ اور فضائیہ محض ابتدائی شکل میں تھیں۔

حکومتِ پاکستان کو وزیر اعظم ہندوستان کی طرف سے ایک تار موصول ہوا جس میں یہ کہا گیا کہ حکومتِ ہندوستان نے ریاست جونا گڑھ کا انتظام اس کے دیوان کی درخواست پر سنبھال لیا ہے تاکہ بدنظمی اور افراتفری نہ ہو۔ نیز یہ کہ وہ الحاق کے بارے میں لوگوں کی خواہشات معلوم کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ وزیر اعظم پاکستان نے اس تار کا یہ جواب دیا کہ جونا گڑھ نے چونکہ پاکستان سے باضابطہ طور پر الحاق کر لیا تھا، اس لیے اس کے دیوان کو ہندوستان کے ساتھ تصفیہ کرنے کا کوئی اختیار نہیں تھا اور ہندوستان کے اس اقدام سے پاکستان کے علاقے اور بین الاقوامی قانون کی صریح بے حرمتی ہوئی ہے۔ وزیر اعظم پاکستان نے مطالبہ کیا کہ حکومت ہندوستان جونا گڑھ سے فی الفور اپنی فوجیں واپس بلالے اور دونوں مملکتوں کے مابین مذاکرات سے پہلے ریاست کے جائز حکمران کی حکومت بحال کر دے۔ مزید خط و کتابت سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ چند ماہ بعد حکومت ہندوستان نے اپنے ہی زیر اہتمام استصواب کرایا۔ استصواب کا نتیجہ پہلے ہی نظر آ رہا تھا۔ اکثریت نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے حق میں ووٹ دئیے۔ پاکستان نے،

جس کا استصواب سے کوئی بھی واسطہ نہیں تھا' اسے ناجائز قرار دیا۔ ہندوستان کا اب تک جونا گڑھ پر غیر قانونی قبضہ ہے۔ پاکستان نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل سے جو شکایت کی تھی وہ ابھی تک معلق ہے۔

حیدر آباد ہند کی سب سے اہم ریاست تھی۔ اس کا رقبہ ۸۲ ہزار مربع میل اور آبادی ایک کروڑ ۶۰ لاکھ تھی۔ اس کی سالانہ آمدنی ۲۶ کروڑ روپے تھی' اور اس کی اپنی کرنسی اور ڈاک کے ٹکٹ تھے۔ اس کی آبادی کی اکثریت ہندو تھی لیکن اس کا حکمران ــــ نظام ــــ مسلمان تھا۔ حکمران خاندان کی بنیاد اٹھارھویں صدی کے آغاز میں مغل سلطنت کے ایک امیر کبیر نظام الملک نے رکھی تھی۔ نظام کو "ہزایگزالٹڈ ہائی نس" کا امتیازی خطاب حاصل تھا اور اسے "یار وفادار سلطنت انگلشیہ" کہا جاتا تھا۔ سلطنتِ مغلیہ کے جاہ و جلال سے پیوستگی کی وجہ سے مسلمانانِ ہند کے دلوں میں حیدر آباد کے لیے ایک خاص مقام تھا۔ اپنے رقبہ' وسائل' اہمیت اور سطوت کے اعتبار سے حیدر آباد کی ریاست اپنے آپ کو ایک آزاد و خود مختار مملکت کی حیثیت کا حق دار سمجھتی تھی۔ ۳ جون کے منصوبہ کے اعلان کے بعد نظام نے یہ اعلان کیا کہ وہ نہ ہندوستان سے الحاق کرے گا اور نہ پاکستان سے۔ اسے اپنی ریاست کے لیے ڈومینین کا درجہ حاصل کر لینے کی توقع تھی' چنانچہ اس نے ۱۱ جولائی ۱۹۴۷ء کو ایک وفد وائسرائے کے پاس بھیجا۔ مونٹ بیٹن نے وفد کو بتایا کہ حکومتِ برطانیہ حیدر آباد کو ڈومینین کا درجہ دینے پر آمادہ نہیں ہو گی۔ اس کے برعکس اس نے حیدر آباد پر ہندوستان سے الحاق کرنے کے لیے زور دیا۔ لیکن یہ بات نظام کے لیے قابلِ قبول نہیں تھی۔ جب وفد کی طرف سے اشارۃً یہ کہا گیا کہ اگر ہندوستان نے نظام پر بہت زیادہ دباؤ ڈالا' تو پھر وہ پاکستان سے الحاق کرنے پر بھی غور کر سکتا ہے' تو مونٹ بیٹن نے یہ جواب دیا: "اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ قانونی طور پر نظام کو یہ حق حاصل ہے لیکن جغرافیائی حقائق کی وجہ سے جو مشکلات درپیش ہیں وہ بہت ٹھوس ہیں۔ کوئی دھمکی دئے بغیر اس نے یہ پیشگوئی کی کہ اگر اس کے مشورہ کو قبول نہ کیا گیا تو پانچ یا دس سال کے اندر ریاست کو تباہ کن نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا"[۲۲]۔ مونٹ بیٹن جن جغرافیائی حقائق کی طرف اشارہ کر رہا تھا وہ یہ تھے کہ حیدر آباد کو سمندر تک کوئی راستہ نہ تھا اور یہ ریاست چاروں طرف سے ہندوستانی علاقے سے گھری ہوئی تھی۔

۱۵ اگست تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ ہندوستانی کابینہ نے مزید گفت و شنید کا کام گورنر جنرل لارڈ مونٹ بیٹن کے سپرد کر دیا' جس نے حیدر آباد کو ہندوستان کا حلقہ بگوش کرنے کے لیے سرتوڑ کوشش

کی۔ نظام کو الحاق کی مقررہ دستاویز پر دستخط کرنا گوارا نہیں تھا لیکن دفاع، امورِ خارجہ اور مواصلات کے معاملات میں وہ ہندوستان کے ساتھ معاہدۂ اشتراک کر لینے پر آمادہ تھا۔ حکومتِ ہندوستان کے ساتھ مذاکرات میں نظام کا مشیرِ خاص سر والٹر (بعد میں لارڈ) مانکٹن تھا، جو مونٹ بیٹن کا دوست تھا۔ لیکن حکومتِ ہندوستان نے الحاق پر اصرار کیا، اور اس کے سوا کوئی دوسری صورت قبول نہ کی۔

حیدرآباد میں مسلمانوں کی تنظیم اتحاد المسلمین اور اس کے رہنما قاسم رضوی کی طاقت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ نومبر ۱۹۴۷ء کے اواخر میں ان کی تائید سے میر لائق علی جو حیدرآباد کے ایک ممتاز مسلمان صنعت کار تھے، وزیرِ اعظم بن گئے۔ اگرچہ جب نظام نے اس معاملہ میں قائدِ اعظم سے مشورہ چاہا تھا تو انہوں نے اس تقرر کے خلاف مشورہ دیا تھا۔ ؎ ہندوستان کی طرف سے حیدرآباد کو جو مشکلات درپیش تھیں ان کے بارے میں پاکستان کے لیڈروں کو حیدرآباد کے ساتھ پوری ہمدردی تھی لیکن ان کا خیال تھا کہ ہندوستان اور حیدرآباد کے باہمی تعلقات کی نوعیت کو نظام اور اس کی صوابدید پر ہی چھوڑ دینا چاہیئے۔

ہندوستان اور حیدرآباد کے درمیان ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو ایک اقرار نامہ طے ہوا جس کے تحت ان کے موجودہ روابط بدستور برقرار رہنے تھے۔ نظام نے بطیب خاطر مونٹ بیٹن سے یہ وعدہ بھی کیا کہ پاکستان سے الحاق نہیں کرے گا۔ ؎ حکومتِ ہندوستان نے یہ دعویٰ کیا کہ اس اقرار نامے کے تحت حیدرآباد کسی غیر ملک کے ساتھ کوئی تعلقات قائم نہیں کر سکتا چنانچہ نظام کی حکومت نے پاکستان کو ۲۰ کروڑ روپے کا جو قرضہ دیا تھا اس پر بڑی لے دے کی گئی۔ اگرچہ حیدرآباد والے یہ عذر پیش کرتے رہے کہ یہ ایک تجارتی معاملہ تھا۔ یہ قرضہ حکومتِ ہند کے تمسکات کی صورت میں تھا۔ ان کی وصولی سے پاکستان کو محروم کرنے کے لیے حکومتِ ہندوستان نے ایک آرڈی نینس جاری کر کے ان تمسکات کو غیر منتقل کر دیا۔

اقرار نامہ کے تحت سردار پٹیل نے حیدرآباد میں حکومتِ ہندوستان کے ایجنٹ جنرل کے طور پر کے۔ ایم منشی کو منتخب کیا۔ وہ بمبئی کا ایک سابق وزیر اور اکھنڈ بھارت کا سرگرم حامی تھا۔ اس نے اپنا یہ فرض سمجھا کہ ہندوؤں کو اکسا کر یا جس طرح بھی بن پڑے نظام کے اقتدار کو ضعف پہنچایا جائے۔ حیدرآباد پر اقرار نامہ کی خلاف ورزی کرنے کے الزامات لگائے گئے، لیکن جب نظام کی حکومت نے اقرار نامہ کی دفعات کے تحت اس معاملے کا ثالثی فیصلہ کروانے کی پیشکش کی تو حکومتِ ہندوستان رضامند نہ ہوئی۔

نظام سے اتحاد المسلمین کو خلافِ قانون قرار دینے اور رضا کاروں کی تنظیم ختم کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ جنگ کی دھمکیاں بھی دی گئیں۔ ۲۶ اپریل ۱۹۴۸ء کو بمبئی میں تقریر کرتے ہوئے نہرو نے کہا "رضا کاروں کی سرگرمیوں سے اگر حیدر آبادی عوام کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہوا تو حکومتِ ہندوستان لازماً حیدر آباد ریاست میں مداخلت کرے گی"۔[۶] پٹیل حیدر آباد کو جونا گڑھ کا انجام یاد دلاتا تھا۔ الغرض حکومتِ ہندوستان نے نظام کو ہندوستان سے الحاق پر مجبور کرنے کے لیے ہر طرح کا دباؤ ڈالا۔

ماؤنٹ بیٹن اور ہندوستانی لیڈروں کا یہ خیال تھا کہ حیدر آباد کی ساری ہندو آبادی ہندوستان سے الحاق کے حق میں ہے۔ وہ بار بار اس بات پر زور دیتے تھے کہ حیدر آباد کے مسئلے کا فیصلہ عوام پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں ماؤنٹ بیٹن نے نظام کو ایک خط میں "انگریز افسروں کی زیر نگرانی استصواب" کی پیشکش کی تھی لیکن نظام نے اسے قبول نہیں کیا تھا۔[۷] لیکن جون ۱۹۴۸ء میں میر لائق علی نے ماؤنٹ بیٹن کی تجویز منظور کر لی یعنی غیر جانبدارانہ سرپرستی میں آزادانہ استصواب کرا لیا جائے کہ آیا ریاست کو ہندوستان کے ساتھ الحاق کرنا چاہیئے یا آزاد رہنا چاہیئے۔ میر لائق علی کو یہ دیکھ کر سخت تعجب اور رنج ہوا کہ اب حکومتِ ہندوستان کی طرف سے یہ اصرار کیا جا رہا تھا کہ دفاع، امورِ خارجہ اور مواصلات کے معاملات میں ریاست کو ہندوستان سے لازماً الحاق کر لینا چاہیئے اور اس کے بعد "اگر حکومتِ حیدر آباد کی خواہش ہو تو وہ اس مسئلہ کی استصواب سے مزید تصدیق کرا سکتی ہے"۔[۸] یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ حیدر آباد میں فوراً ذمہ دار حکومت قائم کی جائے کیونکہ جیسا کہ حکومتِ ہندوستان نے حیدر آباد کے بارے میں اپنے قرطاس ابیض میں کہا "ایک ایسی عبوری حکومت کے بغیر جو حیدر آباد کی آبادی کی اکثریت کی نمائندہ ہو اور ان کے لیے اطمینان بخش ہو، استصوابِ عوام سے محض فریب ہوگا"۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن حیدر آباد کے الحاق سے متعلق اپنی دلی آرزو پوری کیے بغیر ۲۱ جون ۱۹۴۸ء کو ہندوستان سے رخصت ہو گیا۔ حیدر آباد پر دباؤ شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ اقتصادی محاصرہ بھی کیا گیا اور فوجی تیاریاں بھی شروع کر دی گئیں۔ دونوں طرف سے سرحدوں کے آر پار حملوں اور اقرار نامہ کی خلاف ورزیوں کے الزامات لگائے گئے۔ ۳۰ جولائی کو ونسٹن چرچل نے پارلیمنٹ میں بحث کے دوران نہرو کی ایک تقریر کا حوالہ دیا، جو اس نے چار دن قبل کی تھی، اور جس میں نہرو سے یہ الفاظ منسوب کیے گئے تھے "اگر اور جب بھی ہم نے ضروری سمجھا، ہم حیدر آباد کے خلاف فوجی کارروائی شروع کر دیں گے"۔ نہرو نے آگے چل کر

یہ بھی کہا تھا کہ ریاست کی حکومت غنڈوں کے ہاتھ میں ہے اور الحاق کا واحد بدل یہ ہے کہ حیدرآباد بطور ریاست بالکل معدوم ہو جائے' اور اس صورت میں حیدرآباد کے خلاف کارروائی کو جنگ کا نام نہیں دیا جائے گا۔ اس پر چرچل نے یہ رائے زنی کی کہ "میرے خیال میں ہٹلر نے آسٹریا کو نگل جانے سے پہلے کچھ ایسی ہی بات کہی ہوگی"۔

۲۴ راگست کو حیدرآباد نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں ایک شکایت دائر کی' لیکن پیشتر اس کے کہ سلامتی کونسل اس کی سماعت کا انتظام کرتی' ہندوستان نے فوجی طاقت سے حیدرآباد کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ قائداعظم کے انتقال کو ابھی دو دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ ۱۳ ستمبر ۱۹۴۸ء کو ہندوستان کی افواج نے ریاست حیدرآباد پر بھرپور حملہ کیا۔ مختصر مزاحمت کے بعد حیدرآباد کی فوج نے ۱۷ ستمبر کو ہتھیار ڈال دیئے رفتہ رفتہ ریاست کے حصے بخرے کر دیئے گئے اور انہیں ہندوستان کے مختلف صوبوں میں ضم کر دیا گیا۔ سلامتی کونسل سے جو شکایت کی گئی تھی' وہ ابھی تک "زیر غور" ہے۔

کشمیر جس کا مکمل نام ریاست جموں و کشمیر ہے' برصغیر پاکستان و ہندوستان کا شمالی ترین حصہ ہے اس کا رقبہ ۸۴،۴۷۱ مربع میل ہے' اور اس لحاظ سے یہ ہند کی سب سے بڑی ریاست تھی۔ اس کی بین الاقوامی سرحدیں تبت' چین' افغانستان اور ایک مختصر حائل علاقہ سے قطع نظر روس سے ملتی ہیں' جن سے اسے فوجی اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ پہاڑی علاقہ ہونے کے باعث کشمیر کی حسین وادی کے سوا باقی ریاست میں آبادی بہت چھدری ہے۔ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق ریاست کی مجموعی آبادی چالیس لاکھ تھی' جن میں سے ۷۷ فی صد مسلمان تھے۔ مسلمان ریاست کے ہر صوبہ میں اکثریت میں تھے۔ صوبہ کشمیر میں مسلمانوں کی آبادی ۹۳ فی صد تھی' صوبہ جموں میں ۶۱ فی صد اور گلگت کے شمالی علاقہ میں تقریباً سو فی صد' تبت سے ملحق لداخ میں بدھ مت کے پیروکاروں کی تھوڑی سی آبادی تھی۔

جغرافیائی اعتبار سے یہ ریاست مغربی پاکستان کے میدانوں کو سلسلہ ہائے کوہ تک لے جاتی ہے۔ سندھ' جہلم اور چناب جو مغربی پاکستان کے لیے آب حیات کا درجہ رکھتے ہیں' ریاست سے بہتے ہوئے مغربی پاکستان کے میدانوں میں داخل ہوتے ہیں اور اس سارے علاقے کو ایک ہی جغرافیائی وحدت بنا دیتے ہیں۔ ریاست کی سڑکوں اور ریلوے کے تمام مواصلات مغربی پاکستان سے آ ملتے تھے۔ اس کی درآمدات اور برآمدات پاکستان سے گزر کر جاتی تھیں۔ ریاست کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ عمارتی

لکڑی تھی' جو دریاؤں میں بہا کر پاکستان کو برآمد کی جاتی تھی۔ ریاست اور مغربی پاکستان کے مسلمانوں میں ثقافتی روابط اتنے گہرے ہیں کہ وہ عملی طور پر ایک ہی ہیں۔ دستِ قدرت نے مغربی پاکستان اور کشمیر کا رشتہ ایک دوسرے سے باندھ دیا ہے اور ان کے معاشی' مذہبی اور ثقافتی اور دفاعی مفادات سب کے سب یکساں ہیں۔

۱۸۴۶ء کے معاہدہ امرتسر کے تحت انگریزوں نے ریاست جموں و کشمیر کو ایک ڈوگرہ سردار گلاب سنگھ کے ہاتھ ۷۵ لاکھ روپے کے عوض بیچ دیا تھا۔ اس معاہدہ کے لیے بات چیت لارڈ لارنس نے کی تھی۔ اس نے بھی اس سودے کو "کاربد" قرار دیا تھا۔ مہاراجہ اور اس کے ڈوگرہ رشتہ داروں نے ریاست میں ایک مستبدانہ' رجعت پسندانہ اور ظالمانہ حکومت قائم کی' جو ایک صدی تک برقرار رہی۔ ریاست کے قدرتی وسائل کو ترقی دینے کی کوئی کوشش نہ کی گئی۔ لوگوں پر بے رحمی سے ٹیکس لگائے گئے اور انہیں فقر و غربت کی پستیوں میں گرا دیا گیا۔ ہر شعبہ میں مسلمانوں کے ساتھ ناروا امتیازی سلوک کیا گیا۔ ریاست کی ملازمتوں میں ہندوؤں کو کم و بیش مکمل اجارہ داری حاصل تھی۔ چونکہ گائے ہندوؤں کے نزدیک متبرک ہے' اسے ذبح کرنا خلافِ قانون قرار دیا گیا۔ اگر کوئی مسلمان اپنے کنبہ کو کھلانے کے لیے بھی اپنی گائے ذبح کرتا تو اسے سزائے موت دی جاتی۔ بعد میں ترحم خسروانہ سے اس سزا کو گھٹا کر دس سال قید کر دیا گیا! اہل کشمیر کو قدرت نے بڑی صلاحیتیں عطا کی ہیں لیکن مسلسل ظلم و ستم سے ان کی روح کچل دی گئی۔

جدید تعلیم کے فروغ سے ۱۹۳۰ء کے بعد بنیادی سیاسی حقوق کا مطالبہ شروع ہو گیا۔ اس تحریک کے رہنما شیخ محمد عبداللہ اور چودھری غلام عباس تھے۔ اوّل الذکر کا تعلق وادیٔ کشمیر اور مؤخرالذکر کا جموں سے تھا۔ دونوں نے مل کر جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی تنظیم کی۔ مہاراجہ نے سخت جابرانہ اقدامات کیے۔ گرفتاریاں ہوئیں اور گولیاں برسانے تک نوبت پہنچی۔ اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کرنے کے لیے پنجاب کے قریبی علاقوں سے مسلمان جوق در جوق ریاست میں داخل ہو گئے۔ ۴۰ ہزار رضاکاروں نے اپنے آپ کو قید کے لیے پیش کیا۔ لاہور میں اہل کشمیر کی جدوجہد کی حمایت کے لیے قومی شاعر علامہ اقبال کی صدارت میں ایک کشمیر کمیٹی قائم کی گئی۔ اقبال کے آباؤ اجداد کشمیر سے آ کر پنجاب میں آباد ہوئے تھے۔ اس جدوجہد کا نتیجہ نکلا کہ حکومتِ ہند نے گلانسی کمیشن مقرر کیا جس کی سفارش پر کچھ آئینی اصلاحات کا اجرا عمل میں آیا اور جزوی طور پر منتخب مجلس قانون ساز قائم

کردی گئی۔

۱۹۳۹ء میں شیخ عبداللہ پر گاندھی اور نہرو کا جادو چل گیا۔ کانگرسی لیڈروں نے انہیں یقین دلایا کہ اگر مسلم کانفرنس کو غیر فرقہ وارانہ تنظیم بنا دیا جائے تو وہ مہاراجہ کے خلاف جدوجہد میں ان کی مدد کریں گے چنانچہ مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کر دیا گیا۔ لیکن بہت ہی جلد مسلمانوں اور ہندوؤں کے مفادات میں اختلاف منظر عام پر آ گیا۔ آزاد و خود مختار پاکستان کے مطالبے نے ایک نئی صورت حال پیدا کر دی۔ پاکستان کے نام اور تصور میں کشمیر بطور جزو لاینفک شامل تھا چنانچہ کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان تقسیم ہند کے مسئلے پر کشمکش سے کشمیر بھی متاثر ہوا اور چودھری غلام عباس کی قیادت میں مسلم کانفرنس کو بحال کر دیا گیا۔ شیخ عبداللہ نیشنل کانفرنس سے ہی اس کے لیڈر کے طور پر وابستہ رہے۔ جوں جوں پاکستان کے نظریہ کو قبول عام ملا۔ ہندو کانگرس کی حلیف نیشنل کانفرنس کی ہر دلعزیزی گھٹنے لگی۔ اس حقیقت کو بھانپ کر شیخ عبداللہ نے قائداعظم سے رجوع کیا۔ ۱۹۴۴ء میں نیشنل کانفرنس اور مسلم کانفرنس دونوں کی دعوت پر قائداعظم نے کشمیر کا دورہ کیا۔ انہوں نے دونوں جماعتوں کو متحد کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ شیخ عبداللہ کا کانگرسی لیڈروں کے ساتھ بہت کچھ قول قرار ہو چکا تھا۔ خاص طور پر نہرو ان کی بہت آؤ بھگت کرتا تھا اور ان کی دوستی کا دم بھرتا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں جب شیخ عبداللہ نے مہاراجہ سے گلو خلاصی کے لیے "کشمیر چھوڑ دو" تحریک شروع کی اور مہاراجہ نے انہیں جیل میں ڈال دیا تو نہرو اپنے دوست کے دفاع کے لیے کابینہ مشن کے ساتھ مذاکرات کو بیچ میں چھوڑ کر کشمیر دوڑا گیا۔ اس ڈرامائی مظاہرے کا مقصد شیخ عبداللہ کی کانگرس کے ساتھ وابستگی کو مضبوط تر کرنا تھا۔

جب کانگرسی لیڈروں نے تقسیم ہند کو قبول کیا تو ان کی نیت یہ تھی کہ جہاں "تک ممکن ہو سکے پاکستان کی قطع و برید کی جائے اور اسے زندہ رہنے کے قابل نہ چھوڑا جائے۔ انہوں نے شمال مغربی سرحدی صوبہ کو پاکستان سے علیحدہ کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن اس صوبے کا ہندوستان کے ساتھ اتصال کا کوئی راستہ نہیں تھا الا بواسطہ کشمیر۔ گاندھی اور دوسرے کانگرسی لیڈروں نے شمال مغربی سرحدی صوبے کو پاکستان میں شامل ہونے سے روکنے کے لیے جو انتہائی کوششیں کیں ان کی لم اسی صورت میں سمجھ آ سکتی ہے جب انہیں ایک ایسی وسیع چال کا جزو سمجھا جائے جو کشمیر اور سرحدی صوبہ دونوں پر حاوی تھی لیکن شمال مغربی سرحدی صوبہ سے قطع نظر کشمیر کو بجائے خود بھی بڑی اہمیت حاصل تھی۔ کشمیر

پر قبضہ کرنے سے وہ تمام دریا ہندوستان کے قابو میں آجاتے تھے جن پر مغربی پاکستان کی معیشت کا انحصار تھا اور پاکستان کے نہایت اہم علاقے فوجی اعتبار سے غیر محفوظ ہو جاتے تھے۔ گاندھی کو پورا اندازہ تھا کہ کشمیر "شاید ہند بھر میں سب سے زیادہ جنگی اہمیت رکھتا ہے"۔ شیخ عبداللہ نے ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دہلی میں ایک اخباری بیان میں یہ رائے ظاہر کی "فوجی نقطۂ نظر سے ریاست کشمیر کو اتنا اہم مقام حاصل ہے کہ اگر یہ ریاست ہندوستانی ڈومینین میں شامل ہو جاتی ہے تو اس کی بدولت پاکستان مکمل طور پر گھیرے میں آجائے گا"۔ غرض حصولِ کشمیر سے ہندوستان کو پاکستان کے مقابلے میں بالادستی کا مقام مل جاتا۔

کشمیر کے متعلق کانگرسی لیڈر اپنے منصوبے کو سرِدست اس لیے ظاہر نہیں کر رہے تھے کہ حیدرآباد کا معاملہ ابھی طے نہیں ہوا تھا۔ اپنی بدرجہا بہتر انتظامیہ سے قطع نظر حیدرآباد کا معاملہ کشمیر سے بالکل برعکس تھا۔ اوّل الذکر ہندو اکثریت کی ریاست تھی جس کا حکمران مسلمان تھا جبکہ مؤخر الذکر مسلم اکثریت کی ریاست تھی جس کا حکمران ہندو تھا۔ ریاست حیدرآباد کو دکن یا جنوبی ہندوستان میں مرکزی حیثیت حاصل تھی اور کم و بیش وہ ہندوستان کے لیے اسی طرح اہم تھی جس طرح کشمیر پاکستان کے لیے۔ اگر حیدرآباد کا معاملہ طے ہونے سے پہلے کشمیر کی مسلم اکثریت والی ریاست کا ہندو مہاراجہ ہندوستان سے الحاق کر لیتا، تو حیدرآباد پر بحیثیت ہندو اکثریت والی ریاست کے کانگرس کا دعویٰ کمزور ہو جاتا، اور ممکن تھا کہ نظام حیدرآباد پاکستان سے الحاق کر لیتا۔ کانگرس کا منصوبہ یہ تھا کہ کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کے لیے مہاراجہ سے خفیہ مفاہمت کر لی جائے، اور اس وقت تک کھلم کھلا الحاق کو منظور نہ کیا جائے جب تک حیدرآباد ہندوستان کی آغوش میں نہ آجائے۔ تقسیم کے ایام میں مجھے کانگرس کے اس منصوبہ پہلے حیدرآباد اور پھر کشمیر کے بارے میں ایک قابلِ اعتماد ذریعہ سے اطلاع ملی تھی اور ہندوستانی لیڈروں کے رویہ اور سرگرمیوں نے اس کی تصدیق کر دی۔

تقسیم کے ایام میں کشمیر کے بارے میں ہندوستانی لیڈروں کی بظاہر بے التفاتی کی ایک اور وجہ ہندوستانی ڈومینین اور ریاست جموں و کشمیر کے مابین مواصلات کا فقدان تھا۔ دونوں میں مشترکہ سرحد اونچے پہاڑوں میں سے گزرتی تھی، جہاں کوئی سڑک نہیں تھی۔ اگرچہ جیسا کہ قبل ازیں دسویں باب میں بیان کیا جا چکا ہے، ماؤنٹ بیٹن اور کانگرسی لیڈروں کے درمیان ضلع گورداسپور کو تقسیم کرنے کے بارے

میں مفاہمت ہو چکی تھی، لیکن اس وقت تک کوئی علانیہ اقدام نہیں کیا جا سکتا تھا جب تک ریڈ کلف ضلع گرداسپور کی مسلم اکثریت والی تحصیلیں (گورداسپور اور بٹالہ) ہندوستان کے حوالے نہ کر دیتا اور اس طرح ہندوستان اور کشمیر میں رابطہ کا ذریعہ بہم نہ پہنچا دیتا۔

اس اثنا میں کانگرسی لیڈروں نے کشمیر کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے بہت جتن کیے۔ سب سے پہلے اچاریہ کرپلانی نے، جو اس زمانے میں کانگرس کا صدر تھا، کشمیر کا دورہ کیا۔ ۳ جون کے منصوبہ کے اعلان کے فوراً بعد نہرو نے وہاں جانے کی خواہش ظاہر کی۔ جب مہاراجہ نے اس پر اعتراض کیا، تو گاندھی نے کہا کہ نہرو کے بجائے وہ جائے گا خواہ اپنی ذاتی حیثیت میں ہی سہی۔ مہاراجہ کو یہ اندیشہ تھا کہ نہرو اور گاندھی کے دوروں کے باعث کہیں قائداعظم کے دورۂ کشمیر تک نوبت نہ پہنچ جائے۔ وہ کسی مسلم لیگی لیڈر کے کشمیر جانے کے سخت خلاف تھا۔[۵۵] نہرو یا گاندھی کے دورہ کا معاملہ مونٹ بیٹن کی وساطت سے کیا جا رہا تھا، چنانچہ اس نے خود ہی سب سے پہلے کشمیر جانے کا فیصلہ کیا۔

جون ۱۹۴۷ء کے تیسرے ہفتے میں مونٹ بیٹن نے کشمیر میں چار دن بسر کیے۔ اس دوران میں وہ مہاراجہ کے ساتھ صورتِ حال پر بات چیت کرتا رہا۔ چونکہ نہرو اور گاندھی دونوں اس بارے میں بہت فکرمند تھے کہ کہیں مہاراجہ آزادی کا اعلان نہ کر دے، مونٹ بیٹن نے مہاراجہ اور اس کے وزیر اعظم پر زور دیا کہ "آزادی کا اعلان نہ کریں، بلکہ حتی الوسع جلد از جلد کسی نہ کسی طرح کشمیر کے لوگوں کی مرضی معلوم کریں، اور اس کے مطابق ۱۴ اگست تک کسی ایک آئین ساز اسمبلی میں اپنے نمائندے بھیجنے کا اعلان کر دیں۔ اس نے انہیں بتایا کہ ریاستوں کا محکمہ، جو ابھی قائم ہوا ہے یہ یقین دلانے کے لیے تیار ہے کہ اگر کشمیر نے پاکستان سے الحاق کیا تو حکومت ہندوستان اسے مخالفانہ اقدام نہیں سمجھے گی۔ اس نے تاکید کی تھی کہ اگر انتقالِ اقتدار سے پہلے کشمیر نے دونوں میں سے کسی ایک ڈومنین کی حمایت حاصل نہ کی تو وہ خطرے میں پڑ جائے گا"۔[۵۶] حقیقت یہ ہے کہ ریاستوں کا محکمہ مونٹ بیٹن کی کشمیر سے واپسی کے کئی دن بعد قائم ہوا۔ لیکن مہاراجہ کے ساتھ مذکورہ بالا گفتگو کی تفصیل مونٹ بیٹن نے خود اپنے پریس اتاشی کیمبل جانسن کو بتائی۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو مونٹ بیٹن نے رایل ایمپائر سوسائٹی کے اجلاس میں جو تقریر کی اس سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس تقریر میں مونٹ بیٹن نے تفصیل سے بتایا کہ اس نے کس طرح مہاراجہ پر زور دیا تھا کہ ایک یا دوسری ڈومنین میں شامل ہونے کے لیے وہ اپنے عوام کی مرضی معلوم کرے۔ اگر وہ پاکستان میں شامل ہو جاتا تو حکومت

ہندوستان کوئی جھگڑا کھڑا نہ کرتی۔ اگر وہ ہندوستان میں شامل ہو جاتا تو اس وقت پاکستان ابھی معرضِ وجود میں ہی نہیں آیا تھا' اس لیے اس صورت میں بھی کوئی فساد نہ ہوتا۔"

تقسیم کے ان نازک ایام میں کشمیر کے الحاق کے بارے میں مونٹ بیٹن کا رویہ بحیثیت وائسرائے غور طلب ہے۔ کسی مرحلے پر بھی اس نے مہاراجہ کو یہ نہ بتایا کہ جغرافیائی اور دفاعی عوامل اور ریاست میں مسلمانوں کی غالب آبادی کے پیشِ نظر اس کا صریح فرض یہ ہے کہ وہ پاکستان سے الحاق کرے۔ حیدر آباد جے پور اور جیسلمیر کے سامنے اس نے جو دلائل ہندوستان سے الحاق کے لیے پورے زور سے پیش کئے' کشمیر کے پاکستان سے الحاق کے لیے بھی ان کا بہمہ وجوہ اطلاق ہوتا تھا۔ اس کے برعکس اس نے مہاراجہ کو یقین دلایا کہ اگر وہ ۱۵ اگست سے قبل کسی ایک ڈومینین سے الحاق کر لے گا تو کوئی دقت نہیں ہو گی کیونکہ وہ جس ڈومینین سے بھی الحاق کرے گا' وہ پورے طور پر اس کی حفاظت کی ذمہ داری سنبھال لے گی۔"[۱۲] یہ یقین دہانی جون ۱۹۴۷ء میں کی گئی جب کہ — اگر یہ فرض کیا جائے کہ سرحدوں کا ثالثی فیصلہ غیر جانبدارانہ ہو گا — ہندوستان کے کشمیر کے ساتھ کوئی مواصلات نہ تھے اور دفاع' امورِ خارجہ اور مواصلات کے لئے ہندوستان سے ریاست کا الحاق بے معنی تھا۔

مونٹ بیٹن ریاست کشمیر میں مسلم اکثریت کو آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا' لیکن اس نے خود واضح نتیجہ اخذ کرنے کی بجائے معاملہ مہاراجہ پر چھوڑ دیا۔ حیدر آباد اور ہندو اکثریت کی دوسری ریاستوں کے معاملے میں' جن کے حکمران مسلمان تھے' اس نے ہندوستان سے فوری الحاق کے حق میں واشگاف مشورہ دیا تھا صرف کشمیر کے معاملے میں ہی اس نے یہ مشورہ دیا کہ مہاراجہ اس وقت تک اپنے فیصلہ کا اعلان نہ کرے جب تک وہ کسی نہ کسی طرح لوگوں کی مرضی معلوم نہ کر لے۔

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں اپنی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے مونٹ بیٹن نے کیمبل جانسن کو بتایا کہ "اس نے مہاراجہ کشمیر پر اپنا پورا اثر و رسوخ استعمال کیا تھا کہ وہ اس وقت تک کسی ڈومینین سے الحاق نہ کرے جب تک وہ شورائے عام' استصواب یا انتخابات کے ذریعے اپنے عوام کی مرضی معلوم نہ کر لے اور اگر یہ طریقے ناقابلِ عمل ہوں تو نمائندہ جلسہ ہائے عام کے ذریعے سے۔"[۱۳] لوگوں کی مرضی معلوم کرنے کے معاملے میں بھی ان طریقوں میں واضح تضاد ہے جو مونٹ بیٹن نے حیدر آباد اور کشمیر میں اختیار کئے۔ حیدر آباد میں مونٹ بیٹن نے غیر جانبدارانہ سرپرستی کے تحت آزادانہ استصواب پر اصرار کیا اور اس ضمن میں انگریز افسروں

کی نگرانی میں استصواب کرانے کی پیشکش کی۔ کشمیر میں اس نے ایسی کوئی شرائط عاید نہ کیں اور نہ ہی اس قسم کی کوئی پیشکش کی بلکہ یہ بات مہاراجہ پر چھوڑ دی کہ وہ جس طریق سے چاہے عوام کی مرضی معلوم کرلے۔ غیر جانبدارانہ سرپرستی کے تحت کشمیر میں استصواب یا شورائے عام ہوتا تو مسلمانوں کی بھاری اکثریت اور بعض ہندو بھی پاکستان کے حق میں ووٹ ڈالتے کیونکہ ہندوؤں میں بھی ایسے لیڈر تھے۔ مثال کے طور پر پنڈت پریم ناتھ بزاز' جو صدقِ دل سے یہ یقین رکھتے تھے کہ پاکستان سے الحاق کشمیر کے بہترین مفاد میں ہے۔ لیکن آمرانہ نظام میں عام جلسے منعقد کرنے کے مبہم اور غیر معین طریقے سے مہاراجہ اور اس کی حکومت جو نتیجہ بھی چاہتے اس کا اعلان کرسکتے تھے۔

اس تفصیل سے واضح ہوجاتا ہے کہ اگرچہ مونٹ بیٹن بظاہر غیر جانبداری کا دم بھرتا تھا لیکن درحقیقت وہ کشمیر میں کانگرس کے ڈھب کی چال چل رہا تھا۔ کانگرس کے لیڈروں نے جائز و ناجائز ہر صورت میں کشمیر کو ہتھیانے کے جو منصوبے بنا رکھے تھے۔ مونٹ بیٹن کو ان میں ملوث ہونے کے الزام سے بری الذمہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس نے ہندوستان اور پاکستان کے غیر مساوی دعاوی کو جس طرح ایک ہی سطح پر رکھا اور ہندوستان سے الحاق کی صورت میں مہاراجہ کو حفاظت کا یقین دلایا اور پھر لوگوں کی مرضی معلوم کرنے کے لیے اس نے جو غیر معین طریقہ تجویز کیا' ان سب سے ہندو مہاراجہ نے یہی تاثر لیا ہوگا کہ اگر وہ چاہے تو بہت آسانی سے ہندوستان کے ساتھ الحاق کرسکتا ہے۔

کشمیر کے الحاق کے بارے میں مسلم لیگ کے اندازِ فکر کو قائداعظم نے جولائی ۱۹۴۷ء میں جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے ایک وفد سے بات چیت کے دوران میں واضح کردیا تھا۔ تبادلۂ خیالات کے دوران میں انہوں نے کہا "میں پہلے ہی کئی دفعہ واضح کرچکا ہوں کہ ریاستوں کو ہندوستان یا پاکستان کی آئین ساز اسمبلی میں شامل ہونے یا آزاد رہنے کا پورا حق حاصل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مہاراجہ اور حکومتِ کشمیر اس مسئلے میں پوری توجہ اور غور و فکر سے کام لیں گے اور نہ صرف حکمران کے مفاد کا بلکہ اس کی رعایا کے مفاد کا صحیح اندازہ کریں گے"۔ درحقیقت قائداعظم کو پورا یقین تھا کہ آبادی اور جغرافیہ کے حقائق اور اقتصادی اور ثقافتی روابط بلکہ مہاراجہ کے اپنے خاندان کے مفادات پر بے لاگ غور و فکر کیا جائے گا' تو یہ سب پہلو لازماً پاکستان سے الحاق کی طرف رہنمائی کریں گے۔ انہوں نے سری نگر جانے کی بھی خواہش ظاہر کی' لیکن مونٹ بیٹن نے حکومتِ کشمیر کے اعتراضات کے پیشِ نظر انہیں اس خیال کو

ترک کرنے پر آمادہ کر لیا۔

اگرچہ ماؤنٹ بیٹن نے قائد اعظم کو کشمیر جانے یا کسی اور مسلم لیگی لیڈر کو وہاں بھیجنے کا ارادہ ترک کرنے پر آمادہ کر لیا لیکن اس نے یکم اگست ۱۹۴۷ء کو گاندھی کے دورۂ کشمیر کا انتظام کرا دیا۔ اس جنت نظیر وادی میں گاندھی کی یہ پہلی آمد تھی۔ یہ تو کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ ۷۷ سال کی عمر میں اس طویل سفر کا مقصد جمالیاتی ذوق کی تسکین نہیں تھا۔ گاندھی نے مہاراجہ اور وزیر اعظم سے ملاقات کی، اور نیشنل کانفرنس کے کارکنوں سے، جن میں بخشی غلام محمد بھی شامل تھا، کئی ملاقاتیں کیں۔ اس زمانے میں کشمیر کا وزیر اعظم پنڈت رام چندر کاک تھا، جو اگرچہ ہندو تھا لیکن ریاست کے ہندوستان سے الحاق کا مخالف تھا۔

گاندھی کا مقصد کاک کا اخراج اور مہاراجہ کو ہندوستان سے الحاق کا حامی بنانا تھا چنانچہ اس نے مہارانی کے گرو کے وسیلے سے مہاراجہ کے مذہبی جذبات سے فائدہ اٹھایا۔ مذہب سے شغف رکھنے والے ہندو گاندھی سے جو عقیدت رکھتے تھے، وہ اسے اپنے سیاسی مقاصد کے کام میں لایا۔ جس مہاراجہ کو جوانی کے عالم میں لندن کی ایک فاحشہ نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے بآسانی بلیک میل کر لیا تھا۔ وہ اس سن رسیدگی کے عالم میں اس قسم کے بزرگانہ دباؤ کی تاب کیسے لا سکتا تھا۔

گاندھی کی کامیابی کا اندازہ اس اطلاع سے لگایا جا سکتا ہے، جو اس نے اپنے دورے کے بارے میں نہرو اور پٹیل کو بھیجی: "میں نے مہاراجہ اور مہارانی سے ملاقات کی۔ وہ ہندوستان میں شامل ہونے کے خواہ کس قدر خواہش مند ہوں، انہیں اپنے عوام کی مرضی کے مطابق ہی انتخاب کرنا پڑے گا۔ بخشی غلام محمد تو عوام کے آزادانہ ووٹ کے نتیجہ کے بارے میں از حد پر امید ہے، ووٹ خواہ بالغ رائے دہی کی اساس پر ڈالے جائیں یا موجودہ انتخابی فہرستوں کے مطابق عوام کا فیصلہ کشمیر کے ہندوستان میں شامل ہونے کے حق میں ہو گا۔ بشرطیکہ شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھی قیدیوں کو رہا کر دیا جائے، تمام پابندیاں ختم کر دی جائیں اور موجودہ وزیر اعظم برسر اقتدار نہ رہے۔" تنہا پٹیل کے نام گاندھی نے لکھا کہ مہاراجہ "کاک کو ہٹانا چاہتا ہے۔ اس کے سامنے صرف یہ مسئلہ ہے کہ کس طرح ہٹایا جائے۔ میرے خیال میں کشمیر کے مسئلہ کو حل کیا جا سکتا ہے۔" [۱۵]

گاندھی کے دورۂ کشمیر کے بعد دس دن کے اندر پنڈت کاک کو وزیر اعظم کے عہدہ سے ہٹا دیا گیا۔ ایک ماہ بعد شیخ عبداللہ کو بھی جیل سے رہا کر دیا گیا۔ لیکن چودھری غلام عباس اور مسلم کانفرنس کے دوسرے

رہنما بدستور جیلوں میں رکھے گئے۔ کشمیر کا مسئلہ گاندھی کی حسبِ خواہش حل ہوا جا رہا تھا۔

آزادی کے اعلان کے بعد پاکستان اور کشمیر کے مابین ایک اقرار نامہ پر دستخط ہو گئے۔ جس کے تحت ان کے موجودہ روابط برقرار رہنے تھے۔ اس اقرار نامے کی ریاست کو اس لیے ضرورت تھی کہ ہندوستان کے ساتھ ڈاک اور تار کے مواصلات اور درآمد و برآمد کا انتظام کرنے کے لیے مہلت درکار تھی اور ایک حد تک یہ اقرار نامہ ریاست کے منصوبوں کی پردہ پوشی بھی کرتا تھا۔ حکومتِ کشمیر نے ہندوستان کو بھی ایسے ہی اقرار نامہ کی پیشکش کی لیکن حکومتِ ہندوستان نے اس پر کوئی کارروائی نہ کی۔ جیسا کہ واضح کیا جا چکا ہے یہ بات ہندوستان کے لیے مفید مطلب نہ تھی کہ وہ مناسب وقت سے پہلے کشمیر پر قبضہ کرنے کے لیے کھلم کھلا اقدام کرتا۔

یوم آزادی پر کشمیر کے مسلمانوں نے اپنی خواہشات کا بالکل صاف مظاہرہ کیا۔ ریاست کے طول و عرض میں ۱۵ اگست "یوم پاکستان" کے طور پر منایا گیا۔ لیکن ۱۵ اگست کا دن مہاراجہ کے لیے بھی پیغام لایا کہ وہ مسلم اکثریت کو ختم کرنے کے متعلق اپنے منصوبے پر عمل پیرا ہو جائے۔ اس مسئلے پر مہاراجہ کشمیر کو مشورہ دینے کے لیے کپورتھلہ اور پٹیالہ کے سکھ مہاراجوں نے کشمیر کا دورہ کیا۔ ریاست کپورتھلہ میں مسلمان اکثریت میں تھے لیکن تمام مسلمانوں کو ریاستی فوجوں کی مدد سے ہلاک یا ریاست بدر کر دیا گیا تھا۔ مہاراجہ پٹیالہ نسل کشی میں اس سے بھی بڑا ماہر تھا۔ اگر اسی طرح کے حربے کشمیر میں بھی استعمال کیے گئے اور مسلم آبادی کو ہلاک اور خوفزدہ کر دیا گیا تو پھر ہندوستان سے الحاق میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ اس منصوبہ پر عمل درآمد کے لیے ڈوگرہ جرنیل جنک سنگھ کو پنڈت کاک کی جگہ وزیر اعظم مقرر کر دیا گیا۔ شہری آبادی کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے تمام ہتھیار ریاستی حکام کے پاس جمع کرا دیں۔ سکھوں اور آر۔ ایس۔ ایس کے قاتل گروہوں نے اپنا کام شروع کر دیا اور ریاست کے فوجی دستوں نے بھی ان کی پوری مدد کی۔ مشرقی پنجاب میں جو ہتھکنڈے استعمال کیے گئے تھے ان میں دغابازی کا اضافہ کر دیا گیا۔ مسلمانوں کو پاکستان جانے کے لیے پروانۂ امان دیا جاتا پھر گھات لگا کر ان پر اچانک حملہ کر دیا جاتا اور راستے میں ہی انہیں ذبح کر دیا جاتا۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۸ء کے شمارہ میں لندن ٹائمز نے یہ خبر شائع کی "ایک علاقے میں ۲،۳۷،۰۰۰ مسلمانوں کو بڑے سوچے سمجھے طریقے سے نیست و نابود کر دیا گیا' سوائے ان لوگوں کے جو سرحد کے کنارے کنارے پاکستان بچ نکلے۔ مسلمانوں کا یہ قتلِ عام ڈوگرہ ریاست کی فوجوں

نے کیا' اور مہاراجہ بذاتِ خود ان کی قیادت کر رہا تھا۔ اَین سٹیفنز نے جو اس زمانہ میں کلکتہ کے روزنامہ سٹیٹسمین کا ایڈیٹر تھا' یہ لکھا ہے

"اگست سے لے کر گیارہ ہفتوں کے اندر اسی طرح کی منظم سفاکیوں سے جو اس سے پہلے مشرقی پنجاب' پٹیالہ اور کپورتھلہ میں کی گئی تھیں' جموں وکشمیر سے تقریباً پانچ لاکھ مسلمان آبادی کا صفایا کر دیا گیا۔ دو لاکھ تو ایسے نیست و نابود ہوئے کہ ان کا سراغ تک نہ ملا یا انہیں قتل کر دیا گیا تھا اور زیادہ وبائی بیماریوں اور سردی گرمی سے مر گئے تھے۔ باقی ماندہ تے بالکل بے سروسامانی کی حالت میں مغربی پنجاب میں بھاگ کر جان بچائی"۔[۱۶]

صوبہ جموں کے مغربی حصہ پونچھ میں مہاراجہ کے منصوبوں پر کما حقہ عمل درآمد نہ ہو سکا۔ پونچھ سے افواج ہند کے لیے بھرتی کی جاتی تھی اور وہاں دوسری جنگ عظیم کے سابق فوجیوں کی تعداد ۶۰ ہزار تھی۔ اگست ۱۹۴۷ء کے دوران میں پونچھ کے کئی حصوں میں مہاراجہ کی ہندوستان سے الحاق کی مجوزہ تحریک کے خلاف مظاہرے کیے گئے۔ ان جلسوں پر ریاستی فوجوں نے گولیاں برسائیں' اور بہت سی جانیں تلف ہوئیں۔ یہ لوگ جو عرصہ دراز سے ظلم و ستم سہہ رہے تھے اب مہاراجہ کی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے قبائلی علاقوں سے ہتھیار حاصل کیے اور جوابی جنگ شروع کر دی۔ جس شخص نے علمِ بغاوت بلند کیا وہ سردار عبدالقیوم تھے لیکن "جہاں ایک کنبہ بھی بغاوت میں شریک ہوتا تھا ڈوگرے گاؤں کے گاؤں جلا دیتے تھے"۔ اس حماقت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ساری مسلم آبادی تحریک میں شامل ہو گئی' ۵ تا ۶ ہفتوں کے اندر پونچھ شہر کے سوا پونچھ اور میرپور کے اضلاع ریاستی فوجوں سے بالکل صاف کر دیئے گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک مقامی بیرسٹر سردار محمد ابراہیم کی صدارت میں آزاد کشمیر حکومت کی تنظیم عمل میں آ گئی۔ ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دہلی میں تقریر کرتے ہوئے شیخ عبداللہ نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا کہ کشمیر کے مسلمانوں کو اندیشہ تھا کہ ریاست کا ہندوستان سے الحاق ان کے لیے خطرناک ہو گا۔ اس کے بعد شیخ عبداللہ نے کہا ہ

"پونچھ میں موجودہ خراب حالات کا سبب ریاست کی غیر دانشمندانہ پالیسی ہے۔ پونچھ کے لوگوں نے عوامی شکایات کے ازالے کے لیے تحریک شروع

کی تھی۔ یہ تحریک فرقہ وارانہ نہیں تھی۔ ریاست کشمیر نے وہاں اپنی فوج بھیج دی لیکن پونچھ کی بیشتر بالغ آبادی افواج ہند کے سابق فوجیوں پر مشتمل تھی، جن کے پاکستان کے اضلاع جہلم اور راولپنڈی کے لوگوں سے قریبی تعلقات تھے۔ انہوں نے اپنی عورتوں اور بچوں کو حفاظت کے خیال سے باہر پہنچادیا، سرحد عبور کی اور اسلحہ سے لیس ہو کر واپس آئے جو وہاں کے لوگوں نے بخوشی انہیں دئے تھے۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ ریاست کشمیر کی فوجیں بعض علاقوں سے پسپا ہونے پر مجبور ہو گئی ہیں" ؎

اس زمانے میں حکومتِ پاکستان کو بے پایاں مسائل در پیش تھے۔ اور وہ ایک نئی انتظامیہ کے قیام، پنجاب میں بحرانی صورتِ حال اور عام ترکِ وطن کے مسائل میں پوری طرح منہمک تھی۔ پاکستان کے عوام کو جموں و کشمیر میں اپنے بھائیوں سے انتہائی ہمدردی تھی۔ وہاں جو المیہ ہو رہا تھا، وہ پاکستان کو قائم ہوتے ہی تباہ کر دینے کی وسیع سازش کا حصہ معلوم ہوتا تھا۔ جوں جوں ریاست سے پاکستان کے قریبی علاقوں میں لاکھوں مسلمان مہاجرین آنے لگے، پاکستان کے لیے ایک نیا اور سنگین خطرہ پیدا ہو گیا۔ یہ منظم قتل و غارت مزید فتنہ و شر کی خبر دے رہا تھا۔ پاکستانی فوج کے حکام بھی سخت مضطرب تھے کیونکہ پونچھ میں رخصتیں گزار کر آنے والے سپاہیوں نے اطلاع دی تھی کہ مسلمانوں کے دیہات پر ریاستی فوجیں حملے کر رہی ہیں۔ مہاراجہ کی حکومت سے پر زور احتجاج کئے گئے لیکن اصلاحِ حال کی بجائے ریاستی حکومت نے الٹا پاکستان پر یہ الزام دھرا کہ اس نے خوراک۔ تیل اور دوسری ضروری اشیا کی رسد دیدہ دانستہ روک رکھی ہے۔ یہ الزامات بالکل بے بنیاد تھے۔ لاکھوں مہاجرین کی نقل و حرکت اور ان کی خوراک کی ضروریات پوری کرنے کے باعث پنجاب میں مواصلات اور رسد کے وسائل پر ناقابلِ برداشت بار پڑ گیا تھا۔ ریاست میں اگر کمی محسوس ہو رہی تھی تو اس کی وجہ وہ انتہائی غیر معمولی حالات تھے جو تاریخ میں ترکِ وطن کے سب سے بڑے حادثے سے پیدا ہو گئے تھے۔ بایں ہمہ حکومتِ پاکستان حتی الوسع ہر طرح کی مدد دینے کی خواہاں تھی۔

ستمبر کے وسط میں قائدِ اعظم خود کشمیر جانا چاہتے تھے تاکہ مہاراجہ کے ساتھ دوستانہ بات چیت کر سکیں لیکن مہاراجہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ کشمیر جائیں۔ ۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو لیاقت علی خاں نے یہ تجویز پیش کی کہ کشمیر

کے لیے شہری ضروریات کی رسد کے مسئلے پر دونوں حکومتوں کے نمایندوں میں تبادلۂ خیالات ہونا چاہیئے۔ اس کا جواب کشمیر کے وزیرِ اعظم نے یہ دیا کہ اس وقت وہ بہت مصروف ہے۔ اس کے باوجود حکومتِ پاکستان نے وزارتِ امورِ خارجہ کے ایک اعلیٰ افسر کرنل شاہ کو ریاستی حکام سے بات چیت کے لیے بھیج دیا۔ وزیرِ اعظم کشمیر نے ان کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرنے سے انکار کر دیا اور انہیں واپس آنا پڑا۔

ستمبر ۱۹۴۷ء میں حکومتِ ہندوستان نے مہاراجہ کشمیر کے ساتھ مل کر بعض اہم اقدامات کیے۔ شیخ عبداللہ کو رہا کر دیا گیا، لیکن جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا گیا ہے، مسلم کانفرنس کے لیڈر چودھری غلام عباس کو رہا نہیں کیا گیا۔ گوپال سوامی آئنگر کو ہندوستانی کابینہ میں وزیر بے محکمہ مقرر کیا گیا۔ وہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۳ء تک کشمیر کا وزیرِ اعظم رہا تھا اور مسلمان دشمنی کی شہرت رکھتا تھا۔ ۳۰ ستمبر کو ہندوستانی کابینہ کی ایک عبوری دفاع کمیٹی قائم کی گئی۔ جو وزیرِ اعظم، نائب وزیرِ اعظم، وزیرِ دفاع، وزیرِ مالیات اور وزیرِ بے محکمہ پر مشتمل تھی۔ موخر ترین کی شمولیت قابلِ ذکر تھی۔ گوپال سوامی آئنگر کشمیر کے بارے میں تو ماہر تھا لیکن دفاع کے معاملات میں اسے ہرگز ماہر تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ماؤنٹ بیٹن کو کمیٹی کا چیئرمین بنا دیا گیا" کیونکہ اسے اعلیٰ فوجی معاملات کا علم اور تجربہ تھا۔"[۱۵] یعنی کشمیر میں جارحیت کے لیے تیاریاں شروع کر دی گئی تھیں۔ اس مرحلہ پر حکومتِ ہندوستان کو یہ تیاریاں شروع کرنے کی ضرورت غالباً پونچھ میں تحریکِ آزادی کی وجہ سے محسوس ہوئی، جسے مہاراجہ کی فوجیں دبانے میں ناکام ہو گئی تھیں اور جو دوسرے علاقوں میں بھی پھیل رہی تھی۔

عبوری دفاع کمیٹی کی تشکیل کے فوراً بعد ڈوگرہ جرنیل جنک سنگھ کی جگہ ایک معتمد ہندوستانی مہر چند مہاجن کو وزیرِ اعظم کشمیر مقرر کر دیا گیا۔ مہاجن کا رویہ ابتدا ہی سے جارحانہ تھا۔ اپنا عہدہ سنبھالتے ہی اس نے ایک پریس کانفرنس میں پاکستان کی مذمت کی اور اسی دن ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو اس نے حکومتِ پاکستان کو ایک تار بھیجا جس میں مہاراجہ کی حکومت کی شکایات کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کرانے کی تجویز پیش کی۔ اس تار میں یہ پُر معنی جملہ بھی تھا" اگر اس تجویز کو قابلِ التفات نہ سمجھا گیا، تو حکومتِ کشمیر بادلِ ناخواستہ مجبور ہوگی کہ اپنی سرحد پر پاکستان کے لوگوں کے جارحانہ اور مخالفانہ اقدامات کا مقابلہ کرنے کے لیے کمک طلب کرے۔" یہ صریحاً ہندوستان سے متوقع کمک کی طرف اشارہ تھا۔ یہ اس امر کا بھی واضح نشان تھا کہ مہاراجہ کی حکومت کی دعوت پر کشمیر پر فوجی قبضہ کرنے کے ہندوستانی منصوبے

اس حد تک پہنچ چکے تھے کہ ان کا کھلم کھلا اقرار کیا جا سکتا تھا۔ حکومتِ پاکستان نے غیر جانبدارانہ تحقیقات کی تجویز کو بلا تامل قبول کر لیا اور دونوں حکومتوں کے نمایندوں کی فوری ملاقات کی تجویز پیش کی۔ لیکن حکومتِ کشمیر نے اس مثبت جواب کو کسی توجہ کا مستحق نہ سمجھا اور اس بات کا پھر کبھی ذکر تک نہ کیا۔ تین دن بعد ۱۸ اکتوبر کو وزیر اعظم کشمیر کی طرف سے ایک اور تار موصول ہوا۔ اس مرتبہ یہ تار قائد اعظم کے نام تھا۔ اس میں تمام سابقہ الزامات کا اعادہ کیا گیا تھا اور ایک مرتبہ پھر باہر سے کمک حاصل کرنے کی دھمکی دی گئی تھی۔ یہ بات واضح تھی کہ کشمیر میں ہندوستان کی فوجی مداخلت کے لیے بہانہ تلاش کیا جا رہا تھا۔ قائد اعظم نے جواب میں ۲۰ اکتوبر کو جو تار بھیجا اس میں مہاراجہ سے کہا کہ وہ کشمیر کے وزیر اعظم کو کراچی بھیجے تاکہ مشکلات کو رفع کیا جا سکے اور معاملات کو دوستانہ طور پر طے کیا جا سکے۔ قائد اعظم نے اس تار میں کہا:

"بیرونی مدد حاصل کرنے کی دھمکی سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی حکومت کا اصل مقصد ہندوستان میں شامل ہونے کا ناگہانی موقع تلاش کرنا اور اس ڈومینین کی مداخلت اور کمک طلب کرنا ہے۔ یہ پالیسی قدرتی طور پر آپ کی رعایا میں، جن میں سے ۸۵ فی صد مسلمان ہیں، گہری ناراضی اور سنگین خدشات پیدا کر رہی ہے۔ میری حکومت نے آپ کے مستند نمایندے کے ساتھ ملاقات کی جو تجویز پیش کی تھی، اس کی اب اشد ضرورت ہے۔"

مہاراجہ نے اس تار کا کوئی جواب نہ دیا، حالانکہ قائد اعظم نے یاد دہانی بھی کرائی۔

اسی زمانے میں قبائلی علاقوں میں ایک طوفان اُمڈ رہا تھا، جس کی حکومتِ پاکستان کو کوئی خبر نہیں تھی۔ مسلمانانِ کشمیر پر مہاراجہ کی حکومت کے وحشیانہ مظالم کی خبریں پونچھ کے اُن مہاجرین اور سابق فوجیوں کے ذریعہ قبائلی علاقوں میں پہنچ گئی تھیں جو وہاں ہتھیار خریدنے گئے تھے۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتلِ عام سے قبائل کے جذبات پہلے ہی مشتعل ہو چکے تھے۔ اب وہ کشمیر میں جہاد کرنا اپنا فرض سمجھنے لگے۔ ۲۱ اکتوبر کو لیاقت علی خاں نے غیر معمولی گھبراہٹ کے عالم میں مجھے یہ بتایا کہ کئی ہزار کا قبائلی لشکر کشمیر کی طرف روانہ ہو گیا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کیا آپ نے قائد اعظم کو اطلاع دے دی ہے؟ انہوں نے کہا کہ "ابھی نہیں"۔ انہیں تو دابھی اطلاع ملی تھی۔ حکومتِ پاکستان اس معاملے میں بے بس تھی۔ اگر قبائل کو ایک ایسی بات سے روکنے کی کوشش کی جاتی جسے وہ اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے

تو اس سے سارے سرحدی علاقے میں آگ لگ جاتی۔ پاکستانی فوج نہ پوری طرح منظم تھی اور نہ ٹھیک طرح مسلح۔ لاکھوں مہاجرین کی آمد نے پاکستانی فوج پر جو عظیم ذمہ داریاں ڈالی تھیں' وہ ان سے ہی بمشکل عہدہ برآ ہو سکتی تھی۔ قبائلی لشکر دریائے جہلم کا پل عبور کر کے ۲۲ اکتوبر کو ریاستی علاقہ میں داخل ہوا' اس نے آن کی آن میں ریاستی فوجوں کو پائمال کر دیا اور ۲۶ اکتوبر کو کشمیر کے دارالحکومت سری نگر کے مضافات تک پہنچ گیا۔ اس سے ایک رات پہلے مہاراجہ سری نگر سے بھاگ کر جموں چلا گیا تھا۔ اگر قبائلی لشکر زیادہ منضبط ہوتا اور راستے میں مالِ غنیمت پر نہ جھک پڑتا تو وہ ۲۶ اکتوبر کو وادیٔ کشمیر پر قبضہ کر چکا ہوتا۔

جب ہندوستانی کابینہ کو کشمیر میں قبائلی یلغار کی اطلاع ملی تو وہ "حکومتِ کشمیر کی ایک پہلے سے آئی ہوئی درخواست پر اسلحہ اور گولہ بارود بہ عجلت تمام بھیجنے کی خواہاں تھی" "لیکن مونٹ بیٹن نے زور دیا کہ اس سے پہلے ریاست کا الحاق حاصل کر لینا چاہیئے۔" اس کی رائے یہ تھی کہ ایک غیر جانبدار ریاست میں فوجیں بھیجنے کی کارروائی نہایت احمقانہ ہوگی۔ ہمیں وہاں فوجیں بھیجنے کا کوئی حق حاصل نہیں اور چونکہ پاکستان بھی ایسی ہی کارروائی کر سکتا ہے' اس کا نتیجہ فوجوں میں تصادم اور جنگ کی صورت میں ہی نکلے گا"۔

الحاق حاصل کرنے کے لیے وی۔ پی۔ مینن کو سری نگر بھیجا گیا۔ اس کے ساتھ ہی مونٹ بیٹن نے فوجی اقدامات کی نگرانی سنبھال لی۔ یہ بات اس کے عملہ کے ایک رکن نے مجھے بتائی۔ جب دو ہفتوں کے بعد میں دہلی گیا۔ اُس کے ڈرامائی الفاظ یہ تھے: "گورنر جنرل کی قبا پھینک کر اس نے سپہ سالارِ اعلیٰ کا لبادہ اوڑھ لیا۔" شاید مونٹ بیٹن نے خیال کیا ہو کہ یہ کارروائی اس کے ان فرائض کی ہی توسیع ہے جو وہ بطور صدر عبوری دفاع کمیٹی پہلے سے ہی ادا کر رہا ہے۔ بہر حال اس نے دوسری جنگِ عظیم میں حربی تدابیر کا جو عظیم تجربہ حاصل کیا تھا' وہ اسے کشمیر میں ہندوستانی جارحیت کے کام میں لایا۔ مونٹ بیٹن نے جب ۲۷ اکتوبر کی صبح کو اس دستاویزِ الحاق پر دستخط ثبت کیے' جو وی۔ پی۔ مینن لے کر واپس آیا تھا تو سری نگر کے لیے طیاروں میں ہندوستانی افواج کی نقل و حرکت شروع ہو چکی تھی۔ جیسا کہ ۳۰ ستمبر کو عبوری دفاع کمیٹی کی تشکیل اور وسط اکتوبر میں مہاراجہ کی طرف سے بیرونی امداد طلب کرنے کی دھمکی سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے' ہندوستانی کافی عرصہ سے کشمیر میں مسلح مداخلت کے منصوبے بنا رہے تھے۔ لیکن چند دنوں کے اندر ہندوستانی افواج کی اڑان کا اہتمام اور سری نگر سے باہر قبائلی لشکر کو روکنے میں ان کی کامیابی ان کا سہرا مونٹ بیٹن کی جنگی مہارت کے سر پر ہی باندھنا چاہیئے۔ بعینہٖ جس طرح کہ مہاراجہ سے فوری الحاق

کے حصول کی تدبیر اس کی سیاسی حیلہ گری کی مرہون منت ہے۔ جیسا کہ کیمبل جانسن نے لکھا ہے: "ماؤنٹ بیٹن کی غیر معمولی قوت عمل اور کائیاں پن اس وقت کے تقاضوں کے حسب حال تھے"۔[۲۱] یہ حکمت عملی اُسی کے ذہنِ رسا کی ایجاد ہے اور اُسی کے ہاتھوں یہ بروئے کار آئی۔

پاکستان و ہندوستان کی تاریخ کے اس نازک مرحلہ میں پاکستان اور کشمیر کے متعلق ماؤنٹ بیٹن کا رویہ آئین سٹیفنز نے بیان کیا ہے۔ لارڈ اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے اسے ۲۷ اکتوبر کو رات کے کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ اُس نے لکھا ہے:۔

"معاملات پر اُن کے یک طرفہ فیصلوں سے میں دنگ رہ گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کلی طور پر ہندوؤں کے حامی "بن گئے ہیں۔ اس رات گورنمنٹ ہاؤس کا ماحول قریب قریب جنگ کے زمانہ کا سا تھا۔ پاکستان 'مسلم لیگ اور مسٹر جناح دشمن تھے۔ پٹھانوں کے حملہ کے باعث عین اس وقت ہندوستان سے مہاراجہ کے باقاعدہ الحاق کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا رہا تھا۔ یہ عظیم ریاست جس کے بیشتر باشندے مسلمان تھے' بشرطِ استصواب قانونی اعتبار سے جناح کے ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھی۔ جوناگڑھ کا الحاق قبول کرنا پاکستان کی دیوانگی تھی۔ ہندوستانی افواج آناً فاناً کشمیر میں طیاروں کے ذریعہ پہنچائی جائیں گی۔ سارا بندوبست کیا جا چکا ہے۔ یہ تھا ماؤنٹ بیٹن کا اندازِ گفتگو"۔

آئین سٹیفنز نے اپنی یادداشت میں ماؤنٹ بیٹن کی ان الفاظ میں تصویر کھینچی ہے "کسی بڑی مہم سے عین پہلے ایک اثر آفریں' پُر اعتماد' دلکش اور کامیاب سپہ سالار"۔[۲۲]

غیر ملکی مؤرخین نے اس زمانہ کے واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے ماؤنٹ بیٹن کے کردار پر جرح کی ہے اور اس بات پر تعجب کیا ہے کہ ہندوستانی کابینہ بالخصوص ماؤنٹ بیٹن نے حکومت پاکستان سے براہ راست مشورہ کرنے کا صریح راستہ کیوں نہ اختیار کیا جبکہ پاکستان کے ساتھ مہاراجہ نے اقرار نامہ کر رکھا تھا اور اس کے اس مسئلہ سے نہایت اہم مفادات وابستہ تھے۔ لارڈ برڈ ووڈ نے یہ استفسار کیا ہے:۔

"کیا وجہ تھی کہ ۲۴ یا ۲۵ اکتوبر کو دہلی میں کسی کو بھی یہ خیال نہ آیا کہ وزیر اعظم

پاکستان سے ٹیلی فون پر رابطہ پیدا کیا جائے اور اس بحران سے عہدہ برآ ہونے کو ایک اہم ذمہ داری سمجھ کر مشترکہ تدبر کا مظاہرہ کیا جائے؟ اگر مسٹر نہرو خود اپنی صوابدید سے اس موقع کے شایانِ شان طرزِ عمل اختیار نہیں کر سکتا تھا تو کیا اس کے قریب کوئی صاحب بصیرت (مثلاً مونٹ بیٹن) نہ تھا جو اسے اس راہ پر لے آتا۔ یہی تھا المیہ۔" ۳۲؎

اقوامِ متحدہ کمیشن برائے ہندوستان و پاکستان میں ہندوستان کے نامزد رکن جوزف کاربل نے جسے مسئلہ کشمیر کے مطالعہ کا غیر معمولی موقع ملا تھا، لکھا ہے:-

"آخر مونٹ بیٹن نے یہ مشورہ کیوں دیا کہ مہاراجہ کو ہندوستان سے فوجی امداد بھیجنے سے پہلے الحاق کے قانونی سہارے کی ضرورت ہے؟ اس نے کیونکر یہ خیال کیا کہ الحاق کی درخواست سے پہلے کشمیر کے لیے (جو حملے کے وقت قانونی اعتبار سے ایک آزاد ملک تھا) ہندوستان سے فوجی امداد مانگنا خلاف آئین ہوگا؟ اور اس مرحلے پر اقوام متحدہ سے کوئی اپیل کیوں نہیں کی گئی؟ آخر میں یہ بات سمجھنا سب سے مشکل ہے کہ کسی نے بالخصوص مونٹ بیٹن نے یہ بالکل بدیہی تجویز کیوں نہ پیش کی کہ مشورہ کے لیے فوراً کراچی کی حکومت سے رابطہ پیدا کرنا چاہیے۔" ۳۳؎

قائد اعظم اس وقت لاہور میں تھے اور آئن سٹیفنز کو مونٹ بیٹن نے بالکل غلط بتایا تھا کہ وہ سری نگر میں فاتحانہ داخلہ کے لیے ایبٹ آباد میں بیٹھے انتظار کر رہے ہیں: "جب کشمیر پر ہندوستانی حملہ کی اطلاع قائد اعظم کو ملی تو انہوں نے فوراً پاکستان کے قائم مقام کمانڈر ان چیف جنرل گریسی کو کشمیر میں فوجیں بھیجنے کا حکم دیا۔ گریسی نے اس حکم پر عمل نہ کیا اور اس کے بجائے ہدایات لینے کے لیے دہلی میں سپریم کمانڈر فیلڈ مارشل آکنلک کو ٹیلی فون کیا۔ دہلی میں جو برعکس صورتِ حال تھی وہ قابلِ غور ہے۔ وہاں ہندوستانی فوج کے انگریز کمانڈر ان چیف نے گورنر جنرل لارڈ مونٹ بیٹن اور ہندوستانی کابینہ کی طرف سے جاری شدہ احکام پر کوئی اعتراض نہیں کیا کہ اسے طیاروں کے ذریعہ کشمیر میں فوجیں پہنچانی چاہئیں البتہ قائد اعظم کے حکم کی تعمیل کرنے کا لازمی نتیجہ ان احکام کا اجرا ہوتا جن کے تحت دونوں ڈومینینوں کے

درمیان مسلح تصادم کی صورت میں انگریز فوجی افسروں کو دونوں فوجوں سے ہٹایا جانا تھا۔ آکنلک نے اس طرح کی رپورٹ لندن میں چیف آف سٹاف کو بھیج رکھی تھی۔

ہندوستانی حملے سے اگلے دن ۲۸ اکتوبر کی صبح کو قائد اعظم سے صورتِ حال پر بات چیت کرنے کے لیے آکنلک طیارہ سے لاہور پہنچا۔ تبادلۂ خیالات کے بعد قائد اعظم اپنا وہ حکم واپس لینے پر رضامند ہو گئے۔ جو پاکستانی فوج کو کشمیر میں داخل ہونے کے لیے انہوں نے دیا تھا۔ انہوں نے لاہور میں ہندوستان اور پاکستان کے گورنر جنرلوں اور وزرائے اعظم کی فوری کانفرنس کے لیے آکنلک کی تجویز منظور کر لی۔ مونٹ بیٹن اور ہندوستانی کابینہ نے بھی آکنلک کی تجویز قبول کر لی لیکن اس کے فوراً بعد اپنے وعدے سے سرکنا شروع کر دیا۔ نہرو بیمار ہو کر بستر علالت پر دراز ہو گیا۔ پٹیل نے، جس نے نہرو کے لاہور جانے کی پر زور مخالفت کی تھی یہ کہا کہ وہ دہلی چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ جو کانفرنس ۲۹ اکتوبر کو منعقد ہونی تھی، وہ روز بروز ملتوی ہوتی گئی اور بالآخر مونٹ بیٹن اکیلا یکم نومبر کو لاہور پہنچا۔

ہندوستان کے گورنر جنرل نے ۲۷ اکتوبر کے جس خط کی بنیاد پر مہاراجہ کی طرف سے الحاق کی درخواست منظور کی تھی، اس میں کہا گیا تھا "ہماری پالیسی یہ ہے کہ جس ریاست کے الحاق کا مسئلہ متنازعہ فیہ ہو، وہاں فیصلہ ریاست کے عوام کی خواہشات کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اس اصول پر عمل کرتے ہوئے میری حکومت کی یہ خواہش ہے کہ جونہی کشمیر میں امن و امان بحال ہو جائے اور اس کی سرزمین حملہ آوروں سے صاف ہو جائے، ریاست کے الحاق کا مسئلہ شورائے عام کے ذریعے طے کیا جائے۔"[۴۸]

اسی دن ہندوستان کے وزیر اعظم نے پاکستان کے وزیر اعظم کو ایک تار بھیجا، جس میں یہ کہا کہ: "میں یہ امر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس ہنگامی حالت میں کشمیر کی امداد کرنے کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہندوستان سے الحاق کے لیے ریاست پر دباؤ ڈالا جائے۔ ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے اور اسے ہم کئی بار برملا بیان کر چکے ہیں کہ کسی بھی متنازعہ فیہ علاقہ یا ریاست کے الحاق کا فیصلہ عوام کی خواہشات کے مطابق ہونا چاہیئے اور ہم اپنے اس نقطۂ نظر پر قائم ہیں۔"

۳۱ اکتوبر کو ایک اور تار میں نہرو نے یہ عہد و پیمان کیا کہ "ہماری یہ یقین دہانی کہ جونہی امن و امان بحال ہو جائے، ہم اپنی فوجیں واپس بلا لیں گے اور اس ریاست کے مستقبل کا فیصلہ ریاست کے عوام

پر چھوڑ دیں گے' صرف آپ کی حکومت سے وعدہ نہیں ہے بلکہ ہمارا یہ وعدہ کشمیر کے عوام اور ساری دنیا سے ہے۔"

حکومتِ پاکستان نے ان یقین دہانیوں کے پس پردہ منصوبہ کو بھانپ لیا تھا۔ ۳۰ اکتوبر کو لاہور سے جاری شدہ ایک سرکاری اعلان میں کہا گیا کہ "حکومتِ پاکستان کی رائے میں ہندوستان سے کشمیر کا الحاق فریب اور تشدد پر مبنی ہے اس لیے اسے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔" اسے تسلیم کیونکر کیا جا سکتا تھا جبکہ اس کا عوام کی خواہشات کے منافی ہونا اظہر من الشمس تھا۔ چونکہ مہاراجہ اس سے پہلے پاکستان کے ساتھ تعلقات کی برقراری کا اقرار نامہ کر چکا تھا' وہ یک طرفہ طور پر کسی اور حکومت سے تعلقات قائم کرنے کا مجاز ہی نہیں تھا۔ مزید برآں جس وقت اس نے ہندوستان کو الحاق کی پیشکش کی' عوامی بغاوت کے باعث وہ ریاست کے وسیع حصوں پر اپنے اقتدار سے محروم ہو چکا تھا۔ صرف کشمیر کے عوام ہی ریاست کے الحاق کا فیصلہ کر سکتے تھے۔ مذکورہ بالا سرکاری اعلان میں یہ بھی کہا گیا کہ "کشمیر میں استصواب کا ذکر لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے کیونکہ بظاہر یہ دلکش معلوم ہوتا ہے لیکن عملاً اس کی حیثیت محض کاغذی ہے۔ اگر حکومتِ ہندوستان کو بوجہ ایں کہ اس نے کشمیر پر قبضہ کر لیا ہے اور وہاں فوج بھجوا دی ہے' بلا روک ٹوک من مانی کارروائی کرنے دی گئی تو استصواب کی زریں دنیا محض سراب ثابت ہو گی۔

یکم نومبر کو مونٹ بیٹن سے ملاقات کے دوران میں تنازع کشمیر طے کرنے کے لیے قائد اعظم نے حسب ذیل تجاویز پیش کیں :۔

(۱) دونوں گورنر جنرلوں کی طرف سے ایک اعلان کیا جائے جس میں متحارب فوجوں کو جنگ بندی کے لیے ۴۸ گھنٹے کا نوٹس دیا جائے اور قبائلیوں کو انتباہ کیا جائے کہ اگر انہوں نے اس پر عمل در آمد نہ کیا تو پھر دونوں ملکوں کی فوجیں ان کے خلاف جنگ کریں گی۔

(۲) کشمیر سے ہندوستانی فوجوں اور قبائلیوں کی بیک وقت واپسی کا انتظام کیا جائے۔

(۳) دونوں گورنر جنرلوں کو امن بحال کرنے' ریاست کا انتظام سنبھالنے اور اپنے مشترکہ اہتمام اور نگرانی میں استصواب کا بندوبست کرنے کے لیے جملہ اختیارات تفویض کیے جائیں۔

مونٹ بیٹن نے یہ تجاویز ہندوستانی کابینہ کے سامنے پیش کرنے کی حامی بھری لیکن محض

آئینی گورنر جنرل ہوتے ہوئے کوئی فیصلہ کرنے یا قائدِ اعظم کے ساتھ مل کر استصواب کا اہتمام کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ البتہ آئینی گورنر جنرل ہونے کی اسی حیثیت نے نہ تو اسے حیدر آباد کے ساتھ معاملہ کرنے کی ذمہ داری لینے سے روکا تھا اور نہ ہی کشمیر میں فوجی مہم کی رہنمائی کرنے سے باز رکھا تھا۔ جب یہ تجاویز حکومتِ ہندوستان کے سامنے رکھی گئیں، تو اس نے انہیں منظور نہ کیا۔ لیکن ۲ نومبر کو ایک نشری تقریر میں نہرو نے اعلان کیا کہ حکومتِ ہندوستان اس بات کے لیئے تیار ہے کہ جب کشمیر میں امن و امان قائم ہو جائے، تو بین الاقوامی سرپرستی میں مثلاً اقوامِ متحدہ کے تحت استصواب کرایا جائے۔"[۲۰]

یکم نومبر کی ملاقات نے قائدِ اعظم کو حتمی طور پر مونٹ بیٹن سے مایوس کر دیا۔ اس ملاقات میں مونٹ بیٹن نے قائدِ اعظم کو حلفاً بتایا تھا کہ نہرو بیمار ہو گیا ہے اور لاہور آنے سے قاصر ہے لیکن، اگلے ہی دن ایک بلند مرتبہ انگریز افسر نے قائدِ اعظم کو بتایا کہ اس نے گذشتہ دن دہلی میں نہرو کو بالکل تندرست دیکھا تھا۔

کشمیر میں حالات کے اس تغیّر نے قائدِ اعظم کی صحت پر سخت ناموافق اثر ڈالا۔ تقسیم کے وقت اس ریاست کی مسلم آبادی اور جغرافیائی محلِ وقوع کی بنا پر انہیں پورا یقین تھا کہ کشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق ضرور ہو جائے گا۔ وہ کہا کرتے تھے "کشمیر ہماری جھولی میں پکے ہوئے پھل کی طرح آ گرے گا۔" اب وہ محسوس کرتے تھے کہ ان سے دھوکہ کیا گیا ہے، اور سابقہ رجائیت کی جگہ شدید مایوسی نے لے لی۔" انہوں نے کہا "ہمیں غلط گاڑی میں سوار کر دیا گیا ہے۔"

ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کے درمیان ان مذاکرات کے دوران میں، گلگت میں، جو کشمیر کے شمال میں واقع ہے، ایک مقامی انقلاب رونما ہو گیا۔ یہ پہاڑی علاقہ ہے اور ریاست کے باقی حصوں سے اس کے مواصلات کا واحد ذریعہ دو بہت اونچے [illegible] درّوں پر سردیوں میں برف کے باعث ناقابلِ عبور ہوتے ہیں۔ اس کی تقریباً ساری آبادی مسلمان ہے۔ اگرچہ گلگت ریاست جموں و کشمیر کا ہی ایک حصہ تھا، لیکن اس کا انتظام برطانوی حکومتِ ہند ایک انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کے ذریعہ کرتی تھی۔ اعلانِ آزادی کے ساتھ برطانوی حکومت نے اس علاقہ کو دوبارہ ریاست کی تحویل دے دیا اور انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کی جگہ ڈوگرہ گورنر نے لے لی۔ جب مہاراجہ کے ہندوستان سے الحاق کی غیر متوقع خبر گلگت پہنچی، تو وہاں کے عوام سخت برافروختہ ہوئے اور انہوں نے مہاراجہ کا جُوا اتار پھینکنے کا فیصلہ کر لیا۔ ۳۱ اکتوبر کو گلگت سکاؤٹوں نے ہندو گورنر کو گرفتار کر لیا، اور ۲ نومبر کو عوام کی پرجوش

تائید کے ساتھ پاکستانی پرچم لہرادیا گیا۔ حکومتِ پاکستان سے انتظام سنبھال لینے کی درخواست کی گئی' جس کے جواب میں ایک نمایندہ ۱۴ نومبر کو وہاں طیارہ کے ذریعہ پہنچ گیا۔ کچھ عرصہ بعد ہنزہ اور ناگر کے حکمرانوں نے' جن کی ریاستیں گلگت ایجنسی میں شامل ہیں' پاکستان سے الحاق کرنے کی درخواست کی۔ اس زمانہ سے ہی حکومت پاکستان نے اس تمام علاقہ کا انتظام سنبھال رکھا ہے' اور یہ علاقہ عرصۂ کارزار سے باہر رہا ہے۔

۸ نومبر کو میں سردار عبدالرب نشتر کے ساتھ مشترکہ دفاع کونسل کے اجلاس میں شریک ہونے کے لیے دہلی گیا۔ اجلاس کے بعد عبدالرب نشتر نے کشمیر کے مسئلہ پر نہرو سے تبادلۂ خیالات کیا' اور وہ پاکستان واپس آگئے۔ ماونٹ بیٹن نے مزید بات چیت کے لیے مجھے رک جانے کو کہا۔ جن ریاستوں کا الحاق متنازعہ فیہ تھا' میں نے اسے اور وی' پی مینن کے ساتھ مل کر ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی۔ یہ سب ریاستیں ایسی تھیں' جن کے حکمران اس فرقہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے' جس سے ان کی رعایا کی اکثریت کا تعلق تھا۔ لہٰذا الحاق کے بارے میں تنازع طے کرنے کی واحد صورت یہی تھی کہ آزادانہ اظہار رائے کی فضا میں لوگوں کی مرضی معلوم کی جائے۔ کشمیر کے معاملے میں یہ ناگزیر تھا کہ قبائلی لشکر اور ہندوستانی افواج دونوں ہی واپس ہو جائیں۔ شام کو مجھے بتایا گیا کہ ماونٹ بیٹن اور سردار پٹیل دونوں اس تجویز پر رضامند ہیں لیکن نہرو رضامند نہیں ہے۔ مجھے اس سے ملنے کا مشورہ دیا گیا۔

نہرو سے میری بہت طویل بات چیت ہوئی اور میں اس پختہ یقین کے ساتھ واپس آیا کہ نہرو نے کشمیر پر جبر و قوت سے تسلط جمائے رکھنے کا تہیہ کر رکھا ہے اور اہلِ کشمیر کو حق خود ارادیت دینے کی کوئی نیت نہیں رکھتا۔ میرا استدلال یہ تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوستانہ تعلقات کی بہترین ضمانت تنازعۂ کشمیر کا منصفانہ حل ہے' اور یہ بات دونوں کے بہترین مفاد میں ہے۔ لیکن اس دلیل کا نہرو پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ فقط سیاسی غلبہ اور قوت کی باتیں کرتا تھا۔ اس نے بار بار کہا کہ امورِ مملکت میں کسی کبھی آزاد و خود مختار طاقت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان کو صرف اسی صورت میں گوارا کیا جا سکتا ہے کہ اسے کبھی اتنی قوت حاصل نہ ہو جو ہندوستان کے لیے خطرہ کا باعث بن سکے۔ میں نے اسے بتایا کہ کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے سے ہندوستان کے لیے کوئی خطرہ پیدا نہیں ہو سکتا کیونکہ کشمیر اور ہندوستان کے درمیان پہاڑوں کا سلسلہ سدِ راہ ہے۔ اس کے برعکس کشمیر پر قبضہ

کرکے ہندوستان نہ صرف پاکستان کی بلندیوں پر چڑھ بیٹھے گا بلکہ کشمیر سے بہنے والے دریا جو پاکستان کے لیے آبِ حیات ہیں ان پر بھی قابو پالے گا۔ نہرو کے متعلق اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا خاندان چونکہ کشمیر سے آیا تھا، اس لیے اسے کشمیر سے گہرا لگاؤ تھا۔ اس بات چیت کے دوران میں نہرو کے اس لگاؤ کی مجھے کوئی رمق تک نظر نہ آئی۔ اسے مطلقاً پروا نہیں تھی کہ کشمیر پر طویل کشمکش سے کشمیری عوام ہی سب سے زیادہ مصیبت اٹھائیں گے۔ اس کے نزدیک اہمیت رکھتی تھی تو فقط یہ بات کہ پاکستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق سے پاکستان مستحکم ہو جائے گا۔

تین ہفتوں کے بعد مشترکہ دفاع کونسل کے ایک اور اجلاس کے لیے لیاقت علی خاں دہلی گئے اور کشمیر کے جھگڑے کو طے کرنے کے لیے از سرِ نو کوشش کی گئی۔ ایک مرتبہ پھر اسمے، وی پی مینن اور میں نے مل کر دونوں وزرائے اعظم کے مابین مذاکرات کی اساس تلاش کرنے کی کوشش کی۔ مسئلے کا حل بالکل صاف اور واضح تھا۔ یعنی لڑائی بند ہو جانی چاہیے اور قبائلیوں اور ہندوستانی افواج دونوں کو واپس چلے جانا چاہیے۔ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کو مشترکہ طور پر اقوامِ متحدہ سے درخواست کرنی چاہیے کہ وہ اپنے زیرِ اہتمام کشمیر میں آزادانہ و منصفانہ استصواب کرائے۔ امن و امان قائم ہونا چاہیے تاکہ ریاست کے جو باشندے باہر دھکیل دیے گئے ہیں، وہ اپنے گھروں میں واپس آسکیں۔ تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دینا چاہیے۔ جائز سیاسی سرگرمیوں پر کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیے۔ جوناگڑھ کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لیے وہاں بھی اسی طرح استصواب کرانا چاہیے۔ اگر اہلِ کشمیر کے فیصلے کو تسلیم کرنے کی نیت ہوتی، تو کوئی مشکل پیش نہ آتی۔ لیکن نہرو نہ کشمیر سے ہندوستانی افواج کو واپس بلانے اور نہ غیر جانبدارانہ استصواب کے انعقاد کی اجازت دینے کے لیے تیار تھا۔

سردار پٹیل پاکستان کا شدید دشمن ہونے کے باوجود نہرو کے مقابلہ میں زیادہ حقیقت پسند تھا۔ دونوں وزرائے اعظم کے درمیان مذاکرات میں ایک مرتبہ جب کہ پٹیل اور میں بھی موجود تھے، لیاقت علی خاں نے کشمیر اور جوناگڑھ کے متعلق ہندوستان کے موقف میں تضاد کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا۔ اگر اپنے مسلمان حکمران کے پاکستان سے الحاق کے باوجود جوناگڑھ اپنی ہندو اکثریت کے باعث ہندوستان کا حصہ قرار دیا جاسکتا ہے، پھر اپنی مسلم اکثریت کے باوجود کشمیر کس طرح محض اس لیے ہندوستان کا حصہ قرار دیا جاسکتا ہے کہ اس کے ہندو حکمران نے ہندوستان سے الحاق کی مشروط دستاویز پر دستخط کر دیے ہیں۔ اگر اس دستاویز

الحاق کا کوئی جواز نہیں، جس پر جونا گڑھ کے مسلم حکمران نے دستخط کئے ہیں تو پھر الحاق کی جس دستاویز پر کشمیر کے ہندو حکمران نے دستخط کئے ہیں، وہ بھی ناجائز ہے۔ اگر جونا گڑھ میں لوگوں کی مرضی غالب آنی چاہیئے تو پھر کشمیر میں بھی اسے فوقیت حاصل ہونی چاہیئے۔ جب لیاقت علی خاں نے یہ ناقابل تردید نکات پیش کئے، تو پٹیل اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور وہ زور سے بول اٹھا: "آپ جونا گڑھ کا مقابلہ کشمیر سے کیوں کرتے ہیں؟ حیدر آباد اور کشمیر کا ذکر کریں تو ہمارے مابین مفاہمت ہو سکتی ہے۔" پٹیل کی اس وقت بھی اور بعد میں بھی یہ رائے تھی کہ لوگوں کی رضامندی کے بغیر کسی مسلم اکثریت کے علاقے کو ہندوستان میں رکھنے کی کوشش، ہندوستان کے لیے تقویت کا باعث نہیں بلکہ ضعف کا موجب ہے۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ اگر ہندوستان اور پاکستان میں یہ مفاہمت ہو جائے کہ کشمیر پاکستان کو مل جائے اور حیدر آباد ہندوستان کو، تو کشمیر اور حیدر آباد کے مسائل پرامن طور پر اور ہندوستان اور پاکستان کے باہمی مفاد میں حل کئے جا سکتے ہیں۔

لاہور میں ۸ دسمبر کو دونوں وزرائے اعظم میں دوسری مرتبہ پھر مذاکرات ہوئے لیکن ان سے بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا بلکہ نہرو کشمیر میں استصواب کے انعقاد کے لیے اقوام متحدہ سے مشترکہ درخواست کی متفق علیہ تجویز سے بھی منحرف ہو گیا۔ اس دوران میں کشمیر میں لڑائی جاری رہی۔ آزاد کشمیر کی فوج کے پاس ہتھیاروں اور ساز و سامان کی شدید کمی تھی اور ان کی تعداد بھی مقابلتاً بہت تھوڑی تھی، لیکن انہوں نے بڑی جرأت سے ہندوستانی فوج کی مزاحمت کی اور اپنے مورچوں کو مستحکم اور مضبوط بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ مونٹ بیٹن کو یہ ڈر تھا کہ کسی تیسرے فریق کی مداخلت کے بغیر دونوں ڈومینیوں میں جنگ کا شدید خطرہ ہے، اور وہ اس سے بچنے کے لیے از حد فکر مند تھا۔ برطانوی وزیر اعظم نے بھی نہرو پر پرامن اور منصفانہ حل کے لیے بہت زور دیا لیکن بے سود۔ مونٹ بیٹن کو نظر آتا تھا کہ اقوام متحدہ کی طرف رجوع کرنے سے ہی کسی بیرونی مصالحت کنندہ کو بیچ میں ڈالا جا سکتا ہے۔ بالآخر گاندھی کی نارضامندی کے باوجود مونٹ بیٹن نہرو کو اس بات پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ اقوام متحدہ کے سامنے پاکستان کے خلاف شکایت دائر کی جائے۔

یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو حکومت ہندوستان نے سلامتی کونسل سے اپیل کی کہ پاکستان سے یہ کہا جائے کہ وہ اپنے سول اور ملٹری عملے کے ارکان کو جموں و کشمیر پر حملے میں شرکت یا اعانت سے روکے، اپنے

دوسرے شہریوں کو حکم دے کہ وہ ریاست میں لڑائی میں کسی طرح کا حصہ نہ لیں، اور حملہ آوروں کو اپنے علاقے، رسد اور دوسری امداد تک رسائی سے محروم کردے۔ حکومتِ ہندوستان نے اپنی درخواست میں یہ بھی کہا کہ حالات معمول پر آنے کے بعد اہلِ کشمیر بین الاقوامی سرپرستی میں استصواب کے ذریعہ اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں گے۔

پاکستان نے جوابی شکایت دائر کی، جس میں ان کوششوں کی تفصیل بیان کی گئی تھی جو ہندوستان نے پاکستان کو تباہ کرنے کے لیے کی تھیں۔ مشرقی پنجاب، دہلی اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں مسلمانوں کا قتلِ عام، جوناگڑھ پر جبر و طاقت سے قبضہ اور ہندوستان کی طرف سے وہ اقدامات جو اس نے فریب اور تشدد سے کشمیر کا الحاق حاصل کرنے کے لیے کئے تھے۔ پاکستان نے سلامتی کونسل سے درخواست کی کہ ان تنازعات کو انصاف اور عدل سے طے کرایا جائے۔ کشمیر کے بارے میں یہ درخواست تھی کہ لڑائی بند کرائی جائے، باہر کے تمام لوگوں کا خواہ ان کا تعلق پاکستان سے ہو یا ہندوستان سے انخلاء عمل میں لایا جائے، کشمیر کے مہاجرین کو واپس بلایا جائے، ایک غیر جانبدار انتظامیہ قائم کی جائے اور یہ معلوم کرنے کے لیے استصواب کرایا جائے کہ "جموں و کشمیر کے عوام کی آزادانہ اور بے لاگ رائے میں ریاست کو پاکستان یا ہندوستان سے الحاق کرنا چاہیئے"۔

سلامتی کونسل میں پاکستانی وفد کے قائد وزیر خارجہ ظفر اللہ خان تھے۔ وفد میں امریکہ میں سفیرِ پاکستان ایم اے ایچ اصفہانی اور ایڈووکیٹ جنرل ایم وسیم شامل تھے۔ قائد اعظم کے خصوصی احکام پر مجھے بھی وفد کا رکن بنایا گیا۔ ہندوستانی وفد کا قائد گوپال سوامی آینگر تھا۔ وفد میں شیخ عبداللہ بھی شامل تھے، جنہیں پہلے مہاراجہ کی حکومت میں شریک کیا گیا تھا اور پھر کشمیر کا وزیر اعظم مقرر کر دیا گیا تھا۔ ہندوستان شیخ عبداللہ کو کشمیر پر اپنے قبضے کے اخلاقی جواز کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ اس زمانے میں نہرو نے شیخ عبداللہ کو یہ باور کرا رکھا تھا کہ ہندوستان اہلِ کشمیر کے حق خود ارادیت کا پورا احترام کرتا ہے اور امن بحال ہونے کے بعد استصواب کرایا جائے گا۔ شیخ عبداللہ اور میں کالج میں ایک ساتھ تھے۔ اب لیک سکسس میں اقوام متحدہ کے ایوان میں بیس سال کے بعد ہماری ملاقات ہوئی۔ اگرچہ ہم ایک دوسرے کے مدمقابل تھے لیکن ہم نے نیویارک کے ایک ہوٹل میں آپس میں ایک نجی ملاقات کا انتظام کیا۔ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کے سیاق و سباق میں ہم نے مسئلہ کشمیر کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا۔

مجھے معلوم ہوا کہ شیخ عبداللہ کو اس امر کا پختہ یقین ہے کہ نہرو کشمیر کو عملاً آزادی عطا کرنے کی نیت رکھتا ہے
میں نے انہیں بتایا کہ اپنی آزادی کی حفاظت کرنے کے لیے کشمیر کے پاس فوجی استعداد نہیں' لہٰذا اسے
اپنی سلامتی کے لیے کسی ہمسایہ ملک پر انحصار کرنا پڑے گا۔ اگر وہ ملک ہندوستان ہوا' اور ہندوستان کی
افواج کشمیر میں مقیم ہوئیں' تو اس کی آزادی محض برائے نام ہوگی' جسے کسی وقت بھی ختم کیا جا سکے گا۔
کیا مسلم کشمیر بے خوف و خطر اپنی قسمت غیر مسلموں کی بھاری اکثریت والے ہندوستان کو سونپ سکتا ہے؟ لیکن میری کسی بھی بات
سے شیخ عبداللہ کا ان یقین دہانیوں پر اعتماد متزلزل نہ ہوا جو نہرو نے انہیں ذاتی طور پر دلا رکھی تھیں۔ اس زمانے میں شیخ عبداللہ کے
وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ان کا دوست نہرو کس طرح ہر عہد و پیمان کی خلاف ورزی کرے گا اور خود انہیں کس طرح یکلخت
۹ اگست ۱۹۵۳ء کو کشمیر کی وزارتِ عظمیٰ سے برطرف کر کے اپنے ہیروؤں کے ساتھ قید خانہ میں ڈال دیا جائیگا جہاں وہ گیارہ سال تک رہیں گے

سلامتی کونسل نے ۱۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو ہندوستان کی شکایت اور پاکستان کے جواب کی سماعت
شروع کی۔ ظفر اللہ خان نے مقدمہ کی ایسی اعلیٰ وکالت کی کہ سلامتی کونسل کو یقین آ گیا کہ مسئلہ محض کشمیر سے
نام نہاد حملہ آوروں کو نکال دینے کا نہیں ہے' جیسا کہ ہندوستان کا نمائندہ اسے باور کرانا چاہتا تھا' بلکہ
اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہندوستان و پاکستان کے تعلقات کو منصفانہ اور پُر امن اساس پر استوار کیا جائے اور
تنازع کشمیر کو ریاست کے عوام کی مرضی کے مطابق حل کیا جائے۔ ظفر اللہ خان نے صاف گوئی سے
اعتراف کیا کہ پاکستان سے رضا کار کشمیر میں اپنے بھائیوں کی امداد کے لیے گئے ہیں' لیکن اہل کشمیر کے
جائز غضب ایلعین سے پاکستان میں جو ہمہ گیر ہمدردی ہے' اس کے پیشِ نظر حکومتِ پاکستان انہیں وہاں
جانے سے نہیں روک سکتی تھی۔ ۱۷ جنوری کو سلامتی کونسل نے ایک قرارداد منظور کی' جس میں دونوں
حکومتوں سے استدعا کی گئی کہ صورتِ حال کی اصلاح کے لیے اقدامات کریں' اور اگر حالات میں کوئی اہم تبدیلی
ہو تو سلامتی کونسل کو مطلع کریں۔ ۲۰ جنوری کو سلامتی کونسل نے ایک اور قرارداد کے ذریعہ اقوام متحدہ
کمیشن برائے ہندوستان و پاکستان قائم کر دیا۔ یہ کمیشن تین ارکان پر مشتمل ہونا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان
نے ایک ایک رکن نامزد کرنا تھا۔ اور تیسرے کو ان دونوں ارکان نے مشترکہ طور نامزد کرنا تھا۔ بعد میں
ارکان کی تعداد پانچ تک بڑھا دی گئی۔

ان پہلی قراردادوں کے بعد سلامتی کونسل میں جو بحث ہوئی' وہ پندرہ دن جاری رہی' اس
بحث میں ہندوستان اور پاکستان کے نمائندوں نے حصہ لیا اور مسئلہ کشمیر کا ہر پہلو زیر بحث لایا گیا۔

سلامتی کونسل کی عمومی رائے کے مطابق ایک قرارداد مرتب کی گئی جس کا مسودہ کونسل کے صدر کینیڈا کے جنرل میکناٹن نے ۱۰ فروری کو پیش کیا۔ مسودۂ قرارداد میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ تشدد اور لڑائی کے تمام اقدامات ختم کردیے جائیں، جموں وکشمیر میں داخل ہونے والے تمام بے قاعدہ فوجی دستے اور مسلح افراد واپس چلے جائیں، امن وامان اور سلامتی کے قیام کے لیے ہندوستان اور پاکستان کی فوجیں باہمی تعاون کریں، امن و امان کی بحالی پر مسلح افواج ہٹالی جائیں، تارکینِ وطن اپنے گھروں کو لوٹ جائیں، جائز سیاسی سرگرمیوں سے پابندیاں اٹھالی جائیں، سیاسی قیدیوں کو رہا کردیا جائے، ایسی عبوری انتظامیہ کا قیام عمل میں لایا جائے جسے ریاست کے لوگوں کا اعتماد اور احترام حاصل ہو اور جتنی جلدی ممکن ہو سلامتی کونسل کے حکم، انتظام اور نگرانی کے تحت ایک غیر جانبدارانہ استصواب کرایا جائے جو اس مسئلے کو طے کرے کہ آیا ریاست جموں و کشمیر کا الحاق ہندوستان سے ہونا چاہیے یا پاکستان سے؟

سلامتی کونسل کو سخت تعجب ہوا کہ ہندوستان کے نمائندہ نے مسودہ قرارداد پر شدید اعتراض کیا، بالخصوص امن وامان کی بحالی کے بعد ہندوستانی فوج کی واپسی، غیر جانبدار انتظامیہ کے قیام اور سلامتی کونسل کے زیرِ اختیار استصواب کے انعقاد پر۔ وہ صرف اتنی بات ماننے کو تیار تھا کہ "سلامتی کونسل اس استصواب کے انتظام اور انعقاد میں کشمیر حکومت کو مشورہ دے اور اس کی رہنمائی کرے۔ نیز یہ کہ سلامتی کونسل مبصرین بھیج سکے گی، تاکہ وہ یہ دیکھ سکیں کہ استصواب کس طرح منعقد ہوتا ہے"۔ [۲۸] دراصل ہندوستان چاہتا تھا کہ سلامتی کونسل ایک ایسے استصواب کو اہلِ کشمیر کی آزادانہ رائے کے طور پر قبول کرلے، جو ہندوستانی سنگینوں کے زیرِ سایہ اور ہندوستان کی حامی حکومت کے زیرِ اہتمام منعقد ہو۔ دوسری طرف سلامتی کونسل ایک ایسے استصواب کی خواہاں تھی جو فی الواقعہ منصفانہ ہو، اور دنیا بھی اسے منصفانہ قرار دے۔ جیسا کہ سلامتی کونسل میں امریکی نمائندہ وارن آسٹن نے کہا: "میرے خیال میں صرف وہی انتظام قابلِ قبول اور پسندیدہ ہوسکتا ہے، جو شک وشبہ سے بالا ہو اور جس کے تحت استصواب اس قدر غیر جانب داری سے منعقد ہو کہ دنیا بھی اُسے غیر جانبدار سمجھے"۔ [۲۹]

ہندوستان کا نمائندہ اگرچہ "اس مسئلہ کو فوراً حل کرنے" پر زور دیتا رہا تھا لیکن اب اس نے بحث کو پانچ یا چھ ہفتوں کے لیے ملتوی کرنے کی درخواست پیش کردی۔ سلامتی کونسل التوا پر ناخوش تھی لیکن پاکستان کی طرف سے التوا کی پرزور مخالفت کے باوجود اس نے ہندوستان کی درخواست منظور کرلی۔

ہمیں یقین تھا کہ التوا سے ہندوستان کا واحد مقصد مہلت حاصل کرنا ہے، تاکہ اس دوران میں متعلقہ حکومتوں بالخصوص حکومتِ برطانیہ پر دباؤ ڈالا جا سکے۔ سلامتی کونسل کے سامنے جو مسودۂ قرارداد پیش تھا، اسے منظور کرنے کے لیے ضروری اکثریت کی حمایت حاصل تھی۔ روس اور یوکرین غیر جانبدار تھے، لیکن امریکہ، برطانیہ، شام، کولمبیا، ارجنٹائن اور سلامتی کونسل کے تمام دوسرے ارکان نے ان اصولوں کی پرزور حمایت کی تھی، جن پر مسودۂ قرارداد کو مرتب کیا گیا تھا۔ اگر سلامتی کونسل اپنا کام جاری رکھتی، تو قرارداد منظور ہو جاتی اور اس مظاہرۂ استقامت سے سلامتی کونسل کی عزت بڑھ جاتی۔

سلامتی کونسل میں برطانیہ کا نمائندہ فلپ نیول بیکر تھا، جو امور دولتِ مشترکہ کا وزیر تھا۔ مسودۂ قرارداد پر منتج ہونے والی بحث و تمحیص میں اس نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ اپنی جس بلند نظری اور امن عالم کے لیے مخلصانہ مساعی پر چند سال بعد اسے بجا طور پر نوبل انعام برائے امن ملا، وہ اس کی ہر تقریر سے عیاں تھیں۔ لیکن یہی وہ خوبی تھی، جس کی وجہ سے اسے ہندوستان میں ناپسند کیا جاتا تھا۔ کیمبل جانسن نے لکھا ہے: "مونٹ بیٹن بہت فکر مند ہے، کیونکہ اس کے خیال میں ایٹلی اور نیول بیکر اس تنازعہ کے نفسیاتی اثرات سے پوری آگہی کا مظاہرہ نہیں کر رہے، اور ان کی بے لاگ انصاف کی کوشش بے ہنگم سیاسی نتائج پیدا کر رہی ہے۔"[۱۳۲] مونٹ بیٹن نے امورِ ہند میں خود کبھی اس قسم کی "غلطی" نہیں کی تھی۔ وہ اس زمانہ میں ایک ایسا فارمولا وضع کرنے میں مصروف تھا، جس کے ذریعہ ہندوستان اپنے نئے آئین کے تحت جمہوریہ بننے کے باوجود برطانوی دولتِ مشترکہ کا بدستور رکن رہ سکے گا۔ کشمیر میں عدل و انصاف کے لیے نیول بیکر کی مساعی میں مونٹ بیٹن کو اپنی سیاست گری کی شکست نظر آ رہی تھی۔ کیمبل جانسن نے اپنے سلسلۂ بیان کو جاری رکھتے ہوئے لکھا ہے: "مونٹ بیٹن بڑی صاف گوئی سے کہتا ہے کہ اگرچہ ہندوستان کے لیڈر فرداً فرداً دولتِ مشترکہ سے روابط قائم رکھنے کے فوائد سے باخبر ہیں لیکن ان کی سیاسی حیثیت کمزور ہو گئی ہے اور سلامتی کونسل میں برطانوی وفد نے جو پالیسی اختیار کر رکھی ہے، اس کا حکومتِ ہندوستان کے رویہ پر بہت برا اثر پڑا ہے۔"[۱۳۳] جس طرح ہندوستان اور پاکستان کے مفادات میں تصادم کے موقع پر بالخصوص تنازعۂ کشمیر کے ہر نازک موقع پر مونٹ بیٹن ہندوستانی عزائم کا آلۂ کار بنتا رہا، اسی طرح ایک مرتبہ پھر اس نے وہی طرزِ عمل اختیار کیا۔ اعلیٰ ترین مقامی انگریز حاکم کی حیثیت سے اس نے اپنے اثر و رسوخ کا سارا وزن ہندوستان کے پلڑے میں ڈال دیا۔

یہ دھمکی کہ اگر حکومتِ برطانیہ نے کشمیر کے متعلق اپنی پالیسی میں تبدیلی نہ کی تو ہندوستان دولتِ مشترکہ سے علیحدہ ہو جائے گا' وزیر اعظم ایٹلی کو جو اس بات کے لیے کافی تھی۔ حکومتِ برطانیہ پر ہندوستان کے دباؤ کی پیش بینی کرتے ہوئے ظفر اللہ خان اور میں لندن پہنچ گئے۔ ایٹلی کے ساتھ ظفر اللہ خان کی ملاقات میں ہمارے بدترین خدشات کی تصدیق ہو گئی۔ نیول بیکر کے طرزِ عمل کو مسترد کر دیا گیا اور ہندوستانی خواہشات کے مطابق ایک نئی پالیسی اختیار کی گئی۔ برصغیر پاکستان و ہندوستان کے ساتھ طویل ربط و تعلق کے باعث اس کے امور و معاملات کے بارے میں حکومت برطانیہ کی رائے کو مغربی ممالک میں بڑی وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ امریکہ' کینیڈا اور دوسری اقوام کو آسانی سے برطانیہ کے نئے نقطۂ نظر کی پیروی کرنے پر آمادہ کر لیا گیا۔ مغربی طاقتوں کی حمایت کا مزید اطمینان کرنے کے لیے ہندوستانیوں نے روس کے پاس جا کر اس کا حق استرداد (ویٹو) استعمال کروانے کے شوشے بھی چھوڑے۔

مارچ ۱۹۴۸ء میں جب سلامتی کونسل کا پھر اجلاس ہُوا' میکناٹن کے چھ فروری والے مسودۂ قرارداد کو بالکل فراموش کر دیا گیا' اور چینی نمائندے تسیا نگ نے' جو اس مہینہ کے لیے سلامتی کونسل کا صدر تھا' ایک بالکل مختلف قرارداد پیش کر دی۔ جیسا کہ ظفر اللہ خان نے واضح کیا۔ نئی قرارداد میں ہندوستان کو بہت سی مراعات دی گئی تھیں' اور یہ مراعات ان اصولوں کے صریحاً خلاف تھیں۔ جن پر التوا سے پہلے سلامتی کونسل کے ارکان خود زور دیتے رہے تھے۔ ہندوستانی نمائندہ نے بھی نئی قرارداد پر نکتہ چینی کی کیونکہ اگرچہ یہ قرارداد یک طرفہ تھی' لیکن اس کے حسبِ خواہش کلی طور پر یک طرفہ نہیں تھی۔ تاہم سلامتی کونسل نے بعض ترامیم کے ساتھ یہ قرارداد ۲۱۔ اپریل کو منظور کر دی۔ اس قرارداد میں بحالیِ امن کے بعد استصواب کا اہتمام کیا گیا تھا' لیکن ناظم استصواب کو اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کا نامزد ہونے کے باوجود ریاست جموں و کشمیر کے ایک افسر کے طور پر کام کرنا تھا۔ سلامتی کونسل نے التوا کو منظور کر کے اور پھر چھ فروری والے مسودۂ قرارداد سے دستکش ہو کر جو کمزوری دکھائی' وہ مسئلہ کشمیر اور اقوام متحدہ کے وقار کے لیے تباہ کن تھی۔ سلامتی کونسل کا یہ رویّہ دیکھ کر ہندوستان نے یہ محسوس کیا کہ وہ بے خوف و خطر اقوام متحدہ کو آنکھیں دکھا سکتا ہے۔ ۲۱ مئی کی قرارداد میں اگرچہ ہندوستان کے لیے بہت سی مراعات تھیں لیکن اس کے باوجود ہندوستان نے اسے منظور نہ کیا۔ پاکستان نے قرارداد پر نکتہ چینی تو کی' لیکن اسے مسترد نہ کیا۔

جن دنوں سلامتی کونسل میں بحث جاری تھی' کشمیر میں ہندوستانی فوج کو کمک پہنچائی جا رہی تھی۔

موسم سرما کی بارشوں، برفباری اور طوفان کے باوجود سڑکوں اور ہوائی اڈوں کی مرمت ہوتی رہی تاکہ بہار آتے ہی حملہ کیا جا سکے۔ ۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو ہندوستان کے وزیر دفاع نے اپنی آئین ساز اسمبلی میں اعلان کیا کہ اگلے دو تین مہینوں میں ہندوستانی فوج کشمیر کو "حملہ آوروں" سے صاف کر دے گی۔ آزاد کشمیر کی فوج اور اہل قبائل نے ہندوستانی افواج کے پے در پے حملوں کا بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا تھا، لیکن نہ عددی اعتبار سے اور نہ سازوسامان کے لحاظ سے وہ اس قابل تھے کہ اپنے سے بہت بڑی منظم فوج کی پوری تیاری سے چڑھائی کو روک سکتے۔

۲۰ اپریل کو پاکستانی فوج کے کمانڈر ان چیف جنرل گریسی نے حکومت پاکستان کے سامنے فوجی صورتِ حال کے بارے میں اپنا جائزہ پیش کیا۔ ہندوستانی فوج کی تیاریوں کی تفصیل بیان کرنے کے بعد اس نے اپنی رپورٹ کو یوں ختم کیا:-

> "ان حالات سے ظاہر ہے کہ بہت جلد ایک بڑا دھاوا ہونے والا ہے۔ اگر پاکستان مزید ساڑھے ستائیس لاکھ لٹے پٹے مہاجرین کے سنگین مسئلے سے دوچار ہونا نہیں چاہتا، اگر ہندوستان کو عقب اور پہلو سے پاکستان کے آستانے پر تسلط جمانے کی اجازت نہیں دینی ہے کہ جب چاہے پاکستان میں داخل ہو جائے۔ اگر سول اور ملٹری اعتماد نفس کو برقرار رکھنا ہے اور اگر پاکستان کے اندر تخریبی قوتوں کو پنپنے نہیں دینا ہے، تو یہ بات ناگزیر ہے کہ ہندوستانی فوج کو اوڑی، پونچھ، نوشہرہ کے خط سے آگے پیش قدمی کی اجازت نہ دی جائے۔"

علاوہ ازیں ایک اور بے حد اہم معاملہ قابلِ توجہ تھا۔ منگلا ہیڈورکس ریاست کشمیر کے علاقے میں تھا، اس سے نکلنے والی اپر جہلم نہر سے مغربی پاکستان میں وسیع علاقے سیراب ہوتے تھے۔ اگر ہندوستان کی پیش قدمی کامیاب ہو گئی تو منگلا ہیڈورکس جس کے ذریعے دریائے جہلم سے آب رسانی کا انتظام کیا جاتا تھا، ہندوستان کے ہاتھ میں چلا جائے گا۔ پاکستان کی معیشت کو مفلوج کرنے کے لیے ہندوستان نے یکم اپریل ۱۹۴۸ء کو ستلج اور راوی دریاؤں کے ہیڈورکس سے پانی کی بہم رسانی بند کر دی تھی۔ یہ ہیڈورکس ریڈکلف نے غیر منصفانہ طور پر ہندوستان کا حصہ قرار دیے تھے۔ منگلا ہیڈورکس پر بھی قبضہ کرنے کے بعد مغربی پاکستان کی معیشت کی شہ رگ پر ہندوستان کی گرفت کامل ہو جاتی۔ منگلا کی اہمیت کا اندازہ اس

بات سے ہو سکتا ہے کہ یہی وہ واحد جگہ ہے جہاں ہندوستان کے قبضے میں تین مشرقی دریاؤں کی بجائے آب رسانی کے متبادل انتظام کے لیے بند تعمیر کیا جا رہا ہے۔

حکومت پاکستان نے کمانڈر انچیف کی سفارشات کو منظور کر لیا اور خاص مقامات کی حفاظت کے لیے محدود تعداد میں فوج ریاست میں بھیج دی۔ فوج کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ "ہندوستان کو مسلح طاقت کے بل بوتے پر اپنے حق میں فیصلہ کرنے سے روک دو" اس خالصتہً دفاعی کام پر صرف فوج ہی مامور کی گئی۔ فضائیہ کو استعمال نہیں کیا گیا۔ ہندوستانیوں کو اس طرح بلا مقابلہ فضائی قوت حاصل تھی لیکن ان سب رکاوٹوں کے باوجود پاکستانی فوج نے ہندوستان کا حملہ کامیابی سے روک لیا۔

سلامتی کونسل کی ۲۰ جنوری کی قرار داد کے تحت جو اقوام متحدہ کمیشن برائے ہندوستان و پاکستان مقرر کیا گیا تھا اسے "موقع پر حتی الوسع جلد از جلد پہنچنے" کی ہدایت کی گئی تھی، لیکن اس کی تشکیل میں غیر معمولی تاخیر ہوئی اور وہ ، جولائی ۱۹۴۸ء کو کراچی پہنچا۔ کمیشن پانچ ارکان پر مشتمل تھا۔ پاکستان نے ارجن ٹائن کو اور ہندوستان نے چیکوسلاوکیہ کو نامزد کیا تھا۔ کولمبیا اور بلجیم کا انتخاب سلامتی کونسل نے کیا تھا اور امریکہ کو کونسل کے صدر نے نامزد کیا تھا۔ کمیشن کے ساتھ پہلی ملاقات کے دوران میں ہی ظفر اللہ خان نے اسے پاکستان کے اس اقدام سے آگاہ کر دیا، جو کشمیر میں فوج بھیجنے کے سلسلے میں کیا گیا تھا۔ جب کمیشن دہلی گیا تو ہندوستان والوں نے اس اقدام پر جسے وہ پاکستان کی جارحیت قرار دیتے تھے، بہت شور مچایا۔ کمیشن کے ارکان برصغیر میں نووارد تھے اور کشمیر کی آویزش میں کارفرما تاریخی قوتوں کے بارے میں انہیں بہت کم علم تھا۔ وہ پاکستان اور ہندوستان کی طرف سے ان کے متصادم نقطہ ہائے نظر کی پرجوش وکالت سے حیران و پریشان ہو گئے۔ بالآخر انہوں نے ایک لائحہ عمل مرتب کر لیا اور اسے کمیشن کی ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء والی قرار داد میں شامل کر دیا۔ اس قرار داد میں جنگ بندی کا اہتمام کیا گیا تھا جس کے بعد معاہدہ متارکہ جنگ ہونا تھا۔ اس کے تحت ایک طرف پاکستانی فوج، اہل قبائل اور رضا کاروں کا اور دوسری طرف ہندوستانی فوج کے بیشتر حصہ کا کشمیر سے انخلا عمل میں آنا تھا۔ قرار داد کا آخری حصہ جو استصواب کے بارے میں تھا، از حد مبہم تھا، اس میں فقط مذاکرات کا ہی اہتمام تھا جو دونوں حکومتوں اور کمیشن کے مابین استصواب کے لیے منصفانہ اور عادلانہ شرائط طے کرنے کی خاطر ہونے تھے۔ حکومت پاکستان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ منصفانہ استصواب کی پختہ ضمانت کے بغیر کوئی حقیقی مصالحت ممکن نہیں۔ اپنی

ناتجربہ کاری کے باعث کمیشن اس بات کو بخوبی محسوس نہیں کرسکتا تھا کمیشن کے ایک رکن جوزف کاربل نے لکھا ہے :۔

"پاکستان کی صریحاً یہ رائے تھی کہ جب لڑائی بند ہو جائے گی تو ہندوستان کشمیر کی بالفعل تقسیم پر مطمئن ہو جائے گا (جس کا بیشتر اور بہتر حصہ اس کے زیر قبضہ تھا) یہ صورت حال بعد میں مستقل ہو جائے گی اور پھر ہندوستان منصفانہ استصواب میں روڑے اٹکائے گا۔ کمیشن کو اس رائے کے اظہار سے سخت مایوسی ہوئی"[۲۲]

۱۹۴۸ء کے آخری حصے میں پیرس میں جہاں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا' کمیشن کے ساتھ دوبارہ مذاکرات ہوئے۔ ان مذاکرات کا نتیجہ ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کی قرارداد کی صورت میں برآمد ہوا جس میں اقوام متحدہ کے زیر اہتمام آزادانہ وغیر جانبدارانہ استصواب کے اصولوں اور طریق کار کا تعین کیا گیا۔ اس عرصے میں کشمیر میں لڑائی جاری رہی اور کبھی ایک فریق کا قدم بڑھتا تھا کبھی دوسرے کا۔ اوڑی اور ٹیٹوال پر ہندوستانی حملوں کو روک دیا گیا اور ریاست کے جنوب اور مغرب میں خط جنگ مستحکم ہو گیا۔ زوجی لا یعنی درہ جو شمال کی جانب سے وادئ کشمیر کا دروازہ تھا وہاں گلگت سکاؤٹ جا دھمکے۔ لیکن ہندوستانی فوج ان بلندیوں پر ٹینک چڑھانے میں کامیاب ہو گئی۔ پونچھ شہر جو کافی عرصے سے محصور تھا نومبر ۱۹۴۸ء میں ہندوستانی فوج نے اس کی خلاصی کرالی اور نوشہرہ کا اس سے رابطہ قائم کر دیا۔ اس طرح نوشہرہ اور پونچھ کی مشرقی جانب کا سارا علاقہ ان کے ہاتھوں میں چلا گیا' اس میں تحصیل بھمبر بھی تھی جو کشمیر کا اناج گھر تھی۔ ہزاروں کی تعداد میں مسلم مہاجرین کا ایک نیا ریلا پاکستان میں آگیا۔ پاکستان نے اس وقت تک ہندوستانی مواصلات میں مداخلت نہیں کی تھی' حالانکہ انہیں آسانی سے غیر محفوظ بنایا جاسکتا تھا لیکن اب صورت حالات سخت ترا قدامات کی متقاضی تھی۔ بیری پتن کے پل پر لگاتار گولہ باری سے ہندوستان کے گولہ بارود کے ذخائر تہس نہس اور اس کے مواصلات درہم برہم ہو گئے۔ ہندوستان اب کشمیر میں اپنی فوج کو پاکستان کے علاقے پر حملہ کر کے ہی بچا سکتا تھا۔ ایسے حملے سے دونوں ملک کلی طور پر جنگ میں الجھ جاتے۔ اگرچہ کشمیر میں ہندوستان اور پاکستان ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے لیکن دونوں نے ہی غیر محدود جنگ برپا کرنے سے احتراز کیا تھا۔ اب جبکہ وہ جنگ کے کنارے تک پہنچ چکے تھے' دونوں ہی اس سے پیچھے ہٹ گئے۔ نہرو کی منظوری کے ساتھ ہندوستانی کمانڈر انچیف جنرل بُوچر نے

جموں وکشمیر
جنگ بندی کے بعد
یکم جنوری سنہ ۱۹۴۹ء
روس
افغانستان
گلگت
ایجنسی
گلگت
عوامی جمہوریہ چین
ہمالیہ
دریائے شیوک
کوہ
آکسائی چین
جنگ بندی لائن
لداخ
لیہ
دریائے سندھ
پینگانگ جھیل
سری نگر
درہ زوجیلا
پونچھ
درہ بانہال
جموں
راولپنڈی
دریائے جہلم
دریائے چناب
جموں
سیالکوٹ
ہندوستان
دریائے راوی
Scale of Miles
0
50
100

۳۰ دسمبر کو پاکستان کے کمانڈر ان چیف جنرل گریسی کو جنگ بندی کے لیے کہا۔ جنرل گریسی نے اس تجویز کی حمایت کی اور حکومتِ پاکستان نے اسے منظور کر لیا۔ جنگ بندی پر یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو عمل درآمد ہُوا۔ نقشہ ۵ میں جنگ بندی لائن دیکھی جا سکتی ہے۔

جنگ بندی کے فیصلے پر پاکستان میں اکثر کڑی تنقید کی جاتی ہے کہ یہ غیر دانشمندانہ تھا۔ چنانچہ یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ کشمیر میں مقابلہ آرائی میں پاکستانی فوج نے ہندوستانی فوج پر اپنی فوقیت ثابت کر دی تھی، پیشتر اس کے کہ ہندوستان پاکستان کو زیادہ نقصان پہنچا سکتا' پاکستانی فوج کشمیر کو لے سکتی تھی۔ پاکستان کو معلوم تھا کہ ہندوستان استصواب میں سدِّ راہ بننے اور کشمیر پر اپنے فوجی قبضہ کو برقرار رکھنے کا تہیہ کیے ہوئے ہے۔ پاکستان کا اقوامِ متحدہ پر یہ اعتماد کہ وہ استصواب کرا سکے گی سراسر بے جواز اور عقلِ سلیم کے خلاف تھا۔ میں اس زمانہ میں فرانس میں بیمار پڑا تھا' جہاں میں ظفر اللہ خاں کے ہمراہ اقوام متحدہ کمیشن کے ساتھ مذاکرات کے لیے گیا تھا۔ اس لیے میں اس معاملے میں ذاتی علم کی بنا پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن میرا تاثر یہ ہے کہ لیاقت علی خان کے نزدیک فیصلہ کن وجہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان عمومی جنگ سے احتراز کرنے کی خواہش تھی' کیونکہ انہیں پورا یقین تھا کہ جنگ سے دونوں ملک تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ ہندوستان نے کسی صورت بھی کشمیر میں اپنے نقصانات کو حتمی شکست کے طور پر قبول نہیں کرنا تھا بلکہ پاکستان کے خلاف جنگ جاری رکھ کر تلافیٔ مافات کی کوشش کرنی تھی۔ دونوں ملکوں میں سے ایک بھی طویل جنگ لڑنے کے فوجی وسائل نہیں رکھتا تھا۔ دونوں ملکوں کو بہت جلد جنگی رسد کے حصول کے لیے دوسری طاقتوں پر انحصار کرنا پڑتا' اور اس طرح نئی حاصل شدہ آزادی کو سنگین خطرہ لاحق ہو جاتا۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ ایک سیاسی فیصلہ تھا' جس کی اساس کشمیر کے محاذ پر جیت کے فوری امکانات کی بجائے وسیع تر دقیع امور تھے۔

جونہی جنگ بندی پر عمل درآمد ہُوا' اہلِ قبائل اور پاکستانی رضا کار معاہدۂ متارکہ جنگ کی تکمیل کا انتظار کیے بغیر اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ ہندوستان نے کشمیر میں قبائلیوں کی یلغار کے ابتدائی ایام میں بے اعتدالیوں کا بڑا پروپیگنڈہ کیا تھا۔ لیکن جب ہم ان کا مقابلہ مہاراجہ کی ریاستی فوج اور ہندوستانی فوج کے ظلم و ستم سے کرتے ہیں' تو جس لوٹ مار کا ارتکاب ان غیر منظم افراد نے کیا' نہ ہونے کے برابر نظر آتی ہے۔ اگر ان کا مطمحِ نظر صرف لوٹ مار ہوتا' تو جونہی انہیں ہندوستانی فوج سے لڑنا

پڑا نھا وہ تتر بتر ہو جاتے۔ لیکن وہ اپنے سے بدرجہا زیادہ بڑی اور مسلح فوج کے خلاف چودہ ماہ تک لڑتے رہے' ان کے پیشِ نظر صرف ایک ہی مقصد تھا اور وہ تھا: اپنے کشمیری بھائیوں کی آزادی۔ انہوں نے بہ حیثیت مجموعی بڑی جرأت مندانہ اور بے لوث جنگ لڑی اور کشمیر اور پاکستان کے لوگوں کو اس کے لیے ان کا تہِ دل سے ممنون ہونا چاہیئے۔ آزاد کشمیر فوج نے بھی اپنے گھر بار کی حفاظت میں بڑی بے جگری سے جنگ کی۔ آزاد کشمیر کی ساری آبادی نے جنگ کی صعوبتوں اور ہندوستانی فضائیہ کی بمباری کو بڑی جرأت اور ثابت قدمی سے برداشت کیا۔

اقوام متحدہ کمیشن برائے ہندوستان و پاکستان کی ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء اور ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کی دونوں قراردادوں کی توثیق سلامتی کونسل نے کر دی اور ہندوستان اور پاکستان نے بھی انہیں قبول کر لیا۔ ان قراردادوں کو ایک بین الاقوامی معاہدہ کی حیثیت حاصل ہے جس پر ابھی عملدرآمد ہونا باقی ہے۔ اس معاہدہ کا لب لباب یہ ہے کہ جموں و کشمیر کے عوام کو اپنے مستقبل کا تعین کرنے اور اقوام متحدہ کے زیر اہتمام ایک آزاد اور غیر جانبدار استصواب کے ذریعہ یہ فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے کہ انہیں ہندوستان سے الحاق کرنا چاہیئے یا پاکستان سے' اور یہ استصواب ریاست کی انتظامیہ اور دونوں میں سے کسی بھی ایک ملک کی فوج کے دباؤ اور خوف کے بغیر ہونا چاہیئے۔

اقوام متحدہ کی طرف سے بین الاقوامی معاہدہ پر عمل درآمد کرانے کی بہت سی کوششوں کا ابھی تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ یہ عالمی سیاست میں بدنظمی کی کیفیت کا ایک نہایت افسوسناک پہلو ہے کہ اعلیٰ ترین عالمی تنظیم بھی ہندوستان کی ہٹ دھرمی کا علاج کرنے اور اہلِ کشمیر کو آزادانہ اظہار رائے سے ہندوستان یا پاکستان میں شامل ہونے کا حق دلانے میں بے بس ثابت ہوئی ہے۔ یہاں ان واقعات کے رجحان کا مجمل بیان کافی ہو گا۔

اقوام متحدہ کمیشن برائے ہندوستان و پاکستان نے بہت جلد یہ محسوس کر لیا کہ ہندوستان کی طرف سے استصواب میں روڑے اٹکانے کی نیت کے متعلق پاکستان کے خدشات کس قدر درست تھے۔ ہندوستان نے بنیادی طور پر انہی حربوں کو استعمال کیا' جو اس نے کابینہ مشن منصوبہ کے سلسلے میں اختیار کئے تھے۔ وہ معاہدہ کے سیدھے سادے الفاظ کی من مانی تعبیر کرتا تھا' اور پھر کسی اور تعبیر کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا تھا۔ خواہ وہ معاہدہ کے مصنفوں کی طرف سے کیوں نہ پیش کی گئی ہو۔ اپنے اس طریق کار

کے مطابق ہندوستان نے آزاد کشمیر فوج کو درہم برہم کرنے پر اصرار کیا حالانکہ معاہدہ میں اس کا کوئی ذکر تک نہ تھا۔ اور کمیشن نے بھی واضح طور پر یہ بیان کیا تھا کہ "۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد میں آزاد کشمیر فوج کو غیر مسلح یا درہم برہم کرنے کی کوئی تجویز شامل نہیں"۔ کئی اور مسائل بھی چھیڑ دیے گئے، جن کے بارے میں حکومت ہندوستان نے کمیشن کی تعبیر کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد کمیشن نے یہ تجویز پیش کی کہ دوسری عالمی جنگ کے نامور امیر البحر چسٹر ڈبلیو نمٹز جنہیں کشمیر کے لیے ناظم استصواب نامزد کر دیا گیا تھا۔ ان کے سامنے سارے اختلافات ثالثی فیصلے کے لیے پیش کر دیے جائیں۔ امریکی صدر ٹرومین اور برطانوی وزیر اعظم ایٹلی نے ہندوستان اور پاکستان سے اپیل کی کہ وہ ثالثی کی اس تجویز کو منظور کر لیں۔ پاکستان نے اسے منظور کر لیا لیکن ہندوستان نے اسے مسترد کر دیا۔

اس طرز عمل کا اعادہ بعد میں گیارہ مواقع پر ہوا جب سرکردہ سیاست دانوں اور مصالحت کنندگان نے تنازعہ کشمیر کے تصفیہ کے لیے تجاویز پیش کیں، جو پاکستان نے منظور کر لیں لیکن ہندوستان نے مسترد کر دیں۔ آسٹریلیا کے ممتاز جج سر اووِن ڈکسن کو ۱۹۵۰ء میں اقوام متحدہ کا نمائندہ مقرر کیا گیا، اس کا تقرر اقوام متحدہ کمیشن کی بجائے کیا گیا تھا۔ اسے فوجوں کے انخلا کا پروگرام مرتب کرنے اور اس پر عمل درآمد کرانے اور کمیشن کے دوسرے فرائض سرانجام کرنے کا کام سپرد کیا گیا تھا۔ اس نے سلامتی کونسل کو اپنی رپورٹ میں بتایا:

> "آخر میں مجھے پختہ یقین ہو گیا کہ ہندوستان نہ تو فوجوں کے انخلا کی کوئی ایسی صورت قبول کرے گا اور نہ ہی استصواب کے دوران میں ایسی شرائط منظور کرے گا جن سے میرے نزدیک استصواب ایسے حالات میں ہو سکے کہ نہ تخویف ہو، نہ دباؤ اور نہ دیگر اسی طرح کی خرابیاں جن سے استصواب کے آزاد اور بے لاگ ہونے کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہو۔"

جنوری ۱۹۵۱ء میں لندن میں دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس میں مسئلہ کشمیر کے ہر پہلو پر غیر رسمی طور پر تبادلۂ خیالات کیا گیا۔ ریاست کی سلامتی کو خطرہ میں ڈالے بغیر منصفانہ استصواب منعقد کرنے کے لیے آسٹریلیا کے وزیر اعظم منزیز نے تین متبادل طریقے تجویز کیے۔ دوسرے وزرائے اعظم نے بشمول وزیر اعظم ایٹلی ان کی تائید کی۔ وہ طریقے یہ تھے۔ دولت مشترکہ کی فوج متعین کی جائے یا ہندوستان

اور پاکستان کی مشترکہ فوج اور یا ناظم استصواب مقامی طور پر فوج بھرتی کرلے۔ ان میں سے ہر تجویز کو پاکستان نے منظور کرلیا لیکن ہندوستان نے مسترد کر دیا۔

اپریل ۱۹۵۱ء میں اقوام متحدہ کمیشن برائے ہندوستان و پاکستان کی قراردادوں ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء اور ۵ جنوری ۱۹۴۹ء پر عمل درآمد کرانے کی تجاویز پیش کرنے کے لیے امریکہ کے ایک سابق سینٹر ڈاکٹر فرینک گراہم کو اقوام متحدہ کا نمایندہ مقرر کیا گیا۔ اس نے سلامتی کونسل کو کئی رپورٹیں پیش کیں، لیکن چونکہ ہندوستان کی طرف سے کشمیر میں بھاری فوج رکھنے پر اصرار تھا اس لیے وہ بھی فوجی انخلا پر مفاہمت نہ کرا سکا۔

اگست ۱۹۵۳ء میں شیخ عبداللہ کی برطرفی اور گرفتاری کے بعد بڑے نازک حالات میں ہندوستان اور پاکستان کے وزرائے اعظم کے درمیان ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اپنے مشترکہ اعلان میں یہ پختہ رائے ظاہر کی کہ تنازعِ کشمیر کو "ریاست کے عوام کی مرضی کے مطابق حل کرنا چاہیے تاکہ ان کی فلاح و بہبود کو فروغ نصیب ہو اور ان کی زندگی میں خلل نہ آئے۔ عوام کی مرضی معلوم کرنے کا سب سے موزوں طریقہ آزادانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب ہی ہے۔" اعلان میں بتایا گیا تھا کہ ناظم استصواب کو اپریل ۱۹۵۴ء کے اواخر تک مقرر کر دینا چاہیے۔ لیکن پیشتر اس کے کہ یہ تقرر کیا جاتا، نہرو اس نمائشی استدلال کی بنا پر اپنے عہد سے منحرف ہو گیا کہ پاکستان اور امریکہ کے درمیان باہمی حفاظت کا جو سمجھوتہ ہوا ہے اس سے برصغیر میں طاقت کا توازن بگڑ گیا ہے اور مذاکراتِ کشمیر کا سارا سیاق و سباق ہی بدل گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر پاکستان نے اپنی سلامتی کے تحفظ کے لیے امریکہ سے فوجی امداد کا معاہدہ کر لیا تھا تو کشمیری عوام کو ان کے حقِ خود ارادیت سے کیوں محروم کیا جائے؟

فروری ۱۹۵۷ء میں سلامتی کونسل نے اپنے سویڈن کے صدر گنر جارنگ کو ہندوستان و پاکستان کے دورے پر بھیجا تاکہ وہ پُرامن مصالحت کرا سکے لیکن اس دورے کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ڈاکٹر گراہم نے بعد میں جو کوششیں کیں، وہ بھی اسی طرح بے سود ثابت ہوئیں۔

اس اثنا میں ہندوستان نے کشمیر میں ایک نام نہاد آئین ساز اسمبلی قائم کر دی، جس نے ہندوستان کی کارستانی سے ریاست کے "انڈین یونین کا لاینفک حصہ" ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس پر سلامتی کونسل نے ۲۴ جنوری ۱۹۵۷ء کو ایک قرارداد منظور کی، جس میں اس نے اپنے پہلے موقف کی دوبارہ

توثیق کی کہ اس اسمبلی کی کسی بھی کارروائی سے "ریاست کی آئینی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی"۔ ایسی تبدیلی صرف "اقوام متحدہ کے زیر اہتمام آزادانہ وغیر جانبدارانہ استصواب کے جمہوری طریقہ" سے ہی کی جاسکتی ہے۔ اگرچہ ہندوستان نے سلامتی کونسل کو بار بار یقین دہانی کرائی کہ حکومت ہندوستان اس رائے کی پابند نہیں ہوگی جو کشمیر کی آئین ساز اسمبلی الحاق کے بارے میں ظاہر کرے بلکہ وہ اپنے بین الاقوامی عہد کی پاسداری کرے گی۔ لیکن وقت گزرنے پر ہندوستان کے سرکاری ترجمان روز افزوں جسارت سے یہ دعویٰ کرنے لگے ہیں کہ کشمیر ہندوستان کا اٹوٹ انگ ہے، بلکہ انھوں نے تنازع کشمیر کے وجود سے بھی انکار کر دیا ہے۔

جب نومبر ۱۹۶۲ء میں چین کے ہاتھوں ہندوستان نے عبرتناک شکست کھائی تو اس کے طرز عمل میں تھوڑی دیر کے لیے تبدیلی آئی۔ امریکہ کے نائب وزیر خارجہ ایورل ہیری مین اور برطانیہ کے وزیر امور دولت مشترکہ ڈنکن سینڈز کی مساعی سے وزیر اعظم ہندوستان اور صدر پاکستان نے ایک مشترکہ اعلان میں اس امر پر اتفاق کیا کہ "کشمیر اور دوسرے متعلقہ مسائل پر دونوں ملکوں کے درمیان اختلافات رفع کرنے کے لیے از سر نو کوشش کرنی چاہیئے"۔ دسمبر ۱۹۶۲ء سے مئی ۱۹۶۳ء تک ہندوستان اور پاکستان کے درمیان چھ مرتبہ مذاکرات ہوئے، لیکن کوئی مفاہمت نہ ہوسکی، اور ہندوستان نے دوبارہ ہٹ دھرمی کی روش اختیار کرلی۔

اٹھارہ سال سے اوپر مدت سے ہندوستان اپنی بین الاقوامی ذمہ داریوں اور عہد و پیمان کی خلاف ورزی کرتا چلا آرہا ہے۔ اس نے کشمیر کے عوام پر ایک بداطوار اور بدطینت استبداد مسلط کیا ہوا ہے اور انہیں حق خود ارادیت سے محروم کر رکھا ہے۔ شیخ عبداللہ کو مسلسل گیارہ سال تک قید میں ڈال رکھا، حالانکہ جب مہاراجہ کی طرف سے الحاق کی پیشکش کو ہندوستان نے موقتاً قبول کیا تھا تو دنیا بھر کے سامنے شیخ عبداللہ کی تائید کو ہی اس کے اخلاقی جواز کے طور پر پیش کیا تھا۔ ان کا جرم فقط یہ ہے کہ وہ اپنے عوام کے لیے حق خود ارادیت کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ مطالبہ کشمیری عوام کے دلوں کی گہرائیوں سے ابھرنے والے جذبات کا آئینہ دار ہے، اور اسے کسی طرح دبایا نہیں جاسکتا۔

۱۹۶۳-۶۴ء کے موسم سرما میں سری نگر میں درگاہ حضرت بل کی بے حرمتی کے بعد جو زبردست ایجی ٹیشن ہوئی، وہ انہی جذبات کے اظہار کی ایک شکل تھی، جس نے شیخ عبداللہ کی رہائی کے پُرزور

مطالبہ کی صورت اختیار کر لی۔ مئی ۱۹۶۴ء میں پنڈت نہرو کی وفات سے کچھ عرصہ قبل شیخ عبداللہ اور ان کے ساتھی رہا کر دیئے گئے' اور چند لمحوں کے لیے یوں معلوم ہونے لگا کہ کشمیر کے عوام اور ان کے لیڈروں سے جو عظیم ناانصافی روا رکھی گئی تھی' اس کی تلافی کر دی جائے گی۔ نہرو کی رضامندی کے ساتھ شیخ عبداللہ پاکستان آئے تاکہ مسئلہ کشمیر کے پُرامن حل کے لیے ہندوستان اور پاکستان میں اتفاق رائے ہو سکے۔ پاکستان میں ان کا ناقابلِ فراموش استقبال کیا گیا' لیکن ابھی ان کا دورہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ نہرو کا انتقال ہو گیا۔ ابتدا میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ نہرو کا جانشین لال بہادر شاستری شیخ عبداللہ کی تحریک مصالحت میں سدِ راہ نہیں بنے گا' لیکن بہت جلد وہ الٹے رخ چل پڑا اور ہندوستانی مقبوضہ کشمیر کو ہندوستان میں ضم کرنا شروع کر دیا۔ ہندوستان کے آئین میں ریاست جموں و کشمیر کو جو خصوصی حیثیت دی گئی تھی رفتہ رفتہ اس میں کمی کی جاتی رہی تھی کہ علاوہ وہ مفقود ہو گئی۔ دسمبر ۱۹۶۴ء میں حکومتِ ہندوستان نے ہندوستانی آئین کی بعض دفعات کا کشمیر پر بھی اطلاق کر دیا تاکہ اس طرح ریاست کا ادغام بروئے کار لایا جا سکے۔ مئی ۱۹۶۵ء میں جب شیخ عبداللہ حج کرنے کے بعد مکہ معظمہ سے دہلی واپس پہنچے' تو انہیں دوسرے ملکوں میں تقریریں کرنے کی پاداش میں فی الفور گرفتار کر لیا گیا اور غیر معین عرصہ کے لیے قید کر دیا گیا۔ ان تقریروں میں انہوں نے کشمیر کے حقِ خود ارادیت کی پرزور وکالت کی تھی۔

حکومت ہندوستان کے ان اقدامات سے لازمی طور پر کشمیر میں شدید ردِعمل ہوا اور ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات اور بھی کشیدہ ہو گئے۔ رن کچھ کے علاقے میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سرحدی تنازعہ کے دوران میں ہندوستان نے مئی ۱۹۶۵ء میں خط متارکہ جنگ سے پار حملہ کر کے کارگل میں تین پاکستانی چوکیوں پر قبضہ کر لیا۔ کشمیر میں خط متارکہ جنگ کی اس سنگین خلاف ورزی کی تلافی اس وقت کی گئی جب اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے اس کے خلاف پرزور احتجاج کیا۔ ۹ر اگست ۱۹۶۵ء کو جب شیخ عبداللہ کی برطرفی اور گرفتاری کی بارھویں سالگرہ تھی' مقبوضہ کشمیر سے وسیع پیمانے پر بغاوت کی اطلاعات موصول ہوئیں۔ یہ بغاوت ہندوستانی فوج اور کشمیری محبان وطن میں جھڑپوں کی صورت میں نمودار ہوئی۔ حکومت ہندوستان نے الزام عائد کیا کہ یہ سب کچھ ان مسلح افراد کی کرتوت ہے جو حکومت پاکستان کے تجاہل عارفانہ کے ساتھ آزاد کشمیر سے چوری چھپے خط متارکہ جنگ کو پار کر کے پہنچے ہیں۔ حکومتِ پاکستان نے ان الزامات کی تردید کی اور کہا کہ ہندوستان کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لیے

مقبوضہ کشمیر کے لوگوں نے اپنے آزاد کشمیر کے بھائیوں کی مدد کے ساتھ جہاد شروع کر دیا ہے۔ ان الزامات اور جوابی الزامات سے ہندوستان اور پاکستان میں تلخی بڑھتی چلی گئی۔ ۱۵ اگست کو ہندوستانی فوج نے خطِ متارکہ جنگ عبور کر کے کارگل کی تین پاکستانی چوکیوں پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ سارے خطِ متارکہ جنگ کے ساتھ ساتھ شدید لڑائی شروع ہو گئی۔ اوڑی پونچھ محاذ پر زبردست حملہ کر کے ہندوستانی فوج نے درہ حاجی پیر پر قبضہ کر لیا۔ مغربی پاکستان کے ضلع گجرات کے ایک گاؤں پر ۲۴ اگست کو ہندوستان نے گولہ باری کی۔ خطِ متارکہ جنگ کے نہایت اہم جنوبی حصہ پر حملے کی پیش بندی کرتے ہوئے یکم ستمبر کو آزاد کشمیر کی فوج نے پاکستانی فوج کی مدد کے ساتھ چھمب کے علاقے میں خطِ متارکہ جنگ کو عبور کیا، اور اکھنور کی طرف بڑی تیزی سے آگے بڑھیں، چنانچہ جموں میں ہندوستانی مواصلات کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا۔ ہندوستان نے ہوائی جہازوں سے حملے شروع کر دئے اور اس طرح فضائی جھڑپیں بھی شروع ہو گئیں۔

۶ ستمبر کو علی الصبح ہندوستانی فوج نے پاکستان اور ہندوستان کے مابین بین الاقوامی سرحد کو عبور کیا اور مغربی پاکستان کے دارالحکومت لاہور پر تین طرف سے اچانک حملہ کر دیا۔ اس عریاں جارحیت کے خلاف صدرِ پاکستان نے اقوام متحدہ کے منشور کے تحت حق دفاع خود کو استعمال کرتے ہوئے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اعلانِ جنگ کر دیا۔ اپنے سے بدرجہا بڑے دشمن کے خلاف پاکستان کی فوج اور فضائیہ نے بے مثال جرأت اور فوجی مہارت سے جنگ لڑی اور لاہور پر حملہ روک دیا۔ اس سے کہیں زیادہ بڑی اور تند لڑائیاں مغربی پاکستان کے ضلع سیالکوٹ میں لڑی گئیں جس پر ہندوستان نے ایک لشکر جرار کے ساتھ، جس میں ایک بکتر بند ڈویژن بھی شامل تھی، حملہ کر دیا تھا۔ ٹینکوں کی جو لڑائی اس علاقے میں ہوئی وہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سب سے بڑی لڑائیوں میں سے تھی۔ پاکستانی فوج کے مدمقابل دشمن سے کہیں زیادہ تعداد تھی۔ اس کے باوجود وہ ہندوستان کے حملے کو روکنے اور دشمن کو پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہو گئی۔ کوچک مگر بے حد مستعد پاکستانی فضائیہ نے اپنے مقابلہ میں کہیں زیادہ بڑی ہندوستانی فضائیہ کو بھاری نقصان پہنچایا اور فضا میں مکمل برتری حاصل کرنے کے بعد بری فوج کی شاندار مدد کی۔ پاکستان کی بحریہ بھی میدان عمل میں آ گئی اور ایک جرأت مندانہ حملہ کر کے اس نے ہندوستان کے دوارکا کے فوجی اڈے کو تہس نہس کر دیا۔

سلامتی کونسل نے انتہائی تشویش کا اظہار کیا۔ ۴ ستمبر کو اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے جنگ بندی اور مسلح افراد کے انخلا کے لیے پر زور اپیل کی جس کی توثیق سلامتی کونسل نے اپنی ۴ اور ۶ ستمبر کی قرارداد وں

میں کر دی۔ ۹ ستمبر کو اقوام متحدہ کا سیکرٹری جنرل امن کی بات چیت کے لیے بذریعہ طیارہ پاکستان اور ہندوستان پہنچا لیکن کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ جب چین نے ہندوستان کو الٹی میٹم دیا کہ وہ سکم کی سرحد کے پار چینی علاقہ میں اپنی جارحیت سے دستکش ہو جائے تو جنگ کی آگ دور تک پھیلنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

۲۰ ستمبر کو سلامتی کونسل نے ایک قرارداد منظور کی جس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ ۲۲ ستمبر کو جنگ بند ہو جانی چاہیئے اور پھر تمام مسلح افراد کو ان مقامات پر واپس آجانا چاہیئے جہاں وہ ۵ اگست ۱۹۶۵ء کو تھے اور کہا گیا کہ اس کارروائی کے بعد سلامتی کونسل اس امر کا جائزہ لے گی کہ جو سیاسی مسئلہ موجودہ تصادم کا موجب بنا ہے اس کے حل میں مدد دینے کے لیے کیا اقدامات کئے جا سکتے ہیں۔ جیسا کہ ساری دنیا کو معلوم ہے یہ مسئلہ فقط تنازعہ کشمیر ہے۔ اس مسئلہ کے ابھی تک حل نہ ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ اقوام متحدہ کمیشن برائے ہندوستان و پاکستان کی ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء اور ۵ جنوری ۱۹۴۹ء والی قراردادوں کی علانیہ خلاف ورزی کرتے ہوئے ہندوستان نہایت ہٹ دھرمی کے ساتھ کشمیر میں استصواب کی مزاحمت کر رہا ہے۔ جنگ بندی ۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کو ہوئی اور بوقت تحریر ہذا (اکتوبر ۱۹۶۵ء) ایک مضطرب سی عارضی صلح ہے۔

اس تنازع کے تصفیہ کے لیے ہر ممکن طریقہ آزمایا جا چکا ہے۔ بین الاقوامی مصالحت سے بھی رجوع کیا جا چکا ہے۔ ثالثی کے لیے بھی تجاویز پیش ہوتی رہی ہیں۔ اعلیٰ ترین سطح پر ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کے درمیان مذاکرات بھی ہوتے رہے ہیں لیکن کوئی بھی طریقہ کارآمد ثابت نہیں ہوا۔ عالمی رائے عامہ کا یہ واضح فتویٰ ہے کہ ہندوستان قصوروار ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مسئلہ کشمیر سب سے اہم اور خطرناک تنازع ہے۔ یہ تنازع برصغیر اور دنیا کے امن کے لیے ہر آن خطرہ کا باعث ہے۔ انصاف، اخلاق اور بین الاقوامی امن کے ہر تقاضے کو نظر انداز کرتے ہوئے ہندوستان نے کشمیر پر بالجبر قبضہ کر رکھا ہے اور کشمیر کے عوام کو ان کا حق خود ارادیت دینے سے انکار کر رہا ہے۔ پاکستان کے عوام اور حکومت اپنی جدوجہد کو جاری رکھنے کا عزم صمیم کر چکے ہیں تا آنکہ اہل کشمیر کو یہ فیصلہ کرنے کا حق مل جائے کہ وہ ہندوستان سے الحاق کرنا چاہتے ہیں یا پاکستان سے۔ سالہا سال ناقابلِ بیان ظلم و ستم سہنے کے باوجود کشمیر کے عوام نے ہندوستان کے جبر و استبداد کے سامنے سرِ خم تسلیم نہیں کیا۔ ہندوستانی قبضہ کے خلاف ان کا جرأت مندانہ جہاد اس وقت تک جاری رہے گا جب تک وہ حق خود ارادیت کی منزل مقصود تک نہیں پہنچ جاتے۔

باب ۱۵

طاس سندھ کا تنازعۂ آب

طاس سندھ کے تنازعۂ آب نے تقسیم پنجاب کی کوکھ سے جنم لیا اور منظرِ عام پر اس وقت آیا جب یکم اپریل ۱۹۴۸ء کو ہندوستان کے صوبہ مشرقی پنجاب نے پاکستان کے صوبہ مغربی پنجاب کو آنے والی نہروں کا پانی روک لیا۔

مغربی پاکستان کی زمین زرخیز ہے لیکن اس کی آب و ہوا گرم اور خشک ہے۔ بارش ناکافی ہوتی ہے اور اس پر انحصار نہیں کیا جاسکتا۔ نصف سے زیادہ علاقے میں بارش کی سالانہ اوسط دس انچ سے بھی کم ہے۔ اور باقی میں بیس انچ سے کم۔ معیشت کا بیشتر دار و مدار زراعت پر ہے اور اس کا تقریباً تمام تر انحصار نہروں سے آبپاشی پر ہے، جو دریائے سندھ اور اس کے پانچ معاون دریاؤں سے نکالی گئی ہیں۔ تین مغربی دریا ــــ سندھ جہلم اور چناب ــــ ریاست جموں و کشمیر سے پاکستان میں داخل ہوتے ہیں اور تین مشرقی دریا ــــ راوی، بیاس اور ستلج ــــ ہندوستان سے پاکستان کی طرف بہتے ہیں۔ فی الحقیقت سندھ کا دریائی نظام ہی مغربی پاکستان کے لیے آبِ حیات ہے۔ اس کے زندگی بخش پانی کے بغیر مغربی پاکستان اپنی ساڑھے چار کروڑ آبادی کے عشرِ عشیر کا بھی کفیل نہیں ہوسکتا۔ اس کے برعکس ہندوستان میں کئی دریائی نظام ہیں، جو بڑی حد تک کسی استفادہ کے بغیر سمندر میں جاگرتے ہیں، مزید براں اس کے بیشتر علاقے میں اس قدر بارش ہوجاتی ہے کہ

آبپاشی کے بغیر بھی زرعی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔

قدیم زمانے سے طاس سندھ طغیانی کے پانی اور سیلابی نہروں سے سیراب ہوتا رہا ہے۔ پچھلی ایک صدی میں انگریز انجینیروں کی رہنمائی میں دریاؤں پر ہیڈ ورکس کی تعمیر اور نہروں کا جال بچھا دینے سے آبپاشی میں بڑی توسیع ہوئی۔ خوشحال نوآبادیاں قائم ہو گئیں۔ کپاس، گندم، چاول اور گنے کی کاشت دور دور تک پھیل گئی۔ نئے شہر آباد ہو گئے۔ باغات اور لہلہاتے ہوئے کھیت ہر طرف نظر آنے لگے۔ دنیا بھر میں کسی دریائی نظام سے اتنی زمین سیراب نہیں ہوتی جتنی سندھ کے دریائی سلسلے سے۔

تقسیم سے پہلے تقریباً ۳ کروڑ ۷۰ لاکھ ایکڑ رقبہ سندھ کے دریائی سلسلے سے سیراب کیا جاتا تھا۔ اس میں سے ۲ کروڑ ۱۰ لاکھ ایکڑ رقبہ پاکستان میں ہے۔ اس کے علاوہ مغربی پاکستان میں کم از کم ۵ کروڑ ۵۰ لاکھ ایکڑ اراضی پر مشتمل ایسے صحرائی علاقے ہیں، جن کے لئے اگر حسب مراد پانی مل جائے تو انہیں زیر کاشت لایا جا سکتا ہے۔ دریاؤں میں رواں پانی ــــ یعنی وہ پانی جو بند تعمیر کئے بغیر دریاؤں سے میسر آ سکتا ہے ــــ تقریباً سارے کا سارا آبپاشی کی ان سکیموں میں استعمال کر لیا گیا تھا جو تقسیم ہند سے پہلے مکمل ہو چکی تھیں یا پلان کی جا چکی تھیں۔ پورے موسم سرما کے دوران میں، اور بہار اور خزاں کے اہم دنوں میں جب ربیع اور خریف کی فصلوں کو پانی کی بیک وقت ضرورت ہوتی ہے۔ موجودہ نہروں کے ذریعے دریاؤں کا سارا بہاؤ صرف ہو جاتا تھا۔ اے۔ ایم۔ آر مانٹیگ نے بطور چیف انجینیر ۱۹۴۶ء میں اپنی رپورٹ میں لکھا تھا: "سال کے بیشتر حصوں میں پنجاب کے لئے میسر پانی کا ایک ایک قطرہ فصلوں کو سیراب کرنے کے لئے دریاؤں سے لے لیا جاتا ہے"۔ چونکہ سال بہ سال دریاؤں کے بہاؤ میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے، بعض سالوں میں کئی ایک نہروں میں پانی کی شدید کمی ہوتی تھی۔

جولائی اور اگست میں برسات کے دوران میں دریا طغیانی میں ہوتے ہیں اور پانی کی بے پایاں مقدار سمندر میں جا گرتی ہے۔ موسم گرما کے ان سیلابوں سے استفادہ کے لئے بڑے بڑے بند درکار ہیں۔ ایسے منصوبوں پر بہت زیادہ لاگت آتی ہے۔ ان کی تکمیل میں کئی سال لگتے ہیں اور وہ صرف موزوں مقامات پر ہی تعمیر ہو سکتے ہیں۔ تقسیم سے پہلے اس نوعیت کا صرف ایک ہی منصوبہ تھا وہ مشرقی پنجاب میں دریائے ستلج پر بھاکڑہ ڈیم تھا۔ اس میں پانی کے ذخیرہ کی گنجائش ۴۰ لاکھ ایکڑ فٹ تھی۔ لیکن اس کی منظوری سے قبل زیریں دریا صوبہ سندھ نے یہ شکایت کی تھی کہ بھاکڑہ ڈیم کی تعمیر سے اس کی

سیلائی نہروں کی آبپاشی میں کمی واقع ہو جائے گی۔

طاس سندھ کے پانی پر مختلف صوبوں اور ریاستوں کے حقوق کا تعین کرنے کیلئے حکومت ہند نے سر بی۔ این راؤ کی صدارت میں جو بعد میں بین الاقوامی عدالت کا جج بھی بنا ایک کمیشن قائم کیا۔ راؤ کمیشن نے فریقین کے متعلقہ حقوق کے سلسلے میں "منصفانہ حصہ داری" کا اصول وضع کیا۔ یہ اصول ایک مشترک طاس والے دریا کے ملکوں کے حقوق کے تعین میں بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ ہے اس اصول میں یہ قاعدہ بھی شامل ہے کہ بالائی حصہ دریا والا ملک کسی ایسے اقدام کا مجاز نہیں، جو زیریں حصے کے موجود نظام آبپاشی میں خلل اندازی کرے۔

پنجاب کے خطِ تقسیم نے طاس سندھ کے دریاؤں اور نہروں کو آرپار کاٹ دیا تھا اور ہندوستان کو بالائی حصہ اور پاکستان کو زیریں حصہ بنا دیا تھا تقسیم پنجاب سے پیدا ہونے والے مسائل طے کرنے کے لئے جو متعدد سرکاری کمیٹیاں قائم کی گئی تھیں۔ ان میں "بی" کمیٹی بھی شامل تھی۔ یہ کمیٹی مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب کے مساوی تعداد میں افسروں پر مشتمل تھی۔ اسے مشترکہ املاک کے آئندہ انتظام اور دوسری املاک کی تقسیم اور ان کی مالیت کے مسائل طے کرنے تھے۔ "بی" کمیٹی نے اپنی رپورٹ کے پندرھویں پیرا میں اپنے ارکان کی متفقہ رائے سے یہ لکھا کہ "کمیٹی اس امر پر متفق ہے کہ دونوں صوبوں اور مختلف نہروں میں پانی کی منظور شدہ مقدار میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی"۔ اس طرح کمیٹی نے آبی وسائل کی اس تقسیم کو برقرار رکھنے پر اتفاق کیا جو تقسیم ہند سے پہلے تھی، لیکن کمیٹی میں ان نہروں کی مالیت پر اتفاقِ رائے نہ ہو سکا۔ جن کے ذریعے پانی تقسیم کیا جاتا تھا اور نہ ہی کمیٹی ان سرکاری بنجر زمینوں کی مالیت پر متفق ہو سکی جو سیراب کی گئی تھیں۔

"بی" کمیٹی کی رپورٹ پنجاب تقسیم کمیٹی کے سامنے پیش ہوئی، جس کا صدر گورنر تھا اور جو مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب کے وزارتی نمائندوں پر مشتمل تھی۔ تقسیم کمیٹی نے وہ معاملات قبول کرلئے، جن پر "بی" کمیٹی میں اتفاق رائے ہو گیا تھا۔ یعنی کہ نہری پانی کے مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب کے قبل از تقسیم حصوں کو برقرار رکھا جائے۔ اس نے "بی" کمیٹی کے دو ارکان کو پندرھویں پیرا کی دفعات پر عمل درآمد کے لئے مامور کر دیا۔ ان دفعات کا تعلق ہر علاقے اور نہر میں پانی کی بہم رسانی برقرار رکھنے سے تھا۔ لیکن تقسیم کمیٹی میں بھی "بی" کمیٹی کی طرح نہری نظام کی مالیت پر اتفاقِ رائے نہ ہو سکا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ سرکاری بنجر زمینوں کی مالیت کے متعلقہ مسئلہ کی طرح یہ مسئلہ بھی ثالثی ٹریبونل کے سامنے پیش کر دیا جاتے۔ یہ سب کچھ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے

قبل تقسیم کے ایام میں ہوا۔

چونکہ ہندوستان اور پاکستان کے مشترک دریاؤں سے حاصل شدہ نہری پانی کی تقسیم پر کوئی اختلاف رائے نہیں تھا لہٰذا یہ مسئلہ ثالثی ٹربیونل کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔

۱۷ راگست ۱۹۴۷ء کو جب سرحدوں کے بارے میں ثالثی فیصلہ کا اعلان کیا گیا تو یہ معلوم ہوا کہ ریڈکلف نے نہ صرف مسلم اکثریت کے بہت بڑے علاقے ہندوستان کو بخش دیئے ہیں بلکہ سرحدی خط اس طرح کھینچا ہے کہ دریائے راوی پر مادھوپور ہیڈورکس اور دریائے ستلج پر فیروزپور ہیڈورکس دونوں ہی ہندوستان کی جانب رہ گئے ہیں۔ اوّل الذکر سے اپر باری دوآب کے سلسلہ انہار کو کنٹرول کیا جاتا تھا اور مغربی پنجاب کی سنٹرل باری دوآب کی نہریں اسی سلسلہ کی کڑیاں تھیں۔ موخرالذکر مغربی پنجاب کی دیپالپور نہر اور ریاست بہاولپور کے ایک حصہ کو سیراب کرنے والی ایسٹرن گریے نہر کو کنٹرول کرتا تھا۔ سرحد پنجاب سے متعلق اپنے ثالثی فیصلہ میں ریڈکلف نے لکھا:۔

"اس علاقہ میں سرحد کے تعین کے کام میں نہری نظام کی موجودگی سے مزید پیچیدگی پیدا ہوگئی تھی۔ یہ نہری نظام پنجاب کی زندگی کے لئے ازحد اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن اس کی تعمیر و ترقی ایک واحد حکومت کے تصور کے تحت ہوئی ہے میں سمجھتا ہوں کہ میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ فرض کر لینے میں حق بجانب ہوں کہ ان نہروں کے پانی میں حصہ داری کے یا کوئی دوسرے معاہدے ہوں گے، ان کا ہر وہ حکومت احترام کرے گی جسے بعدازیں متعلقہ ہیڈورکس پر اختیار حاصل ہوگا۔"

باوجود اس کے کہ ریڈکلف ایوارڈ نے پاکستان کے لئے ازحد اہم ہیڈورکس کا کنٹرول ہندوستان کے ہاتھوں میں دے دیا تھا۔ کمیٹی "بی" اور پنجاب تقسیم کونسل میں جو سمجھوتا ہوا تھا، اس پر مغربی پنجاب کی حکومت یہ اطمینان محسوس کرتی رہی کہ تقسیم سے قبل ملنے والے پانی کے حصوں میں تغیر و تبدل نہیں کیا جائے گا۔ نہری پانی میں مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب کے ٹھیک ٹھیک حصوں کے تعین کے لئے کوئی باقاعدہ دستاویز مرتب نہیں کی گئی جس پر فریقین کے دستخط ثبت ہوتے۔ مغربی پنجاب کے وزیروں اور ان کے افسروں کو مشرقی پنجاب کے وزیروں اور افسروں کے کردہ اعلانات پر پورا اعتماد تھا کہ نہری پانی کے قبل از تقسیم انتظامات میں تبدیلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ثالثی ٹربیونل کے سامنے جب نہری نظام کی بابت کا مسئلہ پیش ہوا تو وہاں بھی

مشرقی پنجاب کے نمائندوں نے ایسے ہی اعلانات کئے۔ درحقیقت، جیسا کہ بعد میں واقعات سے ظاہر ہوا، مشرقی پنجاب کے وزیر اور افسر پاکستان پر مہلک ترین وار کرنے کی تدبیر سوچ رہے تھے اور شیریں بیانی سے حکومتِ مغربی پنجاب کو نیند کی آغوش میں ڈالنے کے لئے لوریاں سنا رہے تھے۔ وہ اس دن کا انتظار کر رہے تھے جب ۳۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ثالثی ٹربیونل کی میعاد ختم ہو جائے گی۔ مشرقی پنجاب والوں نے شاطرانہ فریب کی چال چلی اور مغربی پنجاب والوں نے اپنے فرض سے غفلت برتی، سہل انگاری سے کام لیا اور حزم و احتیاط کے فقدان کا مظاہرہ کیا ـــــ اس کے نتائج پاکستان کے لئے تباہ کن ثابت ہوئے۔

یکم اپریل ۱۹۴۸ء کو، جب ایک دن پہلے ثالثی ٹربیونل کا وجود ختم ہو چکا تھا، حکومتِ مشرقی پنجاب نے پاکستان میں آنے والی ہر نہر میں پانی کی رسد منقطع کر دی۔ اس اقدام سے سنٹرل باری دوآب کا نہری نظام، دیپال پور کا نہری نظام اور ریاست بہاولپور کی نہری شاخ متاثر ہوئیں۔ سر پیٹرک سپنس نے، جو ثالثی ٹربیونل کا صدر تھا، ۲۳ فروری ۱۹۵۵ء کو ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن اور اوورسیز لیگ کے مشترکہ اجلاس منعقدہ لندن میں تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

> "مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ کیا پانی کی مسلسل بہم رسانی کے بارے میں کسی حکم کا اجرا مناسب نہیں ہوگا؟ لیکن (ہندوستان اور پاکستان) دونوں کے اٹارنی جنرلوں نے ہمیں اس بنا پر فیصلہ کرنے کے لئے کہا کہ پانی کی موجودہ بہم رسانی میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ میرے ساتھی ججوں نے جو ثالثی فیصلہ کیا، اور جس میں میرا کوئی حصہ نہ تھا، وہ انہوں نے اسی اساس پر کیا۔ ہمارے ثالثی فیصلے مارچ ۱۹۴۸ء کے اواخر میں شایع کر دیئے گئے۔ میں اس ضمن میں کچھ اور نہیں کہوں گا، سوائے اس کے کہ مجھے اس بات سے سخت صدمہ پہنچا کہ ہمارے ثالثی فیصلے کے بعد ایک یا دو دن کے اندر ہی اس اساس کی شدید خلاف ورزی کی گئی، جس پر ہمارے ثالثی فیصلے صادر کئے گئے تھے۔"

صورتِ حال کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ثالثی ٹربیونل نے اپنے فیصلہ میں ہندوستان کے اس دعویٰ کو اصولاً قبول کر لیا کہ سرکاری حساب کتاب میں نہری نظام کی جو قیمت درج ہے۔ اس کی بنا پر پاکستان کے حصے کا تعین نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس سے کہیں زیادہ رقم پاکستان کے ذمے ڈالنی چاہئے۔ ٹربیونل نے

یہ فیصلہ اس بنا پر کیا تھا کہ پانی کی تقسیم میں موجودہ حصوں کا احترام کیا جائے گا کیونکہ پانی کے بغیر نہریں محض خشک کھائیاں ہوں گی۔ جو قیمتی اثاثہ نہیں بلکہ اس کے برعکس معیشت پر بار ہوں گی۔ ٹربیونل نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ چونکہ نہروں کی بدولت سرکاری بنجر اراضی کی قیمت بڑھ گئی ہے اس لئے ہندوستان کے ساتھ حساب فہمی میں یہ بڑھی ہوئی قیمت پاکستان کے ذمے لگائی جائے گی۔

جونہی ثالثی ٹربیونل کا وجود ختم ہوا۔ ہندوستان کے نمائندہ نے اس کے سامنے جو وعدے کئے تھے کہ "پانی کی موجودہ بہم رسانی میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی" وہ سب کے سب بھلا دیئے گئے اور پاکستان کی نہروں سے پانی کی رسد روک لی گئی۔ ان نہروں سے ساڑھے سولہ لاکھ ایکڑ اراضی سیراب کی جاتی تھی۔ مشرقی پنجاب نے اب یہ دعویٰ کیا کہ دریاؤں اور نہروں کے پانی پر پاکستان کا کوئی حق نہیں ہے اور نہروں کو دوبارہ کھولنے کے لئے حقوقِ مالکانہ کی قیمت ادا کرنے کی شرط عائد کر دی۔ پاکستان پر سخت مصیبت آ پڑی جو روز بروز زیادہ ناقابلِ برداشت ہوتی گئی۔ کئی وسیع علاقوں میں جہاں زیرِ زمین پانی کھاری ہے۔ وہاں پینے کے لئے بھی پانی نہیں ملتا تھا۔ لاکھوں انسان اپنی فصلوں کی بربادی، مویشیوں کے اتلاف اور پانی کی قلت کے باعث ہلاکت کے خطرے سے دوچار ہو گئے۔

پریشانی کے اس عالم میں اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے کے لئے پاکستان سے ایک وفد اوائل مئی ۱۹۴۸ء میں دہلی گیا۔ اس وفد کے قائد پاکستان کے وزیرِ خزانہ غلام محمد تھے اور اس میں مغربی پنجاب کے دو وزیر شوکت حیات خان اور ممتاز دولتانہ شامل تھے۔ دہلی میں مذاکرات کے دوران میں مشرقی پنجاب کے نمائندوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ جب تک مغربی پنجاب اس بات کو تسلیم نہیں کرے گا کہ اس کا پانی میں کوئی حق نہیں ہے۔ وہ نہروں میں پانی بحال کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ مغربی پنجاب کے نمایندے اسے منظور نہیں کر سکتے تھے۔ پاکستان کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی کہ دونوں حکومتیں اپنے اختلافات ثالثی فیصلہ کے لئے بین الاقوامی عدالت کے سامنے پیش کر دیں۔ ہندوستان نے یہ تجویز منظور نہ کی۔ معاملہ لاینحل ہوتا نظر آیا۔ غلام محمد نے مونٹ بیٹن سے استدعا کی جس نے نہرو سے مشورہ کیا۔ اس کے بعد غلام محمد کے سامنے ایک بیان رکھ دیا گیا کہ وہ کسی لفظ یا شوشہ کو تبدیل کئے بغیر اس پر دستخط کر دیں —— پانی کی بحالی اس سے مشروط تھی۔

۴ مئی ۱۹۴۸ء کو اس بیان پر دستخط کر دیئے گئے۔ پاکستان کی طرف سے غلام محمد اور مغربی پنجاب

کے دو وزیروں نے دستخط کئے اور ہندوستان کی طرف سے نہرو اور مشرقی پنجاب کے دو وزیروں نے۔ اس بیان میں یہ کہا گیا کہ متعلقہ قانونی مسائل سے قطع نظر دونوں حکومتیں خواہاں ہیں کہ اس قضیے کو عملی انداز سے طے کیا جائے۔ مشرقی پنجاب کی حکومت مغربی پنجاب کی سنٹرل باری دوآب اور دیپالپور نہروں میں پانی کی رسد بتدریج کم کرے گی تاکہ حکومتِ مغربی پنجاب کو متبادل وسائل سے استفادہ کے لئے معقول مہلت مل جائے۔ بیان میں یہ اعلان بھی کیا گیا کہ ان نہروں میں پانی بحال کیا جا رہا ہے اور مغربی پنجاب بعض متنازعہ فیہ ادائیگیوں کے لئے بطور پیشگی "اتنی رقم علی الحساب جمع کرا دے گا جس کا تعین وزیر اعظم ہندوستان کرے گا۔" اور یہ کہ ہر فریق کی طرف سے اس مسئلہ کے قانونی اور دوسرے پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد مزید مذاکرات کئے جائیں گے۔ آخر میں دونوں حکومتوں نے یہ امید ظاہر کی کہ اس مسئلہ کو دوستانہ طور پر حل کر لیا جائے گا۔

اگرچہ ہندوستان نے دیپالپور نہر اور سنٹرل باری دوآب کی اہم شاخوں میں پانی کی رسد بحال کر دی لیکن ریاست بہاولپور کی ایک چھوٹی نہر اور سنٹرل باری دوآب نظام کی نو چھوٹی شاخوں کو پانی سے محروم رکھا۔ آخر کار ریاست بہاولپور میں کافی علاقے پھر سے آباد صحرا بن کر رہ گئے۔ پاکستان نے اس بندوبست کو بامر مجبوری قبول کیا تھا لیکن پھر بھی پاکستان نے اپنا فرض ادا کیا' اور وزیر اعظم ہندوستان نے جن رقوم کا تعین کیا انہیں جمع کرا دیا۔ بعد میں نہرو نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے اس بات کی تردید کی کہ اس معاملہ میں جبر کیا گیا تھا۔ ستمبر ۱۹۵۰ء میں لیاقت علی خان کو ایک خط میں نہرو نے لکھا: "آپ کی حکومت کے مراسلے میں یہ کہا گیا ہے کہ ۴ مئی ۱۹۴۸ء کے بیان کو پاکستان نے "جبر کے تحت" قبول کیا تھا۔ اس بات سے مجھے بہت تعجب اور رنج ہوا ہے۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ان حالات میں جبر روا رکھنے کا کوئی سوال پیدا ہو سکتا تھا۔ اس وقت پانی روکنے کے بارے میں کسی قسم کی دھمکی بلکہ تجویز تک بھی نہیں تھی۔"

۴ مئی کے بیان میں دونوں ملکوں کی حکومتوں کے مابین جو مزید مذاکرات پیش نظر تھے۔ ان کے سلسلے میں ایک مجلس جولائی ۱۹۴۸ء میں لاہور میں منعقد ہوئی۔ اس مجلس میں ہندوستان نے پھر یہ موقف اختیار کر لیا کہ "مشرقی پنجاب میں دریاؤں پر مالکانہ حقوق تمام تر حکومتِ مشرقی پنجاب کو حاصل ہیں" اور یہ تجویز پیش کی کہ اس بات کو ایک حتمی معاہدہ میں شامل کر دیا جائے جو ہر دو فریق کے قانونی حقوق اور واجبات کا قائم مقام ہوگا۔ ظاہر ہے اس بنیاد پر کوئی اتفاق رائے نہیں ہو سکتا تھا۔ دونوں وزرائے اعظم کے مابین خط و کتابت سے مفاہمت کی منزل قریب نہ آ سکی۔ ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو نہرو نے ایک تار بھیجا' جس میں یہ مطالبہ کیا کہ ۴ مئی کے بندوبست کی یوں تعبیر کی جائے کہ "حکومتِ مشرقی پنجاب کو مغربی پنجاب کے لئے پانی

کی رسد میں بتدریج کمی کرنے کا حق حاصل ہے۔" تار میں مزید کہا گیا تھا کہ "دونوں حکومتوں کے نمایندوں کے مابین مزید مذاکرات مغربی پنجاب کی طرف سے اس حق کو تسلیم کر لینے کی بنا پر ہوں گے۔" نہرو نے انتباہ کیا کہ "اگر کسی ایک فریق نے اس معاملے میں نا واجب تاخیر روا رکھی' تو دوسرا فریق معقول نوٹس دے کر موجودہ بندوبست کو ختم کر دینے کا مجاز ہوگا۔" دوسرے الفاظ میں اگر پاکستان نے جلد ہی ہندوستان کے دعویٰ کو قبول نہ کیا تو ہندوستان اس بندوبست کو ختم کر دے گا اور ایک مرتبہ پھر پانی کی رسد منقطع کر دے گا۔ پاکستان کی طرف سے ہندوستان کی تعبیر قبول کرنے کا معنیٰ یہ ہوتا کہ پاکستان ہمیشہ کے لئے اپنے قانونی حقوق سے دستبردار ہو گیا ہے پاکستان نے اس تنازع کے قانونی نکات کو بین الاقوامی عدالت میں پیش کرنے کی پیشکش کی۔ لیکن ہندوستان نے انکار کر دیا۔

دونوں حکومتوں میں براہ راست بات چیت سے بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اگست ۱۹۴۹ء میں ایک کانفرنس میں صرف اس امر پر اتفاق رائے ہوا کہ ایک اور کانفرنس منعقد کرنی چاہئے چنانچہ مارچ ۱۹۵۰ء کے اواخر میں ہندوستان اور پاکستان کے نمایندوں کی کراچی میں ملاقات ہوئی۔ میں اس کانفرنس میں پاکستانی وفد کے قائد کی حیثیت میں شامل ہوا۔ میں نے تنازعہ کے تصفیہ کے لئے خالصتاً عملی بنیاد تلاش کرنے کی کوشش کی۔ میں نے یہ تجویز پیش کی کہ پانی کی موجودہ ضروریات کو موجودہ ذرائع سے پورا کیا جائے اور نئی رسد کا انتظام ستلج، بیاس، راوی اور چناب پر بندوں کی تعمیر سے سیلاب کے اس پانی کو روک کر کیا جائے' جو اب سمندر میں جا گرتا ہے۔ ان بندوں کی تعمیر کے اخراجات کا حصّہ اس نسبت سے ادا کیا جائے گا۔ جس تناسب سے فواید اٹھائے جائیں گے اور متعلقہ حقائق کی روشنی میں پانی کی نئی رسد کی منصفانہ تقسیم کی جائے گی۔ ہندوستان کے وفد میں اے، این کھوسلہ بھی شامل تھا۔ وہ برقی طاقت، انہار اور جہاز رانی کے مرکزی کمیشن کا صدر تھا۔ اس نے یہ تجویز پیش کی کہ ستلج کا پانی' جس پر بھاکڑا ڈیم تعمیر کیا جا رہا تھا' تمام تر ہندوستانی علاقوں میں استعمال کیا جائے لیکن بیاس، راوی اور چناب کے پانی کو ہندوستان کے حق میں بعض جزوی تبدیلیوں کے ساتھ پاکستان میں موجودہ آبپاشی کو برقرار رکھنے کے لئے استعمال کیا جائے۔

پاکستانی نہروں میں پانی کی رسد میں اگر کوئی کمی ہو' تو اس کی تلافی دریائے چناب سے رابطہ نہر (لنک) کے ذریعہ کر لی جائے۔ چناب کا سارا پانی پاکستان کو میسر رہے گا۔ اگر ضرورت محسوس ہو تو دریائے چناب پر بند تعمیر کرنے سے کمی کو پورا کیا جا سکتا ہے بلکہ آبپاشی میں توسیع بھی کی جا سکتی ہے۔ اس امر پر اتفاق ہو گیا کہ دونوں

ملکوں کے انجینیر دونوں تجویزوں کا جائزہ لیں گے۔ اور بعد ازاں مئی ۱۹۵۰ء میں ایک اور کانفرنس دہلی میں ہوگی
مارچ کی کانفرنس کے آخر میں مجھے معقول سمجھوتے کی کچھ امید ہوگئی تھی لیکن دو ماہ بعد جب میں دہلی پہنچا تو فضا بالکل بدلی ہوئی تھی۔ کراچی میں جن خطوط پر بات چیت ہوئی تھی۔ ہندوستانی نمایندے اب ان خطوط پر آگے بڑھنے کو آمادہ نہیں تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ نہ صرف دریائے ستلج کے تمام قابلِ استعمال پانی کو اپنے کام میں لائیں گے بلکہ بیاس اور راوی کے پانی کو بھی، اور اس کے علاوہ مارو کے مقام پر ٹنل تعمیر کرکے دریائے چناب سے بھی دس ہزار کیوسک پانی لے لیں گے۔ دوسرے الفاظ میں ہندوستان وہ تمام پانی لینا چاہتا تھا۔ جو وہ ممکن طور پر لے سکتا تھا اور پاکستان کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ ستلج، بیاس اور راوی سے مدت مدید سے مغربی پاکستان میں ۵۰ لاکھ ایکڑ سیراب ہوتے رہے تھے۔ جن پر ۵۰ لاکھ سے زاید آبادی کا انحصار تھا۔ ہندوستان اب ان لوگوں کو ہلاکت کے خطرے سے دوچار کر رہا تھا۔ میں نے نہرو سے ملاقات کی اور اس کی حکومت کے اندازِ فکر سے جو نتائج پیدا ہونے والے تھے وہ اس کے سامنے بیان کئے اس کے ہاں وہ روح پرور جذبات تو فراواں تھے جن سے بیگانہ لوگ اتنے متاثر ہو جاتے ہیں اور انسان نواز حل کے لئے بھی اس نے بڑی خواہش ظاہر کی، لیکن مسئلہ زیر بحث میں میں اس کا دل بدل نہ سکا۔

یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے مابین مذاکرات سے پانی کی تقسیم پر کوئی مفاہمت نہیں ہو سکے گی۔ قانونی حقوق کا مسئلہ حل کرنا اور بھی مشکل تھا۔ پاکستان نے کئی بار ہندوستان سے یہ کہا تھا کہ یہ مسئلہ ثالثی کے لئے عالمی عدالت کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ ہندوستان نے ہر بار انکار کر دیا تھا۔ ۱۹۴۸ء مئی کا عارضی بندوبست سمجھوتے کی راہ صاف کرنے کی بجائے سدِ راہ بن گیا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں جب ہندوستان نے اسے معاہدہ نمبر ۷۹۴ کے طور پر اقوامِ متحدہ میں درج کرایا تو پاکستان نے اقوامِ متحدہ پر اس کی حقیقی ماہیت واضح کر دی اور اس امر کی تصدیق کر دی کہ یہ بندوبست ختم کیا جا چکا ہے۔

اقوامِ متحدہ کے منشور کے تحت فریقین کو قانونی تنازعات میں بالعموم بین الاقوامی عدالت سے رجوع کرنا چاہئے۔ پاکستان نے یہ تنازعہ عالمی عدالت میں کیوں پیش نہ کیا؟ اس کی مختصراً وضاحت ضروری ہے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہند جمعیت الاقوام کا رکن بن گیا تھا اور اس نے بھی برطانوی دولتِ مشترکہ کے دوسرے ملکوں کی طرح بین الاقوامی عدالت کے لازمی اختیارِ قانونی کو تسلیم کر لیا تھا، سوائے ان تنازعات کے، جو دولتِ مشترکہ کے ارکان کے مابین ہوں گے۔

یہ فرض کرلیا گیا تھا کہ دولتِ مشترکہ جن اقوام پر مشتمل ہے، ان کی اپنی برادری میں ہی باہمی تنازعات کا تصفیہ ہوجایا کرے گا۔ جب برصغیر کو دو آزاد و خود مختار ملکوں میں تقسیم کیا گیا تو ہندوستان کی ڈومینین نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ اس سیاسی ہستی کا جانشین ہے جو قبل ازیں ہند سے موسوم تھا۔ اس کے نتیجے میں وہ غیر منقسم ہند کے بین الاقوامی حقوق اور ذمہ داریوں کا وارث بن گیا۔ ان میں دولتِ مشترکہ کے ارکان کے باہمی تنازعات کے سوا بین الاقوامی عدالت کا لازمی اختیارِ قانونی بھی شامل تھا۔ اگرچہ دولتِ مشترکہ نے اپنے ارکان کے مابین تنازعات کا تصفیہ کرانے میں اپنی بے بسی ظاہر کردی تھی لیکن اس پرانے استثنا کے باعث جب تک ہندوستان رضامند نہ ہوتا۔ پاکستان نہری پانی کے تنازعہ کو بین الاقوامی عدالت میں نہیں لے جاسکتا تھا۔ چونکہ ہندوستان کو معلوم تھا کہ بین الاقوامی قانون کی رُو سے اُس کا موقف ناجایز ہے۔ اس لئے وہ رضامند نہیں ہوتا تھا۔

بالآخر ستمبر ۱۹۵۰ء میں حکومتِ ہندوستان نے قانونی مسائل کو عدالتی فیصلے کے سپرد کردینا منظور کرلیا۔ لیکن عالمی عدالت یا کسی اور غیر جانبدار ادارہ کے ذریعے نہیں بلکہ ایک ایسی عدالت کے ذریعہ، جو دو ہندوستانی اور دو پاکستانی ججوں پر مشتمل ہوگی۔ جب وزیر اعظم پاکستان نے اس عدالت کے لئے غیر جانبدار صدر مقرر کرنے کی تجویز پیش کی، تو اس کے جواب میں نہرو نے کہا: "ابتداً ہی تیسرے فریق کے بارے میں سوچنے کا مطلب دوسروں پر مسلسل انحصار کا اعتراف ہوگا۔ یہ بات کسی طرح باوقار اور خود دار اقوام کے شایانِ شان نہیں۔" نہرو اس بات کے لئے بھی آمادہ نہیں تھا کہ جن مسائل پر پہلی عدالت میں اتفاق نہیں ہوگا ان کے بارے میں کسی اور عدالت سے رجوع کیا جاسکے گا۔ جس کا صدر غیر جانبدار ہوگا۔ صاف ظاہر تھا کہ ہندوستان کا مقصد اس وقت تک گفت وشنید کو طول دیتے جانا تھا۔ جب تک بھاکڑہ ڈیم، راجستھان نہر اور دوسری تعمیرات پر کام پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ جاتا۔ اور پاکستان اپنے اہم آب رسانی کے وسائل سے محروم ہوجاتا۔

اس اثنا میں پاکستان کو محروم کرکے ہندوستان پانی میں اپنے حصّے کو بالجبر بڑھاتا جارہا تھا۔ پاکستانی نہروں میں پانی کی رسد ان نازک اوقات میں کم کردی جاتی تھی، جب فصلیں کاشت کی جاتی تھیں یا پکنے والی ہوتی تھیں۔ ستلج اور بیاس کے سنگم ہریکے میں ایک ہیڈورکس تعمیر کیا جارہا تھا اور اس کے ذریعے ہندوستان کے مزید علاقے سیراب کئے جانے تھے۔ بھاکڑہ ڈیم کی بلندی اور ذخیرہ کی گنجائش قبل از تقسیم منصوبے سے بدرجہا زیادہ بڑھادی گئی تاکہ سیلاب کے دنوں میں دریائے ستلج کے سارے پانی کا ذخیرہ کیا جاسکے۔ بھاکڑہ

ڈیم بہ حیثیت موجودہ دنیا کا سب سے اونچا بند ہے۔ اس کی بلندی ۴۰۰ فٹ ہے، جو امریکہ کے مشہور زمانہ ہُوور ڈیم سے بھی ۴۰ فٹ زیادہ ہے۔ اس میں ۸۰ لاکھ ایکڑ فٹ پانی کا ذخیرہ کیا جا سکتا ہے۔ ابتدائی منصوبہ میں ۴۳ لاکھ ایکڑ فٹ کا اہتمام کیا گیا تھا۔

ہندوستان کی طرف سے پانی کی رسد منقطع کر دینے کی مسلسل دھمکیوں سے محفوظ ہونے اور مختلف نوآباد علاقوں میں آبپاشی کا یکساں اہتمام کرنے کے لئے پاکستان نے اپنے خرچ سے چند رابطہ نہریں مثلاً بلوکی سلیمانکی لنک بنائیں۔ لیکن ان رابطہ نہروں سے مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہو سکتا تھا۔ بند تعمیر کرنے کے لئے موزوں مقامات کی تلاش ازحد ضروری تھی۔ ہندوستان کی طرف سے نہری پانی کی بندی کے فوراً بعد میں نے مغربی پنجاب کے انجنیئروں سے کہا کہ وہ جہلم اور سندھ دریاؤں پر بند تعمیر کرنے کی جگہوں کا جائزہ لیں۔ ان میں جہلم پر منگلا کا مقام بہت اُمید افزا تھا۔ دریائے سندھ پر پہلے درہ بند کا مقام پسند کیا گیا، لیکن بعد کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ تربیلا زیادہ موزوں جگہ ہوگی۔ حکومتِ پاکستان نے منگلا ڈیم کی منظوری دے دی، اور اس کے ڈیزائن اور تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا۔ اگرچہ جب تک ہندوستان سے جھگڑے کا تصفیہ نہ ہو جاتا، کوئی غیر ملکی امداد نہیں مل سکتی تھی۔

۱۹۵۱ء میں امریکہ کی ٹینیسی ویلی اتھارٹی کے سابق سربراہ ڈیوڈ للینتھال نے ہندوستان اور پاکستان دونوں کا دورہ کیا، اور اپنے تاثرات ایک مضمون کی صورت میں مرتب کئے جو اگست ۱۹۵۱ء میں جریدہ "کولیئرز" میں شائع ہوا۔ اس نے نہری پانی کے تنازعہ کو "خالص ڈائنامائٹ ـــ پنجاب کا بارود دان" قرار دیا اور یہ انتباہ کیا کہ "جب تک یہ آتشگیر مواد موجود ہے۔ برّصغیر ہندوستان و پاکستان میں امن کی توقع عبث ہے"۔ اس نے آگے چل کر لکھا:-

> "آبپاشی کے لئے پانی نہ ملنے سے مغربی پاکستان ریگستان بن جائے گا۔ ۲ کروڑ ایکڑ اراضی ایک ہفتے کے اندر خشک ہو جائے گی اور کروڑوں انسان فاقوں مر جائیں گے۔ جن نہروں سے پاکستان کے کھیت اور لوگ زندگی پاتے ہیں۔ اگر ہندوستان اُن کے سرچشمے مستقل طور پر بند کر دے تو فقط اس ترکیب سے پاکستان کی سرزمین اس طرح تباہ و برباد ہو جائے گی کہ کوئی فوج بموں اور توپوں کی گولہ باری سے بھی اتنی مکمل غارت گری نہیں کر سکتی"۔

لیلین تھال نے اپنے مضمون کے آخر میں ایک تعمیری تجویز پیش کی۔

"کہ آغاز پاکستان کے ان خدشات کا ازالہ ہونا چاہئے کہ وہ پانی سے محروم کر کے پھر سے ریگستان نہیں بنا دیا جائے گا۔ پاکستان اس وقت جس قدر پانی استعمال کر رہا ہے۔ ہندوستان کو اس کی توثیق کر دینی چاہئے بشرطیکہ وہ ہندوستان کے ساتھ تعاون کرے اور مجھے امید ہے کہ پاکستان تعاون کرے گا اگر اس واقعتاً بین الاقوامی دریائی طاس کو انجینیئرنگ کی بنا پر مشترکہ طور پر کام میں لایا جائے اور جیسا کہ حقائق سے واضح ہے اس بنا پر ہندوستان کی آئندہ ضروریات بھی پوری ہو سکیں گی۔ اسلئے یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ تعمیرات میں سرمایہ مشترکہ طور پر لگایا جائے نیز عالمی بنک کی مدد سے۔"

عالمی بنک کے صدر یوجین بلیک کو یہ خیال پسند آیا۔ اس نے ستمبر ۱۹۵۱ء میں ہندوستان اور پاکستان کے وزرائے اعظم کو لکھا کہ اگر ان کی حکومتیں جو لیلین تھال کی تجویز کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہیں تو بنک کی خدمات حاضر ہیں۔ اپنے خط میں اس نے لیلین تھال کی تجویز کے متعلق لکھا کہ:

"ہندوستان اور دوسرے ذرائع کو اعلیٰ پیمانے سے تعمیر کرنے اور پروجیکٹ کار تجربہ سے دونوں ملکوں میں وسیع زرعی پیداوار کی ضروریات کو پورا کرنا اس کا مقصود ہے ان کاموں کے لئے سرمایہ کا کچھ حصہ شاید عالمی بنک کو فراہم کرنا ہوگا۔ میرے نزدیک اس کی تجویز کا لب لباب یہ ہے کہ سندھ کے آبی وسائل کو انجینیئرنگ کی اساس پر ترقی دینی چاہئے۔ دونوں ملکوں کا دورہ کرنے اور حکومتوں کی اعلیٰ ترین شخصیتوں سے تبادلہ خیالات کے بعد لیلین تھال کو پختہ یقین ہو گیا ہے کہ آبی ترقیات کا ایسا مشترکہ منصوبہ بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ جس کی نوعیت عملی ہو گی، سیاسی نہیں، اور جس پر پاکستان اور ہندوستان کے پیش آمدہ سیاسی مسائل سے علیحدہ ہو کر عمل درآمد کیا جا سکتا ہے۔"

دونوں حکومتوں نے صدر بلیک کی پیشکش کو قبول کر لیا اور فریقین نے اس بات سے بھی اتفاق کیا کہ جب تک عالمی بنک کے ساتھ مل کر یہ کار مشترک جاری رہے گا۔ وہ کوئی ایسا اقدام نہیں کریں گے۔ جس سے دوسرے فریق کے لئے موجودہ استعمال کے پانی میں کمی واقع ہو جائے۔ اس بات کو بھی تسلیم کر لیا

گیا کہ فریقین کے قانونی حقوق متاثر نہیں ہوں گے۔

ہندوستان نے پانی میں کمی نہ کرنے کا عہد کرنے کے باوجود پاکستانی نہروں میں پانی روکنے اور اپنے ہاں آبپاشی میں توسیع کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اکتوبر اور نومبر ۱۹۵۲ء میں پنجاب میں گندم کاشت کرنے کے اہم موقع پر پاکستان کو اپنے جائز حصے کا صرف ۴۰ فیصد پانی ملا۔ فروری ۱۹۵۳ء میں پاکستان کو اپنے حصے کا صرف ۸ فیصد پانی ملا۔ ہندوستان نے اپنے پورے حصے کے علاوہ پاکستان کے حصے کا بیشتر پانی بھی استعمال کر لیا۔ ہندوستان نے اپر باری دوآب نہر سے نئی شاخیں نکالنے کا اعلان کیا جن سے [illegible] لاکھ ہزار ایکڑ رقبہ سیراب کیا جاتا تھا جو پہلے نہری نہیں تھا۔ ۱۹۵۳ء میں خشک سالی [illegible] بہت کم تھا۔ اور مغربی پنجاب میں پانی کی قلت سے فصلیں سوکھ رہی تھیں لیکن مشرقی پنجاب [illegible] کے نقطہ نظر سے یہ بہترین سال تھا۔ پاکستان تو قحط سالی سے دوچار تھا۔ اور مشرقی پنجاب کا گورنر اعلان کر رہا تھا کہ خوراک کی صورت حال بہت اچھی ہے" اور اناج کی برآمد کے اعداد و شمار پیش کر رہا تھا حالانکہ [illegible] مشرقی پنجاب خوراک کے لحاظ سے کمی کا علاقہ ہوتا تھا۔

پاکستان نے جب اس کیفیت سے عالمی بنک کو مطلع کیا تو صدر بلیک نے [illegible] کہ پانی کی بہم رسانی کے متعلق اطلاعات کی تصدیق کے لئے ایک کمیشن قائم کیا جائے جو عالمی بنک، ہندوستان اور پاکستان کے ایک ایک انجینئر پر مشتمل ہو۔ پاکستان نے یہ تجویز منظور کر لی۔ لیکن ہندوستان نے [illegible] مسترد کر دی۔ صدر بلیک نے یہ متبادل تجویز پیش کی کہ عالمی بنک اپنے انجینئر نامزد کر دے گا جو ہندوستان میں [illegible] ہندوستانی انجینئروں اور پاکستان میں پاکستانی انجینئروں کے ساتھ مل کر کام کریں گے تاکہ [illegible] اعداد و شمار میسر کئے جا سکیں۔ پاکستان نے یہ تجویز بھی منظور کر لی۔ لیکن ہندوستان [illegible] کر دیا۔ ہندوستان نے جس طرزِ عمل کا مظاہرہ تنازعہ کشمیر میں کیا تھا۔ اب اُس کا اعادہ نہری پانی کے تنازعے [illegible] کر رہا تھا۔ اسی طرزِ عمل کی مطابقت میں نہرو نے ۲۰ فروری ۱۹۵۳ء کو اعلان کیا "ہم نے [illegible] پاکستان کو نہری پانی سے محروم نہیں کیا اور نہ ہی ہمارا ایسا ارادہ ہے۔"

عالمی بنک اور پاکستان و ہندوستان کی حکومتوں کے درمیان سالہا سال تک جو [illegible] مذاکرات ہوتے رہے ان کی تاریخ اس کتاب کے موضوع سے باہر ہے۔ عالمی بنک کے زیر اہتمام [illegible] مساعی میں جو تین اہم مراحل ہوئے۔ ان کا مختصر سا خاکہ ہی کافی ہو گا۔

منصوبہ طاسِ سندھ کے کارکنندگان ہندوستان اور پاکستان کے مقرر شدہ انجینیئر اور اُن کے مشیر تھے جنہوں نے عالمی بنک کے نمایندہ اور مشاورین کے ساتھ کم و بیش دو سال تک کام کیا تاکہ سندھ کے دریائی نظام سے استفادہ کا ایک جامع منصوبہ مرتب کیا جا سکے۔ لیکن کوئی مشترک راستہ نہ ملا۔ ہندوستان نے ستلج، بیاس اور راوی دریاؤں کے سارے پانی اور دریائے چناب کے پانی کے ایک حصّے کا دعویٰ کیا۔ وہ پانی کی اس مزید رسد کو طاس سندھ کے باہر وسیع علاقوں کو سیراب کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ یہ نئے علاقے دریائے جمنا سے بجزئی سیراب کئے جا سکتے تھے۔ لیکن اس طرح پاکستان کو حیات بخش پانی سے محروم کرنے کا مقصد پورا نہیں ہوتا تھا۔ پاکستان نے یہ تجویز پیش کی کہ موجودہ استعمال کو برقرار رکھا جائے اور غیر مستعمل فاضل پانی کے دونوں ملکوں میں منصفانہ بنیاد پر حصّے مقرر کر دیئے جائیں۔ بعد میں جو مذاکرات ہوئے ان سے کچھ مراعات بھی سامنے آئیں لیکن کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔

۵ر فروری ۱۹۵۴ء کو دونوں فریقوں کے غور و خوض کے لئے عالمی بنک نے اپنی تجویز پیش کی۔ بنک نے بڑی صاف گوئی سے تسلیم کیا کہ "طاس کی ضروریات پوری کرنے کے لئے پانی کی رسد اور ذخیرہ اندوزی کے امکانات ناکافی ہیں" بنک کی تجویز میں یہ بتایا گیا کہ "اگرچہ ماہرین کی جماعت ایک ہی اقتصادی وحدت کی اساس پر طاس سندھ کی ترقی کا منصوبہ مرتب کر رہی ہے لیکن اس کام کا تعلق دو آزاد و خود مختار حکومتوں سے ہے اور جب معاملہ دو آزاد و خود مختار حکومتوں سے متعلق ہو تو پھر وسائل سے بہترین استفادہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔" لیکن بنک کے خیال میں سب سے اشد دشواری ہندوستان اور پاکستان کے "نقطۂ نظر میں بنیادی اختلاف" سے پیدا ہو رہی تھی۔

بنک کا منصوبہ یہ تھا:۔

> "مغربی دریاؤں (سندھ، جہلم اور چناب) کا سارا پانی صرف پاکستان کے استعمال اور استفادہ کے لئے میسر ہوگا اور پاکستان ان آبی وسائل کو ترقی دے سکے گا ماسوا دریائے جہلم کے پانی کی اس بہت تھوڑی مقدار کے، جو اس وقت کشمیر میں استعمال کی جاتی ہے۔ مشرقی دریاؤں (راوی، بیاس اور ستلج) کا سارا پانی صرف ہندوستان کے استعمال اور استفادہ کے لئے میسر ہوگا اور ہندوستان ہی ان آبی وسائل کو ترقی دے سکے گا۔ ماسوا ایک متعینہ عبوری مدّت کے، جس میں ہندوستان

ایک متفق علیہ پروگرام کے مطابق ان دریاؤں سے پاکستان کو اس قدر پانی بہم پہنچاتا رہے گا، جتنا کہ ماضی میں وہ حاصل کرتا رہا ہے۔"

بنک کے پلان میں :-

"عبوری مدت کی اجازت دی گئی تھی تاکہ اس دوران میں پاکستان رابطہ نہریں بنا سکے، جن کے ذریعہ ہندوستان سے آنے والے پانی کا متبادل انتظام کیا جا سکے گا، ان رابطہ نہروں کی لاگت ہندوستان بھی اس حد تک برداشت کرے گا، جس حد تک وہ ان نہروں سے مستفید ہوگا۔"

عبوری مدت کے لئے تقریباً پانچ سال کا اندازہ لگایا گیا تھا۔

بنک کے منصوبے میں کسی بند کی تجویز شامل نہیں تھی، ماسوا بھاکڑہ ڈیم کے، جو ہندوستان میں زیرِ تعمیر تھا اور جس کی تعمیر صرف ہندوستان کے مقاصد کے لئے ہی تھی۔ اس منصوبے میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ بندوں کی تعمیر کے بغیر بھی پاکستان اس قدر پانی حاصل کرسکے گا جو ماضی میں وہ حاصل کرتا رہا ہے۔ اور بیشتر ستلج ویلی نہروں میں منظور شدہ مقدار تک بہم رسانی کا انتظام مغربی دریاؤں سے کرسکے گا۔

بنک کے منصوبے میں للین تھال کی تجویز سے یکسر انحراف کیا گیا تھا۔ جن نے بند اور دیگر تعمیرات کے ذریعہ طاس سندھ کے آبی وسائل کو ایک ہی وحدت کے طور پر ترقی دینے کا تصور پیش کیا تھا۔ بنک نے اس تصور سے روگردانی کی اور سیاسی سرحدوں کی اساس پر طاس سندھ کے آبی وسائل دو حصوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کردی جس میں امدادِ باہمی سے ترقی کا تصور شامل نہیں تھا۔ عالمی بنک کے نزدیک اس منصوبے کا جواز یہ تھا کہ جب پانی منتقل کرنے کے انتظامات مکمل ہو جائیں گے تو ہر ملک اپنے آبی وسائل کو بروئے کار لانے میں دوسرے سے آزاد ہوگا۔ "بنک کے منصوبے کا مقصد ان پیچیدگیوں سے بچنا تھا، جو دریاؤں کے پانی میں دو ملکوں کی شراکت سے پیدا ہو جاتی ہیں۔

ہندوستان نے بلا تامل بنک کا منصوبہ منظور کرلیا۔ اس منصوبے میں وہ سب کچھ تسلیم کرلیا گیا تھا۔ جو ہندوستان مانگ رہا تھا۔ ماسوا اس کے کہ اسے چناب کے پانی میں کوئی مداخلت نہیں کرنی چاہئے۔ بنک کے منصوبہ کے مطابق ہندوستان نے پاکستان میں رابطہ نہروں کی لاگت کا ایک حصہ ادا کرنا تھا لیکن پانی کی بہت قیمتی بہم رسانی کا یہ بہت ہی معمولی معاوضہ تھا۔ جب ساری معیشت کا انحصار پانی پر ہو تو

روپیہ اس کا بدل نہیں بن سکتا۔

بنک نے پاکستان کو ایک ناقابلِ برداشت صورتِ حال سے دوچار کر دیا۔ بنک پر بہت پرزور طریقے سے یہ واضح کیا گیا کہ مشرقی دریاؤں کا پانی جہاں استعمال ہوتا رہا ہے ان ضروریات کے لئے مغربی دریاؤں میں رواں پانی قطعاً ناکافی ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے بندوں کی تعمیر لازمی ہے لیکن یہ نہ صرف گراں بہا ہوں گے بلکہ ان کے لئے طویل میعاد بھی درکار ہوگی۔ لیکن بنک کے منصوبہ میں ان کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا تھا۔ اگر ایسا اہتمام بھی کر دیا جاتا تو بھی پاکستان میں ذخیرۂ آب کی جو بہت محدود گنجائش تھی وہ صرف موجودہ صورتِ حال کو برقرار رکھنے میں صرف ہو جاتی اور اسے بڑھتی ہوئی آبادی کی فروغ پذیر ضروریات کے لئے استعمال نہ کیا جا سکتا۔ روایتی سرزمینِ عجائب کی ایلس کی طرح پاکستان حتی الوسع سعی تو کرے گا لیکن عملاً اسی مقام پر ہی رہے گا۔ جہاں وہ تھا۔

پاکستان کی فرمائش پر ڈینور (کولوریڈو۔ امریکہ) کے ایک مشاورتی انجینئر آر۔ جے ٹیٹان نے بنک کے منصوبہ کا انجینئرنگ کے نقطۂ نظر سے غیر جانبدارانہ جائزہ لیا۔ اس کے جائزہ سے معلوم ہوا کہ بین الاقوامی قانون کے تحت جو عادلانہ معیار ضروری ہوتا ہے۔ بنک کی تجویز اس پر پوری نہیں اترتی اور طاس سندھ کے پانی کی منصفانہ تقسیم نہیں کرتی اور مزید برآں یہ تجویز آبی وسائل کو بہترین طریق سے ترقی دینے کے اصول کے منافی ہے۔ ٹیٹان کے جائزوں سے یہ بھی انکشاف ہوا کہ بنک کے منصوبے سے پاکستان کو شدید نقصان پہنچے گا۔ پاکستان کے بعض حصے مستقل طور پر پانی سے محروم ہو جائیں گے؛ ماضی میں پانی کی جو مقدار دریاؤں سے حاصل کی جاتی رہی ہے اُسے برقرار نہیں رکھا جا سکے گا۔ تقسیمِ ہند سے قبل پانی کو استعمال کرنے کے جو منصوبے بنائے گئے تھے۔ ان میں خلل پڑ جائے گا اور پاکستان کی آئندہ ترقی کی استعداد بہت گھٹ جائے گی۔

اگلا مرحلہ اس وقت آیا جب اٹھارہ ماہ تک اپنے مشاورین کی مزید تحقیقات کے بعد بنک ان نتائج پر پہنچا، جنہیں اس نے اپنی ۲۱ مئی ۱۹۵۶ء کی یادداشت میں پیش کیا۔ اس یادداشت میں یہ اعتراف کیا گیا کہ "ربیع میں مستقل کمی ہوتی رہے گی، جو گاہے گاہے اواخر ستمبر میں شروع ہوگی اور اوائلِ اپریل تک جاری رہے گی۔ یہ کمی اس درجہ، میعاد اور کثرتِ وقوع کی ہوگی کہ بنک کا زرعی ماہرین لے "قابلِ برداشت" تصور نہیں کر سکتا" اس لئے بنک نے محسوس کیا کہ اس کی طرف سے فروری ۱۹۵۴ء میں جو تجویز پیش کی گئی تھی اس کی ترمیم ضروری ہے۔ یہ ترمیم ایسی ہونی چاہئے کہ جس سے بنک کی رائے میں پاکستان کو مذکورہ بالا کمی کو رفع کرنے

کے لئے کافی پانی بروقت ملتے رہنے کا اطمینان ہو جائے۔"

اس ترمیم کی مستقبل صورت بھی اختیار کی جا سکتی تھی کہ مشرقی دریاؤں سے "بروقت" پانی کی بہم رسانی جاری رہے یا ہندوستان کی لاگت پر مغربی دریاؤں پر بند تعمیر کئے جائیں۔ بنک نے موخرالذکر طریقہ کو ترجیح دی اور اس مقصد کے لئے یہ تجویز پیش کی کہ مغربی دریاؤں (سندھ، جہلم اور چناب) کے رواں پانی سے حتی الوسع زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جائے۔ اور ذخیرۂ آب کی جو محدود گنجائش پاکستان کی دسترس میں ہے۔ اس میں کم از کم مداخلت کی جائے۔" الغرض تقریباً دو سال کی بحث مباحثے اور تفتیش و تحقیق کے بعد بنک نے اس حقیقت کا احساس کر لیا کہ مشرقی دریاؤں کے پانی کی محرومی سے جو نقصان ہوگا، مغربی دریاؤں میں رواں پانی سے اس کی تلافی نہیں کی جا سکے گی۔ بنک کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ اپنے اس غلط مفروضے کی تصحیح کے لئے تیار ہو گیا۔ جس کی بنا پر اس کی ابتدائی تجویز مرتب ہوئی تھی۔ یہ تصحیح مشرقی دریاؤں سے پانی لے کر سہی، مغربی دریاؤں پر ہندوستان کے خرچ سے بند تعمیر کر کے ہی سہی بہر صورت تصحیح تھی۔

چنانچہ عالمی بنک نے اپنے ۲۰ جولائی ۱۹۵۷ء کے مکتوب میں یہ سفارش کی کہ دونوں حکومتوں کو بنک کی ۵ فروری ۱۹۵۴ء کی تجویز اور ۲۱ مئی ۱۹۵۶ء کی یادداشت کی اساس پر بنک کی اعانت کے ساتھ تعمیری کام کو جاری رکھنے پر رضامند ہو جانا چاہئے۔ دونوں حکومتوں نے اس سے اتفاق کر لیا۔

اس کے بعد بھی ایک معین حل کی تلاش میں چار سال تک مذاکرات ہوتے رہے۔ مشکل صرف یہ نہیں تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کے زاویہ ہائے نگاہ مختلف تھے۔ سرمایہ کی فراہمی کے بہت بڑے مسائل در پیش تھے۔ یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر ہو گئی تھی کہ عالمی بنک کی تجویز کے خطوط پر تصفیہ کے لئے جن تعمیرات کی ضرورت ہے، ان کی لاگت ہندوستان اور پاکستان کے بس سے باہر ہے۔ بالآخر عالمی بنک کے صدر بلیک کی مستقل مزاجی اور بقول اس کے "اقتصادی سیاست گری" سے اور امریکہ، برطانیہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور مغربی جرمنی کی دوستانہ امداد سے سمجھوتہ ہو ہی گیا۔

معاہدہ طاس سندھ پر ۱۹ ستمبر ۱۹۶۰ء کو کراچی میں ہندوستان، پاکستان اور عالمی بنک کے نمائندوں نے دستخط کئے۔ معاہدہ پر دستخط ہونے کے ساتھ ہی ساتھ آسٹریلیا، کینیڈا، مغربی جرمنی، نیوزی لینڈ، پاکستان، برطانیہ اور امریکہ کی حکومتوں اور عالمی بنک کے نمائندوں نے ایک بین الاقوامی مالیاتی اقرار نامہ پر مہر ثبت کر دی۔ اس اقرار نامے کے تحت پاکستان میں آبپاشی اور دوسری تعمیرات کی مالی ضروریات

پوری کرنے کے لئے تقریباً ۹۰ کروڑ ڈالر کا طاس سندھ تعمیراتی فنڈ قائم ہو گیا۔ اس فنڈ کے لئے ۶۴ کروڑ ڈالر کے عطیات امداد کرنے والی حکومتوں نے دینے تھے۔ ہندوستان نے معاہدہ طاس سندھ کے تحت ۱۷ کروڑ ۴۰ لاکھ ڈالر ادا کرنے تھے اور عالمی بنک کی طرف سے پاکستان کو ۸ کروڑ ڈالر کا قرضہ بھی اس فنڈ میں شامل ہونا تھا۔ تعمیرات کے پروگرام میں پاکستان میں ۸ رابطہ نہریں شامل ہیں، جو تقریباً ۴۰۰ میل لمبی ہوں گی اور ان سے مغربی دریاؤں کا پانی ان علاقوں تک لے جایا جائے گا جو قبل ازیں مشرقی دریاؤں سے سیراب ہوتے تھے۔ دو بند تعمیر ہونے ہیں۔ ایک جہلم پر اور دوسرا سندھ پر۔ علاوہ ازیں کئی بجلی گھر، ۲۵۰۰ ٹیوب ویل اور سارے دریائی اور نہری نظام میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے دوسری تعمیرات بھی اس پروگرام کا حصہ ہیں۔ طاس سندھ کے سمجھوتے میں ہندوستان میں دریائے بیاس پر ایک بند کی تعمیر بھی پیش نظر رکھی گئی ہے اس کی اور ستلج پر بھاکڑہ ڈیم کی مدد سے اور راجستھان نہر کے ذریعے ہندوستان میں بڑے وسیع نئے علاقوں کو سیراب کیا جائے گا۔

معاہدہ میں دس سال کی عبوری میعاد کا اہتمام کیا گیا ہے۔ جس میں مزید تین سال کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اس دوران میں ہندوستان مشرقی دریاؤں سے پاکستان کو پانی بہم پہنچاتا رہے گا۔ اگر ضرورت پیش آئے تو معاہدہ کے تحت ایک غیر جانب دار ماہر مقرر کیا جا سکتا ہے۔ جو فنی مسائل پر حتمی فیصلہ صادر کرنے کا مجاز ہو گا۔ علاوہ ازیں خاص ثالثی عدالت سے بھی رجوع کیا جا سکتا ہے۔

ایک مدت کے بعد ہی پتہ چلے گا کہ اس معاہدہ میں جن نہروں اور بندوں کی تعمیر پیش نظر ہے۔ وہ پایۂ تکمیل تک پہنچنے کے بعد اس سے وابستہ توقعات کو پوری کرتی ہیں یا نہیں؟ بنیادی طور پر اس معاہدہ کا مقصد پاکستان میں آبپاشی کے موجودہ نظام کو برقرار رکھنا ہے۔ لیکن اس سے ترقی کی امید بھی کی جا سکتی ہے کہ یہ روز افزوں آبادی کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کے کام آئے۔ مگر بعض لوگوں کو اس کی سود مندی میں بہت شک ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ گار والے دریاؤں پر بندوں کی عمر زیادہ نہیں ہوتی۔ نیز یہ کہ بڑی بڑی رابطہ نہروں کی مرمت اور نگہداشت پر خرچ اور جو قرضے پاکستان کو لینے پڑے ہیں انکی ادائیگی کا بار نظام آبپاشی کی پیداواری استعداد سے بہت زیادہ ہو گا۔ دریائے سندھ پر تربیلا بند کی تعمیر کے سلسلے میں جو تحقیق ہو رہی ہے وہ اس سے بھی زیادہ تشویش کا باعث ہے۔ کیونکہ اس بند کے بغیر ترقیات کی تمام اُمیدیں نقش بر آب ثابت ہوں گی اور واجبات کی گرانباریاں فوائد سے کہیں زیادہ ہوں گی۔ تاہم ابھی حتمی رائے قائم کرنے کا وقت نہیں آیا۔

باب ۱۶

نئی مملکت کے اقتصادی اور مالی وسائل

پاکستان کا نظریہ سامنے آتے ہی یہ شبہات پیش کیے جانے لگے تھے کہ آیا پاکستان اقتصادی اور مالی اعتبار سے بقا کی صلاحیت رکھتا ہے؟ اس موضوع پر ہندوؤں نے اس زور کا مخالفانہ پروپیگنڈا کیا کہ اور تو اور اس نظریے کے ہمدرد بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ دسمبر ۱۹۴۳ء میں جب انگریز صحافی بیورلے نکولس نے قائداعظم سے ملاقات کی، تو تصور پاکستان کی توضیح سننے کے بعد اس کا پہلا سوال پاکستان کے اقتصادی پہلو کے بارے میں ہی تھا کہ "آیا غالباً پاکستان میں مسلمان پہلے سے امیر تر ہوں گے یا غریب تر؟" قائداعظم نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا کہ "مسلمان ایک سخت جان قوم ہیں، دبلے پتلے اور جفاکش۔ اگر پاکستان کا نتیجہ یہ ہوتا کہ انہیں کچھ اور سخت کوش ہونا پڑے گا، تو وہ اس پر کوئی شکوہ نہیں کریں گے۔ لیکن اس کا یہ نتیجہ کیوں نکلے؟ یہ خیال کرنے کی کیا معقول وجہ ہے کہ قومی آزادی کا انعام معاشی بدحالی ہوگا؟"[1]

ستمبر ۱۹۴۵ء میں سرہرمی مودی اور ڈاکٹر جان متھائی نے پاکستان کے اقتصادی اور مالی پہلوؤں پر یادداشت شائع کی۔ یہ دو سربرآوردہ قومی کارکنوں کی طرف سے ایک بے لاگ تحقیق تھی۔ ان میں ایک ممتاز پارسی تاجر تھا اور دوسرا سرکردہ ماہر اقتصادیات، جو حکومت ہند کا اقتصادی مشیر رہ چکا تھا اور بعد میں اس

کا وزیر خزانہ بھی بنا تھا۔ انہوں نے اپنی آرا کا خلاصہ دو قضیوں کی صورت میں بیان کیا۔

۱۔ علیحدگی کے فیصلے کو اگر محض اس اعتبار سے دیکھا جائے کہ آیا موجودہ معیارِ زندگی قائم رکھا جا سکتا ہے اور قبل از جنگ کی سطح پر سرکاری اخراجات پورے کیے جا سکتے ہیں، ماسوائے دفاعی اخراجات کے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ تقسیم ملک اقتصادی لحاظ سے قابلِ عمل ہے۔

۲۔ لیکن اگر مطمحِ نظر یہ ہو کہ مستقبل میں اقتصادی ترقی اس حد تک ہو جس سے نہ صرف عام معیارِ زندگی بھی معقول حد تک بہتر ہو جائے، بلکہ دفاعی اخراجات بھی ضروریاتِ زمانہ کے مطابق پورے ہو جائیں تو پھر سیاسی علیحدگی کی جو سکیم بھی پیشِ نظر ہو اس کی اولیں شرط یہ ہونی چاہیے کہ برصغیر کی حفاظت اور اس کے اقتصادی استحکام و ترقی کے معاملات میں دونوں ملکوں کے مابین موثر اور مسلسل تعاون ہو گا۔ اگر ایسا تعاون نہ ہوا تو پھر پاکستان اور ہندوستان، دونوں معرضِ خطر میں پڑ سکتے ہیں۔

تعاون میں دونوں ہی ملکوں کا فائدہ تھا لیکن کانگرس کی پاکستان دشمنی نے اس کی بنیاد اکھاڑ دی تھی۔ پنجاب میں قتلِ عام، نقد بقایاجات اور فوجی ساز و سامان کے جھگڑے، کشمیر اور نہری پانی کے تنازعات اور دوسرے سب قضیے ایک جارحانہ ذہنیت کی پیداوار تھے کہ اگر اس کا بس چلتا تو وہ پاکستان کا پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دیتی۔ کانگرس کے لیڈر کچھ تو اس بات پر غصہ کے مارے اندھے ہو رہے تھے کہ قیامِ پاکستان سے ان کا سارے ہند پر بلا شرکتِ غیرے حکمرانی کا خواب فی الحال شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا لیکن ان کی سوچ بچار کا اصلی محور یہ تھا کہ ہندوستان کے برعکس پاکستان اقتصادی اعتبار سے دیر تک زندہ رہنے کے قابل نہیں۔ لہذا ہندوستان اپنے آپ کو نقصان پہنچائے بغیر معاندانہ پالیسی سے پاکستان کے انہدام کو تیز تر کر سکتا ہے۔

ہندوستان نہ صرف علاقہ اور آبادی کے لحاظ سے پاکستان سے پانچ گنا بڑا ہے بلکہ وہ ایک ہی جغرافیائی وحدت بھی ہے، جو پاکستان کے دونوں حصوں کے مابین حائل ہے۔ ہندوستان قدرتی ذرائع بالخصوص کوئلے اور لوہے سے مالا مال ہے اور اس کی صنعتی اساس بھی مضبوط ہے۔ برصغیر کا انگریزی نظامِ حکومت اس بنیاد پر قائم تھا کہ ہندوستان ایک اقتصادی وحدت ہے۔ ملک بھر میں تجارت پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ مواصلات کا نظام بھی ایک ہی تھا، کرنسی اور مالی سہولتوں کا ایک ہی متحدہ نظام تھا، علاوہ ازیں ریلوے اور تار برقی کے

قائد اعظم ولیکا ٹیکسٹائل ملز میں

سلسلے نے بھی اقتصادی وحدت کو مضبوط کرنے میں بڑی مدد دی تھی۔ لیکن انگریزوں نے مختلف خطوں کی متوازن ترقی کی طرف کوئی توجہ نہیں کی تھی۔ درحقیقت انگریزی عہدِ حکومت میں تعمیر و ترقی کے لیے کسی منصوبہ بندی کا تصور ہی نہیں تھا۔ اس کی بنیادی دلچسپی صرف دفاع اور امن و امان برقرار رکھنے سے تھی۔ معاشی شعبہ میں انگریزی حکومت کا بڑا کارنامہ کلکتہ، بمبئی اور مدراس کی بندرگاہوں کی تعمیر و ترقی تھا۔ مواصلات کے سلسلے بھی انہی بندرگاہوں سے ملک کے کونے کونے تک پھیلتے چلے جاتے تھے، لیکن یہ سب کچھ بھی معاشی بہبود کے منصوبوں کے بجائے زیادہ تر دفاعی ضروریات کا مرہونِ منت تھا۔

یہ بڑی بندرگاہیں اور ان کے متصل یا دوسرے علاقوں میں قائم شدہ صنعتی مراکز سب کے سب ہندستان میں واقع تھے۔ جو علاقے پاکستان میں شامل ہونے والے تھے ان میں بہت ہی کم صنعتیں تھیں۔ ان علاقوں کی زرعی پیداوار ہندوستان کے صنعتی مرکزوں تک لے جائی جاتی تھی۔ جہاں وہ یا تو صنعت میں کام آتی یا برآمد کر دی جاتی۔ جو کاروباری ادارے اور بنک برصغیر کی اس باہمی مربوط معیشت کو کنٹرول کرتے تھے، ان سب کے صدر دفاتر انہی مراکز میں تھے۔ برصغیر کی صنعت و تجارت ہندوؤں یا انگریزوں کے ہاتھ میں تھی۔ سرمایہ دار، صنعت کار، صنعتی منتظم اور فنی ماہر بھی زیادہ تر ہندو ہی تھے۔ اپنی قوت کے غرور میں کانگرسی لیڈر پاکستان کی طرف دستِ تعاون بڑھانے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ اس کے برعکس ان کا خیال یہ تھا کہ دباؤ اور پاکستان کی ہیئتِ ترکیبی کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر وہ اس کی معیشت کو تہ و بالا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ سردار پٹیل کے اس خیال سے تقریباً تمام ہندو لیڈر متفق تھے کہ ہندوستان "اس قدر مضبوط ہو گا کہ باقی ماندہ حصے بھی بالآخر اس میں آملیں گے"۔[۲]

پاکستان اس لحاظ سے ایک منفرد ملک ہے کہ اس کے دو حصے ہیں جو برابر کے اہم ہیں اور ان کے درمیان ایک ہزار میل چوڑا غیر ملکی علاقہ حائل ہے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق مشرقی پاکستان کی آبادی ۵ کروڑ ۱۰ لاکھ اور مغربی پاکستان کی آبادی ۴ کروڑ ۳۰ لاکھ ہے اور کل آبادی ۹ کروڑ ۴۰ لاکھ ہے۔ آزادی کے وقت کل آبادی ۷ کروڑ ۴۰ لاکھ تھی۔ یعنی پاکستان کی آبادی میں دو فیصد سے زیادہ سالانہ شرح سے اضافہ ہو رہا ہے۔ مشرقی پاکستان کا رقبہ ۵۵ ہزار مربع میل اور مغربی پاکستان کا رقبہ ۳ لاکھ ۱۰ ہزار مربع میل ہے۔ اس طرح مشرقی پاکستان اگرچہ رقبہ کے لحاظ سے مغربی پاکستان کے چھٹے حصے کے برابر ہے، لیکن اس کی آبادی مغربی پاکستان سے قدرے زیادہ ہے۔ دونوں خطوں کے قدرتی خصائص بھی ایک دوسرے سے

بہت مختلف ہیں۔

مشرقی پاکستان کی آب و ہوا گرم ملکوں کی سی ہے۔ اوسطاً ۸۰ انچ سالانہ بارش ہوتی ہے۔ اس کی بیشتر زمین ہموار ہے۔ درحقیقت یہ ایک زیرِ تشکیل ڈیلٹا ہے۔ گنگا اور برہم پتر کے عظیم دریائی سلسلے جو خلیج بنگال میں جاکر گرتے ہیں، ہر سال لاکھوں ٹن گاد پھیلا کر زمین کی زرخیزی بڑھاتے ہیں۔ ہزاروں ندیاں ہیں جو آمد و رفت کا ذریعہ ہیں۔ البتہ گاہے گاہے تند طوفان، موسلادھار بارش اور خلافِ معمول سیلاب وسیع علاقوں کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ زمین کی زرخیزی اور گرم مرطوب آب و ہوا نے سارے خطے کو سبزہ زار بنا دیا ہے۔ سب سے اہم فصلیں چاول اور پٹ سن ہیں۔ شمال اور مشرق کی جانب پہاڑی علاقوں میں چائے کاشت کی جاتی ہے۔ گرم ملکوں کے پھل مثلاً کیلا، اناناس اور ناریل افراط سے ہوتے ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے مشرقی پاکستان دنیا بھر میں ایک گنجان ترین خطہ ہے۔ آبادی کی اوسط شرح ۹۲۲ کس فی مربع میل ہے۔ بعض حصوں میں آبادی کی شرح ڈیڑھ ہزار کس فی مربع میل تک ہے۔

مغربی پاکستان منطقہ حارہ کے شمال میں واقع ہے، یہاں بارش کی اوسط سالانہ شرح ۱۲-۱ انچ ہے۔ گرمیوں میں سخت گرمی اور سردیوں میں سخت سردی پڑتی ہے۔ اس کے وسیع علاقے صحرا یا بے آب و گیاہ پہاڑ ہیں، جو زیادہ آبادی کی کفالت نہیں کر سکتے۔ اس میں آبادی کی اوسط شرح ۱۳۸ کس فی مربع میل ہے۔ زراعت کا زیادہ تر انحصار نہری آبپاشی پر ہے۔ شمال میں اونچے پہاڑوں سے کئی دریا نکلتے ہیں جو بحیرہ عرب میں جا گرتے ہیں۔ جو علاقے ان دریاؤں کی نہروں سے سیراب ہوتے ہیں ان میں زرعی خوش حالی کا دور دورہ ہے۔ اگر کافی پانی میسر آجائے، تو زیرِ کاشت رقبہ کو دگنا کیا جا سکتا ہے۔ سیم اور تھور کی غارت گری سے زیرِ کاشت اراضی میں ہر سال ۵، ہزار ایکڑ کی کمی ہو جاتی ہے اور وسیع علاقوں کی زرخیزی بھی کم ہو جاتی ہے۔ مغربی پاکستان کی بڑی فصلیں گندم اور کپاس ہیں۔ گنے، چاول، مکئی اور تمباکو کی بھی کاشت کی جاتی ہے۔ سنگتروں اور آموں کے باغات افراط سے ہیں۔

تقسیم کے وقت کلکتہ کے ہندوستان کو دیے جانے سے مشرقی پاکستان کو نقصان عظیم پہنچا۔ غیر منقسم بنگال کے ۹۰ فیصد صنعتی ادارے کلکتہ میں تھے یا اس کے قریبی علاقوں میں جو مغربی بنگال کا حصہ بن گئے۔ تقسیم کے وقت غیر منقسم بنگال کے صنعتی کارکنوں میں سے صرف ۵ فیصد مشرقی پاکستان میں تھے۔ کارخانے، بنک، بیمہ کمپنیاں، تجارتی کوٹھیاں، درآمدی برآمدی ادارے، مرکزِ مواصلات، بجلی گھر اور اعلیٰ درس گاہیں سب

کے سب کلکتہ میں تھے، جو غیر منقسم بنگال کا دارالحکومت اور اس کی بڑی بندرگاہ تھا۔

غیر منقسم ہند کو دنیا بھر میں خام پٹ سن کی قریب قریب مکمل اجارہ داری حاصل تھی۔ اس سنہری ریشہ کی ۷۵ فیصد فصل اور تمام تر اعلیٰ اقسام ان علاقوں میں پیدا ہوتی تھیں جو مشرقی پاکستان میں شامل ہوئے۔ لیکن مشرقی پاکستان میں پٹ سن کا ایک بھی کارخانہ نہیں تھا، اور گانٹھیں باندھنے والی مشینیں بھی چند ایک ہی تھیں۔ مشرقی پاکستان میں پیدا ہونے والی پٹ سن تقریباً تمام تر کلکتہ بھیج دی جاتی تھی جہاں کی کثیر التعداد جیوٹ ملوں میں اس سے بوریاں یا پٹ سن کی دوسری مصنوعات تیار کی جاتیں یا گانٹھیں باندھنے کے بعد اسے بحری جہازوں کے ذریعہ برآمد کر دیا جاتا تھا۔ پٹ سن ہی مشرقی پاکستان کی سب سے اہم زر آور فصل ہے، اور کاشتکاروں کی خوشحالی کا انحصار اس کی قیمت فروخت پر ہے۔ لیکن اس معاملے میں وہ بڑی حد تک کلکتہ کی منڈی کے اتار چڑھاؤ کے رحم و کرم پر ہوتے تھے جہاں سٹہ باز اور برآمد کنندگان پٹ سن کے کاشتکاروں کی کمائی سے ہاتھ رنگتے تھے۔

تقسیم کے وقت مشرقی پاکستان میں صرف ایک بندرگاہ چٹاگانگ میں تھی۔ یہ ایک چھوٹی سی بندرگاہ تھی اور اس میں سالانہ پانچ لاکھ ٹن سامان کی درآمد برآمد کی گنجائش ہی تھی اس کی استعدادِ کار کی توسیع اور ذرائع مواصلات کا رخ اس کی طرف موڑنے کے لیے سالہا سال درکار تھے۔ اس دوران میں پٹ سن اور مشرقی پاکستان کی دوسری پیداوار کو باہر بھیجنے کے لیے کلکتہ کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں تھا۔ پٹ سن کی برآمد پر محصول وصول کیا جاتا تھا، جس سے حکومت ہند اور بنگال کی صوبائی حکومت کو معتدبہ آمدنی حاصل ہوتی تھی۔ جیسا کہ قبل ازیں اس باب میں بیان کیا جا چکا ہے۔ تقسیم کے وقت پاکستان کے نمائندوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ کم از کم عبوری دور کے لیے محصولات اور مرکزی محاصل ایکسائز کی آمدنی ایک ہی جگہ جمع کی جائے اور پھر اسے دونوں مملکتوں میں منصفانہ بنیادوں پر تقسیم کر دیا جائے۔ ہندوستانی نمائندے یہ بات نہ مانے اور مُصر ہوئے کہ ہر ڈومینین اپنے علاقے سے حاصل ہونے والی آمدنی اپنی تحویل میں ہی رکھے۔ نہ ہی وہ خاص پٹ سن کے لیے کسی سمجھوتے پر رضامند ہوئے۔ چنانچہ حکومت پاکستان مشرقی بنگال سے سرحد پار مغربی بنگال جانے والی پٹ سن پر برآمدی محصول عائد کرنے پر مجبور ہو گئی، اور لامحالہ ان مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جو ایک لمبی سرحد پر محصول کی چوکیاں بٹھانے سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ مشکلات خاص طور پر زیادہ تھیں کیونکہ سرحد کے آر پار سینکڑوں آبی راستوں سے سمگلنگ کے بہت مواقع میسر تھے۔

مغربی پاکستان میں سب سے اہم زرعی فصل کپاس ہے، اور اسے کم و بیش وہی حیثیت حاصل ہے جو مشرقی پاکستان میں پٹ سن کو ہے۔ مغربی پاکستان کا حصہ بننے والے علاقوں میں غیر منقسم ہند کی ۴۰ فیصد کپاس پیدا ہوتی تھی، اس میں امریکی قسم کی بہترین درمیانہ درجہ کے ریشے والی کپاس بھی شامل تھی۔ غیر منقسم ہند میں پارچہ بافی کی صنعت ہی سب سے بڑی صنعت تھی، لیکن تقسیم کے وقت پارچہ بافی کے ۳۹۴ میں سے ۳۸۰ کارخانے ہندوستان میں تھے اور صرف ۱۴ پاکستان میں۔ مغربی پاکستان میں پیدا ہونے والی روئی کا بیشتر حصہ ریل کے ذریعہ احمد آباد اور بمبئی میں پارچہ بافی کے مراکز میں بھیج دیا جاتا تھا، اور وہاں سے اس کے بجائے پاکستان کو کپڑا آتا تھا۔

الغرض تقسیم کے وقت پاکستان اور ہندوستان کے تجارتی تعلقات کی نوعیت کم و بیش یہ تھی کہ اول الذکر خام مال بہم پہنچاتا تھا اور مؤخر الذکر مصنوعات۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان کے مابین تجارتی لین دین کے اسلوب میں تغیر ناگزیر تھا۔ لیکن پنجاب میں فسادات اور مغربی پاکستان اور شمالی ہندوستان کے درمیان تقریباً کامل تبادلۂ آبادی سے تجارت اور آمد و رفت کے عام ذرائع ختم ہو گئے اور ان کی سمت مجبوراً بدلنی پڑی۔ روئی اور دوسری خام اشیا جو ریل کے ذریعہ ہندوستان کے صنعتی مراکز میں بھیجی جاتی تھیں، انہیں بیرونی دنیا میں بھیجنے کے لیے کراچی کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ مغربی پاکستان کے لیے تمام درآمدات و برآمدات کی نقل و حمل کراچی کے ذریعہ ہونے لگی، اور اسے روز افزوں اہمیت حاصل ہوتی گئی۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے مابین تجارت کے فروغ سے ایک طرف کراچی اور دوسری طرف چٹاگانگ کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا۔

ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی پسماندہ تھے۔ لیکن دونوں میں سے پاکستان زیادہ پسماندہ اور غریب تر تھا۔ آبادی کے بیشتر حصے کے روزگار کا انحصار زراعت پر تھا۔ جس کے طور طریقے بہت پرانے تھے ـــــ ۵۰-۱۹۴۹ء میں کل قومی سالانہ آمدنی ۱۸ ارب ۴۰ کروڑ روپے تھی جس کا ۶۰ فیصد سے زائد حصہ زراعت سے حاصل ہوتا تھا۔ فی کس سالانہ آمدنی صرف ۲۳۷ روپے تھی۔ اکثر لوگ بڑی تنگی سے گزر اوقات کرتے تھے۔ خشک سالی یا سیلاب کے زمانے میں قحط کا ڈر رہتا تھا۔ تعلیم اور طبی امداد کی سہولتیں ناکافی تھیں۔ زیادہ تر آبادی ـــ ۸۰ فیصد ـــ دیہات میں رہتی تھی۔ بمشکل ۱۶ فیصد خواندہ تھے۔

آزادی کے بعد ملک کو جو اولیں مسائل درپیش تھے، وہ انتظامیہ کا قیام اور مہاجرین کی آبادکاری تھے۔ یہ مسائل کس طرح حل کیے گئے، ان کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔ لیکن ان کے علاوہ بھی کئی ایک

فوری مسائل تھے، جنہیں حل کرنا ضروری تھا۔

تقسیم کے وقت مغربی پاکستان فاضل اناج پیدا کرتا تھا۔ پنجاب کی نوآبادیوں سے ہند کے کم پیداوار والے علاقوں حتیٰ کہ انتہائی جنوب میں واقع مدراس تک کو گندم بھیجی جاتی تھی۔ لیکن مشرقی پاکستان میں اس کی بنیادی غذا چاول کی کمی تھی۔ ۱۹۴۷ء کی گرمیوں میں مشرقی پاکستان کے اضلاع چٹاگانگ اور نواکھالی میں بلا کے سیلاب آئے، جن سے پانچ سو مربع میل علاقہ کو نقصان پہنچا۔ چاول کی "اَوس" فصل کے علاوہ سیلاب سے متاثر شدہ علاقہ میں "امان" فصل کے نوخیز پودے بھی تباہ ہو گئے۔ سال کے خاتمے تک ایک لاکھ ٹن اناج کی ضرورت تھی۔ جس میں سے ۴ ہزار ٹن فوری طور پر درکار تھے۔ ۱۹۴۳ء کے قحط بنگال کی یاد ابھی لوگوں کے ذہن میں تازہ تھی۔ صورتِ حال اس قدر سنگین تھی کہ مشرقی بنگال کے وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین ۲۵ اگست ۱۹۴۷ء کو —آزادی کے گیارہ دن بعد— رسد کا پختہ انتظام کرنے کے لیے کراچی آئے۔ خوش قسمتی سے مغربی پاکستان میں چاول کی فاضل مقدار موجود تھی لیکن اس کے حصول اور نقل و حمل میں دشواریاں پیش آ رہی تھیں۔ مغربی پاکستان میں ریلوے کو بعض شاخوں پر کوئلے کی کمی کے باعث گاڑیوں کی آمد و رفت معطل کرنی پڑی تھی۔ جہاز بھی بہت کمیاب تھے۔ تاہم مغربی پاکستان سے اناج بروقت بھیجنے کا انتظام ہو ہی گیا۔ جنوری ۱۹۴۸ء کے بعد مغربی پاکستان کو بھی گندم کی قلت سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ تارکینِ وطن کی بے اندازہ آمد و رفت کا نتیجہ تھی۔ بعض اضلاع میں گندم بہت کمیاب ہو گئی۔ دوسرے ملکوں سے بھی فاضل گندم میسر نہیں تھی۔ بلکہ عالمی ادارۂ خوراک و زراعت کے ڈائریکٹر جنرل نے اگست ۱۹۴۷ء میں جنیوا میں مندوبین کو متنبہ کر دیا تھا کہ آنے والے سرما اور بہار کے موسم میں یورپ میں لاکھوں افراد کو زمانۂ جنگ سے بھی بدتر غذائی قلت کا سامنا کرنا ہوگا۔ خوراک کے معاملے میں ۱۹۴۸ء کا سارا سال تشویش میں گزرا۔ مغربی پاکستان میں ۲۵ لاکھ ایکڑ اراضی سیلابوں سے متاثر ہوئی اور فصل خریف کی ۱۰ لاکھ ٹن پیداوار تباہ ہو گئی۔ عموماً ۴ لاکھ ٹن سالانہ پیداوار فاضل ہوتی تھی، اب اس کی بجائے کمی تھی۔ بایں ہمہ مشرقی پاکستان کو اناج پہنچانا انتہائی ضروری تھا۔ کیونکہ وہاں سیلابوں سے بہت نقصان ہوا تھا۔ خوراک کے استقبال میں کفالت کے لیے اپیل کی گئی اور ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری کی روک تھام کے لیے قانون نافذ کر دیا گیا۔ یہ احساس روز افزوں ہوتا گیا کہ خوراک کی صورتِ حال نازک ہے، ملک کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور اس لیے اناج کی پیداوار بڑھانے اور سیلابوں کی روک تھام کے لیے حفاظتی اقدامات کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ آبادی کی ہیئت ترکیبی میں تبدیلی کا بھی خوراک کے مسئلہ پر اثر پڑا۔ سبزی خور

ہندوؤں کی جگہ مسلمانوں نے لے لی جس سے گوشت کی کھپت بہت زیادہ ہوگئی اور مویشیوں کی نسل گھٹنے لگی جن پر نہ صرف کاشتکاری بلکہ دودھ، گھی وغیرہ کی رسد کا انحصار تھا۔ چنانچہ ہفتہ میں دو دن کے لیے گوشت کے ناغہ کا اعلان کر دیا گیا۔

مواصلات کا مسئلہ غیر معمولی طور پر اہم تھا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان مسافت فضا میں ۱۲۰۰ میل اور سمندر کے ذریعہ ۳۰۰۰ میل تھی۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے مابین رابطہ قائم کرنا ایک فوری ضرورت تھی۔ ریڈیو پاکستان کے قیام اور مناسب طاقت کے ایک ٹرانسمیٹر کے حصول کا کام تقسیم کے ایام میں ہی شروع کر دیا گیا تھا۔ فضائی اور بحری مواصلات کی ضرورت بھی کچھ کم نہ تھی۔ کراچی میں بین الاقوامی فضائی اڈہ تھا، جس نے پاکستان کا بیرونی دنیا سے رابطہ پیدا کر دیا تھا۔ لیکن ڈھاکہ بین الاقوامی فضائی راستہ پر واقع نہیں تھا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان اپنی فضائی سروس لازم تھی۔ اس ضرورت کو ایک چھوٹی سی فضائی کمپنی اورینٹ ایرویز نے پورا کیا۔ اس نے اپنا صدر دفتر کلکتہ سے کراچی میں منتقل کر لیا اور مرمت کی سہولتوں کا کچھ نہ کچھ انتظام کر لیا۔ ۱۹۴۸ء میں ایک اور نجی فضائی کمپنی پاک ایر قائم ہوئی۔ اس کمپنی کا قیام وزیر خزانہ غلام محمد کی تحریک کا مرہون منت تھا۔ غلام محمد چند سال پہلے حیدر آباد کے وزیر خزانہ رہ چکے تھے وہ بہت خواہاں تھے کہ نظام اپنے سونے جواہرات اور نقدی کے سارے وسیع خزانہ کو نہیں تو کم از کم اس کے ایک حصّہ کو حفاظت کے لیے طیاروں کے ذریعہ کراچی منتقل کر دے۔ وہ حیدر آباد گئے لیکن نظام کو اس پر آمادہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے نظام کو اپنی دولت اتنی عزیز تھی کہ وہ اسے اپنی نظروں سے دور بھیجنے پر رضامند نہیں ہو سکتا تھا۔ بعد میں نظام کا سارا خزانہ حکومت ہندوستان نے ہتھیا لیا۔ تاہم غلام محمد کو اتنی کامیابی ضرور ہوگئی کہ پاک ایر کے سرمایے کے لیے انہیں حیدر آباد سے کافی رقم مل گئی۔ لیکن یہ کمپنی بد انتظامی کا شکار ہوگئی اور چند حادثات کے بعد اس کا کاروبار بند ہوگیا ان حادثات میں کئی قیمتی جانیں ضائع ہوگئیں۔ ان میں پاکستانی فوج کے دو قابل ترین افسر میجر جنرل محمد افتخار خان اور بریگیڈیر شیر خان بھی تھے۔

مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان تجارت نے لازماً فروغ پانا تھا لیکن بعض خاص ضروریات مثلاً مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان کو خوراک اور نمک کی ترسیل فوری طور پر درکار تھی۔ اس زمانے میں تجارتی جہازوں کے بیڑے کا تو ذکر ہی کیا، استعمال شدہ جہاز بھی آسانی سے نہیں ملتے تھے۔ جنگ کے فوراً بعد کے زمانہ میں ہر قسم کی بھاری مشینری بہت کمیاب تھی۔ برطانیہ، مغربی یورپ، روس اور جاپان کی جنگ زدہ معیشت کی بحالی و تعمیر

تمام دوسرے تقاضوں پر فوقیت رکھتی تھی۔ نئے اور ترقی پذیر ملکوں کو اپنے آرڈر قبول کرانے میں بڑی دشواری اور تاخیر کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور ان کی تعمیل کی تاریخ غیر معمولی طور پر لمبی ہوتی تھی۔ یہ تھا وہ پس منظر جس میں پاکستان کو اپنی معیشت کو رواں دواں کرنا تھا۔

کلکتہ اور اس کی سہولتوں سے محروم ہونے کے بعد مشرقی پاکستان کا سب سے اہم مسئلہ مواصلات اور برقی طاقت کے ایسے بنیادی ڈھانچہ کی تخلیق تھا، جس کی اساس پر معاشی تعمیر و ترقی کو فروغ دیا جا سکتا۔ بنفسہٖ بھی اور علی الخصوص اس زمانے کے حالات میں یہ ایک تدریجی اور طویل عمل تھا۔ اولین کام چاٹگانگ کی بندرگاہ کو جدید خطوط پر ترقی دینا اور اس کی توسیع کرنا تھا۔ مرکزی حکومت نے جن بڑے منصوبوں کو منظور کیا، یہ ان میں سرفہرست تھا لیکن افسوس کہ منظوری اور عمل درآمد میں کافی وقفہ ناگزیر ہوتا ہے۔ قابل مشیروں کے تقرر، مجازوں کی تکمیل، ڈیزائنوں اور تخمینوں کی تیاری سب میں وقت لگتا ہے۔ مشرقی پاکستان میں ریلوے کی پٹریاں اور انجن دوسری جنگ عظیم میں برما محاذ کے لیے فوجی رسد اور فوجوں کی بھاری نقل و حمل کے باعث بری طرح گھس چکے تھے۔ وسیع پیمانہ پر نئے ساز و سامان کی ضرورت تھی۔ کوئلے کی کمی بھی نازک صورت اختیار کر رہی تھی۔ دریائی مواصلات جو مشرقی پاکستان کی معیشت میں بہت اہمیت رکھتے ہیں، ابتر حالت میں تھے۔ جوائنٹ سٹیم شپ کمپنی جو سب سے بڑا مواصلاتی ادارہ تھا، اس کے صدر دفاتر کلکتہ میں تھے اور اس وجہ سے کئی مشکلات پیدا ہو گئی تھیں۔

مغربی پاکستان میں صورت حال نسبتاً بہتر تھی۔ پنجاب اور اس کے ہمسایہ علاقوں میں نہایت وسیع فسادات سے پیدا شدہ بدنظمی کے باوجود نارتھ ویسٹرن ریلوے مہاجرین کی بے پایاں آمد و رفت کے مسئلہ سے عہدہ برآ ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ کراچی کی بندرگاہ میں اگرچہ مرمت اور توسیع درکار تھی لیکن فوری ضروریات پوری کرنے کے لیے وہ کافی تھی۔

سڑکوں کے معاملے میں بھی مغربی پاکستان کی حالت مشرقی پاکستان کے مقابلہ میں بہتر تھی۔ مغربی پاکستان میں سڑکوں کا سلسلہ برصغیر میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھا، ایک حد تک اس کی وجہ فوجی تقاضے تھے۔ اس کے برعکس مشرقی پاکستان میں ایک تو پتھر کمیاب ہے اور دوسرے وہاں ہموار میدان میں بے شمار ندیاں چکر کھاتی ہوئی بہتی ہیں۔ اس لیے سڑکوں کی تعمیر ایک مشکل اور گراں کام ہے۔ چنانچہ وہاں اندرونی آمد و رفت کی بیشتر ضروریات ہزاروں کی تعداد میں کشتیوں سے ہی پوری ہوتی ہیں۔

مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں میں برقی قوت کی کمی تھی۔ مغربی پنجاب میں وسیع علاقے کو

مشرقی پنجاب میں واقع منڈی ہائیڈرو الیکٹرک ورکس سے بجلی بہم پہنچائی جاتی تھی۔ تقسیم کے بعد بجلی کا یہ ذریعہ قابلِ اعتماد نہ رہا۔ تقسیم کے وقت ملک بھر میں کل نصب شدہ قوت ۲۸۰٬۵۰۰ کلوواٹ تھی، لیکن مرمت اور موزوں تنظیم کی کمی کے باعث کارگر قوت اس سے بہت کم تھی۔ مشرقی پاکستان میں نصب شدہ قوت صرف ۱۵٬۶۰۰ کلوواٹ تھی۔ کرنافلی ہائیڈرو الیکٹرک پروجیکٹ مستقبل میں تو روشن امکانات کا حامل تھا لیکن اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کئی سال درکار تھے۔ مغربی پاکستان میں بھی ہائیڈرو الیکٹرک منصوبوں کے لیے سروے کیے گئے اور چند سال بعد شمال مغربی سرحدی صوبہ میں وارسک پروجیکٹ پر کام شروع کر دیا گیا۔ موجودہ ضروریات صرف بھاپ سے چلنے والے بجلی گھروں سے پوری کی جا سکتی تھیں لیکن یورپ میں جنگ کے بعد تعمیر نو کے تقاضے اتنے زیادہ تھے کہ کسی بھی نوعیت کی مشینری کی فرمائش پوری ہونے میں طویل مہلت درکار ہوتی تھی۔ مغربی پاکستان میں گھٹیا درجہ کا کچھ کوئلہ اور تیل کی معمولی مقدار بھی دستیاب تھی۔ مشرقی پاکستان ماضی میں اپنی ایندھن کی ضروریات ہندوستان سے پوری کرتا رہا تھا، اب اسے کوئلہ اور تیل کے حصول میں مسلسل مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ آزادی سے قبل پاکستان میں تیل اور معدنی ذخائر کا کھوج لگانے میں کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہوا تھا۔ ہند کے محکمہ طبقات الارض نے محض سرسری تحقیقات پر ہی اکتفا کیا تھا۔

ایسی اور دوسری بے شمار مشکلات اور ہر قسم کی تنگی کے باوجود تعمیر و ترقی کا کام شروع کیا گیا۔ تحریکِ پاکستان کا اصل مقصد مسلمان علاقوں کے انسانی اور مادی وسائل کو فروغ دینا تھا تاکہ لوگوں کی اخلاقی فلاح اور مادی ترقی کا سامان ہو سکے۔ ان کے لیے مناسب معیارِ زندگی، معاوضہ عام کے کام اور مساوی مواقع ترقی مہیا ہوں اور آمدنی اور املاک کی زیادہ سے زیادہ منصفانہ تقسیم ہو سکے۔ ان معاشرتی اور معاشی مقاصد کی بنیادیں سماجی انصاف اور انسانی اخوت کے اسلامی اصولوں پر استوار تھیں۔ ان مقاصد کے حصول اور فروغ میں جتنے کر ہی حکومت عوام کی دلی آرزوؤں کو پورا کر سکتی تھی۔ اور یہ کام نہ صرف سرانجام دینا تھا بلکہ اسے حتی الوسع جلد از جلد ثمر آور بھی بنانا تھا۔ صدیوں تک جو غفلت برتی گئی تھی، اگر سالوں میں نہیں تو اس کی تلافی عشروں میں کی جانی تھی۔ اتنے عظیم کام کے لیے جو مالی اور معاشی وسائل میسر تھے، وہ بہت ناکافی تھے اور ملک بجو طریق پر فضول خرچی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ جہاں یہ ضروری تھا کہ عوام کی قوتوں کو زیادہ سے زیادہ ابھارا اور بروئے کار لایا جائے وہاں حکومت کے لیے یہ بھی لازم تھا کہ وہ پالیسی کی ترتیب اور سرکاری اور نجی مساعی میں یک جہتی پیدا کرنے کے لیے مثبت اور تعمیری کردار ادا کرے۔ ریلوے، تار اور ٹیلی فون بند کر لئیں

وفاقی تاسیسات، آبپاشی کے ہیڈورکس، نہریں اور جنگلات حکومت کی ملکیت تھے۔ کئی اور شعبے بھی تھے جن میں سرمایہ کی کمی یا گھاٹے کے خوف سے لوگ سرمایہ لگانے سے جھجکتے تھے۔ مثال کے طور پر ڈھاکہ میں صوبائی حکومت کو مرکزی حکومت سے قرضہ لے کر ایک ہوٹل تعمیر کرنا پڑا۔ پاکستان کے معاشی نظام میں لامحالہ قومی اور نجی سرمایہ دونوں نے منصوبہ بندی کے تحت پہلو بہ پہلو کام کرنا تھا لیکن حکومت کی سوچی سمجھی پالیسی زیادہ سے زیادہ آزاد کاروبار کے حق میں تھی۔

اوائل ۱۹۴۸ء میں ایک ترقیاتی بورڈ قائم کیا گیا، جس کا کام یہ تھا کہ منصوبوں میں ہم آہنگی پیدا کرے۔ تعمیری سکیموں کا تقدم متعین کرے اور ان کی رفتار ترقی کے بارے میں وقتاً فوقتاً حکومت کو رپورٹیں پیش کرے۔ اس بورڈ کا صدر وزیر امور اقتصادیات تھا۔ میں بطور سیکرٹری جنرل اس کا نائب صدر رہتا۔ ترقیات سے متعلق وزارتوں کے سیکرٹری اس بورڈ کے ارکان تھے۔ اس کے ساتھ منصوبہ بندی کا ایک مشاورتی بورڈ بھی قائم کر دیا گیا جو مرکزی، صوبائی اور ریاستی حکومتوں کے افسروں اور نجی شعبہ کے نمائندوں پر مشتمل تھا۔ اس بورڈ کا کام منصوبہ بندی کے معاملہ میں حکومت کو مشورہ دینا اور ترقیاتی مساعی کے لیے عوامی تعاون کو فروغ دینا تھا۔ منصوبہ بندی کے مشاورتی بورڈ کی مدد کے لیے کئی کمیٹیاں تھیں جو مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے قائم کی تھیں۔ ۱۹۵۰ء میں جب کولمبو منصوبہ کے تحت پاکستان کے لیے ایک چھ سالہ ترقیاتی پروگرام مرتب کیا گیا، تو وزیر اعظم کی صدارت میں ایک اقتصادی کونسل بھی قائم کر دی گئی۔ اس ابتدائی زمانہ میں اس طریقۂ کار سے ترقی کی یہ مساعی کافی مفید ثابت ہوئیں، لیکن باقاعدہ طور پر ایک مربوط منصوبہ اس وقت تیار ہوا جب ۱۹۵۳ء میں منصوبہ بندی کا علیحدہ ادارہ قائم کیا گیا۔

ترمیم شدہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت، جو کہ ملک کا عبوری آئین تھا، صنعت صرف ایک صوبائی محکمہ تھا، لیکن منصوبہ بندی کے تحت ملک کی سریع ترقی کا تقاضا یہ تھا کہ کلیدی صنعتیں مرکزی حکومت کے زیر نگرانی ہوں۔ مرکزی حکومت کے زیر اہتمام دسمبر ۱۹۴۷ء میں منعقد ہونے والی ایک صنعتی کانفرنس نے بعض بنیادی صنعتوں کے قیام کی سفارش کی اور مطلوبہ صنعتی پیداوار کی مقداریں بھی متعین کیں۔ اپریل ۱۹۴۸ء میں حکومت پاکستان نے اپنی صنعتی پالیسی کا اعلان کیا یہ پالیسی زیر نظر رہتی تھی اور حسب ضرورت اس میں ترمیم کر دی جاتی تھی۔ اس پالیسی میں یہ کہا گیا کہ پاکستان کو پہلے پہل اپنے خام مال سے وہ اشیا تیار کرنی چاہئیں، جن کے لیے ملک کے اندر یا باہر یقینی مانگ موجود ہے۔ ان میں پٹ سن اور کپاس سب سے اہم تھیں، اور سب سے پہلے ان ہی کی طرف توجہ کی گئی۔ پٹ سن کی صنعت سے

ملک کی زرِمبادلہ کی آمدنی میں اضافہ ہو گا اور سوتی مصنوعات سے نہ صرف لوگوں کی ایک بنیادی ضرورت پوری ہو گی بلکہ زرِمبادلہ کی بچت بھی ہو گی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ حکومت "ہر ایسی بھاری صنعت کو ترقی دے گی، جسے ایک مضبوط اور متوازن معیشت کے جلد از جلد حصول کے لیے ضروری سمجھا جائے گا"۔ تین قسم کی صنعتیں سرکاری ملکیت کے لیے مخصوص کر دی گئیں، اسلحہ اور گولہ بارود، پن بجلی اور ریلوے، ٹیلی فون، تار اور وائرلیس کے ساز و سامان کا بنانا اور چلانا۔ باقی سارا میدان نجی مساعی کے لیے کھلا چھوڑ دیا گیا۔ لیکن حکومت ذمہ دار تھی کہ "محنت کشوں کے ساتھ آجر منصفانہ سلوک کریں گے۔ بالخصوص اوقاتِ کار، اجرتوں، کام اور ملازمت کی شرائط میں"۔

۲۷ صنعتوں کی منصوبہ بندی مرکزی حکومت نے کرنی تھی۔ ان میں لوہا اور فولاد، ضخیم انجینئرنگ، مشینی اوزار، ثقیل کیمیات، سیمنٹ، معدنیات اور معدنی تیل، چینی، پارچہ بافی اور تمباکو کی صنعتیں شامل تھیں۔ حکومت نے یہ حق بھی اپنے لیے محفوظ رکھا کہ وہ ملک کے تحفظ یا بہبود کے لیے ضروری صنعتوں کو اپنی تحویل میں لے سکتی ہے یا ان میں شرکت کر سکتی ہے بشرطیکہ قومی اہمیت کی کسی خاص صنعت کی ترقی کے لیے نجی سرمایہ خاطر خواہ مقدار میں نہ لگایا جا رہا ہو۔

اسی پالیسی میں اعلان کیا گیا کہ "پاکستان ہر ایسے غیر ملکی سرمایہ کا خیر مقدم کرے گا، جس کا مقصد خالصتاً صنعتی اور معاشی ہو اور جو کسی خاص رعایت کا طالب نہ ہو"۔ سالانہ منافع کی ترسیل اور لگا ہوا سرمایہ مع بکار آمدہ منافع واپس لے جانے کا بھی یقین دلایا گیا تھا۔ علاوہ ازیں اگر کسی صنعتی ادارہ کو قومی ملکیت میں لیا گیا تو اس کا منصفانہ معاوضہ ادا کیا جائے گا جسے واپس لے جانے کی اجازت ہو گی۔ تیرہ متعین صنعتوں میں لازماً ۵۱ فیصد مقامی سرمایہ لگایا جائے گا اور باقی میں ۳۰ فیصد۔ لیکن اگر مقامی سرمایہ کی مطلوبہ رقم میسر نہ ہو سکی، تو پھر حکومت کی منظوری سے باقی رقم بھی غیر ملکی سرمایہ کار لگا سکیں گے۔ بعد میں مقامی سرمایہ کی حد کو گھٹا کر ۴۰ فیصد کر دیا گیا۔ تیل اور گیس کی تلاش میں غیر ملکی کمپنیوں کی بالخصوص حوصلہ افزائی کی گئی۔

صنعتی ترقی کی رفتار تیز تر کرنے کے لیے حکومت نے بنیادی ارتفاقات، حفاظتی محصولات اور مالی ترغیبات کے ذریعہ ہر ممکن مدد دی۔ ان ارتفاقات میں معدنی وسائل کا سروے، برقی طاقت کی پیداوار میں توسیع، ذرائع مواصلات کی بہتری، مشینری اور خام مال کے حصول میں اعانت اور صنعتی مقاصد کے لیے اراضی کے حصول میں مدد بھی شامل تھیں۔ علاوہ ازیں فنی تعلیم کا فروغ، سائنس اور صنعتی تحقیقات

اور صنعتی تجارتی املاک کی تعمیر بھی ان سہولتوں میں شامل تھیں۔ پہلے بجٹ میں ہی ٹیکس کی کئی رعایات کا اعلان کیا گیا۔ مثلاً نئے صنعتی اداروں میں لگائے ہوئے سرمایہ پر پہلے پانچ سال کے لیے پانچ فیصد تک منافع کو انکم ٹیکس، سُوپر ٹیکس اور کاروباری منافع ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ نئی مشینری اور اس کے متعلقات پر کاہش بہا کی آغازی شرح ۲۰ فیصد اور صنعتی مقاصد کے لیے نئی تعمیرات پر ۱۵ فیصد کر دی گئی۔ یہ آغازی کاہش بہا گویا حکومت کی طرف سے صنعتی اداروں کے لیے بلا سود قرضہ تھی۔ متوسط اور طویل المیعاد صنعتی قرضے دینے کے لیے ۱۹۴۹ء میں حکومت نے ایک صنعتی مالیاتی کارپوریشن قائم کی۔ جس کے دو کروڑ روپے کے سرمایہ کا ۵۱ فیصد حصہ حکومت نے لگایا اور باقی رقم کے لیے عام لوگوں کو دعوت دی گئی۔

ان مراعات کے باوجود سرمایہ دار اور کاروباری لوگوں کا صنعت کی طرف رجحان توقع سے بہت کم تھا۔ اس کی وجہ کسی حد تک تو انتظامی قابلیت اور فنی مہارت کی کمیابی تھی ــــــ یہ پسماندہ ملکوں کی ایک عام کمزوری ہے۔ لیکن اصل اور اہم وجہ فوری اور زیادہ منافع کی وہ کشش تھی جو تجارت میں کمایا جا سکتا تھا۔ ہندو تاجروں کے جانے سے کاروبار میں جو رخنہ پڑ گیا تھا، اس کی تلافی بڑی تیزی سے ہو رہی تھی۔ پاکستانی خام اشیاء کی دوسرے ملکوں میں بڑی اچھی مانگ تھی۔ دوسری جنگِ عظیم میں درآمدات پر جو سخت پابندیاں عائد کی گئی تھیں، ان کی وجہ سے اشیاءِ صرف کی مانگ بہت چڑھ گئی تھی۔ اگست ۱۹۴۷ء میں جب درآمدی پالیسی میں فراخدلی سے کام لیا گیا تو درآمدات جو کہ سال کے پہلے نصف میں ۱۱ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے تھیں اس سے بڑھ کر سال کے دوسرے نصف حصہ میں ۳۱ کروڑ روپے تک جا پہنچیں۔ درآمدات کا ایک تہائی حصہ سوتی پارچات اور سوت پر مشتمل تھا۔ ان حالات میں یہ بات حیرت انگیز نہیں کہ جو سرمایہ بھی میسر تھا اس نے صنعت کے بجائے تجارت کا رخ کر لیا۔ حکومت نے ایک سرمایہ کاری کی تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی جو اس امر کی تفتیش کرے اور چارۂ کار تجویز کرے۔ مستقبل کے صنعت کاروں سے حبِ وطن کے نام پر بھی بار بار اپیل کی گئی۔ لیکن اس کا اس وقت تک کوئی اثر نہ ہوا، جب تک ایسے اقتصادی حالات پیدا نہ کر دیے گئے، جن میں صنعت بھی تجارت کی طرح منفعت بخش ہو گئی۔ جنگِ کوریا کے ختم ہونے کے بعد جب خام اشیاء کی قیمتیں بڑی تیزی سے گر گئیں تو اس سے پاکستان کی زرِ مبادلہ کی آمدنی بھی بہت گھٹ گئی۔ چنانچہ پہلے سالوں کی نا روا طور پر فراخدلانہ درآمدی پالیسی جس کے تحت صنعتی مشینری سے کہیں زیادہ اشیاءِ صرف منگوائی جاتی تھیں۔ ۱۹۵۲ء میں اس پر سختی سے نظرِ ثانی کی گئی اور اس کا رخ نئی صنعتوں کے لیے مشینری

وغیرہ کی درآمد کی طرف پھیر دیا گیا۔ غیر ملکی کپڑے اور دوسری اشیاء صرف کی درآمد پر پابندیوں سے مقامی صنعتی پیداوار کو تحفظات بھی ملے اور محرکات بھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سرمایہ تجارت سے صنعت کی طرف بہنے لگا۔ اسی زمانہ یعنی جنوری ۱۹۵۲ء میں پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن بھی قائم کر دی گئی تاکہ قومی اہمیت کی ایسی صنعتوں کی تاسیس کی جا سکے جن میں نجی سرمایہ نہیں لگایا جا رہا تھا۔ اس کارپوریشن میں سارا سرمایہ مرکزی حکومت نے لگایا تھا۔ غلام فاروق کی سرگرم سربراہی میں اور ان وسیع وسائل کی مدد سے جو حکومت پاکستان نے باوجود سخت مالی تنگی کے اسے مہیا کیے۔ اس کارپوریشن نے ملک کی صنعتی ترقی میں بہت نمایاں حصّہ لیا۔ کارپوریشن نے خود پہل کر کے اور نجی سرمایہ کی شرکت کے ساتھ پٹ سن کی صنعت کو فروغ دیا۔ اس نے کرنافلی پیپر مل اور سمینٹ چینی اور کیمیائی کارخانوں کے علاوہ جہاز سازی کے ادارے بھی قائم کیے۔ نجی اور سرکاری مساعی کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۵۲ سے ۱۹۵۵ تک چار سالوں میں صنعتی پیداوار میں ۱۰۰ فیصد سے بھی زیادہ اضافہ ہو گیا۔ معاشی ترقی کی یہ رفتار کسی بھی دَور میں کسی بھی ملک کے لیے امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

زراعت ایک صوبائی شعبہ تھا، یہ شعبہ نہ صرف صنعتوں کے لیے خام مال اور آبادی کے لیے خوراک کی ضروریات پوری کرتا تھا بلکہ ملک کا کم و بیش سارا زرِ مبادلہ بھی اسی شعبہ سے حاصل ہوتا تھا۔ اور آبادی کی اکثریت کے لیے ذریعہ معاش بھی یہی شعبہ تھا۔ مرکزی حکومت نے اس کے ترقیاتی منصوبوں کے لیے قرضوں اور عطیات کی صورت میں مدد بہم پہنچائی۔ آبپاشی کے منصوبے مثلاً مغربی پاکستان میں تھل پروجیکٹ اور مشرقی پاکستان میں گنگا کپاڈک پروجیکٹ زراعت کی ترقی کے لیے نہایت ضروری تھے۔ کام میں ہم آہنگی پیدا کرنے اور فنی امداد دینے کے لیے حکومت پاکستان نے سنٹرل انجینیئرنگ اتھارٹی قائم کر دی۔ حکومت پاکستان نے لارڈ بائیڈ ارکی صدارت میں ایک زرعی تحقیقاتی کمیٹی بھی مقرر کی۔ مرکزی حکومت نے زرعی ترقیاتی مالیاتی کارپوریشن بھی قائم کی۔ لیکن زراعت کی بنیادی ذمہ داری صوبائی حکومتوں کی تحویل میں ہی رہی، اور انہوں نے بدقسمتی سے اس کی طرف کماحقہٗ توجہ نہ کی۔

ہماری زراعت کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ کاشتکاری کے موجودہ طریقوں کو کس طرح جدید سائنسی طریقوں میں تبدیل کیا جائے تاکہ فی ایکڑ اور فی کس پیداوار بڑھائی جا سکے۔ اس کے لیے دیہی زندگی کے معاشرتی اور معاشی حالات میں تبدیلی کی ضرورت ہے، اراضی کے نظام لگان داری میں اصلاح ہونی چاہیے۔ امداد باہمی کی نئی راہیں کھولنی چاہئیں۔ زمین کو زیادہ بارآور بنانے کے لیے وسیع پیمانے پر سرمایہ لگانا چاہیے، قرضہ کی

سہولتوں کا مناسب بندوبست ہونا چاہیے۔ ذرائع مواصلات کو پھیلانا چاہیے۔ بہتر قسم کے بیجوں اور کاشتکاری کے سائنسی طریقوں کا استعمال بڑھانا چاہیے۔ کیمیائی کھاد، کرم کش ادویہ، ٹریکٹروں اور دوسرے زرعی ساز و سامان کی تیاری کیلئے صنعتوں کا قیام عمل میں لانا چاہیے۔ اس کے لیے کاشتکاروں کے ذہنی رجحان میں بھی تبدیلی کی ضرورت ہے تاکہ وہ ایک جامد معیشت سے، جس میں وہ محض اپنی ضروریات کے مطابق پیداوار حاصل کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں، آگے بڑھ کر ایسی متحرک معیشت کو اختیار کر سکیں، جس کا مقصد فاضل پیداوار کی تجارت بھی ہو۔

مشرقی پاکستان میں اور مغربی پاکستان کے بیشتر علاقوں میں عام طور پر زرعی املاک قلیل اور اقتصادی لحاظ سے ناکافی ہیں اور آبادی بڑھنے سے حصے بخروں میں تقسیم ہو کر اور بھی کم ہوتی جا رہی ہیں۔ اشتمال اراضی ایک فوری اور اہم ضرورت ہے۔ مشرقی پاکستان میں، جو آبادی کے اعتبار سے دنیا بھر میں ایک گنجان ترین علاقہ ہے۔ زمین کی شدید قلت ہے۔ وہاں اراضی سے پوری طرح استفادہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مصنوعی آبپاشی سے موسم سرما میں ایک اور فصل حاصل کی جائے۔ مغربی پاکستان میں پانی بہت بڑا مسئلہ ہے اور اراضی کا استعمال پانی کی میسر مقدار تک محدود ہے۔ ایک بڑی اور بڑھتی ہوئی آبادی زمین کے محدود وسائل پر صرف اسی طرح بسر اوقات کر سکتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ فصلیں کاشت کی جائیں۔ زراعت کو سائنسی خطوط پر ترقی دی جائے۔ اور اسے گھریلو دستکاریوں اور اوسط درجہ کی صنعتوں سے مربوط کیا جائے۔ اس کام کے لیے ملک بھر کے دیہات میں بجلی کی بہم رسانی ناگزیر ہے۔ جہاں ملکیتیں اتنی چھوٹی ہوں کہ ان پر گزارہ مشکل ہو اور کسان اتنے غربت زدہ ہوں کہ اکیلے اکیلے نہ کسی برے وقت کا سامنا کر سکیں اور نہ قرض حاصل کر سکیں تو وہاں امداد باہمی اور اجتماعی جدوجہد کا راستہ اختیار کرنا ضروری ہے۔

آزادی کے بعد پہلے چند سالوں میں زراعت کی ترقی کے مسائل کی وسعت اور پیچیدگیوں کا پوری طرح احساس نہیں کیا گیا۔ بارش معمول کے مطابق ہوتی تھی۔ ملک خوراک میں خود کفیل تھا — لیکن کتنی تھوڑی حد تک؟ اس پر بہت کم لوگ سوچنے کی زحمت گوارا کرتے تھے۔ بنیادی زر آور فصلوں پٹ سن اور کپاس کی معقول قیمتیں مل جاتی تھیں اور ان میں اضافہ کا رجحان بھی تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جس کساد بازاری کا اندیشہ تھا، وہ وقوع پذیر نہیں ہوئی تھی۔ مغربی پاکستان سے ہندو ساہوکاروں کے چلے جانے سے قرضے کا عظیم بار تقریباً رفع ہو گیا تھا اور اس پر کاشتکاروں نے فوری طور پر سکھ کا سانس لیا تھا۔ اگرچہ کچھ عرصہ بعد دیہی قرضہ کی سہولتوں میں کمی کا احساس ہوا۔ ہندوستان کی طرف سے نہری پانی بند کر دینے سے

مغربی پنجاب کو دھچکہ ضرور لگا تھا لیکن یہ ایک خارجی خطرہ تھا اور اس کی نوعیت اندرونی مسائل مثلاً نظام لگان داری یا سیلاب اور سیم سے کافی مختلف تھی۔

مشرقی پاکستان میں لارڈ کارنوالس نے ۱۷۹۳ء میں بنگال کا بندوبست دوامی کر کے زمینداروں کا ایک نیا طبقہ پیدا کر دیا تھا، جو بیشتر ہندو تھے، وہ حکومت کو مالیہ کی ایک مقررہ رقم ادا کرتے تھے لیکن کاشتکار سے حتی الوسع زیادہ سے زیادہ لگان حاصل کرنے میں انہیں چھوٹ تھی۔ زمیندار اپنی اراضی کسی لگان دار کو پٹے پر دے دیتا تھا، جو لگان وصول کرنے کے لیے آگے کسی اور کو مامور کر دیتا تھا اور اس طرح کاشتکار کی محنت، یہ کئی ایک نکھٹو پلتے تھے۔ زرعی اصلاحات کے لیے کئی مرتبہ پُرزور آواز بلند کی گئی تھی لیکن متقدر زمیندار طبقہ کا سیاسی اثر و رسوخ اسے صدا بصحرا بنا دیتا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں بنگال کے زرعی مالیہ کمیشن کی اس سفارش کے باوجود کہ بندوبست دوامی کو منسوخ کر دیا جائے، انگریزی راج کے خاتمہ تک یہ نظام کسی تبدیلی کے بغیر نافذ رہا۔ قیام پاکستان کی بدولت ان زرعی اصلاحات پر عمل درآمد ممکن ہو گیا، جن کی ضرورت عرصہ دراز سے محسوس کی جا رہی تھی۔ چنانچہ مشرقی بنگال کے قانون مجریہ ۱۹۵۰ء نے بندوبست دوامی کو منسوخ کر دیا اور کاشتکار اور حکومت کے مابین براہ راست روابط قائم کر دیے۔ لیکن کئی اور مسائل پیدا ہو گئے مثلاً جوار بھاٹا کی لہروں اور دریاؤں کے کٹاؤ سے حفاظت کے لیے بندوں کی دیکھ بھال کا مسئلہ۔ تنسیخ زمینداری کے بعد ان بندوں کی مرمت نہ ہو سکی۔ کیونکہ ان کی دیکھ بھال کے لیے کاشتکاروں کے پاس نہ مالی وسائل تھے اور نہ قوت تنظیم۔ رفتہ رفتہ حکومت کی اعانت اور امداد باہمی سے ان مسائل پر قابو پایا جا رہا ہے۔ لیکن ابھی ان سے بھی بڑے مسائل حل طلب ہیں، ان کا تعلق غیر معمولی سیلابوں اور دوسری ارضی و سماوی آفات پر قابو پانے سے ہے، جن سے وقتاً فوقتاً معیشت کو سخت نقصان پہنچتا رہتا ہے۔ برہم پترا اور گنگا جیسے عظیم دریاؤں میں پانی کے بہاؤ پر قابو پانے کے لیے ہندوستان کے اشتراک عمل سے بہت وسیع تعمیرات کی ضرورت ہے یہ دریا ہندوستان سے مشرقی پاکستان کے ہموار ڈیلٹا علاقہ میں بہتے ہیں۔ کیا ایسے اشتراک عمل کی نوبت آئے گی؟ یہ ایک بحث طلب سوال ہے کیونکہ دریائے گنگا پر فرخا بند کی تعمیر کے سلسلے میں ہندوستان نے مشرقی پاکستان کے مفادات کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔

مغربی پاکستان میں خود کاشت کاروں کا بہت بڑا طبقہ موجود تھا، جو اپنی زیر کاشت اراضی کے خود مالک تھے، لیکن بڑے زمیندار بھی موجود تھے۔ خاص طور پر سندھ اور پنجاب اور شمال مغربی سرحدی

صوبہ کے بعض علاقوں میں زرعی اصلاحات کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی۔ پنجاب میں حقوق مزارعت کے تحفظ و بحالی کا قانون ۱۹۵۰ء میں منظور کیا گیا، لیکن اس سے مطلوبہ نتائج برآمد نہ ہوئے۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ میں جو قانونِ مزارعت ۱۹۵۰ء میں منظور کیا گیا، اس سے قدرے بہتر نتائج حاصل ہوئے۔ سندھ بڑے زمینداروں کا مضبوط گڑھ تھا، وہ زیر کاشت رقبہ کے ۷۰ فیصد حصہ کے مالک تھے۔ قانون مزارعت سندھ مجریہ ۱۹۵۰ء میں ہاریوں کو معمولی سے حقوق عطا کیے گئے۔ مغربی پاکستان کی ریاستوں کا ڈھانچہ جاگیردارانہ تھا سوائے بہاولپور کے نوآباد علاقوں میں، جہاں نئی نہری زمینوں کو خود کاشتکاروں نے آباد کیا تھا۔

مغربی پاکستان کے لیے ایک اور بڑا مسئلہ سیم اور تھور کا ہے، جو دیہی علاقوں میں سرطان کی طرح پھیل رہا ہے۔ اس سے متاثر ہونے والے وسیع علاقوں کی بحالی اور اس کی مزید تباہ کاریوں کی روک تھام کے لیے پمپوں اور پانی کے نکاس کے لیے نالیوں کے بہت وسیع نظام کی ضرورت ہے، مزید برآں تازہ پانی بھی بڑی مقدار میں چاہیے تاکہ سطح زمین کو شورہ سے پاک کیا جا سکے۔

تعلیم بھی صوبائی محکمہ تھا۔ حصولِ آزادی کا ایک اثر یہ ہوا کہ تعلیم کے تقاضے بہت بڑھ گئے، لیکن صوبائی حکومتیں ان سے کما حقہٗ عہدہ برآ نہیں ہو سکیں۔ ہندو اساتذہ کے جانے سے معلمین کی تعداد گھٹ گئی اور عارضی طور پر تعلیم کو دھچکا لگا۔ مرکزی حکومت نے تعلیم کے معاملے میں رہنمائی بھی کی اور یونیورسٹیوں اور فنی تعلیم کے لیے گرانٹیں بھی دیں۔ کراچی وفاقی علاقہ تھا، وہاں تعلیم کی ذمہ داری حکومتِ پاکستان پر عائد تھی۔ اس نے کراچی یونیورسٹی کو قائم کیا۔ سائنسی و صنعتی تحقیقات کی ایک کونسل بنائی۔ جس کی مرکزی تجربہ گاہ کراچی میں تھی اور مشرقی و مغربی پاکستان میں علاقائی تجربہ گاہیں تھیں۔

اسی طرح صحتِ عامہ بھی صوبوں کی ذمہ داری تھی اور مرکزی حکومت کا کام صرف مشورہ اور تطبیق یا انسداد ملیریا ایسے منصوبوں کے لیے اعانت تک محدود تھا۔ شہروں میں آبادی کی افراط نے رہائش کی جو قلت پیدا کر دی تھی اسے دور کرنے کے لیے حکومت پاکستان نے ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کی۔

معاشرتی اور معاشی ترقی کے ان مسائل کے علاوہ پاکستان کو دفاع کا بارِ گراں بھی درپیش تھا۔ اپنی جغرافیائی وضع کے اعتبار سے پاکستان برِصغیر کی شمال مغربی اور شمال مشرقی سرحدوں کا محافظ ہے چند سال پہلے تک ہمالیہ کے سلسلۂ کوہ کی بلند دیوار ایک ناقابلِ عبور سدِ راہ تھی۔ برِصغیر پر بڑے حملے خواہ وہ زمانہ قبل از تاریخ میں آریاؤں کے تھے یا تاریخی دور میں سکندرِ اعظم اور دوسروں کے، وہ سب کے سب

شمال مغرب کی طرف سے ہوئے تھے۔ البتہ دوسری جنگِ عظیم میں برصغیر کو جاپان کی طرف سے خطرہ شمال مشرق سے ابھرا۔ لیکن زمانہ حال میں پاکستان کی سلامتی کو سب سے بڑا خطرہ ہندوستان کی طرف سے ہے۔ جوناگڑھ حیدرآباد اور کشمیر میں ہندوستان کی جارحیت مسلسل یاد دلا رہی ہے کہ برصغیر میں امن کتنا ناپائیدار ہے۔

یہ تھا وہ پس منظر، جس میں ۴۹-۱۹۴۸ء کے مالی سال کے لیے پاکستان کے وزیرِ خزانہ نے مارچ ۱۹۴۸ء میں اپنا پہلا بجٹ پیش کیا۔ کیا دوست اور کیا دشمن سبھی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہ متوازن بجٹ تھا۔ برطانوی حکومت کے معمول کے مطابق ہندوستان اور پاکستان میں بجٹ دو حصوں میں منقسم ہوتا ہے۔ مالیاتی بجٹ اور تعمیر و ترقی کا بجٹ۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۴۸ء تک کے ساڑھے سات مہینوں میں خسارہ ہوا تھا لیکن اس عرصہ کے حالات یکسر غیر معمولی تھے۔ ایک نئی انتظامیہ کے قیام اور مہاجرین کے سیلاب نے حکومت پر بڑا بھاری مالی بار ڈال دیا تھا۔ مواصلات اور تجارت میں خلل کی وجہ سے کاروباری سرگرمیاں اور سرکاری آمدنی بہت کم ہو گئی تھی۔ تارکینِ وطن ٹیکسوں کے جو بقایا چھوڑ گئے تھے، وہ وصول نہیں کیے جا سکتے تھے۔ ہندوستان کے ساتھ اقرارنامہ کے تحت ہر ڈومینین صرف اپنے علاقہ میں جمع ہونے والے محاصل وصول کرنے کی مجاز تھی اور یہ بات پاکستان کے مفاد میں نہیں تھی۔ کیونکہ ٹیکسوں کی وصولی کاروباری اداروں کے صدر دفاتر سے ہوتی تھی اور ان میں سے اکثر ہندوستان میں واقع تھے۔ مزید برآں مرکزی ایکسائز کے محاصل ان مقامات سے وصول کیے جاتے تھے جہاں مصنوعات تیار ہوتی تھیں۔ اور ہندوستان نے پاکستان کو ان اشیاء پر یہ محاصل ادا کرنے سے انکار کر دیا جو پاکستان کو برآمد کی جاتی تھیں۔

پہلا بجٹ جو پورے سال کے لیے پیش کیا گیا وہ ۴۹-۱۹۴۸ء کے لیے تھا، اور وہ متوازن تھا۔ اس مقصد کے لیے غیر منقسم ہند کی وفاقی مالیات کی سکیم میں چند تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ مثلاً ریلوے بجٹ کو مرکزی بجٹ میں شامل کر دیا گیا۔ اگرچہ شمال مغربی سرحدی صوبہ میں دفاعی اہمیت کی حامل ریلوے لائنوں پر خسارہ ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود نارتھ ویسٹرن ریلوے سے معتدبہ فاضل آمدنی حاصل ہو رہی تھی جبکہ ایسٹ بنگال ریلوے خسارہ پر چل رہی تھی۔ تاہم مجموعی حیثیت سے کاہش بہا کا اہتمام کرنے کے بعد بھی ریلوے سے منافع حاصل ہو رہا تھا جسے عام محاصل آمدنی میں شامل کر لیا گیا۔ صوبوں سے مشورہ کرنے کے بعد سیلز ٹیکس کو بھی عارضی طور پر مرکزی حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت یہ صوبوں کی آمدنی کا ایک ذریعہ تھا، اس سلسلہ میں صوبوں کے ساتھ یہ مفاہمت ہوئی تھی کہ جو آمدنی انہیں اس ٹیکس سے بطورِ خود

حاصل ہوتی وہ انہیں بہرحال ادا کر دی جائے گی۔ تقسیم سے قبل وفاقی مالیات کی باقیماندہ سکیم برقرار رہنے دی گئی۔ ۱۹۳۶ء کے نیمائر ایوارڈ کے تحت پٹ سن پیدا کرنے والے صوبے پٹ سن پر برآمدی محصول کے ۶۲٫۵ فیصد حصہ کے حقدار تھے، علاوہ ازیں مرکزی حکومت کی طرف سے شمال مغربی سرحدی صوبہ کو ایک کروڑ روپے کی اعانت ملا کرتی تھی۔ یہ ادائیگیاں جاری رکھی گئیں۔

اخراجات کے ضمن میں دفاعی امور کے لیے ۳۷٫۱۰ کروڑ روپے اور دفاع کے ترقیاتی منصوبوں کے لیے ۳٫۰۰ کروڑ روپے مخصوص کیے گئے۔ اقتصادی ترقی و تعمیر کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ ریلوے اور ڈاک اور تار اور مرکزی حکومت کے دوسرے ترقیاتی منصوبوں کے لیے دس کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی اور صوبائی حکومتوں کو ترقیات کے لیے ڈیڑھ کروڑ کے عطیات اور بارہ کروڑ کے قرضے دیے گئے۔ یہ رقوم بڑی نہیں تھیں۔ لیکن آغاز تو کر دیا گیا۔ آئندہ سالوں میں جوں جوں آمدنی بڑھتی گئی، ترقیات کے لیے ان سے بہت بڑی رقوم مخصوص کی جاتی رہیں۔

صوبائی حکومتوں نے بھی شدید دشواریوں کے باوجود اپنے وسائل کے اندر گزر اوقات کا انتظام کر لیا۔ مشرقی بنگال کو چونکہ ایک نئی انتظامیہ کے ساتھ ہی ساتھ ڈھاکہ میں نیا دارالحکومت بھی قائم کرنا تھا، اس لیے اسے غیر معمولی اخراجات برداشت کرنے پڑے۔ اگرچہ مشرقی بنگال کی آبادی مغربی بنگال کے مقابلہ میں دگنی تھی، تقسیم کے وقت اس کی آمدنی مغربی بنگال سے آدھی تھی۔ یہ کلکتہ اور دوسرے ترقی یافتہ علاقوں کے پاکستان سے نکل جانے کا ناگزیر نتیجہ تھا۔ مزید خرابی یہ ہوئی کہ مغربی بنگال نے مشترک اثاثہ جات سے مشرقی بنگال کا حصہ نہ دیا۔ حکومت ہندوستان نے بھی مختلف حیلوں بہانوں سے مشرقی بنگال کو ۱۲ کروڑ روپے کی وہ خطیر رقم ادا کرنے سے انکار کر دیا، جو دوسری جنگ عظیم میں زمینوں اور عمارات کو سرکاری تحویل میں لینے کے باعث واجب الادا تھی۔ بہ حیثیت مجموعی مشرقی پاکستان کو خاصی شدید مالی مشکلات درپیش تھیں۔ مغربی پنجاب کی معیشت کو انتہائی وسیع فسادات اور عام تباد لۂ آبادی نے مختل کر دیا تھا۔ زراعت، تجارت، صنعت، مواصلات الغرض معاشی زندگی کے ہر شعبہ کو نقصان پہنچا تھا اور اس کی بحالی ضروری تھی۔ لاکھوں مہاجروں کو آباد کرنا تھا۔ بایں ہمہ معیشت کی بحالی تیز رفتاری سے ہوئی۔ سب صوبوں میں سے سندھ کی حالت اطمینان بخش تھی۔ اس کے زمین اور پانی کے وسائل بلحاظ آبادی بہت کافی تھے۔ سکھر بیراج سے وسیع علاقے سیراب ہوتے تھے اور کوٹری کے مقام پر ایک اور بیراج پایۂ تکمیل تک پہنچنے والا تھا۔

بہ حیثیت مجموعی حالت یہ تھی کہ صوبے موجودہ انتظامیہ کو تو برقرار رکھ سکتے تھے لیکن قومی تعمیر کے کاموں کے لیے ان کے وسائل ناکافی تھے۔ وہ اس بات کی ضرورت محسوس کرتے تھے کہ مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں کے مابین محاصل آمدنی کی تقسیم کا از سر نو جائزہ لینے اور اس میں ترمیم کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسا جائزہ ۵۲-۱۹۵۱ء کے موسم سرما میں سر جیری ریزمین نے لیا، وہ غیر منقسم ہند میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا سابق فنانس ممبر تھا۔ اس نے جو سفارشات پیش کیں وہ منظور کر لی گئیں۔

پاکستان کا پہلا بجٹ فقط اس لحاظ سے دقیع نہیں تھا کہ وہ متوازن تھا بلکہ اس کی اصل اہمیت یہ تھی کہ اس نے ثابت کر دیا کہ حکومتِ پاکستان کے پاس نہ صرف انتظامیہ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی وسائل ہیں، بلکہ دفاع اور ترقی و تعمیر کے لیے بھی وسائل میسر ہیں۔ پاکستان کے مخالفین کی یاس انگیز پیشگوئیاں غلط نکلیں۔ پاکستان کی صلاحیتِ بقا محقق ہو گئی اور پاکستان کے معاشی استحکام میں لوگوں کے یقین کو بڑی تقویت پہنچی۔ یکم اپریل ۱۹۴۸ء کو قائد اعظم نے ایک تقریر کے دوران میں کہا :-

> "جب ہم نے پہلے پہل پاکستان کی آزاد و خود مختار مملکت کے لیے مطالبہ کیا تھا تو ایسے باطل پیغمبروں کی تعداد کم نہ تھی، جو ہمیں اپنے نصب العین سے یہ کہہ کر منحرف کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ پاکستان معاشی اعتبار سے ممکن العمل نہیں ہے اولین بجٹ نے ہی ان باطل پیغمبروں کو سخت صدمہ پہنچایا ہو گا۔ اس نے پاکستان کے مالیاتی استحکام اور اس کی حکومت کے اس عزم کا پورا مظاہرہ کر دیا ہے کہ وہ اسے مستحکم تر اور مضبوط تر بنائے گی"۔ [۳۵]

ایک اور اقدام جو قوم کے لیے اطمینان بخش اور اعتماد افزا تھا وہ یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو سٹیٹ بنک آف پاکستان کا افتتاح تھا۔ تقسیم کے ایام میں میں نے حتی الوسع جلد از جلد اپنا مرکزی بنک اور کرنسی کا ادارہ قائم کرنے پر زور دیا تھا، کیونکہ اس کے بغیر ہمیں اپنی آزادانہ پالیسی پر گامزن ہونا دشوار ہو گا لیکن نامزد وزیر خزانہ غلام محمد نے اس بات کو قرینِ احتیاط سمجھا کہ ریزرو بنک آف انڈیا کم و بیش ایک سال کے لیے ہمارے مالیاتی امور کا انتظام کرے۔ سٹیٹ بنک کے گورنر کے طور پر زاہد حسین کا انتخاب ایک طے شدہ معاملہ تھا۔ وہ ایک بہت آزمودہ کار ماہرِ مالیات تھے۔ لیکن جب یکم اکتوبر ۱۹۴۷ء تک ریزرو بنک آف انڈیا کو ہی پاکستان کے کرنسی کے معاملات سپرد کرنے کا فیصلہ ہو گیا، تو انہیں عارضی طور پر ہندوستان میں

ہائی کمشنر برائے پاکستان مقرر کر دیا گیا۔ جب دسمبر ۱۹۴۷ء میں حکومت ہندوستان کی ہدایات کے تحت ریزرو بنک آف انڈیا نے پاکستان کے حصّہ کے متفق علیہ نقد بقایا جات روک لیے، تو طے شدہ تاریخ سے پہلے ہی اپنے لیے آپ انتظام کرنے کی ضرورت واضح ہو گئی، اور سٹیٹ بنک آف پاکستان کے قیام کی تاریخ تین ماہ پہلے کر دی گئی۔

سٹیٹ بنک آف پاکستان کا قیام یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو تین کروڑ روپے کے سرمایہ سے عمل میں لایا گیا، اس میں ۱۵ فیصد سرمایہ مرکزی حکومت نے اور باقی عام لوگوں نے لگایا تھا۔ بنک کے امور کی عمومی ہدایت اور نگرانی ایک سنٹرل بورڈ آف ڈائریکٹرز کے ذمّے ہے۔ ان میں بعض کو حکومت نامزد کرتی ہے اور بعض کا انتخاب حصّہ دار کرتے ہیں۔ کراچی، ڈھاکہ اور لاہور کے تین مرکزوں میں ایک ایک لوکل بورڈ بھی ہے۔

غیر منقسم ہند میں بنک کاری کا میدان غیر مسلموں کے لیے مخصوص تھا، اور بہت تھوڑے مسلمان اس پیشہ میں تربیت یافتہ تھے۔ تجربہ کار عملہ کی کمی کے باعث جن مشکلات سے پاکستان کا ہر محکمہ اور ادارہ دوچار تھا، سٹیٹ بنک کو وہ بدرجہا بڑے پیمانہ پر درپیش تھیں۔ تمام ابتدائی امور کو سرانجام دینے کے لیے بہت تھوڑا وقت میسّر تھا۔ لیکن زاہد حسین کی قابل قیادت میں بنک نے مقررہ تاریخ کو اپنا کام شروع کر دیا۔

یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو رسمِ افتتاح قائدِاعظم نے ادا کی، وہ اس تقریب کے لیے اپنی علالت کو نظرانداز کرتے ہوئے کوئٹہ سے خاص طور پر کراچی آئے، جہاں گرمی کا کافی زور تھا۔ اس موقع کو اور زیادہ یادگار حیثیت اس لیے بھی حاصل ہو گئی کہ یہ آخری تقریب تھی جس میں قائدِاعظم تشریف لائے۔ انہوں نے کہا کہ "سٹیٹ بنک آف پاکستان کا افتتاح مالیاتی شعبہ میں ہماری مملکت کی خودمختاری کا مظہر ہے"۔ انہوں نے اپنی تقریر کو ختم کرتے ہوئے جو خیالات ظاہر کیے، ان سے واضح ہو جاتا ہے کہ دنیا جن معاشرتی و معاشی عوارض میں مبتلا تھی، وہ انہیں کس قدر شدت سے محسوس کرتے تھے اور ان کے مداوا کی انہوں نے کیا تدبیر تجویز کی۔ قائدِاعظم نے فرمایا:

"مغرب کے معاشی نظام نے نوعِ انسانی کے لیے تقریباً لاینحل مسائل پیدا کر دیے ہیں، اور ہم میں سے اکثر یہ محسوس کرتے ہیں کہ کوئی معجزہ ہی اس تباہی سے بچا سکتا ہے جو اس وقت دنیا کو درپیش ہے۔ مغرب کے معاشی نظریہ اور معمول کو اختیار کرنے سے ہمیں اپنے نصب العین ـــ عوام کو خوشحال اور خوشنود بنانے ـــ کے حصول میں کوئی مدد نہیں ملے گی۔ ہمیں اپنے مقدر کو اپنے طریقہ پر بنانا چاہیے۔

جو انسانی مساوات اور سماجی انصاف کے صحیح اسلامی تصورات پر مبنی ہو" کلے

سٹیٹ بنک کے اوّلیں فرائض میں قبل از تقسیم کی کرنسی کو تبدیل کرنا تھا۔ یکم اپریل ۱۹۴۸ء سے ایسے ہندوستانی نوٹ چل رہے تھے، جن پر "حکومتِ پاکستان" کے الفاظ کا ٹھپا لگا ہوا تھا رفتہ رفتہ پاکستان کے اپنے نوٹوں نے ان کی جگہ لے لی۔ تھامس ڈی لارو کی برطانوی فرم کے ساتھ مل کر کراچی میں سیکورٹی پرنٹنگ کارپوریشن کا قیام عمل میں لایا گیا تاکہ کرنسی نوٹ اور وثیقہ کی دوسری دستاویزات تیار کی جاسکیں۔

سٹیٹ بنک کا بنیادی فرضِ منصبی روپے پیسے کے نظام کو استحکام اور بنکوں اور قرضوں کے سسٹم کو ملک کے بہترین مفاد میں فروغ دینا تھا۔ غیر منقسم ہند میں بنک کاری میں عملی طور پر ہندوؤں کو اجارہ داری حاصل تھی۔ تقسیم کے ایام میں یعنی ۳۰ جون سے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء تک ہندوؤں کے زیرِ انتظام بیشتر بنکوں نے اپنے صدر دفاتر اور فنڈ پاکستان سے ہندوستان میں منتقل کر دیے تھے۔ پنجاب میں فسادات نے اس سلسلہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ مغربی پاکستان میں منظور شدہ بنکوں کی ۴۸۷ شاخوں میں تقسیم کے بعد صرف ۶۹ باقی رہ گئیں، ۵ھ صرف ایک بنک نے اپنے صدر دفتر کو ہندوستان سے پاکستان میں منتقل کیا اور وہ مسلمانوں کی زیرِ ملکیت حبیب بنک تھا۔ اس طرح قرضہ کی سہولتیں بے حد کم ہو گئی تھیں۔ اور اس شعبہ میں خاص جدّ و جہد کی ضرورت تھی۔

سٹیٹ بنک کو زرِ مبادلہ کو کنٹرول کرنے اور قومی قرضہ کا انتظام کرنے کے فرائض بھی تفویض کیے گئے تھے۔ چونکہ بازارِ زر بالکل ابتدائی حالت میں تھا اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ سرکاری قرضے لینے کا سارا کام مرکزی حکومت کی وساطت سے سرانجام دیا جائے، اس میں صوبائی حکومتوں کو ان کے ترقیاتی منصوبوں کے لیے قرضے بھی شامل تھے۔ ۱۹۴۸ء میں کئی قرضے جاری کیے گئے، عوام نے ان میں بڑے جوش و خروش سے سرمایہ لگایا۔ چنانچہ اس سال کے دوران میں قرضوں سے حاصل شدہ رقوم کی مجموعی مالیت ۵۰۰ کروڑ روپے تھی، جو اس زمانے میں ملک کے معاشی حالات کے پیشِ نظر بہت غیر معمولی تھی۔ یہ ہر طبقے کے لوگوں کی طرف سے پاکستان کو ایک مستحکم اور جدید مملکت بنانے کے پختہ عزم کا ایک اور مظاہرہ تھا۔

زرِ مبادلہ کی حالت اطمینان بخش تھی۔ پاکستان میں پیدا ہونے والی اشیا کی بیرونی منڈیوں میں خاصی مانگ تھی۔ رواں آمدنی کے علاوہ پاکستان کے حصہ کے وہ سٹرلنگ بقایاجات بھی تھے جو دوسری

جنگِ عظیم کے دوران میں جمع ہوتے رہے تھے۔ ان کی مالیت ۱۹۶ کروڑ روپے تھی۔ اس بند کھاتے سے جاریہ اخراجات کے لیے رقوم وقتاً فوقتاً گفت و شنید سے نکلوالی جاتی تھیں۔ بڑی برآمدت خام پٹ سن کی اوسطاً ساٹھ لاکھ گانٹھیں اور روئی کی سولہ لاکھ گانٹھیں سالانہ تھیں۔ پٹ سن سے برآمدی آمدنی کا تقریباً نصف حصہ حاصل ہوتا تھا اور روئی سے ایک تہائی۔ جنگِ کوریا کی وجہ سے جب بھاؤ چڑھ گئے تو روئی سے برآمدی آمدنی کا حصہ ۴۰ فیصد تک بڑھ گیا۔ لیکن ملک میں پارچہ بافی کی صنعت کے فروغ پانے سے اس میں معتدبہ کمی ہوگئی۔ پٹ سن اور روئی سے کم درجہ پر چھوٹی برآمدات تھیں۔ مثلاً چائے، اون، کھالیں اور چمڑا اہم درآمدات سوتی کپڑا اور سوت، مشینری، گاڑیاں، دھاتیں، تیل، کیمیات اور ادویہ تھیں۔

تجارت کا اسلوب وہی تھا، جو قبل از تقسیم زمانہ سے ورثہ میں ملا تھا۔ پٹ سن کا سب سے بڑا خریدار ہندوستان تھا۔ درآمدات میں برطانیہ سے خریداری سرِ فہرست تھی۔ اس کی ایک وجہ شاہی ترجیحات تھیں، جن کے تحت برطانوی مصنوعات بشمول سوتی کپڑا اور فولاد کی درآمد پر محصول میں رعایت دی جاتی تھی اور کسی حد تک یہ بات برِصغیر سے طویل برطانوی تعلقات کا بھی نتیجہ تھی۔ برطانیہ سے تجارت میں مستقل خسارہ رہتا تھا، یعنی اس کی پاکستان میں درآمد زیادہ تھی اور یہاں سے برآمد کم۔

اس ناہموار صورتِ حالات کو زیادہ متوازن اور متنوع بنانے کی ضرورت تھی تاکہ پاکستان کی معاشی قسمت ایک یا دو ملکوں سے جکڑی نہ رہے۔ اس پالیسی کے تحت کئی ملکوں سے بات چیت کے بعد تجارتی معاہدے کیے گئے۔ ان معاہدوں میں باہمی خریداری کی حدیں متعین کردی جاتی تھیں۔ اگرچہ ان پر ہمیشہ پورا عمل درآمد نہیں ہوتا تھا۔ تاہم وہ تجارت کے نئے میدان کھولنے میں بہت مفید ثابت ہوئیں اور ان سے پالیسیوں کی تشکیل میں زیادہ آزادی ملی۔

پاکستان کی معاشی آزادی کو ستمبر ۱۹۴۹ء میں سخت آزمائش سے گزرنا پڑا، جب برطانیہ نے پونڈ سٹرلنگ کی قیمت میں تقریباً ۳۰ فیصد کمی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی سٹرلنگ علاقہ کے رکن تھے۔ ہندوستان نے برطانیہ کی پیروی کی اور ہندوستانی روپے کی قیمت میں کمی کردی۔ پاکستان نے پاکستانی روپے کی قیمت میں کمی نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس زمانہ میں پاکستان کی برآمدات تقریباً تمام تر خام مال پر مشتمل تھیں۔ اور دنیا میں مناسب قیمتوں پر آسانی سے فروخت ہو جاتی تھیں۔ پاکستانی روپے کی قیمت میں کمی کرنے سے برآمدات میں تو اضافہ نہیں ہو سکتا تھا۔ البتہ ملک کے اندر قیمتوں کی سطح بلند

ہوجاتی۔ نوماہ بعد جب کوریا میں جنگ چھڑ گئی اور خام اشیاء کے بھاؤ تیزی سے چڑھنے لگے تو ملک کے اندر قیمتوں کو افراطِ زر سے بچانے کے لیے روئی اور پٹ سن پر بھاری شرح سے برآمدی محصول عائد کرنا پڑا۔ از طرفِ دیگر پاکستانی روپے کی قیمت میں کمی کرنے سے سٹرلنگ علاقہ کے باہر سے درآمد ہونے والی مشینری کی قیمت بڑھ جاتی اور صنعتی ترقی اور زیادہ مشکل ہوجاتی۔ اس کے برعکس پاکستانی روپے کی قیمت میں کمی نہ کرنے کا یہ نتیجہ نکلتا کہ اس سے برطانیہ اور باقی سٹرلنگ علاقہ سے درآمدات کی رفتار یقیناً تیز تر ہوجاتی، اور چونکہ اس زمانہ میں کھلے عام لائسنس پر آزادانہ درآمد کی پالیسی پر عمل ہو رہا تھا، اس لیے پاکستان میں دوسرے ملکوں سے اشیاءِ صرف کا سیلاب آجاتا۔ یہ صورتِ حال کسی طرح بھی نئی صنعتوں کے قیام کے لیے سازگار ثابت نہیں ہوسکتی تھی۔

وزیرِ خزانہ غلام محمد اس موقع پر ملک سے باہر تھے، انہوں نے وزیرِ اعظم کو ایک مفصل تار بھیجا جس میں سٹرلنگ کے ساتھ ہی ساتھ اسی شرح سے پاکستانی روپے کی قیمت کم کرنے کا پُرزور مشورہ دیا۔ لیکن وزیرِ تجارت فضل الرحمٰن نے ان سے بھی زیادہ اصرار کیا کہ قیمت میں کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ کابینہ میں اس مسئلہ پر طویل بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ سٹیٹ بنک کے گورنر زاہد حسین کو مشورے کے لیے بلایا گیا۔ بہ حیثیت مجموعی وہ قیمت میں کمی کرنے کے حق میں تھے لیکن ہر دو صورتوں میں ان کے نزدیک فوائد اور نقصانات کم و بیش یکساں تھے۔ میری رائے یہ تھی کہ قیمت میں کمی کرنے کی ضرورت تو ہے، لیکن برآمدات بڑھانے کے لیے نہیں، کیونکہ ہماری برآمدات بیشتر خام اشیاء پر مشتمل تھیں، بلکہ اشیاءِ صرف کی درآمد کے سیلاب کو روکنے کے لیے، اور اس مقصد کے لیے سٹرلنگ جتنی نہیں، بلکہ جزوی تخفیف کافی ہوگی۔ اس صورتِ حال کا ایک علاج درآمدات پر پابندی بھی ہوسکتا تھا۔ لیکن اس زمانہ میں کابینہ کھلے عام لائسنس کی پالیسی جاری رکھنے کا تہیہ کرچکی تھی۔ پورے دو دن تک اس مسئلہ کے ہر پہلو پر مفصل غور و خوض کرنے کے بعد کابینہ نے بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ پاکستانی روپے کی قیمت میں کمی نہیں کی جائے گی۔ آخری فیصلہ میں ایک اہم عنصر یہ احساس بھی تھا کہ اس سے پاکستان کی ساکھ بڑھ جائے گی۔

پاکستان کے روپے کی قیمت کو برقرار رکھنے کا فیصلہ پاکستان کے مفادات کی روشنی میں تمام پہلوؤں کا محتاط جائزہ لینے کے بعد کیا گیا۔ اس سے پاکستان کے معاشی استحکام اور آزادیِ رائے کا جو مظاہرہ ہوا اس سے دنیا دنگ رہ گئی۔ ہندوستانی نہ صرف دنگ رہ گئے بلکہ اس معاملہ میں انہوں نے اپنی تحقیر بھی محسوس کی، کیونکہ انہیں یہ بات ماننی پڑی کہ ایک سو پاکستانی روپے ۱۴۴ ہندوستانی روپوں کے برابر ہیں۔ دنیا بھر

کے ملکوں میں ہندوستان واحد ملک تھا، جس نے پاکستان کے اس فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، اور تجارتی جنگ شروع کر دی۔

اس وقت پٹ سن کی فصل کا موسم تھا۔ ہندوستان میں دنیا کی ساٹھ فیصد پٹ سن کی گھٹڑیاں نصب تھیں اور وہی خام پٹ سن کا سب سے بڑا خریدار تھا۔ کلکتہ جہاں کثیر تعداد میں گانٹھیں باندھنے والے کارخانے تھے، مشرقی پاکستان سے بیرونی منڈیوں کے لیے خام پٹ سن کی نکاس کا وہی بڑا دروازہ تھا۔ مارواڑی جن کے ہاتھ میں پٹ سن کی بیشتر تجارت تھی ہندوستانی شہری تھے اور ان کے صدر دفاتر بھی کلکتہ میں تھے۔ تجارت کے لیے جو بنک قرضے کی سہولتیں بہم پہنچاتے تھے، وہ بھی کلکتہ میں ہی تھے۔ پٹ سن کے معاملہ میں ہندوستانیوں کو اپنی مضبوط پوزیشن کا اتنا زعم تھا کہ دونوں ملکوں کے مابین تجارتی معاہدہ کے لیے بات چیت کے دوران میں ہندوستانی وفد کے لیڈر نے مجھ سے کہا "آپ اپنی پٹ سن کا کیا کر سکتے ہیں، سوائے اس کے کہ ہمارے ہاتھ فروخت کر دیں، کیا آپ اسے نذر آتش کر دیں گے؟ یا خلیج بنگال میں پھینک دیں گے؟"

اب یکایک پاکستان کو ایک سنگین بحران درپیش تھا۔ ہندوستان کا پٹ سن کی خرید سے انکار اور اس کی برآمد اور کلکتہ میں بنک کاری کی سہولتیں بند کرنے کا مطلب یہ تھا کہ پٹ سن کی قیمتوں میں تباہ کن کمی ہو جائے گی، جس سے مشرقی پاکستان میں لاکھوں کاشت کار مالی طور پر تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ میں وزیر اعظم کی معیت میں مشرقی پاکستان گیا، جہاں کئی ہنگامی نوعیت کے اقدامات کیے گئے۔ "پٹ سن کی بین الاقوامی تجارت کے تحفظ کے لیے" ایک آرڈی ننس جاری کیا گیا۔ اس کے تحت مرکزی حکومت اس کی کم از کم امدادی قیمت متعین کرنے اور اپنی طرف سے پٹ سن خریدنے، ذخیرہ کرنے اور فروخت کرنے کے لیے ایجنٹ اور دلال مقرر کرنے کی مجاز تھی۔ ان فرائض کو سرانجام کرنے کے لیے ایک جیوٹ بورڈ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ کھلی پٹ سن کے لیے کم از کم قیمتوں پر پٹ سن خریدنے کے لیے مشرقی پاکستان بھر میں ایجنٹ مقرر کر دیے گئے اور پٹ سن کی تجارت میں حصہ لینے کے لیے پاکستانیوں کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ قرضہ کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے نیشنل بنک آف پاکستان قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ گانٹھیں باندھنے والے جدید کارخانوں کے مزید آرڈر دیے گئے۔ چٹاگانگ بندرگاہ کی ترقی و توسیع اور چالنا میں لنگر اندازی کے انتظامات کا کام تیز تر کر دیا گیا۔ ان ٹھوس اقدامات اور عوام کی طرف سے حکومت کی پالیسیوں کی پرجوش حمایت کی بدولت پاکستان اس بحران سے عہدہ برآ ہونے کے قابل ہو گیا، جو پاکستان کے اپنے روپے کی قیمت کم نہ کرنے پر ہندوستان کے

معاندانہ ردعمل سے پیدا ہو گیا تھا۔ آخرکار ہندوستان کو بھی اپنے اقدام کی بے ہودگی کا احساس ہو گیا اور اس نے فروری ۱۹۵۱ء میں پاکستانی روپے کی شرحِ مبادلہ کو تسلیم کر لیا۔ یہ شرح مبادلہ ۱۹۵۵ء کے وسط تک برقرار رہی ۱۹۵۲ء سے اشیاءِ صرف کی درآمد بہت کم کر دی گئی جب کافی بعد از وقت کھلے عام لائسنس کی پالیسی کو ترک کر دیا گیا۔ پاکستان کے اپنے خام مال بالخصوص روئی اور پٹ سن پر مبنی صنعتوں کی ترقی کے لیے پرزور تحریک شروع کی گئی۔ پھر جب وقت آیا کہ پاکستانی مصنوعات عالمی منڈیوں کے لیے مہیا ہو گئیں، تو ان کی برآمد میں سہولت کی خاطر روپے کی قیمت میں کمی کر دی گئی۔ اس سے پہلے روپے کی قیمت میں کمی کرنے سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوتا، کیونکہ اس سے مشینری کی درآمد میں تو رکاوٹ پیش آتی، مگر خام اجناس کی برآمد میں کوئی مدد نہ ملتی، جو اس زمانہ میں پاکستان کی بنیادی برآمدات تھیں۔

۴۸-۱۹۴۷ء میں پاکستان کی معیشت ابھی دوسری جنگِ عظیم کے افراطِ زر کے اثرات سے متاثر تھی۔ قیمتوں پر کنٹرول نافذ تھے جو اپنے جلو میں چوربازاری اور منافع اندوزی کی ساری قباحتیں لے کر آئے تھے۔ فسادات اور عام ترکِ وطن کی خلل اندازی سے خوراک کی پیداوار بہت کم ہو گئی تھی۔ ترقیاتی منصوبوں کے لیے سازوسامان اور اشیاءِ ضرورت کی باہر سے بہم رسانی بہت محدود تھی۔ یہ عوامل جو قیمتوں اور اخراجاتِ زندگی کو بڑھا رہے تھے۔ ان کے خلاف موثر اقدامات ناگزیر تھے۔ رفتہ رفتہ صورتِ حال بہتر ہو گئی اور قیمتیں مستحکم ہو گئیں۔ معاشی ترقی کے لیے زمین صاف کر دی گئی۔ بیشتر اس کے کہ ترقی و تعمیر کے منصوبے بنائے جائیں۔ پاکستان کو زندہ رہنے کا حق حاصل کرنا تھا۔ اس زمانے میں غیر ملکی امداد کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ حتیٰ کہ صدر ٹرومین کا نہایت معمولی چار نکاتی پروگرام برائے امدادِ فنی اور دولتِ مشترکہ کا وضع کردہ کولمبو منصوبہ بھی ابھی مستقبل کی آغوش میں تھے۔ اس لیے پاکستان کو اپنی مساعی پر ہی انحصار کرنا تھا۔ پاکستان کے ابتدائی سال شدید مشکلات اور دشواریوں سے پُر تھے اور ان پر قابو پانا بہت بڑی کامیابی تھی۔ یہ کامیابی عزم و ہمت اور خوش تدبیری کا نتیجہ تھی۔ جس کا ثمر مالی اور اقتصادی استحکام تھا۔

باب ۱۷

نئی مملکت کے انتظامی اور سیاسی مسائل

پاکستان کو جو سب سے بڑا انتظامی مسئلہ درپیش تھا وہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں قابل اور تجربہ کار عملہ کی قلت تھی۔ عام انتظامیہ عملہ کے علاوہ فنی ملازمتوں کے زمروں میں شدید کمی تھی۔ زمانہ ماقبل تقسیم سے جو انتظامی ہئیت ورثہ میں ملی تھی وہ کئی درجوں پر مشتمل تھی۔ اعلیٰ اور درجہ اول کے افسران جو بڑی بڑی اسامیوں پر لگائے جاتے تھے، درجہ دوم میں جونیئر افسران تھے، درجہ سوم کلرکوں پر مشتمل تھا اور درجہ چہارم میں چپراسی اور اردلی تھے۔ انڈین سول سروس کو "فولادی ڈھانچہ" کی حیثیت حاصل تھی، اس کے افسر امن و امان کے قیام، اضلاع میں مالیہ کی وصولی اور مرکزی اور صوبائی سیکرٹریٹ میں سرکاری پالیسیوں کی تشکیل کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ ہر قسم کے انتظامی امور اس سروس کے دائرہ کار میں آتے تھے۔ دوسری سروسز مثلاً انڈین پولیس سروس، انڈین آڈٹ اینڈ اکونٹس سروس اور انڈین سروس آف انجینئرز اپنے مخصوص دائرہ میں فرائض ادا کرتی تھیں۔

پاکستان میں سروسز کا بنیادی ڈھانچہ جوں کا توں قائم رکھا گیا۔ اور ملازمت کی موجودہ شرائط برقرار رکھی گئیں، تقسیم کے وقت جن ملازموں نے پاکستان کی ملازمت کرنا قبول کیا تھا، ان سے یہی وعدہ

کیا گیا تھا۔ تاہم پاکستان کے اپنے حالات کے پیشِ نظر کئی اہم ردّ و بدل بھی کیے گئے۔

انڈین سول سروس کئی صوبائی زمروں (کاڈر) میں منقسم تھی۔ ہر افسر کا کسی ایک صوبے میں تقرر ہو جاتا تھا اور وہ اپنی ساری ملازمت اسی صوبے میں گزارتا تھا، سوائے ان محدود وقفوں کے، جب اس کی خدمات مرکزی حکومت مستعار لے سکتی تھی۔ صوبائی زمرے زیادہ تر انگریز افسروں پر مشتمل ہوتے تھے۔ اور چونکہ ان کا بنیادی نقطۂ نظر یکساں ہوتا تھا، لہٰذا علیحدہ علیحدہ صوبوں سے ان کی وفاداری کے باوجود برطانوی ہند کے انتظامی ڈھانچے کی وحدت پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ ہند میں پندرہ سے زیادہ بڑی بڑی زبانیں تھیں اور کسی بھی انگریز کے لیے ان سب پر قدرت حاصل کرنا اور اس طرح ہر ایک صوبہ میں خدمات سرانجام کر دینا فی الواقع ناممکن العمل تھا۔

قیامِ پاکستان کے ساتھ صورتِ حال بنیادی طور پر تبدیل ہو گئی۔ انڈین سول سروس کی جگہ سول سروس آف پاکستان نے لی، جس میں صرف پاکستانی ہی تھے۔ اور اگر انہیں صرف اپنے صوبے میں ہی رکھا جاتا تو ممکن تھا کہ صوبائی وفاداریاں بالآخر قومی زاویۂ نگاہ پر غالب آجاتیں۔ میری سفارش پر (جو میں نے سیکرٹری جنرل ہونے کی حیثیت میں پیش کی) مرکزی حکومت نے مختلف صوبائی زمروں کو ایک ہی زمرہ میں مدغم کر دینے کا فیصلہ کیا، جو صوبائی اور بہ حیثیتِ مجموعی قومی ضروریات پوری کر سکے۔ میری تحریک پر سول سروس کے نوجوان افسروں کی تربیت کے لیے ایک اکادمی قائم کی گئی۔ یہ ایک نئی چیز تھی کیونکہ تقسیم سے قبل ہند میں زیرِ تربیت سول افسران کے لیے ایسا کوئی ادارہ موجود نہیں تھا۔ ہر افسر کے لیے اردو اور بنگلہ سیکھنا لازمی تھا، اور اسے اپنی ملازمت کے پہلے دس سال مشرقی اور مغربی پاکستان میں مساوی طور پر گزارنے پڑتے تھے۔ اس طرح امید کی جا سکتی تھی کہ ان میں ملک کے دونوں بازوؤں کے معاشرتی اور معاشی حالات کا فہم پیدا ہو جائے گا۔ مشرقی اور مغربی پاکستانیوں میں دوستی کے رشتے استوار ہو جائیں گے، اور بعد میں جب یہ افسر مرکزی حکومت سے منسلک ہوں گے، تو انہیں سارے ملک کے انتظامی مسائل سے واقفیت ہو گی۔ اور وہ ان سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت حاصل کر چکے ہوں گے۔ اس طرح انتظامی یک جہتی کے ذریعہ قومی وحدت کو استحکام نصیب ہو گا۔ کچھ تو سول سروس آف پاکستان کی اساس کو وسیع تر بنانے اور قدرے افسروں کی قلت کو دور کرنے کے لیے چند فوجی افسروں اور صوبائی سروس کے افسروں کا بھی اس میں تقرر کیا گیا۔ اس طرح پرانی روایات سے الگ راستہ اختیار کیا گیا۔ پرانے قواعد کے تحت صوبائی سول سروس کے افسروں کو متعینہ

مناصب پر فائز کیا جا سکتا تھا، لیکن انہیں کسی عنوان بھی ترقی دے کر انڈین سول سروس کے ارکان نہیں بنایا جا سکتا تھا۔

صوبائی زمروں کو توڑ دینے اور ایک ہی متحدہ سروس بنانے کے فیصلہ کی سول سروس آف پاکستان کے قدامت پسند ارکان نے پُرزور مخالفت کی۔ اس تجویز کی بھی پُرجوش مخالفت ہوئی تھی کہ صوبائی سول سروس کے افسروں کو سول سروس آف پاکستان میں ترقی دے دی جائے۔ لیکن نیا نظام پاکستان کے لیے اس قدر فائدہ مند تھا کہ بالآخر میں نے انہیں سمجھا بجھا کر راضی کر ہی لیا۔

انڈین پولیٹیکل سروس کے چند افسروں نے بھی پاکستان کی ملازمت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ سروس افواج ہند اور انڈین سول سروس کے ان افسروں پر مشتمل تھی جو دیسی ریاستوں اور سرحدی علاقوں میں متعین کیے جاتے۔ انہیں بھی سول سروس آف پاکستان میں شامل کر لیا گیا۔ اس بہت تھوڑی تعداد کے لیے ایک جداگانہ پولیٹیکل سروس کو برقرار رکھنا غیر ضروری تھا۔ سرحدی علاقوں میں جو خصوصی تجربہ درکار تھا وہ سول سروس آف پاکستان کے افسر اپنی عام ملازمت کے دوران میں بھی حاصل کر سکتے تھے۔

میرا یہ بھی خیال تھا کہ پاکستان پولیس سروس کو بھی ایک ہی ملکی سروس کے طور پر منظم کیا جائے۔ جن اسباب کی بنا پر سول سروس آف پاکستان کے صوبائی زمروں کو یکجا کر دیا گیا تھا۔ ان کا اطلاق مساوی طور پر پاکستان پولیس سروس پر بھی ہوتا تھا۔ لیکن ایک دفعہ جب میں اقوامِ متحدہ میں مندوب کی حیثیت سے ملک سے باہر گیا ہوا تھا تو پولیس سروس میں صوبائی زمروں کو برقرار رکھنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اس فیصلہ کے ناپسندیدہ اثرات بعد میں ظاہر ہوئے جب مرکزی حکومت کو یہ محسوس ہوا کہ نہ تو صوبائی پولیس کے ساتھ اس کا کافی رابطہ ہے اور نہ اس کی کارگزاری پر اسے ۰۰۰ ب کنٹرول حاصل ہے۔ ایک مرکزی پولیس سروس کے قیام کی تجویز بھی ناقابلِ عمل تھی کیونکہ اس سے اخراجات بڑھتے، صوبائی پولیس کے فرائض کے ساتھ تصادم ہوتا اور صوبائی حکومتوں کی مزاحمت کا احتمال ہوتا۔

میری تحریک پر تمام اکونٹس سروسوں یعنی انڈین آڈٹ اینڈ اکونٹس سروس، ملٹری اکونٹس سروس اور ریلوے اکونٹس سروس کو ایک ہی پاکستان اکونٹس سروس میں ضم کر دیا گیا۔ ان تمام سروسوں کا کام نوعیت کے اعتبار سے یکساں تھا اگرچہ ان کے تفصیلی فرائض مختلف تھے۔ متحدہ سروس میں افسروں کو وسیع تجربہ حاصل ہو سکتا تھا۔ ہر سروس میں افسروں کی تعداد زیادہ نہیں تھی اور جب کسی سروس میں

افسروں کی تعداد کم ہو، تو کئی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ غیر متوقع ترقی پانے کے بعد ممکن ہے کہ طویل عرصہ کے لیے کوئی ترقی نہ ہو۔ لیکن اس اصلاحی اقدام کی درون خانہ بہت مخالفت ہوئی اور کچھ عرصہ تک نئے نظام کا تجربہ کرنے کے بعد اسے ترک کر دیا گیا۔

سیکرٹریٹ میں اعلیٰ عہدوں کو پُر کرنے میں غیر منقسم ہند کے مقابلہ میں زیادہ لچک دار پالیسی اختیار کی گئی، وہاں اعلیٰ مناصب پر صرف انڈین سول سروس کے افسروں کا تقرر ہوتا تھا۔ البتہ فنانس اور تجارت کے محکموں میں اعلیٰ عہدوں کا ایک مجموعہ (پُول) اس سے مستثنیٰ تھا۔ کیونکہ ان محکموں کے لیے خصوصی علم و مہارت درکار ہیں۔ یہ مجموعہ دوسری جنگِ عظیم سے کچھ عرصہ قبل قائم کیا گیا تھا، اور اس میں انڈین سول سروس، انڈین آڈٹ اینڈ اکونٹس سروس، ملٹری اکونٹس سروس، انڈین کسٹمز سروس اور انکم ٹیکس سروس سے خاص طور پر چُنے ہوئے افسر شامل تھے۔ اسی طرح کا ایک مجموعہ حکومت پاکستان میں بھی قائم کیا گیا۔ اس خصوصی مجموعہ سے قطع نظر یہ بات قومی مفاد میں سمجھی گئی کہ جہاں کہیں سے بھی جوہرِ قابل ملے، اسے استعمال کیا جائے۔ چنانچہ اعلیٰ عہدوں پر سول سروس آف پاکستان کے علاوہ دوسری سروسوں سے بھی موزوں افسروں کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ میں سیکرٹری جنرل تھا اور میرا تعلق آڈٹ اینڈ اکونٹس سروس سے تھا۔ پولیس سروس کے ایک افسر کو وزارتِ داخلہ کے سیکرٹری کے طور پر مقرر کیا گیا، اور علیٰ ہٰذا القیاس۔

سیکرٹریٹ میں متوسط درجہ کے افسران کی شدید کمی تھی۔ اس کمی کے ازالہ کے لیے ایک جنرل ایڈمنسٹریٹو ریزرو قائم کیا گیا۔ یہ ایک عارضی انتظام تھا جس سے پہلے دس بارہ سال تک کام چلانا مقصود تھا تاآنکہ مستقل سروسوں میں معمول کے مطابق بھرتی سے ساری خالی اسامیاں پُر ہو جائیں۔ اس ریزرو کی اسامیاں کچھ تو وزارتوں کے ماتحت عملہ کو ترقی دے کر پُر کی گئیں اور کچھ پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ کھلے مقابلے سے۔ ان میں سے جو لائق نکلتے وہ کسی نہ کسی باقاعدہ سروس میں مستقل طور پر کھپ سکتے تھے۔ لیکن جیسا کہ وسعت پذیر دفتر شاہی میں ہوتا ہے، عارضی انتظامات غیر معین عرصہ کے لیے جاری رہتے ہیں۔

ایک بالکل نئی سروس —— پاکستان فارن سروس —— سفارتی اور قونصلی خدمات سرانجام کرنے کے لیے معرضِ وجود میں لانے کی ضرورت تھی۔ اس میدان میں پاکستانی افسروں کو بہت کم تجربہ حاصل تھا۔ سول سروس آف پاکستان کے ایک سینیئر افسر اکرام اللہ کو وزارتِ خارجہ کا سیکرٹری مقرر کیا گیا، اور انہوں نے کچھ موجودہ افسروں اور بعض نئے بھرتی کیے گئے افسروں کے ساتھ بڑی ہمت سے دفترِ خارجہ قائم کرنے

کی جدوجہد کی تاکہ سفارت خانوں کی روز افزوں ضروریات پوری کی جا سکیں۔

صوبوں اور مرکزی حکومت کی مختلف وزارتوں کے تقاضے تجربہ کار افسروں کی میسر تعداد سے بدرجہا زیادہ تھے۔ اور جوں جوں نئے اور سنگین مسائل پیدا ہوتے گئے، مثلاً مہاجرین کی بحالی، کشمیر اور نہری پانی، ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے موزوں اشخاص کی تلاش مشکل سے مشکل تر ہوتی گئی۔ اس صورت حال سے نپٹنے کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ مہیا افسروں کی منصفانہ تقسیم کی جائے۔ لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں تھا، کیونکہ جس وزارت یا محکمے میں معدودے چند قابل افسر تھے، وہ ہر قیمت پر ان سے چمٹے رہتے تھے۔ کسی جگہ بھی انتظامی تعطل کے نتائج تباہ کن ثابت ہو سکتے تھے۔ سیکرٹری جنرل کی حیثیت میں یہ میری ذمہ داری تھی کہ جس حد تک بھی ممکن ہو ہر محاذ کی ضروریات پوری کروں، اور ہمتوں کو پست نہ ہونے دوں۔ ان سخت مجبوریوں کے باوجود نا واجب اور بہت تیز ترقیوں کے آسان لیکن غیر حقیقی حل کو اختیار کرنے سے احتراز کیا گیا۔ جب کبھی اونچے مرتبہ پر ترقی دی جاتی تھی، تو اس عہدہ کی پوری تنخواہ اس وقت تک نہیں دی جاتی تھی، جب تک وہ افسر معینہ سالوں کی سروس مکمل نہیں کر لیتا تھا۔ انتظامی معیاروں کو برقرار رکھنے کے لیے ان اور دوسرے اقدامات کو بہ حیثیت مجموعی افسروں نے بڑی خوش دلی سے قبول کیا، وہ بھی اس زمانہ میں تعمیر پاکستان کے جذبۂ حب الوطنی سے سرشار تھے۔

فروری ۱۹۴۸ء میں حکومت پاکستان نے جسٹس محمد منیر کی صدارت میں ایک تنخواہ کمیشن قائم کیا جسے مرکزی اور صوبائی حکومتوں دونوں کے لیے تنخواہوں اور الاؤنسوں کی شرح اور ملک کے مالی وسائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے پاکستان میں معاوضۂ ملازمت کے معیار کے بارے میں رپورٹ پیش کرنے کی ہدایت کی گئی۔ تاکہ سروسز کے نظام میں معقولیت، سادگی اور یکسانیت پیدا ہو جائے۔

تقسیم کے وقت تنخواہوں کے دو نظام موجود تھے۔ یکم جولائی ۱۹۳۱ء سے پہلے سروس میں شامل ہونے والے پرانی شرح کے مطابق تنخواہ پاتے تھے اور اس کے بعد والے ترمیم شدہ شرح کے مطابق کافی کم تنخواہ پاتے تھے۔ بہت وسیع کساد بازاری کے بعد جو شدید مالی مشکلات پیدا ہوئی تھیں، ان کی وجہ سے تنخواہوں پر نظر ثانی ضروری ہو گئی تھی اور ۱۹۳۰ء کے بعد قیمتوں اور اخراجات زندگی میں کمی نے اس کا جواز بھی مہیا کر دیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہونے کے بعد قیمتیں تیزی سے بڑھنے لگیں اور جب جنگ ختم ہوئی تو پہلے سے تگنی ہو چکی تھیں۔ روپے کی قوت خرید گرنے کے باعث مقررہ تنخواہ پانے والے سرکاری

ملازمین بالخصوص تھوڑی تنخواہ والے بہت تنگ دست تھے۔ مہنگائی الاؤنس سے اس تنگی میں صرف جزوی تخفیف ہوئی تھی اور ایک باقاعدہ جائزہ ضروری ہو گیا تھا۔ چنانچہ ایک تنخواہ کمیشن مقرر کیا گیا، جس نے ۳۰ اپریل ۱۹۴۷ء کو اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ تقسیم کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ ہند کے تنخواہ کمیشن نے غیر منقسم حکومتِ ہند کو جو سفارشات پیش کی تھیں، کیا حکومتِ پاکستان کو بھی انہیں قبول کر لینا چاہیے۔ پاکستان کے مالی حالات وہ نہیں تھے، جو غیر منقسم ہند بلکہ ہندوستان کے بھی تھے۔ تقسیم کے فوراً بعد شدید فسادات اور وسیع پیمانہ پر آبادی کی نقل و حرکت نے معیشت کو خستہ حال کر دیا تھا۔ لیکن یہ ایک عارضی دور تھا جس نے فضا پر اپنا تاریک سایہ ڈال دیا تھا، ابھی وقت نہیں آیا تھا کہ دور رس عوامل کا صحیح اندازہ اور معیشت کی آئندہ شکل و صورت کا واضح تصور کیا جاتا۔

وزیرِ خزانہ غلام محمد ایک قدامت پسند ماہرِ مالیات تھے اور نجی کاروبار کے زبردست حامی تھے۔ ان کے سر میں متوازن بجٹ کا سودا تھا اور وہ اخراجات کو سختی سے دبائے رکھتے تھے۔ ان کی تحریک پر تنخواہوں میں رضاکارانہ کمی کی اپیل کی گئی، اور اس کا حوصلہ افزا جواب ملا۔ ہند کے تنخواہ کمیشن کی سفارشات سے جو مسئلہ پیدا ہوا تھا، اس کا عارضی یا وقتی حل تلاش کرنے کی جگہ انہوں نے کابینہ کو ایک نئے تنخواہ کمیشن کے قیام پر رضامند کر لیا۔ جیسا کہ کمیشن نے خود اعتراف کیا، کہ "ہم ایسے وقت اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کر رہے ہیں، جب ہر چیز غیر یقینی ہے، سوائے اس بات کے کہ پاکستان ایک اہم مملکت کے طور پر نقشۂ عالم پر برقرار رہنے کے لیے معرضِ وجود میں آگیا ہے۔"

کمیشن کا تقرر ایک غلطی تھی۔ جن حالات میں اسے مقرر کیا گیا ان سے عام تاثر یہ ہوا کہ اسے محض تنخواہیں گھٹانے کا فرض سپرد کیا گیا ہے۔ اس نے پہلے ہی کام سے دبے ہوئے محکموں پر بلا ضرورت بوجھ ڈال دیا۔ اس سے غلام محمد سے یہ خیال اخذ کیا کہ سرکاری ملازمین کو معقول تنخواہیں دینے کی خاص ضرورت نہیں کیونکہ قابل اور ذہین افراد تجارت اور صنعت میں درکار ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کسی پسماندہ ملک میں جامع منصوبہ کے بغیر اقتصادی ترقی کا حصول ناممکن ہے، اور ایسے منصوبے کی ترتیب و تشکیل اور اس پر عملدرآمد کے لیے بہترین انتظامی صلاحیت درکار ہے۔ صرف ایسے ڈھانچے کے اندر ہی نجی کاروبار کو ملک کے بہترین مفاد میں بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔

مجھے کمیشن کا نقطۂ نظر معلوم ہوا تو میں نے وزیرِ اعظم کو یہ مشورہ دیا کہ وہ کمیشن کے چیئرمین کو بلا بھیجیں اور مسئلہ کو متوازن انداز میں پیش کریں۔ یہ محض مالی مسئلہ نہیں تھا بلکہ اس کا تعلق سرکاری نظم و نسق کی پاکیزگی،

کیفیت اور صلاحیتِ کار سے بھی تھا۔ جسٹس محمد منیر نے وزیرِ اعظم سے اپنی بات چیت سے غلام محمد کو مطلع کیا تو وہ فوراً اس نتیجہ پر پہنچے کہ میں نے ان کے دائرہ کار میں مداخلت کی ہے۔ اس سب کچھ کا مختصراً نتیجہ یہ نکلا کہ غلام محمد کبیدہ خاطر ہو گئے اور تنخواہ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں قطعی انداز میں یہ کہہ دیا کہ "اس کے نزدیک مملکت کے لیے یہ پالیسی درست نہیں کہ وہ اپنے ملازمین کو ایسی تنخواہوں کی پیشکش کرے جس میں ملک کے بہترین دماغ کشش محسوس کریں۔ ہمارے قابل ترین افراد کے لیے صحیح جگہ نجی کاروبار میں ہے، سرکاری ملازمت کے بندھے ٹکے کام میں نہیں جہاں غیر معمولی قابلیت کے بجائے کیرکٹر اور گزراوقات کے لیے دیانتداری سے خدمت زیادہ ضروری ہے" کاش کہ اس کی جگہ کمیشن کو یہ کہنے کی بصیرت عطا ہوتی کہ "ہمارے قابل ترین افراد کے لیے صحیح جگہ یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں میں ہے"۔ تنخواہوں کے نظام کو زیادہ سادہ اور معقول تر بنانے کے بجائے کمیشن کی رپورٹ نے اسے اور پیچیدہ بنا دیا۔ کمیشن نے جو بخیلانہ سفارشات پیش کی تھیں کابینہ کو ان میں اصلاح کرنی پڑی۔

صوبوں میں سے عملہ کی شدید ترین کمی مشرقی پاکستان میں تھی۔ تقسیم کے وقت انڈین سول سروس میں مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والا صرف ایک افسر تھا، انڈین پولیس میں چند افسر تھے اور ان سے بھی کمتر دوسری اعلیٰ سروسوں میں۔ باقی مسلمان افسر یا مغربی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے یا مسلم اقلیتی صوبوں سے آئے تھے۔ اگرچہ اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو مشرقی یا مغربی پاکستان میں جانے کا مساوی حق حاصل تھا، لیکن ان میں سے زیادہ تر مغربی پاکستان میں آباد ہوئے اور بہت جلد عام آبادی میں گھل مل گئے۔ ہر دور میں مغربی پاکستان کو برصغیر کے دروازہ کی حیثیت حاصل رہی تھی۔ باہر سے لوگ یہاں کثیر تعداد میں آتے رہے ہیں اور نسلوں اور ثقافتوں کی اس کٹھالی میں مدغم ہوتے رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان برصغیر کے پرلے شرقی سرے پر ہونے کے باعث نسبتاً محفوظ تھا اور اسی لیے ذہناً الگ تھلگ تھا۔ اس طرح مشرقی پاکستان نے بنگال سے باہر کے علاقوں سے آنے والے ہر شخص کو ــــ خواہ وہ سرکاری افسر تھا یا تاجر ــــ مغربی پاکستانی قرار دیا۔ چنانچہ مغربی پاکستان اور ہند کے اقلیتی صوبوں کے افسروں کو ایک ہی کھاتے میں جمع کر دیا گیا۔

بنیادی طور پر سرکاری ملازمتوں میں مشرقی اور مغربی پاکستان میں تفاوت اس ناروا امتیازی سلوک سے پیدا ہوا، جو غیر منقسم بنگال میں تعلیم سمیت ہر شعبہ میں مسلمانوں کے خلاف روا رکھا جاتا تھا۔ کلکتہ یونیورسٹی میں ہندوؤں کی اجارہ داری تھی۔ سکولوں اور کالجوں میں بھی ہندو اساتذہ کو غلبہ حاصل تھا۔ بنگالی مسلمانوں کے خلاف ناروا امتیازی سلوک اُن کے لیے اس قدر سنگِ راہ بن گیا تھا کہ وہ اعلیٰ ملازمتوں کیلئے کل ہند امتحانوں

میں کامیابی سے مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

اس صورتِ حال کا ممکن العمل تک جلد از جلد مداوا ضروری تھا تاکہ ملک کے نظم و نسق میں مشرقی پاکستان بھی مساوی اور مؤثر حصہ لینے کے قابل بن سکے۔ اعلیٰ ملازمتوں میں بھرتی کے لیے پاکستان پبلک سروس کمیشن نے مقابلہ کا جو پہلا امتحان منعقد کیا اس میں مشرقی پاکستان سے چالیس سے کچھ زائد امیدوار پاس ہوئے۔ اگرچہ ہمیں ان سب کی ضرورت نہیں تھی، میں نے وزیر اعظم کو یہ سفارش کی کہ ان سب کا بمشکل پاس ہونے والوں کے سمیت تقرر عمل میں لایا جائے تاکہ حتی الوسع جلد از جلد توازن قائم کیا جا سکے۔ اس طرح پاکستان میں پہلی بھرتی میں ہی سرکاری ملازمتوں میں مشرقی پاکستان سے لیے جانے والے افسروں کی تعداد تقسیم سے قبل کے ہر زمانہ سے کئی گنا زیادہ تھی۔ آیندہ بھرتی کے لیے کابینہ نے ایک منصوبہ منظور کیا، جس کے تحت ۲۰ فی صد امیدوار اہلیت کی بنا پر سارے پاکستان سے لیے جانے تھے اور مشرقی و مغربی پاکستان میں سے ہر ایک سے ۴۰ فیصد۔ مغربی پاکستان کا حصہ مختلف صوبوں میں مزید تقسیم کیا گیا تاکہ تعلیمی اعتبار سے پسماندہ صوبوں کو بھی عہدوں میں اپنا جائز حق مل سکے۔ اس طریق کار سے پنجاب کے امیدوار گھاٹے میں رہتے ہیں۔ لیکن یہ بہترین قومی مفاد میں ہے، ایسی پالیسی کے ثمرات کو کافی وقت گزرنے کے بعد ہی دیکھا جا سکتا ہے، ایک صدی کے تغافل کا ازالہ چند سالوں میں ممکن نہیں۔ یہ سب کچھ مسلمہ امر تھا، تاہم بہت جلد مرکزی حکومت میں مغربی پاکستانیوں کی بھاری تعداد کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اور موجودہ عدم توازن کا سارا الزام مرکزی حکومت پر دھرا جانے لگا اس الزام ناحق کا مسلسل اعادہ کیا جاتا رہا حتیٰ کہ مشرقی پاکستان کے بہت سے لوگوں کے لیے یہ جزو ایمان بن گیا۔

مشرقی پاکستان میں دوسرے صوبوں سے افسروں کی تعیناتی پر ایک اور قسم کی شکایات بھی پیدا ہوئیں۔ ہر صوبے اور مرکزی حکومت میں تجربہ کار افسروں کی بڑی شدید کمی تھی۔ اس وقت اہم ترین ضرورت نظم و نسق کو جاری رکھنا تھا۔ چونکہ مشرقی پاکستانی افسر میسر ہی نہیں تھے، صوبائی نظم و نسق سنبھالنے اور مرکزی حکومت کے تحت ریلوے اور کسٹم ایسے اداروں کے لیے دوسروں کو بھیجنا ناگزیر تھا۔ ان میں سے اکثر پہلے کبھی مشرقی پاکستان نہیں گئے تھے، اور وہ وہاں کے لوگوں کی زبان، آداب اور احساسات سے ناواقف تھے۔ دفتر شاہی طرزِ عمل کی عام خامیوں پر مستزاد کم از کم بعض افسروں کے رویے میں متکبرانہ احساس برتری کی نمود تھی۔ اگر سلیقہ شعاری اور ہمدردانہ معاملہ فہمی سے کام لیا جاتا، تو ایک نئے نظم و نسق کے قیام میں جو دقت اور کشاکش ہوتی ہے اس میں کمی ہو سکتی تھی۔ لیکن ہر ایک کو یہ اوصاف ودیعت نہیں ہوتے۔ چنانچہ شکایتیں بڑھتی گئیں اور بعض لوگ

یہاں تک بھی کہنے لگے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں کشیدگی کی سب سے بڑی وجہ مغربی پاکستانی افسروں کا طرزِ عمل تھا۔ اگرچہ یہ خیال مبالغہ آرائی پر مبنی ہے، لیکن اس میں کچھ صداقت بھی ہے۔

مشرقی اور مغربی پاکستان کی جغرافیائی علیحدگی سے نہ صرف انتظامی مسائل پیدا ہوئے بلکہ معاشرتی، معاشی اور سیاسی مسائل نے بھی جنم لیا۔ دُوری کے باعث آنا جانا گراں بھی تھا اور غیر مسلسل بھی۔ چونکہ دارالحکومت مغربی پاکستان میں تھا، مشرقی پاکستان یہ محسوس کرتا تھا کہ اسے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ زبان اور پس منظر کے فرق سے بھی قومی یک جہتی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہو گئیں۔ مغربی پاکستان کے اندر بھی کئی صوبے اور ریاستیں اور چار لسانی خطے تھے۔ اسلام کے قومی رشتے نے ایک منفرد ڈھانچے کی مملکت پیدا کر دی تھی جس کی بنیاد ایک مشترک تصورِ حیات، برصغیر ہندوستان و پاکستان میں ایک ہی واحد قوم کے طور پر مشترک تاریخ، انگریزوں کی حکمرانی اور ہندوؤں کے غلبہ سے آزادی کے لیے مشترک جدوجہد، ہندوؤں کے عزائم سے مشترک خدشات اور مشترک مقدر کے جبلی شعور پر تھی۔ غیر ملکی بجا طور پر شک کر سکتے ہیں کہ ایسے ڈھانچے میں جو کشاکش لازمی ہے، یہ قوتیں کامیابی سے اس کا مقابلہ کر سکیں گی۔ لیکن ہماری قوم نے جب اتحاد، یقینِ محکم اور تنظیم سے آزادی حاصل کی تو اس کے اولین مرحلۂ جوش میں اسے پورا اعتماد تھا کہ وہ ایک ہی وحدت کے طور پر برقرار رہ سکے گی۔

آسٹریلیا کے عوام کے نام ایک نشری تقریر میں ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو قائد اعظم نے کہا :

"مغربی پاکستان کو ہندوستان کے تقریباً ایک ہزار میل علاقہ نے مشرقی پاکستان سے علیحدہ کر رکھا ہے۔ باہر کے ملک کے کسی طالب علم کے ذہن میں جو پہلا سوال پیدا ہو سکتا ہے وہ یہ ہے ــــ یہ کیونکر ممکن ہے ؟ اس قدر علیحدہ اور دور افتادہ علاقوں میں حکومت کی وحدت کیسے قائم رہ سکتی ہے ؟ میں اس سوال کا صرف ایک لفظ سے جواب دے سکتا ہوں، یہ "یقین" ہے۔ قادرِ مطلق پر، اپنے آپ پر اور اپنے مقدر پر یقین" [1]

اس کے ایک ماہ بعد انہوں نے قومی اتحاد و یک جہتی کے لیے پرجوش اپیل کی۔ ڈھاکہ مشرقی پاکستان میں ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے قائد اعظم نے کہا :-

"میں واضح ترین الفاظ میں آپ کو ان خطرات سے مکرر خبردار کر دینا چاہتا ہوں جو ابھی تک پاکستان کو اور بالخصوص آپ کے صوبے کو درپیش ہیں۔ قیامِ پاکستان کو رد کرنے میں ناکام ہونے کے بعد، اپنی ناکامی سے سٹ پٹا کر پاکستان کے دشمن اب

پاکستان کے مسلمانوں کے درمیان تفرقہ اندازی سے مملکت کو تباہ کرنے میں منہمک ہیں
ان کوششوں نے خاص طور پر صوبہ پرستی کی حوصلہ افزائی کی شکل اختیار کر رکھی ہے جب
تک آپ اپنی مملکت کو اس زہر سے صاف نہیں کریں گے، اس وقت تک آپ
کبھی اپنے آپ کو ایک حقیقی قوم کے سانچے میں ڈھالنے اور اسے مستحکم کرنے میں کامیاب
نہیں ہوں گے ..... اسلام نے ہمیں یہی تعلیم دی ہے، اور میرا خیال ہے کہ آپ مجھ
سے اتفاق کریں گے کہ آپ خواہ اور کیا ہوں اور آپ خواہ کیا ہیں، آپ بہر حال مسلمان
ہیں۔ اب آپ سب ایک قوم سے متعلق ہیں، آپ نے ایک علاقہ، بہت وسیع علاقہ
اپنے لیے حاصل کر لیا ہے، یہ سب آپ کا ہے، اس کا مالک کوئی پنجابی یا کوئی سندھی
یا کوئی بنگالی نہیں ہے، یہ آپ سب کا ہے۔ آپ کی مرکزی حکومت قائم ہو گئی ہے
جہاں مختلف حصوں کو نمائندگی حاصل ہے۔ اس لیے اگر آپ اپنے آپ کو بحیثیت قوم
تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو برائے خدا اس صوبہ پرستی کو چھوڑ دیجیے" [1]

یہاں دو قوتوں کے درمیان کشمکش پوری طرح عیاں ہے، ایک اتحاد کے فروغ کے لیے ہے اور دوسری تخریب کے لیے۔ عملی تدبر کا تقاضا یہ تھا کہ معاشرتی اور سیاسی عمل واقدام کے ہر شعبہ میں یک جہتی کے عناصر کو فروغ دیا جائے اور ایسی کوشش لازماً ہمیشہ جاری رہنی چاہیے۔

صوبہ پرستی کے خلاف قائد اعظم کے اس انتباہ کا پس منظر وہ لسانی تنازعہ تھا جو قیام پاکستان کے چند ماہ بعد مشرقی پاکستان میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ خرابیٔ صحت کے باوجود قائد اعظم نے اس تنازعہ کو ختم کرنے کیلیے مارچ ۱۹۴۸ء میں مشرقی پاکستان کا پُرصعوبت سفر اختیار کیا۔ تحریک پاکستان کے دوران میں اس بات کو سبھی لوگ تسلیم کرتے تھے کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہوگی، اور اس ضمن میں اکثر اعلانات بھی کیے جاتے رہے تھے۔ اردو برصغیر کے مسلمانوں میں اظہارِ خیالات کا ذریعہ اور ان کے اتحاد کا مظہر تھی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان زبان کے مسئلہ پر اختلافات کا ذکر قبل ازیں کیا جا چکا ہے۔ ان اختلافات نے مطالبۂ پاکستان کی تشکیل میں بہت اہم حصہ لیا تھا۔ اردو مشرقی یا مغربی پاکستان کے کسی بھی صوبہ یا ریاست کے مسلمانوں کی مادری زبان نہیں تھی لیکن ہر جگہ مسلمانوں کی قومی زبان کے طور پر اسے منفرد حیثیت حاصل تھی۔ یہ خیال ہرگز نہیں تھا کہ اردو کسی صوبائی زبان کی جگہ لے گی چہ جائیکہ بنگالی کی جو ایک بہت ترقی یافتہ زبان ہے اور جس کا ادبی سرمایہ بہت وسیع ہے۔

اردو بطور واحد قومی زبان کے خلاف ایجی ٹیشن مشرقی پاکستان میں سیاستدانوں کے ایک مختصر گروہ نے شروع کی تھی، ان کا اصلی مقصد ناظم الدین وزارت کو پریشان کرنا تھا، لیکن بہت جلد طلبا نے اسے اپنا لیا۔ کلکتہ کے مضبوط ہندو پریس نے اس نزاع کی آگ کو خوب بھڑکایا۔ فروری ۱۹۴۸ء میں آئین ساز اسمبلی اپنے طریق کار کے قواعد پر غور کر رہی تھی تو ایک کانگرسی رکن درندر ناتھ دتہ نے ایک ترمیم پیش کی کہ اسمبلی کی کارروائی فقط اردو اور انگریزی میں قلم بند نہ کی جائے بلکہ بنگلا میں بھی کی جائے اور اس رائے کا اظہار کیا کہ جس زبان کو لوگوں کی اکثریت بولتی ہے، اسے ہی سرکاری زبان بننا چاہیے۔ ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا:-

"کیا یہ بات پرمعنی نہیں کہ ماضی میں جن لوگوں نے مسلمانوں سے غداری کی یا پاکستان کے خلاف جنگ لڑی جبکہ پاکستان محض آپ کے بنیادی حق خود اختیاری کا مظہر ہے، تو اب وہی لوگ یکایک آپ کے "جائز حقوق" کے محافظ بن بیٹھے ہیں، اور آپ کو زبان کے معاملے میں حکومت پاکستان کی مخالفت پر اکساتے ہیں، میں آپ کو انتباہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ دشمن کے ان آلۂ کار لوگوں سے خبردار رہیں۔ میں آپ کے سامنے پاکستان کی سرکاری زبان کے بارے میں اپنے نظریات کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس صوبے میں سرکاری دفاتر کے لیے صوبے کے لوگ جو زبان چاہیں اختیار کر سکتے ہیں۔ اس سوال کا فیصلہ صرف اس صوبے کے لوگوں کی خواہشات کے مطابق کیا جائیگا، جو مناسب وقت پر ان کے مستند نمائندے پوری آزادی سے کامل اور بے لاگ غور و خوض کے بعد ظاہر کریں گے۔ لیکن باہمی اظہار خیالات یعنی مملکت کے مختلف صوبوں میں باہمی رابطہ کے لیے صرف ایک ہی زبان ہو سکتی ہے اور وہ زبان اردو ہونی چاہیے۔ کوئی دوسری زبان نہیں ہو سکتی۔ اس لیے واضح ہے کہ سرکاری زبان اردو ہی ہونی چاہیے، یہ وہ زبان ہے جس کی نشوونما میں برصغیر کے دس کروڑ مسلمانوں نے حصہ لیا ہے، یہ وہ زبان ہے جو پاکستان کے طول و عرض میں سمجھی جاتی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ صرف یہی زبان ہے جو دوسری ہر صوبائی زبان کے مقابلے میں اسلامی ثقافت اور مسلمانوں کی روایات کے بہترین سرمایہ کی مظہر ہے۔ یہ زبان دوسرے مسلم ملکوں کی زبانوں سے

بھی قریب ترین ہے۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اردو کو ہندوستان سے نکال دیا گیا ہے اور سرکاری طور پر اردو رسم الخط کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے"۔ [۳]

قائدِ اعظم کی عظمت کے دبدبے سے کچھ عرصے کے لیے یہ ایجی ٹیشن دب گیا لیکن مسئلہ پھر بھی زندہ رہا۔ چند سال بعد اس نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ بالآخر یہ نزاع اس وقت طے ہُوا جب ۱۹۵۶ء کے آئین میں اُردو اور بنگلہ دونوں کو پاکستان کی قومی زبانیں تسلیم کر لیا گیا۔

لیکن جیسا کہ قائدِ اعظم نے ۲۰ مارچ کو مشرقی پاکستان کے نام اپنے الوداعی پیغام میں کہا تھا:۔

"زبان کا یہ نزاع درحقیقت ایک اور بہت بڑے مسئلہ کا ایک پہلو ہے — اور وہ مسئلہ صوبہ پرستی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس بات کا لازماً احساس ہو گا کہ پاکستان جیسی نوتشکیل مملکت میں جس کے مزید براں دو حصے ایک دوسرے سے بہت دور واقع ہیں۔ اس کے تمام شہریوں میں خواہ ان کا تعلق کسی حصہ سے ہو ہم آہنگی اور اتحاد نہ صرف اس کی ترقی بلکہ اس کی بقا کے لیے بھی ناگزیر ہے۔ پاکستان مسلم قوم کے اتحاد کا مجسم مظاہرہ ہے اور ہمیشہ اس کی یہی کیفیت رہنی چاہیے۔ سچے مسلمانوں کی طرح ہمیں اس اتحاد کی حمیت کے ساتھ حفاظت کرنی چاہیے اور اسے برقرار رکھنا چاہیے۔ اگر ہم نے اپنے بارے میں یہ سوچنا شروع کر دیا کہ ہم پہلے بنگالی، پنجابی، سندھی وغیرہ ہیں اور محض اتفاق سے مسلمان اور پاکستانی ہیں تو پھر پاکستان کا شیرازہ لازماً بکھر جائے گا۔ یہ مت سمجھیے کہ یہ کوئی دقیق مسئلہ ہے، ہمارے دشمن اس کے امکانات سے پوری طرح باخبر ہیں، اور مجھے آپ کو خبردار کر دینا چاہیے کہ وہ پہلے سے ہی انہیں اپنے کام میں لانے کے لیے سرگرمِ عمل ہیں"۔ [۴]

پاکستان کے جسدِ سیاست کو ایک اور عارضہ بھی لاحق ہو رہا تھا اور وہ دھڑے بندی کا مرض تھا، اور اس کا بدترین مظاہرہ پنجاب میں ہو رہا تھا۔ تقسیم کے بعد کے مہینوں میں پنجاب کو یکے بعد دیگرے ملک خطرات کا سامنا کرنا پڑا۔ مشرقی پنجاب میں خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں، مہاجرین کا سیلاب اُمڈ آیا تھا۔ پنجاب کی سرحد کے پار کشمیر میں جنگ جاری تھی۔ ہندوستان کی طرف سے نہروں کی بندی سے تباہی ہو رہی تھی — یہ سب حادثات بڑی تیزی سے یکے بعد دیگرے وقوع پذیر ہوئے۔ لیکن ان مہیب خطرات میں محصور

بستے ہوئے پنجاب کی کابینہ ایک متحدہ ٹیم کی طرح کام کرنے کی بجائے جو منظر پیش کر رہی تھی وہ گھٹیا جھگڑوں، ذلیل سازشوں اور دھڑوں کے درمیان جنگ وجدل کے دوسرے لوازمات سے عبارت تھا۔ نہایت جاہ طلب وزیر خزانہ ممتاز دولتانہ دھیمے اور تن آسان وزیر اعلیٰ خان آف ممدوٹ کے خلاف صف آرا تھے اعلیٰ افسر بھی دھڑے بندی میں ملوث ہو رہے تھے۔ اپریل ۱۹۴۸ء میں قائد اعظم نے ممدوٹ، دولتانہ اور وزیر مال شوکت حیات خان کو کراچی طلب کیا۔ تاکہ وزارتی گتھی کو سلجھایا جا سکے۔ لیکن وہ بھی مایوس اور بیزار ہو کر اس سے دستکش ہو گئے۔ دولتانہ اور شوکت حیات خان مستعفی ہو گئے اور ممدوٹ نے دوسری وزارت بنا لی۔ قائد اعظم کی وفات پر جب ساری قوم میں ہنگامی حالت کا احساس تھا۔ مرکزی حکومت نے پنجاب میں اتحاد کرانے کی تحریک کی۔ ممدوٹ اس پر رضامند ہو گئے کہ دولتانہ اور فیروز خاں نون کو کابینہ میں شامل کرلیں لیکن قبل ازیں کہ ان سے حلف لیے جا سکتے ایک تازہ جھگڑا پھوٹ پڑا۔ اور جب نومبر میں دولتانہ پنجاب صوبائی مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے تو جھگڑا اور بڑھ گیا۔ بالآخر اوائل ۱۹۴۹ء میں وزارت کو برطرف کر دیا گیا، پنجاب اسمبلی کو توڑ دیا گیا اور ترمیم شدہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء دفعہ ۹۲ الف کے تحت گورنری راج نافذ کر دیا گیا۔ مرکزی حکومت نے اپنے جاری کردہ اعلامیہ میں کہا:-

"قومی زندگی کو بدعملی نے خراب کر ڈالا ہے۔ اور سازشوں سے سرکاری ملازمتوں میں نظم وضبط تباہ ہو گیا ہے۔ انتظامیہ صرف چند افراد کے مفاد میں چلائی جا رہی ہے اور عوام کی توقعات اور ضروریات کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ اس صورتِ حال کے کئی اسباب ہیں لیکن گورنر جنرل کی رائے میں سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ قانون ساز اسمبلی کے ارکان جن کا انتخاب مختلف حالات میں ہوا تھا، ان عظیم تر ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ناکام رہے ہیں، جو آزادی عائد کرتی ہے۔"

یہ پہلا موقع تھا جب پاکستان میں آئینی طریق کار معطل کرنا پڑا۔

شمال مغربی سرحدی صوبہ میں وزیر اعلیٰ عبدالقیوم خان کو عبدالغفار خان اور اس کے کٹر سرخ پوش پیروکاروں کی مخالفت سے بڑی مشکل صورتِ حال درپیش تھی۔ عبدالغفار خان کی گرفتاری کے بعد صوبائی حکومت کو اطلاعات موصول ہوئیں کہ سرخ پوش اگست ۱۹۴۸ء میں سول نافرمانی کی تحریک کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ چنانچہ وہ بڑی تعداد میں چارسدہ میں جمع ہوئے، اور پولیس کے ساتھ تصادم ہوا جس میں بعض افراد مارے گئے۔ البتہ اس کے بعد امن وامان برقرار رہا۔ صوبائی اسمبلی میں، جس کا انتخاب ۱۹۴۶ء میں ہوا تھا، مسلم لیگ اقلیت میں تھی، لیکن

بعدازاں رائے عامہ میں نمایاں تبدیلی آگئی، جیسا کہ جولائی ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے سوال پر رائے شماری کے نتائج سے ظاہر ہوا۔ رائے عامہ میں اس تغیر کے پیش نظر کئی ارکان اسمبلی جو کانگرس سے وابستہ تھے مسلم لیگ میں میں شامل ہو گئے اور اس طرح وہ اسمبلی میں اکثریتی پارٹی بن گئی۔

تاہم عبدالقیوم خان کی اصل مشکل اسمبلی سے باہر تھی۔ اُن کے آمرانہ طور طریقوں اور کسی بھی قسم کے اختلاف سے عدم رواداری نے کئی مسلم لیگی لیڈروں کو برگشتہ کردیا، خاص طور پر صاحب اثر پیر آف مانکی شریف کو، جنہوں نے پاکستان کے لیے استصواب کے دوران میں غیر معمولی خدمات سرانجام دی تھیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پیر آف مانکی شریف اور کئی دُوسروں کو مسلم لیگ سے باہر نکلنا پڑا۔ اپریل ۱۹۴۸ء میں قائداعظم نے شمال مغربی سرحدی صوبہ کا دورہ کیا۔ ۲۰ اپریل کو پشاور میں ایک عام جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے عوام کو اس سنگین ہنگامی حالت سے آگاہ کیا جو ملک کے اندر اور باہر موجود تھی اور عوام پر زور دیا کہ وہ "نزاعات اور صوبہ پرستی سے احتراز کریں" انہوں نے اپنی تقریر میں آگے چل کر کہا:-

"مجھے معلوم ہے کہ ہم میں ایسے اشخاص بھی ہیں جو بدعنوانی، رشوت ستانی اور اقربا نوازی کے مجرم ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ حکومت عیب و خطا سے پاک ہے۔ یقین مانیے ہم پوری طرح ہوشیار ہیں، آپ کی حکومت، آپ کا صوبہ، آپ کی وزارت اور آپ کے سرکاری ملازمین ہماری نظر میں ہیں۔ سب کچھ ہم پر پوری طرح روشن ہے اور اس امر میں کوئی شک و شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم بہت جلد اس کا تجزیہ کرنے کے قابل ہو جائیں گے اور اپنے جسدِ سیاست سے زہر کو باہر نکال پھینکیں گے۔ لیکن آپ کو صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے اور ہمیں موقع اور معقول وقت دینا چاہیے"۔[۵]

تقسیم سے قبل سیاسی ردوبدل کے لیے سندھ بہت بدنام تھا، جو مختلف گروہوں میں بدلتے ہوئے گٹھ جوڑ کا نتیجہ تھا۔ تقسیم کے وقت عنانِ اقتدار پوری مضبوطی سے محمد ایوب کھوڑو کے تحت ایک مسلم لیگی وزارت کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن گورنر غلام حسین ہدایت اللہ کے ساتھ وزیر اعلیٰ کھوڑو کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ اپریل ۱۹۴۸ء کے اوائل میں کھوڑو اور ان کے دو وزیروں پیر الٰہی بخش اور میر غلام علی تالپور کے درمیان کھلے بندوں نزاع کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اخبارات میں الزامات اور جوابی الزامات شائع ہوئے۔ گورنر نے اس خیال سے وزیروں کے محکمے تبدیل کر دیے کہ شاید اس طرح کابینہ زیادہ خوش اسلوبی سے کام کر سکے گی، لیکن کھوڑو نے اسے گورنر کی

بیجا مداخلت سمجھا۔ معاملہ قائد اعظم تک پہنچا اور گورنر نے ان کے سامنے کھوڑو کی بدانتظامی اور رشوت ستانی کی شہادت پیش کر دی۔ قائد اعظم پاکستان میں ایسی خرابیوں کو جڑ سے اکھاڑ دینے کا عزم صمیم رکھتے تھے، چنانچہ ان کی ہدایت پر ۲۶ اپریل ۱۹۴۸ء کو گورنر نے وزیر اعلیٰ کو برطرف کر دیا۔ حالانکہ انہیں سندھ اسمبلی میں اکثریت کی حمایت حاصل تھی۔ یہ اقدام ترمیم شدہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی دفعہ ۵۱ کے تحت کیا گیا۔ اس دفعہ کے مطابق گورنر کے وزیر "اس کی خوشنودی تک ہی برسرِ عہدہ رہیں گے" اور گورنر اس دفعہ کے تحت اپنے فرائض ادا کرنے میں "گورنر جنرل کے عام کنٹرول کے تابع ہو گا اور ان خاص ہدایات کی تعمیل کرے گا، جو اسے وقتاً فوقتاً دی جائیں گی"۔ گورنر کی طرف سے جاری شدہ اعلامیہ میں کہا گیا کہ کھوڑو کے خلاف بدانتظامی، اپنے فرائض کی ادائیگی میں شدید بدعنوانی اور رشوت ستانی کے الزامات پر مبنی ایسا مقدمہ تیار کر لیا گیا ہے، جس میں وہ ماخوذ ہو سکتے ہیں۔ کھوڑو کے خلاف ۶۲ الزامات کی بنیاد پر مقدمہ کی سماعت کے لیے لاہور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس عبدالرشید اور ڈھاکہ ہائی کورٹ کے جسٹس شہاب الدین پر مشتمل ایک عدالتی ٹربیونل کی تشکیل عمل میں لائی گئی۔ ٹربیونل نے انہیں کئی الزامات میں مجرم قرار دیا۔ لیکن عجب معاملہ تھا کہ کھوڑو ابھی تک سندھ میں حکمران جماعت مسلم لیگ کے لیڈر تھے اور سندھ اسمبلی کے ارکان میں نہیں بہت اثر و رسوخ حاصل تھا۔ دسمبر ۱۹۴۸ء میں جب ان کے خلاف مقدمہ زیرِ سماعت تھا، انہیں باقاعدہ طور پر سندھ مسلم لیگ کا صدر منتخب کر لیا گیا، مگر انہوں نے ٹربیونل کا فیصلہ سنائے جانے تک اس منصب پر فائز ہونے سے احتراز کیا۔ غرض وہ اقتدار کی ذمہ داری تو نہ رکھتے تھے لیکن سیاسی طاقت سے بہرہ ور تھے۔

ایسی بے ڈھب صورتِ حال سے نپٹنے کے لیے مرکزی اسمبلی نے ۱۹۴۹ء میں پبلک اور نمائندہ مناصب (برنا اہلیت کا) قانون (یا پروڈا) منظور کیا۔ اس قانون کے تحت ایسے افراد کو گورنر جنرل کے حکم کے تحت دس سال تک کسی پبلک عہدہ کے لیے نااہل قرار دیا جا سکتا تھا، جو بحیثیت مرکزی یا صوبائی وزیر، نائب وزیر، پارلیمانی سیکرٹری یا رکن مرکزی او رصوبائی مجالس قانون ساز بداعمالی کے مجرم قرار دیے جائیں۔ بداعمالی میں رشوت ستانی، بدعنوانی، اقربا پروری، دانستہ بدانتظامی اور اسی قسم کے دوسرے جرائم شامل تھے۔ اس قانون کے تحت مقدمات کی سماعت کرنے والے ٹربیونل کو دو یا زائد ہائی کورٹ ججوں پر مشتمل ہونا تھا اور گورنر جنرل کا فیصلہ کابینہ کے مشورے پر مبنی ہونے کے بجائے اس کی اپنی صوابدید پر منحصر تھا۔ کھوڑو کو اس قانون کے تحت گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے دو سال کے لیے نااہل قرار دے دیا اگرچہ گورنر سندھ شیخ دین محمد نے سات سال کے لیے نااہل قرار دینے کی سفارش کی تھی۔

کھوڑو کے جانشین پیر الٰہی بخش تھے۔ چھ ماہ کے اندر ہی وہ سخت مشکلات میں گھر گئے۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء کے اواخر میں کراچی کے پانچ روزانہ اخبارات کے ایڈیٹروں نے ایک ساتھ ان کے خلاف ایک فرد قرارداد جرم شائع کی جس کا عنوان تھا "پیر الٰہی بخش کو برطرف ہونا چاہیے"۔ ان کے خلاف بھی حسب معمول رشوت ستانی اور اقربا پروری کے الزامات تھے۔ ان کے علاوہ مجرموں کو پناہ دینے کا مزید الزام بھی تھا، اس کی ایک مثال یہ تھی کہ وزیر اعلیٰ کے ہندو معتمد نائب کو عین اس وقت گرفتار کیا گیا تھا، جب وہ مبینہ طور پر سرکاری دستاویزات لے کر ہندوستان بھاگ جانے والا تھا۔ گورنر جنرل کے دولت کدہ پر ایک اجلاس میں، جس میں وزیر اعظم، گورنر سندھ اور راقم الحروف شامل تھے، یہ فیصلہ کیا گیا کہ گورنر کو ان الزامات کی تحقیقات کرنی چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ پیر الٰہی بخش کے خلاف سندھ انتخابی ٹریبونل میں بھی ایک مقدمہ زیر سماعت تھا، جو ان کے نااہل قرار دیے جانے پر منتج ہوا۔ پیر الٰہی بخش کی جگہ یوسف ہارون نے لی۔ اس ردوبدل کے دوران میں سیاست سندھ میں وزیروں کے مابین جھگڑوں اور اسمبلی کے ارکان کی تغیر پذیر وفاداریوں کے پرانے طریقے نے معمول کی حیثیت حاصل کر لی۔ آخر کار مرکزی حکومت کو ترمیم شدہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی دفعہ ۹۲-الف کے تحت سندھ میں گورنری راج نافذ کرنا پڑا۔

مشرقی بنگال میں وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین کو اسمبلی کے ایک چھوٹے سے لیکن بہت سرگرم گروہ کی وجہ سے جو مشکلات درپیش تھیں، ان میں اس وقت کافی کمی ہو گئی، جب ان کی درخواست پر اس گروہ کے ایک سرکردہ رکن کو سفیر بنا کر باہر بھیج دیا گیا۔ ستمبر ۱۹۴۸ء میں جب خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل بن گئے تو ان کی جگہ نور الامین نے لی۔ ان دونوں حکومتوں کے دور میں مشرقی پاکستان میں سیاسی استحکام برقرار رہا۔ لیکن مخالفت کا سیلاب بڑھ رہا تھا، مرکزی حکومت کی طرف سے بے توجہی اور سوتیلی ماں جیسا سلوک کے الزامات سے لوگوں کے جذبات مشتعل کیے جاتے تھے۔ کئی فعال سیاسی کارکن حزب مخالف کی صفوں میں شامل ہو گئے تھے، ان میں مولانا بھاشانی بھی شامل تھے، جنہوں نے آسام مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت میں سلہٹ کے استصواب کو کامیاب بنانے کے لیے پرزور مہم چلائی تھی۔ رائے عامہ کے رجحان میں تبدیلی کا احساس کرتے ہوئے صوبائی حکومت ضمنی انتخابات منعقد کرانے سے کترانے لگی۔ یہ کمزوری کی علامت تھی اور دلالت کرتی تھی کہ حکومت اس قابل نہیں کہ اپنا موقف عوام کے سامنے پیش کر سکے۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو انتظامیہ قائم کرنے اور معیشت کو مستحکم بنانے کے لیے جو شدید مشکلات درپیش تھیں، ان کا صحیح اندازہ کسی کو نہیں تھا۔ حصول آزادی کے بعد لوگ

حالاتِ زندگی میں یکایک بہتری کی جو توقعات رکھتے تھے، انہیں پورا کرنا ممکن نہیں تھا لیکن مایوسی کبھی اتنی سنگین صورت اختیار نہ کرتی اگر حکومت کی طرف سے لوگوں کے سامنے حقیقتِ حال صاف گوئی سے اور بار بار پیش کی جاتی۔ اگرچہ کہا جا سکتا ہے کہ انتظامی کام کی کثرت نے اس طرف توجہ نہ ہونے دی لیکن حقیقت یہی ہے کہ رابطۂ عوام کی اس ناکامی نے ملک کے سیاسی مستقبل پر بہت دور رس اثرات ڈالے۔

گاندھی کے قتل ہو جانے کے بعد ہندوستان میں سہروردی کے لیے حالات سازگار نہ رہے چنانچہ وہ حزبِ اختلاف کی تنظیم کے لیے پاکستان آگئے۔ ابتدا میں انہیں حصولِ مقصد میں کوئی کامیابی نہ ہوئی لیکن جوں جوں حکمران جماعت میں افتراق و خلفشار بڑھتا گیا، انہیں حمایتی میسر آنے لگے۔ انہوں نے خان محمد ممدوٹ اور میاں عبدالباری سے اشتراکِ عمل کر لیا، وہ دونوں پنجاب مسلم لیگ کے سابق صدر تھے۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ سے پیر مانکی شریف اور مشرقی بنگال میں مولانا بھاشانی بھی ان کے ساتھ مل گئے۔ ان سب نے پاکستان کے قیام میں نمایاں خدمات سرانجام دی تھیں، لیکن پاکستان قائم ہونے کے جلد بعد ہی وہ مسلم لیگ سے علیحدہ ہونے پر مجبور ہو گئے۔ اس طرح چند سال کے اندر ہی مسلم لیگ کو ایک فعال اپوزیشن کا سامنا کرنا پڑا، جس نے اس کی کوکھ سے ہی جنم لیا تھا۔

ان واقعات سے مسلم لیگ کے ڈھانچہ کی ایک کمزوری منظرِ عام پر آگئی۔ اپنی زندگی کے پہلے تیس برس میں مسلم لیگ ایک عوامی تنظیم نہیں تھی۔ وہ مسلمانوں کے دانشور طبقہ کی آرزوؤں کی تو ترجمان تھی، لیکن عوام کے درمیان سرگرمِ عمل نہیں تھی۔ معاشرہ کے ستون یعنی بڑے زمیندار، آسودہ حال وکیل، متمول تاجر اور خطاب یافتہ معززین ہی اس کے اہم معاونین تھے۔ چند مستثنیات کے سوا یہ لوگ کسی اونچی مقصد کے لیے سردھڑ کی بازی لگانے والے نہیں تھے۔ قوم کی خاطر اپنے ذاتی مفاد یا آرام و آسائش کو قربان کرنے پر ان کی آمادگی مشکوک تھی اور یہ شبہ بے جواز نہیں تھا۔ ان میں سے اکثر و بیشتر ایسے بزرگ تھے جو حزم و احتیاط کی حدود کو ملحوظ رکھتے ہوئے ملک و ملت کی خدمت کرتے تھے۔

جب قائدِ اعظم نے اس صدی کے تیسرے عشرے کے وسط میں اس تنظیم کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی اور اس کی ہیئتِ ترکیبی میں تبدیلی کا آغاز کیا، تو مسلم لیگ کے ہندو مخالف اور مسلمان ناقدین کئی سال تک اس جماعت کو مؤثر سیاسی اقدام کا نااہل قرار دے کر اسے بنظرِ حقارت دیکھتے رہے۔ لیکن مختصر عرصہ کے اندر ہی لیگ کا کردار بدل گیا۔

تقسیم سے قبل کے دس سال میں مسلم لیگ نے جو نمایاں کامیابیاں حاصل کیں وہ قائدِ اعظم کے سیاسی تدبر اور ان کی قیادت کی اس پر جوش پذیرائی کی مرہونِ منت تھیں، جو مسلمانوں کے باشعور طبقے، طلبا اور ابھرتے ہوئے درمیانہ طبقہ میں انہیں حاصل ہوئی، البتہ ہندو قیادت کی کوتاہ اندیشی اور رعونت نے بھی ان کی کافی مدد کی۔ جب مسلم لیگ نے پاکستان کے نصب العین کو اپنا لیا تو پھر درمیانہ طبقہ کے مسلم عوام کے جوش کو ابھارنا مشکل نہیں تھا۔ مسلم عوام ایسی اسلامی مملکت کے جو عدل اجتماعی اور عوام الناس کے مفاد کی نگہداشت کو متقیانہ قوت کے ساتھ عمل میں لائے۔ ہمیشہ ہی دل و جان سے آرزو مند رہے ہیں۔ اسلام کے ابتدائی دور میں خلفا نے جس طرح یتیموں اور بیواؤں کی پرورش کی تھی، اعلیٰ و ادنیٰ کے درمیان بے لاگ انصاف کیا تھا، بے حد سادہ زندگی بسر کی تھی اور عوام کی بہبود کے لیے دن رات کوشاں رہے تھے۔ یہ روایات زبان زدِ عوام تھیں اور ہر مسلمان بچے کو ورثے میں ملی تھیں۔ بعد کی صدیوں کے ظلم و استبداد کے باوجود اس اولیں دور کے نصب العین کی کشش میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ متحدہ ہند میں سیاسی تحفظات کا مفہوم عامۃ المسلمین کبھی پوری طرح سمجھ نہیں سکے تھے۔ لیکن مسلمانوں کے لیے ایک ایسی سرزمین، جس میں اسلامی ریاست بروئے کار آسکے گی۔ یہ سادہ اور دلپذیر تصور جاہل سے جاہل آدمی کو بھی فوراً سمجھ آجاتا تھا، اور اس سے اولوالعزمی اور انصاف پر مبنی معاشرتی نظام کی جو یادیں تازہ ہوتی تھیں، وہ ہر دوسری بات سے بدرجہا زیادہ عوامی جوش و خروش کو ابھار سکتی تھیں۔ اس طرح سوادِ اعظم اور درمیانہ طبقہ کے سیاسی کارکنوں اور قائدِ اعظم کی اعلیٰ قیادت میں مکمل ہم آہنگی ہو گئی اور لیگ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اس کا عامۃ المسلمین سے قریبی رابطہ پیدا ہو گیا۔ اب یہ جماعت ان کے دلوں کی گہری تمناؤں کی ترجمانی کرتی تھی اور ان سے قوت و استحکام حاصل کرتی تھی۔

جوں جوں تصورِ پاکستان کے لیے عوامی حمایت بڑھتی گئی، وہ مسلمان سیاست دان بھی مسلم لیگ کی طرف زیادہ سے زیادہ رجوع کرنے لگے، جو انتخابات لڑنے کے فن میں انگریزوں کے زیرِ تربیت تھے۔ اور اقتدار کے ان ٹکڑوں کو جھپٹ لیتے تھے جو انگریز پھینکتے تھے۔ یہ لوگ بہت ہوشیار اور سیانے تھے۔ وہ عارضی طور پر عوامی جوش و خروش سے متاثر ہو سکتے تھے لیکن اپنے مفاد سے کبھی غافل نہیں ہوتے تھے۔ جوں جوں ۱۹۴۶ء کے فیصلہ کن انتخابات نزدیک آتے گئے، یہی وہ لوگ تھے جنہیں انتخابی کھیل کا بیشتر علم تھا یا یوں کہیے کہ انتخابات کے لیے بنے بنائے امیدوار وہی تھے۔ قائدِ اعظم سے ان کی خصلتیں پنہاں نہیں تھیں، لیکن وہ انہیں اپنے ساتھ لیے چلے اور اس طرح یہ لوگ بھی عوامی حمایت کی لہر کے

دوش پر سوار ہو گئے۔ عوام ان کی حقیقت سے بے خبر نہیں تھے اور انہیں نظم و ضبط کے تحت رکھنے میں قائدِ اعظم پر بھروسہ کرتے تھے۔ یہ حضرات خود قائدِ اعظم سے از حد خائف رہتے تھے، کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ عوامی زندگی میں ان کی کامیابی کا انحصار اس اعتماد پر ہے جو قائدِ اعظم ان کے بارے میں ظاہر کریں گے۔

جب تک پاکستان معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا، اس وقت تک تمام تر اہمیت اس انقلابی عوامی تحریک کو حاصل تھی جس کی باگ ڈور مسلم لیگ کے پرچم کے تحت قائدِ اعظم کے ہاتھ میں تھی۔ جب پاکستان حاصل کر لیا گیا، تو قائدِ اعظم کی کم و بیش ساری توجہ مملکت کے قیام اور ان لاتعداد مسائل پر مرکوز ہو کر رہ گئی جو تیزی سے ہر طرف پیدا ہو گئے تھے۔ ان سیاستدانوں کی نگرانی اور نظم و ضبط کے لیے جس وقت اور توجہ کی ضرورت تھی، وہ انہیں کماحقہ، میسر نہیں تھی۔ اگر تحریک پاکستان کے معاشرتی اور معاشی مقاصد کو قیادت اور عوام کے سامنے زیادہ نمایاں طور پر رہنے دیا جاتا، تو صورتِ حال مختلف ہو سکتی تھی۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد بعض سیاستدانوں نے یہ محسوس کیا کہ اب وہ آزادی سے دھڑے بندیوں اور جوڑ توڑ کے ذریعہ حصولِ اقتدار کی پرانی رسم و راہ اختیار کر سکتے ہیں۔

آزادی کے وقت آل انڈیا مسلم لیگ کو ہی سب کی حمایت حاصل تھی۔ اس نے ہی قائدِ اعظم کی رہنمائی میں پاکستان حاصل کیا تھا۔ یہ پاکستان میں مسلمانوں کی واحد سیاسی جماعت تھی۔ پاکستان میں کانگرس بطور جماعت اونچی ذات کے ہندوؤں تک محدود تھی، اور شیڈولڈ کاسٹ فیڈریشن مشرقی پاکستان کے نچلے ہندو طبقات کی نمائندہ تھی۔ لیکن مسلمان خواہ مشرقی پاکستان میں ہوں یا مغربی پاکستان میں، لیگ کی مکمل وفاداری کا دم بھرتے تھے۔ مسیحیوں، بدھوں اور پارسیوں کی مختصر اقلیتیں بھی اس کی حمایت کرتی تھیں۔

آل انڈیا مسلم لیگ نے ۱۵ دسمبر، ۱۹۴۷ء کو کراچی کے اجلاس میں اپنے آپ کو دو علیحدہ تنظیموں میں تقسیم کر دینے کا فیصلہ کیا، ایک پاکستان کے لیے اور دوسری ہندوستان کے لیے۔ اگرچہ یہ فیصلہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک صدمہ تھا اور انہیں یتیم رہ جانے کا احساس ہوا۔ لیکن یہ تقسیم کا لازمی نتیجہ تھا۔ اس فیصلہ کے تحت جو پاکستان مسلم لیگ معرضِ وجود میں آئی، اسے وہ محبت اور عقیدت ورثہ میں ملی جو قبل ازیں آل انڈیا مسلم لیگ کو حاصل تھی۔ لیکن ابتدائے کار سے ہی پاکستان مسلم لیگ نے اس قیادت کے ساتھ اپنا رشتہ ڈھیلا کر دیا جس نے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کو اس قدر مضبوط اور منضبط تنظیم بنایا تھا۔ جب فروری ۱۹۴۸ء میں لیگ کے آئین اور قواعد پر غور کرنے کے لیے کراچی میں پاکستان مسلم لیگ کا اجلاس ہوا تو مسودہ آئین میں

ایک ترمیم کی تحریک کی گئی، جسے میری اطلاع کے مطابق قائداعظم کی مرضی کے خلاف قبول کر لیا گیا۔ ترمیم یہ تھی کہ کوئی وزیر یا حکومتی عہدیدار پاکستان مسلم لیگ میں عہدیدار نہیں بن سکے گا۔ قائداعظم کو اس قاعدے سے مستثنیٰ قرار دینے کی تجویز پیش کی گئی لیکن انہوں نے یہ پیش کش مسترد کر دی۔ پاکستان مسلم لیگ کی تنظیم کا کام چودھری خلیق الزمان کو تفویض کیا گیا، اور وہ بعد میں اس کے پہلے صدر بھی بن گئے، لیکن لیگ کے اندر ایک دوسرے کے ساتھ برسرپیکار دھڑوں کو نظم و ضبط کے تحت رکھنے کے لیے نہ انہیں اختیار حاصل تھا اور نہ رسوخ اور وقار۔ چونکہ لیگ ہی واحد سیاسی تنظیم تھی اور اس پر قبضہ سیاسی اقتدار کی کلید تھی۔ لیگ کے اندر اقتدار کی کشمکش میں ہر قسم کے مشکوک ذرائع روا رکھے گئے۔ فہرست ارکان کی تیاری میں جعل سازی، مخالف گروہ کو رکنیت کے فارم دینے سے انکار، کونسل کے ارکان اور عہدیداروں کے انتخابات میں دھاندلی بطور طریقے عام ہو گئے۔ عام لوگوں اور اہل الرائے کی اکثریت نے سیاست میں دلچسپی لینا چھوڑ دیا اور اسے پیشہ ور سیاست دانوں کا ذاتی مشغلہ قرار دیا جانے لگا۔ چونکہ اس وقت ہر طرف عوام میں حب الوطنی اور اسلامی جذبے کا ولولہ تھا۔ اس لیے سیاستدانوں کی ان کوتاہیوں پر اور بھی زیادہ انگشت نمائی ہوئی۔

ایک اور عامل بھی برسرکار تھا۔ تقسیم سے پہلے اختیار آل انڈیا مسلم لیگ کی تنظیم میں مرتکز تھا۔ صوبائی لیگوں کو بہت محدود اختیار حاصل تھا، اور وہ مرکزی تنظیم کی ہدایات پر عمل درآمد کرنے کی پابند تھیں۔ مرکزی تنظیم کی طاقت کا منبع اس کے صدر قائداعظم کی مضبوط شخصیت اور برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں کی حمایت تھا۔ جب فروری ۱۹۴۸ء میں پاکستان مسلم لیگ قائم ہوئی، اس کی تشکیل کے لیے وفاقی ڈھانچہ اختیار کیا گیا۔ لیگ کونسل میں ہر صوبے کے لیے نشستوں کی تعداد مقرر کر دی گئی۔ مشرقی بنگال کے لیے ۱۸۰، پنجاب کے لیے ۱۵۰، سندھ کے لیے ۵۰، شمال مغربی سرحدی صوبہ کے لیے ۴۰، بلوچستان کے لیے ۲۰، اور ۱۰ کو صدر نے نامزد کیا۔ صوبائی لیگیں صوبائی وزرائے اعلیٰ کے زیر تسلط تھیں اور وہی اپنے صوبوں سے پاکستان مسلم لیگ کے کونسلروں کے انتخابات پر حاوی تھے۔ بعض دفعہ لیگ کونسل کا انتخاب برائے نام تھا۔ عملاً وزیر اعلیٰ نے ہی اپنے وفادار حامیوں کو مقرر کر دیا تھا۔ اس طرح پاکستان مسلم لیگ براہ راست عوام سے طاقت حاصل کرنے کے بجائے صوبائی لیڈروں کی دست نگر ہو گئی۔

اس تمام عرصے میں صوبائی دستوں کے برعکس مرکزی حکومت اپنے استحکام اور قوت کی بنا پر ممتاز تھی۔ مرکزی کابینہ کی تشکیل میں علاقائی نمائندگی کو بالخصوص مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان

ہمیشہ ملحوظ رکھا گیا۔ موزوں قیادت کے تحت یہ بات اتحاد اور مضبوطی کا باعث بنتی ہے، کمزوری اور تفریق کا نہیں۔ قائد اعظم اور ان کی وفات کے بعد لیاقت علی خان کے زیر قیادت مرکزی کابینہ ملک کو درپیش سنگین مسائل کو حل کرنے کے لیے کامل ہم آہنگی سے کام کرتی رہی۔ یہ درست ہے کہ اختلافِ رائے بھی ہوتا تھا اور اس کا اظہار پوری بے باکی کے ساتھ ہوتا تھا لیکن بالعموم ایک متفقہ رائے ابھر آتی تھی، جسے سب خوشدلی سے منظور کر لیتے تھے۔ بعض اوقات بہت ہی معمولی معاملات پر غلط فہمیاں بھی پیدا ہو جاتی تھیں، اور یہ بات ہر انسانی گروہ میں ہوتی ہے۔ ایک موقع پر ایک سرکردہ وزیر نے مستعفی ہونے کی دھمکی دے دی، کیونکہ وزیرِ اعظم نے، جو وزیرِ دفاع بھی تھے، ایک فوجی افسر کی ترقی کے متعلق ان کی سفارش کو نظر انداز کر دیا تھا، اور اس طرح ان کے خیال میں انصاف نہیں کیا تھا۔ بہرحال ہوش مندی سے کام لیا گیا اور مجھے مصالحت کرانے میں کامیابی ہوئی۔ اس سے زیادہ مستقل مناقشت وہ تھی جو قائد اعظم کی وفات کے بعد وزیرِ خزانہ غلام محمد اور وزیرِ تجارت فضل الرحمٰن میں پیدا ہو گئی۔ ان میں ایک کٹاری کی طرح تیز اور تیکھا تھا اور دوسرا سونٹے کی طرح ثقیل اور بھاری۔ میں نے وزیرِ اعظم سے کئی مرتبہ اس جاریہ تنازعہ کو ختم کرنے کے لیے کہا، جو خواہ مخواہ کابینہ کے کام میں حارج ہوتا تھا لیکن وہ اس معاملہ میں فلسفیانہ نقطۂ نظر سے کام لیتے تھے۔ ممکن ہے وہ ان دونوں طاقتور شخصیتوں میں تصادم کو بالکل غیر مفید نہ سمجھتے ہوں۔ بایں ہمہ یہ اختلافات کبھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھے اور کم و بیش شخصی نوعیت کے رہے۔

مرکزی کابینہ کو صرف ایک دھچکا لگا، جب ۱۹۵۰ء میں وزیرِ محنت جوگندر ناتھ منڈل بھاگ کر ہندوستان چلا گیا۔ بنگال کے ہندو اچھوتوں کے رہنما کی حیثیت سے اس نے پاکستان کی جدوجہد میں قائد اعظم کا بڑی وفاداری سے ساتھ دیا تھا۔ قائد اعظم کی وفات کے بعد اس کا رویہ بتدریج تبدیل ہو گیا۔ پاکستان کی آئین ساز اسمبلی میں اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے اس پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیے اور اسے آمادہ کرنے لگے کہ وہ ان کی قیادت بھی سنبھال لے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ کراچی میں ہندوستانی ہائی کمیشن اور منڈل کے درمیان بھی رشتے استوار ہونے لگے۔ لیاقت علی خان اس صورت حال سے باخبر تھے، اور میں بھی احتیاطی تدابیر سے کام لے رہا تھا کہ زیادہ رازدارانہ دستاویزات اس کے ہاتھ نہ لگیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ منڈل کو بھی پتہ چل گیا کہ اس کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ وہ ڈر گیا اور بھاگ کر ہندوستان چلا گیا۔

ہندوستان کے ساتھ تعلقات نے پاکستان کی دفاعی ضروریات اور خارجہ پالیسی کے تعین

میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہندوستان کے لیڈروں نے اس امید کے ساتھ تقسیم قبول کی تھی کہ وہ اسے بہت جلد کالعدم بنادیں گے اور سارے برصغیر پر ان کا تسلط قائم ہو جائے گا۔ برلیشر نے لکھا ہے: " اکثر و بیشتر کانگرسی لیڈروں کا خیال یہ تھا، اور ان میں نہرو بھی شامل تھا کہ پاکستان سیاسی، معاشی، جغرافیائی یا فوجی اعتبار سے زندہ رہنے کے قابل نہیں، اور جو علاقے علیحدہ ہو گئے ہیں وہ جلد یا بدیر حالات سے مجبور ہو کر واپس آملیں گے"۔ پاکستان ان کے لیے ایک عارضی مرحلہ اور ایک وقتی پسپائی کے مترادف تھا، جس سے ان کے اصل مقاصد پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔

پہلے صفحات میں درج کردہ واقعات پاکستان کے خلاف ہندوستان کے مسلسل معاندانہ رویّہ کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ مشرقی پنجاب میں منظم منصوبہ کے تحت قتلِ عام، نہری پانی میں مزاحمت، فوجی ذخائر اور دوسرے اثاثہ جات کی بازداشت، جوناگڑھ اور کشمیر پر فوجی قبضہ اور ۱۹۴۹ء کی تجارتی جنگ۔ یہ سب اسی سلسلہ کی کڑیاں تھیں، غرض ہندوستان نے پاکستان کے علاقوں میں کتر بیونت کرنے، فوجی اعتبار سے اس کے گرد گھیرا ڈالنے اور معاشی طور پر اس کا گلا گھونٹ دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔

پاکستان کی آزادی اور علاقائی سالمیت کے تحفظ کے لیے افواج کو مضبوط بنانا اور اسلحہ سے لیس کرنا لازم تھا۔ چنانچہ جن وسائل کی معاشی تعمیرِ نو اور اقتصادی ترقی کے لیے شدید اور فوری ضرورت تھی، انہیں دفاع کے لیے استعمال کرنا پڑا۔ اور اس مد پر مرکزی بجٹ کا نصف اور بعض اوقات اس سے بھی زائد حصہ مخصوص کیا گیا۔ عوام نے یہ قربانیاں بڑی خوشدلی سے قبول کیں۔ لیاقت علی خان کا یہ قول ساری قوم کے عزم کا آئینہ دار تھا — "ہم ایک دن کے لیے فاقہ تو کر سکتے ہیں لیکن ایک منٹ کے لیے بھی غلام بننا برداشت نہیں کر سکتے"۔ پہلا منصوبہ سوا لاکھ فوج کا تھا لیکن ہندوستان کی طرف سے جارحیت کے مسلسل خطرہ کے پیشِ نظر اس میں معتدبہ اضافہ کیا گیا۔ چونکہ ہندوستان نے پاکستان کے حصہ کے فوجی ذخائر روک لیے تھے، اس لیے جنگی ساز و سامان پر خطیر رقوم صرف کرنی پڑیں۔ ۸ر اکتوبر ۱۹۴۸ء کو قوم کے نام ایک نشری خطاب میں لیاقت علی خان نے کہا — "مملکت کا دفاع ہمارے لیے سب سے زیادہ قابلِ توجہ امر ہے، اور اسے تمام دوسری حکومتی سرگرمیوں پر فوقیت حاصل رہی ہے۔ ہم اپنے ملک کے دفاع پر کوئی بھی رقم خرچ کرنے میں تامل نہیں کریں گے"۔

بری فوج، فضائیہ اور بحریہ کے ہیڈکوارٹرز قائم کیے جانے ضروری تھے۔ ہند کی فضائیہ اور بحریہ کافی ترقی یافتہ نہیں تھیں۔ ان دونوں میں مسلمانوں کی تعداد بھی نسبتاً بہت کم تھی۔ چنانچہ پاکستان کی فضائیہ اور
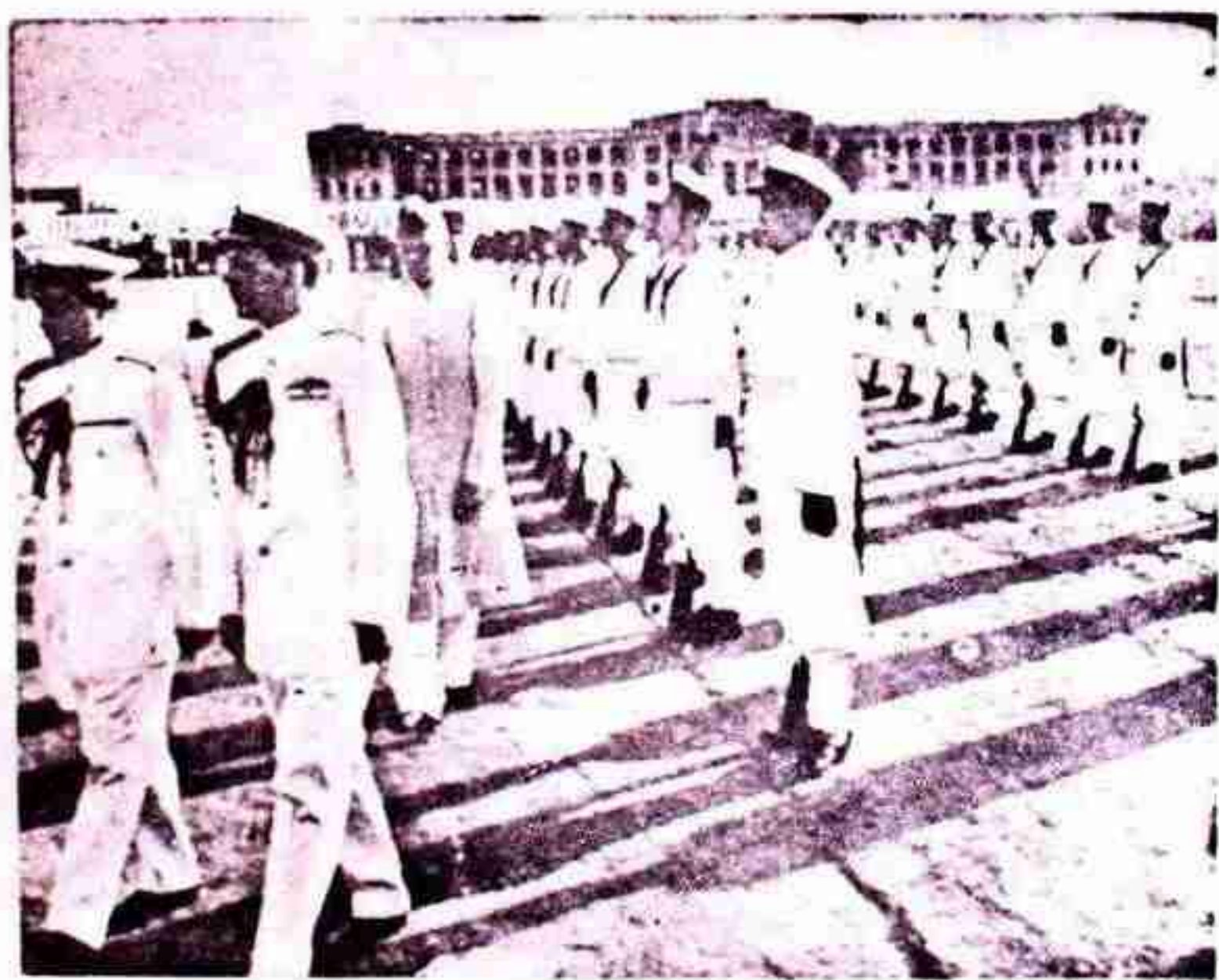
قائد اعظم یوم استقلال کے موقع پر پاکستانی بحریہ
کا معائنہ فرما رہے ہیں -

بحریہ نے واجبی بنیادوں پر آغاز کار کیا۔ ان کے ہیڈ کوارٹر کراچی میں قائم کیے گئے۔ راولپنڈی میں ناردرن کمانڈ کے ہیڈ کوارٹرز کو پاکستانی فوج کا جنرل ہیڈ کوارٹرز بنا دیا گیا۔ اگرچہ ہند کی فوج کا ایک تہائی حصہ مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ لیکن خالص مسلمانوں کا کوئی بھی یونٹ نہیں تھا۔ غیر مسلموں کے انخلاء کے بعد جو دستے باقی رہ گئے ان کو از سر نو منظم کرنا اور ان کی افرادی قوت کو پورا کرنا ضروری تھا۔ فوج کے فنی شعبوں مثلاً توپ خانہ اور انجینیئرز میں کمی بہت شدید تھی، پیدل فوج میں سٹاف اور کمان کا تجربہ رکھنے والے سینیئر افسروں کی تعداد بھی نہایت محدود تھی۔ چنانچہ ہندوستانی فوج کے مقابلہ میں پاکستانی فوج پر برطانوی افسروں کو نسبتاً زیادہ انحصار کرنا پڑا۔ افواج کو قومیانے کا عمل تدریجاً ہی ہو سکتا تھا۔ ان برطانوی افسروں کی احسان شناسی ضروری ہے، جنہوں نے پاکستان کی بری فوج، بحریہ اور فضائیہ کی ترقی و تنظیم میں بڑے جوش و اخلاص سے کام کیا۔

دو صدیوں تک بنگال کی عسکری صلاحیتوں کو قطعاً نظر انداز کیا جاتا رہا تھا۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ ہند کی افواج کی تقسیم سے جو پاکستانی فوج معرض وجود میں آئی، اس میں مشرقی پاکستانیوں کی تعداد محض مٹھی بھر تھی۔ ابتدا سے ہی اس صورت حالات کو بدلنے کی اہمیت کا احساس تھا۔ "غیر عسکری" نسلوں کے غلط نظریہ کو ترک کر دیا گیا اور مشرقی پاکستان میں بھی بھرتی کے مواقع بہم پہنچائے گئے۔ فروری ۱۹۴۸ء میں ایسٹ بنگال رجمنٹ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ مشرقی پاکستان میں فوج کی رہائش کے لیے چھاؤنیاں بھی تعمیر کی گئیں۔

پاکستان میں ایک بھی اسلحہ ساز (آرڈی نینس) فیکٹری نہیں تھی۔ برطانوی ہند کی ساری کی ساری سولہ آرڈی نینس فیکٹریاں ہندوستان میں واقع تھیں۔ دوسری جنگ عظیم میں ان کی کافی توسیع بھی کی گئی تھی اور انہیں جدید ترین مشینوں سے بھی لیس کیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں نئی فیکٹریاں مثلاً بنگلور میں ہندوستان ایئرکرافٹ فیکٹری بھی قائم کی گئی تھیں۔ ہندوستانی لیڈر اس بات کے سخت مخالف تھے کہ پاکستان کو کوئی فیکٹری بلکہ کوئی مشین تک بھی منتقل کی جائے۔ انہوں نے تو ایک برین گن فیکٹری اور فیوز بھرنے والی فیکٹری سے بھی دستکش ہونے سے انکار کر دیا، جو کریٹوں میں بند پڑی تھیں اور ابھی انہیں نصب نہیں کیا گیا تھا۔

اس اٹل مخالفت کے پیش نظر پاکستان کے لیے اپنا جائز حصہ حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ ان حالات میں بہترین طریق مالی تصفیہ ہی تھا۔ چنانچہ اثاثہ جات کی تقسیم کے آخری معاہدہ میں ہیں نے آرڈی نینس فیکٹریوں کے عوض چھ کروڑ روپے طے کیے۔ اس روپے سے راولپنڈی کے قریب واہ میں

ایک نئی آرڈی نینس فیکٹری قائم کرنے کا کام شروع کیا گیا۔ چونکہ یہ منصوبہ میرے زیرِ اہتمام بنا تھا۔ اس کی دیکھ بھال بھی میری ہی ذمہ داری تھی۔ وزیرِ خزانہ غلام محمد اس کے خلاف تھے کیونکہ ان کے خیال میں یہ کام نجی مساعی سے ہو سکتا تھا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ فوجی ہیڈ کوارٹرز نے بھی اس منصوبہ میں کوئی خاص دلچسپی ظاہر نہ کی اور وہ اس کے لیے کسی موزوں افسر کو دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ بڑی مشکل سے میں نے ریلوے حکام کو ایک سینیئر مکینیکل انجینیئر کو اس کام کے لیے فارغ کرنے پر آمادہ کیا۔ فیکٹری کا ڈیزائن تیار کرنے کے لیے انگلستان سے آرڈی نینس کے ایک ماہر نیوٹن بوتھ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اس سلسلے میں سر آرچیبالڈ رولینڈز نے ہماری بڑی مدد کی، وہ گورنر جنرل پاکستان کا مالیاتی مشیر تھا اور جنگ کے دوران میں برطانیہ کی وزارتِ رسد میں مستقل انڈر سیکرٹری رہ چکا تھا۔ پاکستانیوں کو اسلحہ سازی کی تربیت دلانے کی ایک سکیم بھی شروع کر دی گئی۔ جب وزیرِ اعظم حیدر آباد میر لائق علی ہندوستان کے حیدر آباد پر قبضہ کرنے کے بعد بھاگ کر کراچی آ گئے تو انہیں مشیرِ دفاع مقرر کر کے اس فیکٹری کا نگران بنا دیا گیا۔

کوئٹہ میں سٹاف کالج کے سوا، جسے بین الاقوامی شہرت حاصل تھی، پاکستان کو فوجی تربیت کی کوئی بھی درس گاہ ورثہ میں نہ ملی۔ کاکول میں ایک فوجی اکادمی کا قیام عمل میں لایا گیا اور بری فوج، بحریہ اور فضائیہ کے لیے متعدد تربیتی درسگاہیں قائم کی گئیں۔

فروری ۱۹۴۸ء میں امریکہ کے نام ایک نشری خطاب میں قائدِ اعظم نے پاکستان کی خارجہ پالیسی کو یوں بیان کیا:

> "ہماری خارجہ پالیسی دنیا کی تمام قوموں کے ساتھ دوستی اور خیر خواہی کی ہے۔ کسی بھی قوم یا ملک کے خلاف ہم جارحانہ عزائم نہیں رکھتے۔ ہم اپنے ملکی اور بین الاقوامی معاملات میں ایمانداری اور انصاف کے اصولوں میں یقین رکھتے ہیں اور اقوامِ عالم میں امن اور خوشحالی کے فروغ کے لیے زیادہ سے زیادہ حصہ لینے کے لیے تیار ہیں۔ دنیا کے مظلوم و مقہور لوگوں کی مادی اور اخلاقی امداد کرنے اور اقوامِ متحدہ کے منشور کے اصولوں کی سربلندی کے لیے پاکستان اپنا دستِ تعاون بڑھانے میں کبھی کوتاہی نہیں کرے گا۔"

ان اصولوں پر عمل کی مثال برطانوی دولتِ مشترکہ اور مغرب سے اپنے ہمسایوں بشمول

چین اور روس سے اور دنیائے اسلام سے جس کا کہ پاکستان ایک جزو لاینفک ہے، پاکستان کے تعلقات ہیں۔

گورنر جنرل کا منصب سنبھالنے سے عین قبل قائد اعظم نے "دولت مشترکہ کے ان بلند و برتر مقاصد کا دلی اعتراف کیا تھا، جن سے وہ رہنمائی حاصل کرتی رہی ہے اور آئندہ بھی حاصل کرتی رہے گی"۔ پاکستان کے لیڈروں کا یہ خیال تھا کہ دولت مشترکہ اقوام کی ایک برادری ہے، جو اپنے ارکان کے مفاد کا خیال رکھتی ہے ان میں اختلافات کا منصفانہ تصفیہ کراتی ہے، اور جارحیت کے خلاف ان کی مدد کرتی ہے۔ لیکن تجربہ کے بعد یہ توقع غلط ثابت ہوئی۔ جب تنازعہ کشمیر اقوام متحدہ کے سامنے پیش ہوا، تو ابتدا میں برطانیہ نے امریکہ، کینیڈا اور سلامتی کونسل کے دوسرے ارکان کے ساتھ انصاف پرور مؤقف اختیار کیا لیکن بہت جلد برطانیہ نے ہندوستان کی دولت مشترکہ سے علیحدہ ہو جانے کی دھمکی پر گھٹنے ٹیک دیے اور برطانیہ کی پیروی میں سلامتی کونسل کے دوسرے ارکان نے بھی شرمناک پسپائی کی راہ اختیار کرلی۔ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جو تنازعات تھے دولت مشترکہ ان کا تصفیہ کرانے میں بے حد متامل تھی۔ بالآخر جب جنوری ۱۹۵۱ء میں لیاقت علی خان نے کشمیر کے مسئلہ کو زیر بحث لائے بغیر دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا، تو ایک غیر رسمی اجلاس میں بات چیت کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقع پر آسٹریلیا کے وزیر اعظم مینزیز کی مساعی کے باعث تعطل کا خطرہ ٹل گیا۔ وہ لندن جاتے ہوئے کراچی میں رک گیا اور مسئلہ کشمیر پر گفت و شنید کے متعلق دوسرے وزرائے اعظم کی منظوری حاصل کرنے کے بعد وہ لیاقت علی خان کو لندن کی کانفرنس میں شرکت پر آمادہ کر سکا۔ جوں جوں دولت مشترکہ کا حقیقی کردار واضح ہوتا گیا، پاکستان کی اس سے ناامیدی بڑھتی گئی، لیکن یہ مایوسی علیحدہ ہو جانے کی حد تک نہیں پہنچی۔

غالباً اس کی وجہ ان مغربی جمہوری اداروں سے تعلق خاطر ہے جو برطانیہ کا اپنی سابق نوآبادیوں کے لیے سب سے بڑا عطیہ ہیں۔ اس تعلق کو ثقافتی اور معاشی رشتوں نے بھی تقویت پہنچائی۔ انگریزی حکومت اور اعلیٰ عدالتوں کی زبان اور یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم تھی۔ پاکستان سٹرلنگ علاقہ کا رکن تھا اور لندن میں اس کے معتدبہ بقایاجات تھے۔ برطانیہ سے تجارت دوسرے سب ملکوں سے زیادہ تھی۔ کولمبو منصوبہ کے تحت دولت مشترکہ کے ارکان کو معاشی ترقی میں امداد بھی ملتی تھی۔ دولت مشترکہ کی عالمی وسعت کے پیش نظر اس کی رکنیت برقرار رکھ کر پاکستان عالمی پالیسیوں کی تشکیل میں کچھ نہ کچھ حصہ لے سکتا تھا۔

برطانیہ کا سحر ٹوٹنے سے خارجہ تعلقات میں ایک نمایاں فرق پڑا اور جمہوری دنیا کے لیڈر امریکہ سے

رجوع کرنے کا رجحان پیدا ہو گیا۔ کشمیر پر بحث کے دوران میں سلامتی کونسل میں امریکی نمائندہ وارن آسٹن نے نے کشمیر میں آزادانہ استصواب کی واشگاف انداز میں حمایت کی تھی۔ جب دوسری جنگِ عظیم کے ایک امریکی ہیرو ایڈمرل نمٹز کو ناظم استصواب نامزد کیا گیا تو پاکستان کے عوام نے یہ محسوس کیا کہ وہ اپنا فرض پوری غیر جانبداری سے ادا کرے گا۔ امریکہ کے ساتھ ان تعلقات کو مئی ۱۹۵۰ء میں لیاقت علی خان کے سرکاری دورہ سے بھی بڑی تقویت پہنچی۔ امریکہ کے مختلف حصوں میں لیاقت علی خان نے ان مثبت مقاصد پر خاص طور پر زور دیا، جن کے لیے پاکستان کوشاں تھا۔ نیویارک میں ایک تقریر کے دوران میں انہوں نے کہا:۔

"ہم جمہوریت یعنی بنیادی انسانی حقوق میں یقین رکھتے ہیں، ان میں شخصی ملکیت کا حق بھی شامل ہے اور لوگوں کا یہ حق بھی کہ کاروبارِ حکومت ان کی آزاد مرضی سے منتخب نمائندوں کے ذریعہ چلایا جانا چاہیے۔ ہم سب کے لیے، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، مساوی شہریت، مساوی مواقع اور قانون کے تحت برابری میں یقین رکھتے ہیں۔ ہم اس بات میں بھی یقین رکھتے ہیں کہ ہر فرد کو، عورت ہو یا مرد، اپنی محنت کا پھل پانے کا حق ہے۔ اور بالآخر ہمارا یہ بھی یقین ہے کہ ہم میں سے جو دولت یا علم یا جسمانی اہلیت کے اعتبار سے خوش بخت ہیں۔ ان پر کم نصیب لوگوں کی طرف سے اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہم ان اصولوں کو اسلامی نظامِ حیات کہتے ہیں۔ آپ انہیں جو چاہیں نام دے سکتے ہیں" [۸]

پاکستان دنیائے اسلام کا طبعی حصّہ ہے۔ اس کا مقصد تخلیق ہی یہ ہے کہ اسلام اس کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کا رہنما اصول ہے۔ اسلامی عقائد اور معمولات دنیا بھر کے مسلمانوں کے مابین اخوت پر زور دیتے ہیں۔ برطانوی حکمرانی کے دور میں بھی برصغیر کے مسلمان اس صفت کے لیے مشہور تھے جسے اغیار ماورائے علاقہ وفاداری کہتے تھے۔ اشتیاق حسین قریشی نے یہ رائے ظاہر کی ہے۔ "اپنی آزادی سے محروم ہو کر برصغیر کے مسلمانوں میں دوسری مسلم اقوام کے ساتھ اپنے رشتۂ اتحاد کا نیا احساس پیدا ہوا" [۹] قیامِ پاکستان کے بعد یہ شعور کچھ اور اجاگر ہو گیا۔ نہ صرف قومی جذبات بلکہ قومی مفاد کا بھی یہی تقاضا تھا۔ پاکستان کے جغرافیائی ڈھانچے نے اسے مشرقِ وسطیٰ اور جنوب مشرقی ایشیا دونوں کا حصّہ بنا دیا ہے۔

مغرب کی جانب افغانستان، ایران، ترکی اور عرب ممالک واقع ہیں اور مشرق کی جانب ملائیشیا اور انڈونیشیا کی اسلامی سرزمینیں ہیں۔ شمال میں ایشیائے اوسط کی سوویٹ جمہوریتیں ہیں، جن کی آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ان میں بخارا اور سمرقند ایسے قدیم مسلم تہذیب کے گہوارے واقع ہیں۔ جن کے ساتھ عصرِ حاضر تک برِ صغیر کے مسلمانوں کے زندہ روابط رہے ہیں۔

عالمِ اسلام کی آزادی، استحکام، خوشحالی اور اتحاد کے لیے کوشاں رہنا پاکستان کی خارجہ پالیسی کا ایک مستقل مقصد ہے۔ حکومتِ پاکستان کا ایک اولین اقدام یہ تھا کہ مشرقِ وسطیٰ کے ملکوں میں ایک خیر سگالی وفد بھیجا گیا۔ پاکستان نے فلسطین میں عربوں کے حقوق کو اپنا مسئلہ سمجھا، اور اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے وزیرِ خارجہ ظفر اللہ خان اس کے فصیح ترین ترجمان تھے۔ علاوہ ازیں انڈونیشیا، ملایا، سوڈان، لیبیا، طونس، مراکش، نائجیریا اور الجزائر کی آزادی کی مکمل حمایت کی گئی۔ مغربی ایریان کے مسئلے پر پاکستان نے انڈونیشا کا پورا ساتھ دیا۔ کئی مسلم ملکوں کے ساتھ دوستی کے معاہدے کیے گئے ہیں اور ثقافتی ارتباط کا انتظام کیا گیا ہے۔ موتمرِ عالمِ اسلامی کی تنظیم عمل میں لائی گئی۔ ۱۹۴۹ء میں کراچی میں بین الاقوامی اسلامی اقتصادی کانفرنس منعقد کی گئی جس میں ۱۸ مسلم ملکوں کے نمائندے شامل ہوئے تھے۔ کانفرنس نے اتفاق رائے سے اسلامی ایوان ہائے صنعت وتجارت کا بین الاقوامی وفاق قائم کرنے کا فیصلہ کیا لیکن بدقسمتی سے اس قرارداد پر عمل درآمد نہیں کیا گیا۔

صرف ایک مسلمان ملک افغانستان کے ساتھ پاکستان کے تعلقات کشیدہ رہے ہیں۔ افغانستان اور برطانوی ہند کے مابین سرحد کا تصفیہ ۱۸۹۳ء میں سر ہارٹیمر ڈیورنڈ نے کیا تھا، اور اب یہ سرحد ڈیورنڈ لائن کہلاتی ہے۔ ہند میں انتقالِ اقتدار سے کچھ عرصہ قبل افغانستان نے ناقابلِ جواز دعاوی کیے جنہیں حکومتِ برطانیہ نے قطعی طور پر مسترد کر دیا۔ ڈیورنڈ لائن ہی پاکستان اور افغانستان کے مابین مسلّمہ بین الاقوامی سرحد ہے اور حکومت افغانستان نے کبھی اس سے کھلم کھلا انکار نہیں کیا۔ لیکن ہندوستان کی اعانت اور انگیخت پر حکومت افغانستان نے آغاز سے ہی پاکستان کے ساتھ معاندانہ رویے کا اظہار کیا ہے، حالانکہ پاکستان نے اپنے اس قریبی ترین مسلم ہمسایہ سے دوستانہ تعلقات برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ پاکستان کی طرف سے سب سے پہلا سفارتی مشن افغانستان ہی بھیجا گیا تھا۔ بااین ہمہ دنیا بھر میں افغانستان ہی واحد ملک تھا جس نے اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے داخلہ کی مخالفت کی۔ "پختونستان" کا نعرہ جسے گاندھی نے گھڑا اور اس کے چیلے عبدالغفار خان نے بلند کیا تھا، اسے افغان حکمرانوں نے اپنا لیا۔ فقیر اپی ایسے شورش پسند عناصر اور کابل

ریڈیو کے ذریعہ افغان حکومت نے ڈیورنڈ لائن کی پاکستانی جانب میں آباد قبائل کو منحرف کرنے کی کوشش کی۔ پاکستان میں افغان قنصل خانے معاندانہ پروپیگنڈہ کے مرکز بنے رہے لیکن یہ ساری کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ سرحد پر امن و سکون کا وہ دور دورہ ہے جو انگریزوں کو شاذ و نادر ہی میسر تھا۔

مذہب اور ثقافت کے علاوہ دونوں ملکوں بالخصوص افغانستان کے اقتصادی مفادات بھی گہرے اشتراکِ عمل کے متقاضی ہیں۔ افغانستان چاروں طرف دوسرے ملکوں میں گھرا ہوا ہے اور اس کی درآمدی اور برآمدی تجارت کے بیشتر حصہ کا انحصار کراچی کی بندرگاہ پر ہے۔ پاکستان نے افغان اموال تجارت کے لیے بلا روک ٹوک گزرنے کی ساری سہولتیں بہم پہنچائی ہیں۔ افغانستان کے میوہ جات کی پاکستان میں بہت وسیع کھپت ہے اور ان کے عوض وہ کپڑا اور دوسری مصنوعات حاصل کر سکتا ہے۔ جس زمانے میں پاکستان کو زرِ مبادلہ کی شدید دشواریاں درپیش تھیں، اس وقت بھی اس نے افغانستان پر زرِ مبادلہ کی پابندیاں عائد نہ کیں اور پاکستان میں استعمال کے لیے باہر سے جو اشیاء درآمد کی جاتی تھیں وہ افغانستان بھی جاتی تھیں۔ ان دوستانہ مساعی کے باوجود افغان حکمرانوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے تحت اکثر و بیشتر کشیدگی کی راہ ہی اختیار کی ہے۔ بہرحال یہ امید قائم ہے کہ مرورِ زمانہ سے افغان حکومت دونوں مسلم ہمسایوں میں اشتراکِ عمل کے فوائد کی قائل ہو جائے گی۔

ہندوستان اور افغانستان سے قطع نظر دوسرے ہمسایہ ملکوں کے ساتھ پاکستان کے تعلقات دوستانہ رہے ہیں۔ ایران اور پاکستان کے درمیان ثقافتی روابط کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ فارسی صدیوں تک برصغیر میں مسلم سلطنت کی سرکاری زبان رہی ہے۔ اور اردو پر اس کا اثر باقی سب زبانوں سے زیادہ ہے۔ اردو شاعر بسا اوقات فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں۔ اردو کے دو عظیم ترین شاعروں غالب اور اقبال نے تو اپنے بہترین رشحاتِ فکر کے اظہار کے لیے فارسی ہی کا انتخاب کیا۔ ترکی قدرے دُور واقع ہے لیکن قدیم روایات کی بدولت پاکستانی عوام کے دلوں سے بہت قریب ہے۔

پاکستان ان ملکوں میں سے ہے جنہوں نے پہلے پہل کمیونسٹ چین کو تسلیم کیا۔ اور اس کے ساتھ ۱۹۵۰ء میں سفیروں کا تبادلہ کیا۔ جب جنگِ کوریا کا آغاز ہوا، تو امریکہ کے بار بار زور دینے کے باوجود پاکستان نے اس میں حصہ نہ لیا، حالانکہ امریکہ نے یہ پیشکش بھی کی کہ پاکستان کی طرف سے محاذِ جنگ پر جو بریگیڈ بھیجا جائے گا۔ امریکہ خود اسے جدید اسلحہ سے لیس کرے گا۔ لیاقت علی نے ۱۹۵۰ء میں لاس اینجلز (امریکہ) میں تقریر

کرتے ہوئے کہا: پاکستان نے پختہ عزم کر رکھا ہے کہ وہ اپنا سارا وزن ایشیا میں استحکام برقرار رکھنے کے پلڑے میں ڈالے گا۔ ایشیا میں استحکام ہماری آزادی اور ترقی کے لیے ازحد ضروری ہے بلکہ عالمی امن کے لیے بھی لازم ہے۔ دنیا کے جس حصے میں ہم رہتے ہیں، اور وہاں سے ہمیں حالات کا جو نقشہ نظر آتا ہے، اس میں ہم یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ایشیا میں استحکام کے بغیر عالمی امن کس طرح قائم رکھا جا سکتا ہے"؛ ۱۱ؗ

آزادی کے فوراً بعد جب پاکستان اقوام متحدہ کا رکن بنا، تو اس نے بھی عالمی تنظیم سے وہ امیدیں وابستہ کی تھیں، جو جنگ سے تھکی ہاری انسانیت کو تھیں۔ لیکن اس عالمی ادارہ کی عملی کارکردگی نے بالخصوص تنازعۂ کشمیر کے بارے میں اس کی کارگزاری نے اس ابتدائی رجائیت کو زیادہ حقیقت پسندانہ زاویۂ نگاہ میں بدل دیا۔ لیکن نہ اس سے اقوام متحدہ کے منشور کے اصولوں میں پاکستان کا یقین کم ہوا ہے اور نہ ہی ہر ممکن طریقے سے اقوام متحدہ کی حمایت کرنے اور اسے مستحکم بنانے کی ضرورت میں۔

ایشیا اور افریقہ کے دوسرے نوآزاد ملکوں کی طرح پاکستان کی معاشی تعمیر اور معاشرتی ترقی کے لیے بھی عالمی امن ایک لازمی شرط ہے لیکن آئین اور انصاف پر مبنی ایسا عالمی نظام ابھی ظہور پذیر نہیں ہوا جس میں کمزور ممالک استیلا اور استحصال کے خوف کے بغیر طاقتور اقوام کے پہلو بہ پہلو زندہ رہ سکیں۔

پاکستان کی زندگی کے پہلے سال میں ملک کو اس قدر نازک اور اہم مسائل درپیش تھے کہ قائداعظم کے لیے اکثر کابینہ کے اجلاسوں کی صدارت کرنا ناگزیر ہو جاتا تھا۔ یہ درست ہے کہ قائداعظم اور کابینہ میں ان کے رفقائے کار (بشمول وزیراعظم) کے مابین بہت فرق مراتب تھا لیکن اس تفاوت کا سبب قائداعظم کی فکری عظمت اور بابائے قوم کی حیثیت میں ان کا جلیل المرتبہ ہونا تھا۔ عام تاثر کے برعکس وہ ہمیشہ پوری آزادی سے بحث و تمحیص کی اجازت دیتے تھے۔ وہ خود اپنے نقطۂ نظر کی تائید وزنی دلائل سے کرتے تھے لیکن اس کے خلاف رائے کو بھی سننے پر تیار رہتے تھے۔ بشرطیکہ وہ رائے حقائق اور معقولیت پر مبنی ہو۔ صرف ذہنی بددیانتی یا احمقانہ خودسری پر وہ برافروختہ ہوتے تھے بلکہ وہ دوسروں کو اپنے نقطۂ نظر کا قائل کرنے کے شائق تھے اور بڑے تحمل سے زیر بحث مسئلہ کے تمام پہلوؤں کی مفصل وضاحت کرتے تھے۔ جو تحریر بھی ان کی خدمت میں پیش کی جاتی تھی وہ پوری توجہ سے اس کا مطالعہ کرتے تھے۔ ان کی محنت شعاری اتنی ہی حیرت انگیز تھی جتنی کہ تحقیق حق کے لیے ان کی کاوش۔ معمولی جزئیات بھی ان کی نگاہ سے اوجھل نہیں رہتی تھیں اور وہ کام میں کسی قسم کے ڈھیلے پن کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ وہ خود بھی تن دہی سے کام کرتے تھے

اور دوسروں سے بھی دیانتداری اور فرض شناسی کے ایسے ہی معیار کی توقع کرتے تھے۔ ناموافق سے ناموافق حالات میں بھی ان کی اصابتِ فکر و نظر اور اعصاب پر ضبط برقرار رہتے تھے۔ جس وقت ملک پے در پے شدید خطرات سے گزر رہا تھا یہ ان کا ایمان اور ہمت ہی تھی جنہوں نے قوم کو سہارا دیا۔ ان کا دستور العمل ـــ اتحاد، یقینِ محکم اور تنظیم ـــ محض نعرہ ہی نہیں تھا بلکہ یہ اس زندہ تجربہ کا اظہار تھا جس میں قائدِ اعظم اپنی قوم کے ساتھ شریک تھے۔ انہوں نے قوم کی صفوں میں اتحاد پیدا کیا اور ان کی لاتعداد تفرقہ بازیوں کو ختم کر دیا۔ انہوں نے عوام کو وحدتِ قیادت سے بہرہ ور کیا، اپنے مقدر میں ان کے یقین کو بحال کیا اور انہیں ایک منظم قوت بنا دیا۔

بے شمار کام اور از حد سنگین مسائل کے بارے ان کی صحت خراب ہو گئی، لیکن وہ اسی طرح مصروفِ کار رہے اور اپنی صحت کا کچھ خیال نہ کیا۔ جولائی ۱۹۴۸ء میں جب یہ معلوم ہوا کہ ان کے پھیپھڑوں کا عارضہ نازک صورت اختیار کر گیا ہے، تو غالباً انہیں پیش آگاہی ہو گئی کہ اس دنیائے فانی کو خیرباد کہنے کا مرحلہ زیادہ دور نہیں ہے۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو پاکستان کی پہلی سالگرہ پر انہوں نے قوم کے نام جو پیغام دیا، اُس میں اس کا اشارہ موجود ہے۔ پہلے سال کے کارناموں کی تفصیل بیان کرنے اور یہ کہنے کے بعد کہ "پاکستان کا قیام ایک ایسا امر واقعہ ہے، جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی"۔ انہوں نے ان الفاظ کے ساتھ قوم کو خدا حافظ کہا۔" قدرت نے آپ کو ہر شئے عطا کی ہے، آپ کے پاس لامحدود وسائل ہیں۔ آپ کی مملکت کی بنیادیں استوار کر دی گئی ہیں، اب ان پر عمارت بنانا اور حتی الوسع جلد از جلد اور بہترین عمارت بنانا آپ کا کام ہے۔ اس لیے اُٹھیے اور آگے بڑھیے۔ بامانِ خدا ! پاکستان زندہ باد"۔ [۱۱]

ان کے انتقال سے چند روز قبل مجھے کوئٹہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔ میں وہاں ان کی خدمت میں تنازعۂ کشمیر کی تازہ ترین صورتِ حال پیش کرنے اور آئندہ پالیسی کے لیے ان کی ہدایات حاصل کرنے کے لیے گیا تھا۔ وہ بسترِ علالت پر تھے، ان کی توانائی آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی لیکن ان کی اصابتِ فکر پہلے ہی کی طرح تھی، ان کا عزم اسی طرح بلند تھا، ان کی آنکھوں میں وہی پرانی چمک تھی۔ اور اپنی قوم کے مقدر میں انہیں وہی پہلے کی طرح یقین تھا، جو ہمیشہ ان کا منفرد وصف رہا تھا۔

۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو انہیں کراچی میں لایا گیا اور اسی دن شام کو انہوں نے ۷۲ سال کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ان کی رحلت کے ساتھ ایک دور ختم ہو گیا۔ مسلم ہند کی تاریخ میں انہوں نے ایک یگانہ
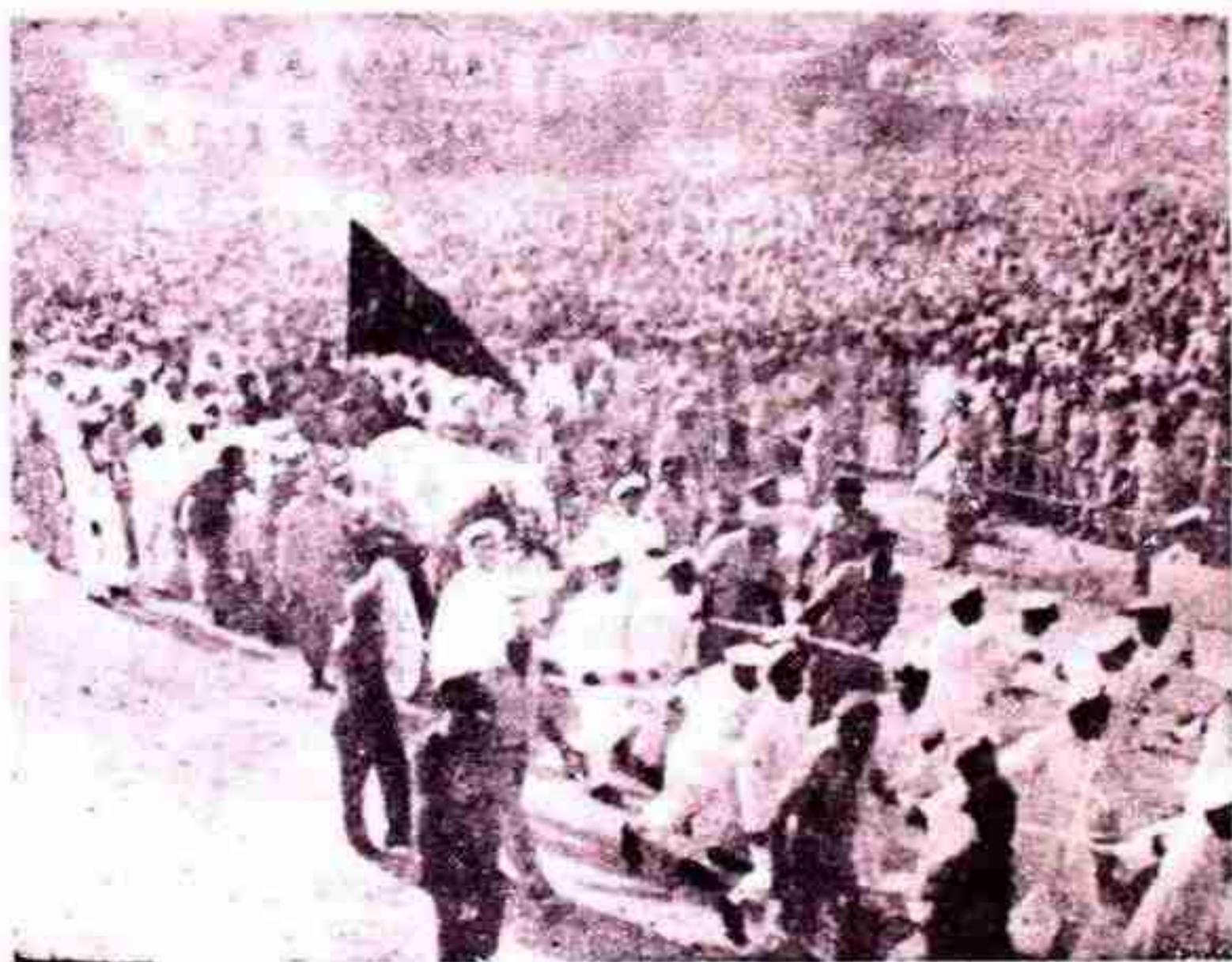
قائد اعظم کا سفر آخرت

روزگار کارنامہ سرانجام کیا۔ جب انہوں نے اسلامیانِ برصغیر کی عنانِ قیادت اپنے ہاتھ میں لی، تو ان کی قوم دو سو سال کی محکومی سے بے حوصلہ ہو چکی تھی، لیکن ان کی رہنمائی میں قوم نے بے پایاں مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے پر امن اور آئینی ذرائع سے دنیا کی سب سے بڑی مسلم مملکت حاصل کر لی۔ لوگ یہ مانتے ہی نہیں تھے کہ قائدِ اعظم کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس سانحہ کے بعد بھی سالہا سال تک عام جلسوں میں "قائدِ اعظم زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے گونجتے رہے۔ ان کے یومِ وفات پر اور اگلے دن جب انہیں سپردِ خاک کرنے سے پہلے نمازِ جنازہ پڑھی گئی، پاکستان میں ہر جگہ سوگ منایا گیا۔ لیکن ہندوستان سے توپوں کی آواز سنی جا سکتی تھی، کیونکہ اس سے اگلے دن ہندوستان نے حیدر آباد پر حملہ کر دیا تھا۔

قائدِ اعظم کی وفات کا صدمہ بہت بڑا تھا، لیکن اس سے قوم پر نہ سکتہ طاری ہوا اور نہ اس کے عزم کا پرچم سرنگوں ہوا۔ عام احساس یہ تھا کہ ان کی یاد میں بہترین خراجِ عقیدت یہی ہے کہ قومی تعمیر کے کام کو اسی طرح جاری رکھا جائے بلکہ اگر ممکن ہو تو اسے اور زیادہ ہمت اور جوش کے ساتھ بجا لایا جائے۔ گورنر جنرل کے طور پر قائدِ اعظم کی جانشینی کے لیے وزیرِ اعلیٰ مشرقی بنگال خواجہ ناظم الدین کا انتخاب کیا گیا۔ آئین ساز اسمبلی کے نائب صدر مولوی تمیز الدین خاں اس کے صدر مقرر ہوئے۔ قومی قیادت کا بار لیاقت علی خاں کے کندھوں پر پڑا۔ گورنر جنرل کے طور پر خواجہ ناظم الدین کا انتخاب بہت موزوں تھا۔ ان کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا اور اپنے اخلاص اور پرہیز گاری کی وجہ سے ان کا بہت احترام کیا جاتا تھا۔ قائدِ اعظم کی خدمت میں قبل ازیں جو کاغذات اور اطلاعات پیش کی جاتی تھیں، وہ اب ان کی خدمت میں پیش کیے جانے لگے۔ تمام اہم مسائل میں وزیرِ اعظم ان سے مشورہ کرتے تھے، اور انہوں نے گورنر جنرل کے طور پر اپنا کردار بڑے وقار اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ ادا کیا۔

قومی رہنما کی حیثیت سے لیاقت علی خان غیر متوقع رفعتوں تک پہنچے۔ مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری کے طور پر، اور مرکزی اسمبلی میں اور دہلی کی عبوری حکومت میں قائدِ اعظم کے نائب کی حیثیت میں وہ نمایاں خدمات بجا لائے تھے۔ پچھلے ایک سال سے وہ وزارتِ عظمیٰ کے منصب کا بار اٹھائے ہوئے تھے۔ قائدِ اعظم کی علالت کے دوران میں انہیں اپنی قوتِ فیصلہ اور صلاحیتِ کار پر زیادہ سے زیادہ انحصار کرنا پڑا تھا۔ قائدِ اعظم کے پیروکاروں میں وہ اپنی دیانت اور پاکستان سے دلبستگی میں بہت ممتاز تھے۔ وہ معاملہ فہم محکم نگاہ، مستقل مزاج اور مردم شناس تھے۔ وہ غیر معمولی ضبطِ نفس کے مالک تھے اور کوئی بھی شخص اُن

گ جہ ۔ سے ان کی دلی کیفیت کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ قائداعظم کی وفات کے بعد انہوں نے جس طرح فوتی آ سکام کو فروغ دیا اور قائداعظم کے تفویض کردہ فرائض ادا کیے، اس کا ساری قوم نے اعتراف کیا۔ آج تک انہیں قائد ملت کے نام سے احترام کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ قائداعظم نہیں تھے اور نہ ہی انہوں نے کبھی قائداعظم کے ایک وفادار پیروکار سے زیادہ کچھ ہونے کا دعویٰ کیا۔ انہیں سوابی ایڈ روں کی وساطت سے امور سرانجام کرنے پڑتے تھے جو ان سے اس طرح نہیں ڈرتے تھے جس طرح وہ قائداعظم سے ڈرتے تھے۔ وہ رہنمائی تو کر سکتے تھے، حکم نہیں دے سکتے تھے۔

اُن پر اکثر ایک ہی بڑا اعتراض کیا جاتا ہے کہ انہوں نے ایسے زمانہ میں (۱۹۴۹-۵۰) آئین سازی کا کام کیوں آگے نہ بڑھایا جب قوم متحد تھی اور مسلم لیگ کو آئین ساز اسمبلی میں غالب اکثریت حاصل تھی۔ کل ۹، ارکان میں سے فقط مٹھی بھر کانگرسی ہندو اپوزیشن میں تھے۔ مسلمانوں میں عبدالغفار خان حکومت کے خلاف تھا، لیکن چونکہ وہ پاکستان کے ہی خلاف تھا اس کی آواز یکسر بے وزن تھی۔ صرف میاں افتخارالدین ہی مستقل نکتہ چین تھے۔ باقی سب حکومت کی ٹھوس حمایت میں تھے۔

قائداعظم قیام پاکستان کے کام میں اس قدر منہمک رہے کہ انہیں آئین سازی کے لیے کوئی فرصت نہ مل سکی۔ اس بات پر کچھ نہ کچھ قیاس آرائی ہوتی رہی ہے کہ قائداعظم کے ذہن میں پاکستان کے آئین کا کیا نقشہ تھا۔ اگرچہ کوئی بھی شخص پورے وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ ان کی رہنمائی میں آئینی ڈھانچہ کیا متعین شکل اختیار کرتا لیکن ان کے اندازِ فکر کے بعض پہلو شک وشبہ سے ماورا ہیں۔ ان کے پیش نظر پاکستان کے لیے ایک وفاقی طرز کا آئین تھا لیکن اتنے مضبوط مرکز کے ساتھ، جو پاکستان کی وحدت اور سالمیت کا ضامن ہو سکتا۔ وہ ان مشکلات سے پوری طرح باخبر تھے، جو مشرقی اور مغربی پاکستان کی جغرافیائی علیحدگی کی وجہ سے درپیش تھیں اور وہ پاکستان کے دونوں بازوؤں میں اتحاد کی ہر کڑی کو مضبوط بنانے کے خواہاں تھے۔

ان کی اپنی حیثیت منفرد تھی۔ وہ قائداعظم اور بابائے قوم تھے۔ جیسا کہ لیاقت علی خان نے کہا:

"ہماری آزادی ایک شخص کی انتھک خدمات اور مساعی کا ثمر ہے اور آپ جانتے ہیں کہ وہ ہمارے محبوب رہنما قائداعظم ہیں۔" گو وہ پاکستان میں کسی بھی سرکاری منصب پر فائز نہ ہوتے تو بھی ارباب اختیار رہنمائی اور ہدایت کے لیے انہیں سے رجوع کرتے۔ عوام کو جتنا اعتماد ان پر تھا اور کسی پر نہیں تھا۔ اشخاص اور معاملات کے بارے میں ان کا فیصلہ حرف آخر تھا۔ جس چیز کو وہ پاکستان کے لیے مفید سمجھتے، کوئی بھی شخص سے

مابہ النزاع نہیں بنا سکتا تھا۔ جب قیامِ پاکستان کے چند ماہ بعد کابینہ نے یہ فیصلہ کیا کہ قائدِ اعظم کابینہ کی رائے کو مسترد کر سکتے ہیں، تو یہ فیصلہ اس لیے کیا گیا تھا کہ وہ قائدِ اعظم تھے، اس لیے نہیں کہ وہ گورنر جنرل تھے۔ اس فیصلے سے آئین میں کوئی ترمیم نہیں ہوئی تھی بلکہ کابینہ رضاکارانہ طور پر بابائے قوم کے حق میں اپنے اختیار سے دستبردار ہو گئی تھی۔ اس فیصلہ کا اطلاق فقط ان کی ذاتِ گرامی پر تھا۔ اگر قائدِ اعظم چاہتے تو آئین ساز اسمبلی عبوری آئین میں اس کے مطابق ترمیم بھی کر دیتی۔ لیکن یہ حقیقت کہ ان خطوط پر کارروائی کے لیے اشارہ تک نہیں کیا گیا، اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ قائدِ اعظم پارلیمانی نظامِ حکومت میں کسی اہم نوعیت کی تبدیلی کے خواہاں نہیں تھے۔ بہرحال اس میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ قائدِ اعظم پاکستان کے لیے ایک جمہوری آئین چاہتے تھے۔ ان کی زندگی کا قوی ترین جذبہ قانون اور آزادی کی محبت تھا۔ پاکستان کے قیام سے پہلے اور بعد لاتعداد مواقع پر انہوں نے اسلامی تعلیمات کے مطابق جمہوریت، معاشرتی انصاف اور انسانی مساوات میں اپنے یقینِ محکم کا اظہار کیا۔ فروری ۱۹۴۸ء میں انہوں نے امریکہ کے عوام کے نام اپنے نشری پیغام میں جو کچھ کہا، صرف اسی کا ذکر کافی ہوگا:۔

> "پاکستان آئین ساز اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخرکار شکل کیا ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ جمہوری طرز کا آئین ہوگا جس میں اسلام کے بنیادی اصول متشکل ہوں گے۔ یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی میں قابلِ عمل ہیں، جس طرح تیرہ سو سال پہلے تھے۔ اسلام اور اس کی مثالیت نے ہمیں جمہوریت کا درس دیا ہے۔ اس نے انسانی مساوات، عدل اور ہر شخص سے منصفانہ برتاؤ سکھایا ہے۔ ہم ان درخشاں روایات کے وارث ہیں اور پاکستان کا آئندہ آئین بنانے والوں کی حیثیت میں ہمیں اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کا پورا احساس ہے۔ بہرحال پاکستان ایک ایسی مذہبی مملکت نہیں ہوگا جس میں مذہبی پیشوا مامور من اللہ کے طور پر حکومت کریں گے۔ ہمارے ہاں بہت سے غیر مسلم ہیں ۔۔۔ ہندو، عیسائی اور پارسی ۔۔۔ لیکن وہ سب پاکستانی ہیں۔ وہ بھی تمام دوسرے شہریوں کی طرح یکساں حقوق اور مراعات سے بہرہ ور ہوں گے اور پاکستان کے معاملات میں کماحقہ کردار ادا کریں گے"۔[۱۲]

قائدِاعظم کے انتقال کے بعد کچھ عرصے کے لیے وزیرِاعظم اور مرکزی حکومت کی ساری توانائیاں قومی استحکام پر مرکوز تھیں۔ ۱۹۴۹ء کے اوائل میں وزیرِاعظم کے لیے ممکن ہُوا کہ وہ اپنی توجہ آئینی مسائل کی طرف مبذول کریں۔ ۷ مارچ ۱۹۴۹ء کو لیاقت علی خان نے قراردادِ مقاصد کی تحریک کی "جو اُن مرکزی اصولوں پر مشتمل تھی، جن پر آئینِ پاکستان کی بنیاد رکھی جانی ہے"۔ یہ قرارداد ایک دلچسپ بحث کے بعد آئین ساز اسمبلی نے ۱۲ مارچ کو منظور کردی، اس بحث میں قرارداد کے تمام مضمرات سامنے آگئے۔ اس قرارداد میں ایک ایسی مملکت کا تصور پیش کیا گیا جس میں اسلامی تعلیمات کے مطابق جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور معاشرتی انصاف کے اصولوں کو ملحوظ رکھا جائے گا، جس میں مسلمان اپنی زندگی اسلام کے مطابق بسر کرسکیں گے، اور جس میں اقلیتیں اپنے مذہب پر عمل پیرا ہوسکیں گی اور اپنی ثقافت کو فروغ دے سکیں گی، جس میں بنیادی حقوق بشمول آزادیٔ اظہارِ رائے اور آزادیٔ اجتماع کی ضمانت دی جائے گی، جس میں عدلیہ کی آزادی کا تحفظ کیا جائے گا اور وفاق کی سالمیت کی حفاظت کی جائے گی" تاکہ پاکستان کے عوام خوشحال ہوں اور اقوامِ عالم کی صف میں اپنا جائز اور باوقار مقام حاصل کرلیں اور بین الاقوامی امن اور ترقی اور نوعِ انسانی کی شادکامی میں پوری اعانت کرسکیں"۔

۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو بنیادی اصولوں کی کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا، جس نے اگلے سال رپورٹ پیش کردی۔ لیکن جب اس رپورٹ پر کچھ مخالفانہ نکتہ چینی ہوئی تو وزیرِاعظم نے آئین ساز اسمبلی سے درخواست کی کہ اس پر بحث ملتوی کردی جائے اور عام لوگوں کو اپنی آرا و افکار پیش کرنے کی کھلی دعوت دی۔ ان کے ناقدین پوچھتے ہیں کہ انہوں نے اس طرح آئین سازی کے کام سے کیوں پہلوتہی کی؟ ہندوستان نے یہ کام اواخر ۱۹۴۹ء تک مکمل کرلیا تھا اور اپنے مرکزی اور صوبائی قانون سازاداروں کے پہلے عام انتخابات 1951ء میں بیک وقت کرالیے تھے۔

اس کی وجہ وہ منصوبہ تھا، جو اس زمانہ میں لیاقت علی خان نے مرتب کیا کہ آئینی مسائل کو طے کرنے سے پہلے باری باری ہر صوبے میں اور اس کے بعد مرکزی اسمبلی کے انتخابات کرائے جائیں۔ انہوں نے اپنے اس منصوبے سے مجھے اور بعض دوسرے اصحاب کو آگاہ کیا تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ترمیم شدہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر مبنی عبوری آئین تسلی بخش طور پر کام کر رہا ہے۔ بالغ رائے دہی کی اساس پر عام انتخابات سے جمہوری اداروں کے قیام کی یقینی ضمانت مل جائے گی لیکن صوبائی اور مرکزی قانون سازاداروں کے انتخابات

بیک وقت کرانے سے انتظامیہ اور مسلم لیگ پارٹی کے وسائل پر بے حد بار پڑے گا۔ اس لیے یہ انتخابات مرحلہ بہ مرحلہ ہونے چاہئیں۔ ان کا آغاز پنجاب سے کیا جائے اور علی الترتیب شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ، مشرقی بنگال اور سب سے آخر میں مرکز کے لیے۔ جب عوام سے تازہ سند اختیار لیے نومنتخب حکومتیں باگ ڈور سنبھالیں گی، تو پھر آئین سازی کا کام ہاتھ میں لے کر پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا سکے گا۔ لیکن ایک قاتل کی گولی نے ۱۶ راکتوبر ۱۹۵۱ء کو لیاقت علی خان کی زندگی کے ساتھ ان کے منصوبے کا بھی خاتمہ کر دیا۔ پاکستان کے لیے یہ ایک شدید المیہ اور ناقابل تلافی نقصان تھا۔

آئین سازی کا کام لشتم پشتم چلتا رہا حتیٰ کہ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں آئین ساز اسمبلی ہی توڑ دی گئی۔ اگلے سال ایک نئی آئین ساز اسمبلی کا انتخاب عمل میں لایا گیا، جس نے ہمت کے ساتھ اس کام کا بیڑا اٹھایا اور چھ ماہ کے اندر اسے مکمل کر دیا۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا آئین اُس قرارداد مقاصد پر مبنی تھا جسے لیاقت علی خان نے پیش کیا تھا۔ اس آئین کا نفاذ ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء سے عمل میں لایا گیا۔ اس آئین کا سنگ بنیاد جسے وزیر اعظم کے طور پر مجھے ملک کے اندر پیش کرنے کی عزت حاصل ہوئی، ہر شعبہ — انتظامی، اقتصادی اور سیاسی — میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے مابین مساوی شراکت تھا۔

اشارات

تاریخی پس منظر

1. J. H. Hutton, *Caste in India* (Bombay, Oxford University Press, 1961), p. 50.
2. *Ibid.*, p. 190.
3. For a critical review of the attitude of British historians, such as Sir Henry Elliot and Professor John Dowsen, see S. M. Ikram and Percival Spear, eds. *The Cultural Heritage of Pakistan* (London, Oxford University Press, 1955), pp. 97-99.
4. Percival Spear, *India : A Modern History* (Ann Arbor, Mich., The University of Michigan Press, 1961), p. 99.
5. Rajendra Prasad, *India Divided* (Bombay, Hind Kitabs, 1947), p. 85.
6. Sir Stanley Reed, *The India I Knew*, 1897-1949 (London, Odhams Press, 1953), p. 176.
7. Philip Woodruff, *The Men Who Ruled India : The Founders* (London, Jonathan Cape, 1959), p. 93.
8. W. W. Hunter, *The Indian Musalmans* (Calcutta, Comrade Publishers, 1945 reprint of 3rd ed.), p. 3.
9. Ram Gopal, *Indian Muslims : A Political History* (Bombay, Asia Publishing House, 1959), p. 16.
10. Hunter, *The Indian Musalmans*, pp. 144-45.
11. Gopal, p. 34.
12. Gopal, p. 35.
13. Quoted in Altaf Husain Hali, حیات جاوید (Lahore, Aina-i-Adab, 1966 ; reprint of 2nd ed. of 1902), p. 164.
14. B. Pattabhai Sitaramayyah, *History of the Indian National Congress* (2 vols., Bombay, Padma Publications, 1946), I, 15.
15. Woodruff, pp. 165-66.
16. Quoted in Hali, p. 574.
17. Quoted in Hali, pp. 276-77. A fuller extract is given in Appendix II of Part I of *The Constitutional Problem in India* by R. Coupland (Madras, Oxford University Press, 1945).
18. *Struggle for Independence, 1857-1947* (Karachi, Pakistan Publications, 1958), Appendix II, pp. 4-5.

19. Quoted in Coupland Part I, p. 34.
20. Sitaramayyah, I, 27.
21. M. H. Saiyid, *Mohammad Ali Jinnah, A Political Study* (Lahore, Muhammad Ashraf, 1953), pp. 189-90.
22. D. G. Tendulkar, *Mahatma* (8 vols., New Delhi, Government of India, Publication Division, 1960), II, 82.
23. B. R. Ambedkar, *Pakistan or the Partition of India* (Bombay, Thacker, 1946). p. 304.
24. Quoted in Coupland, Part I, p. 111.
25. The full text of Iqbal's address is given in Appendix IV of *Struggle for Independence 1857-1947.*
26. Ishtiaq Husain Qureshi, *The Muslim Community of the Indo-Pakistan Sub-Continent* (The Hague, Mouton, 1962), p. 295.
27. Choudhry Khaliquzzaman, *Pathway to Pakistan* (London, Longmans Green, 1961), pp. 152-53.
28. Coupland, Part II, p, 111.
29. Gopal, p. 245.
30. Michael Brecher, *Nehru : A Political Biography* (London, Oxford University Press, 1959), pp. 231.
31. Abul Kalam Azad, *India Wins Freedom* (Calcutta, (Orient Longmans, 1959), pp. 15-16.
32. For details, see Sir Malcolm Darling, *The Punjab Peasant in Prosperity and Debt* (Bombay, Oxford University Press, 1947).
33. *Speeches by the Rt. Hon. John Bright, M. P.*, ed. by James E. Thorold Rogers (London, Macmillan, 1892), pp. 26-28.

۲ - قراردادِ پاکستان

1. Quoted in Beverley Nichols, *Verdict on India* (London, Jonathan Cape, 1944), p. 31.
2. R. Coupland, *The Constitutional Problem in India* (3 parts, Madras Oxford University Press, 1945), Part II, p. 180.
3. *Some Recent Speeches and Writings of Mr. Jinnah*, ed. by Jamil-ud-din Ahmad, 5th ed. (2 vols., Lahore, Muhammad Ashraf, 1952), I, pp. 173-78.
4. Richard Symond, *The Making of Pakistan* (London, Faber and Faber, 1949), p. 59.
5. Nirad C. Chaudhri, *The Autobiography of an Unknown Indian* (London, Macmillan, 1951), p. 231.
6. Quoted in Hector Politho, *Jinnah* (London, John Murray, 1954), p. 126.

7. *Speeches and Documents on the Indian Constitution, 1921-1947*, ed. by Sir Maurice Gwyer and A. Appadorai (2 vols., London, Oxford University Press, 1957), I, 270.
8. In a letter to Jinnah dated June 21, 1937, reproduced in Appendix V to *Struggle for Independence 1857-1947* (Karachi, Pakistan Publications, 1958), p. 34.
9. *Speeches and Writings of Mr. Jinnah*, I, p 76.
10. *Ibid*, pp. 554-55.
11. *Documents and Speeches on British Commonwealth Affairs, 1931-1952*, ed. by Nicholas Mansergh (2 vols, London, Oxford University Press, 1953), II, pp. 6 2-14.
12. Quoted in Coupland, Part II, p. 242.
13. *Documents and Speeches on British Commonwealth Affairs, 1931-1952*, II, pp 616-17.
14. Quoted in Coupland, Part II, p. 290.
15. Quoted in D. G. Tendulkar, *Mahatma* (8 vols., New Delhi, Government of India, Publication Division, 1960), VI, p. 263.
16. Quoted in Pyarelal, *Mahatma Gandhi : The Last Phase* (2 vols., Ahmedabad, Navajivan Publishing House, 1956), I, p. 91.
17. *Some Recent Speeches and Writings of Mr. Jinnah*, vol. II, ed by Jamil-ud-din Ahmad (Lahore, Muhammad Ashraf, 1947), pp. 180-83.
18. *Speeches and Documents on the Indian Constitution*, II, p. 550
19. V. P. Menon, *The Transfer of Power in India* (Calcutta, Orient Longmans, 1957), p. 207.
20. Abul Kalam Azad, *India Wins Freedom* (Calcutta, Orient Longmans, 1959), p. 114.
21. *Ibid.*, p. 129.
22. *Ibid.*, p. 130.

۳ - کابینہ مشن پلان

1. *Cabinet Mission and After*, ed. by Muhammad Ashraf (Lahore, Muhammad Ashraf, 1946), pp. 1-3.
2. *Speeches and Documents on the Indian Constitution, 1921-1947*, ed by Sir Maurice Gwyer and A. Appadorai (2 vols., London, Oxford University Press, 1957), II, pp. 574-75.
3. *Cabinet Mission and After*, pp. 127-29.
4. For the full text of the Cabinet Mission Plan, see *Speeches and Documents on the Indian Constitution*, II, pp. 577-84.
5. *Pyarelal, Mahatma Gandhi : The Last Phase* (2 vols., Ahmedabad, Navajivan Publishing House, 1956), I, 214-15 ; and

V. P. Menon, *The Transfer of Power in India* (Calcutta, Orient Longmans, 1957), pp. 268-69.

6. Quoted in Pyarelal, I, 222.
7. *Speeches and Documents on the Indian Constitution*, II, p. 589-90.
8. *Cabinet Mission and After*, p. 141.
9. *Speeches and Documents on the Indian Constitution*, II, pp. 600-2.
10. *Ibid.*, pp. 595-96.
11. *Ibid.*, pp. 598-99.
12. *Ibid.*, p. 600.
13. Quoted in Pyarelal, I, 225.
14. *Speeches and Documents on the Indian Constitution*, II, pp. 602-3.
15. Pyarelal, I, p. 234.
16. *Ibid.*, p. 233.
17. *Ibid*, pp. 234-36.
18. *Ibid.*, pp. 236-37.
19. *Speeches and Documents on the Indian Constitution* II, pp. 606-9.
20. *Cabinet Mission and After*, pp. 181-82.
21. Pyarelal, I, pp. 236-40.
22. Quoted in Michael Breacher, *Nehru : A Political Biography* (London Oxford University Press, 1959), p. 392.
23. Percival Spear, *India : A Modern History* (Ann Arbor, Mich., The University of Michigan Press, 1961), p. 415.
24. Quoted in D. G. Tendulkar, *Mahatma* (8 vols.. New Delhi, Government of India, Publication Division, 1960), VIII, p 3.
25. Quoted in Abul Kalam Azad, *India Wins Freedom* (Calcutta, Orient Longmans, 1959), p. 155.
26. Quoted in Breacher, p. 316.
27. *Ibid*, pp. 316-17.
28. *Speeches and Documents on the Indian Constitution*, II, p. 638.
29. See *Ibid.*, p. 603.
30. *Some Recent Speeches and Writings of Mr. Jinnah.* Vol. II, ed by Jamil-ud-din Ahmad (Lahore, Muhammad Ashraf, 1947), pp. 407-21.
31. *Cabinet Mission and After*, p., 309.
32. *Ibid.*, pp. 309-10.
33. *Ibid.*, pp. 311-19.

34. *Ibid*, p. 325.
35. *Ibid*, pp. 335-37.
36. In a letter dated August 28, 1946, to the *Statesman* of Calcutta, reproduced in *Cabinet Mission and After*, pp. 385-87.
37. *Cabinet Mission and After*, p. 323.
38. V.P. Menon, *The Transfer of Power in India* (Calcutta, Orient Longmans, 1957), p. 291.
39. روز نامه نوائے وقت - لاهور - یکم جولائی : ۱۹٦۱
40. *Speeches and Documents on the Indian Constitution*, II, pp. 640-41.
41. Azad, pp. 156-57.
42. *Cabinet Mission and After*, pp. 340-44.
43. *Ibid.*, p. 373.
44. Sir Francis Tuker, *While Memory Serves* (London, Cassell, 1950), pp. 154-57.
45. *Ibid*, pp. 158, 160, 165.
46. Ian Stephens, *Pakistan* (London, Ernest Benn, 1963), p. 106.
47. Quoted in Pyarelal, I, p. 268.
48. Menon, p. 302.
49. Quoted in Pyarelal, I, pp. 270-71.
50. Quoted in Menon, p. 303.
51. *Ibid.*, p. 308.
52. Pyarelal, I, p. 274-75.
53. Quoted in Menon, p. 313.
54. *Ibid.*
55. *Cabinet Mission and After* p. 416.
56. *Ibid.*, pp. 415-16.

۴ - عبوری حکومت

1. Michael Brecher, *Nehru: A Political Biography* (London, Oxford University Press, 1959), p. 324.
2. Abul Kalam Azad, *India Wins Freedom* (Calcutta, Orient Longmans, 1959), p. 166.
3. *Ibid.*, p. 166.
4. *Ibid*, p. 167.
5. *Cabinet Mission and After*, ed. by Muhammad Ashraf (Lahore, Muhammad Ashraf, 1946), p. 430.

6. Quoted in E.W.R. Lumby, *The Transfer of Power in India, 1945-1947* (Londor, George Allen and Unwin, 1954), p. 120.
7. Sir Francis Tuker, *While Memory Serves* (London Cassell, 1950), p. 176.
8. *Ibid.*, pp. 181.-82.
9. Lumby, p 121.
10. Quoted in Pyarelal, *Mahatma Gandhi : The Last Phase* (2 vols., Ahmedabad, Navajivan Publishing House, 1956), I, p. 650.
11. Tuker, p. 185.
12. Pyarelal, I, p. 641.
13. Tuker, pp. 196-201.
14. Azad., p. 170.
15. *Ibid.*, p. 171.
16. All the quotes in this paragraph are from *Speeches and Documents on the Indian Consiitution, 1921-1947*, ed., by Sir Maurice Gwyer and A. Appadorai (2 vols., London, Oxford University Press, 1957), II, p. 655-57.
17. *Ibid* , p., 657.
18. V. P Menon, *The Transfer of Power in India* (Calcutta, Orient Longmans, 1957), p. 323.
19. *Speeches and Documents on the Indian Consiitution*, II, p. 660.
20. *Ibid.*, p. 661.
21. *Some Recent* Speeches *and Writings of Mr. Jinnah*, Vol. II, ed. by Jamil-ud-din Ahmad (Lahore, Muhammad Ashraf. 1947), p. 492.
22. *Ibid.*, pp. 496-508.
23. Azad, pp. 167-68.
24. Quoted in Pyarelal, I, p. 489.
25. Quoted in Hector Bolitho, *Jinnah* (London, John Murray, 1954), p. 171.
26. *Speeches and Documents on the Indian Constitution*, II, pp. 661-62.
27. Quoted in Menon, p. 332.
28. *Speeches and Documents on the Indian Constitution*, II, pp. 662-66.
29. Paul Einzeg, "The Blocked Balances", in the weekly *Indian Finance* (Calcutta), March 1, 1947.
30. Quoted in *Indian Finance* (Budget Supplement), March 5, 1947.

31. Quoted in John W. Wheeler-Bennett, *King George VI* (London Macmillan, 1959), p. 708.
32. *Speeches and Documents on the Indian Constitution*, II, pp. 667-69.
33. Alan Campbell-Johnson. *Mission with Mountbatten* (London, Robert Hale, 1953), p. 44.
34. *Parliamentary Debates, House of Commons, 1946-1947*, Vol. CDXXXIV, cols. 503-5.
35. *Ibid.*, col. 678.
36. Quoted in Menon, p. 339.
37. Penderel Moon, *Divide and Quit* (London, Chatto & Windus, 1961), p. 72.
38. *Ibid.*, p. 74.
39. *Struggle for Independence, 1857-1947* (Karachi, Pakistan Publications, 1958), p. 94.
40. Ian Stephens, *Pakistan* (London. Ernest Benn, 1963), p. 142.
41. The daily *Sind Observer* of Karachi, March 4, 1947.
42. Moon, p. 77.
43. Quoted in G. D. Khosla, Stern Reckoning, p. 10) ; cited in Kewal L. Punjabi, *The Indomitable Sardar* (Bombay, Bharatiya Vidya Bhavan, 1962), p. 122.
44. Moon, p. 77.
45. Stephens, p. 153.

۵ - غریب آدمی کا بجٹ

1. Abul Kalam Azad, *India Wins Freedom* (Calcutta, Orient Longmans, 1959), pp. 175-76.
2. *Ibid.*, p. 176.
3. C. N. Vakil,"Some Reflections on the Budget'', in the Bombay weekly *Commerce*, March 8, 1947, p. 417.
4. *Indian Finance* (Calcutta), March 22, 1947.
5. Azad, p. 207.
6. Quoted in Pyarelal, *Mahatma Gandhi : The Last Phase* (2 vols. Ahmedabad, Navajivan Publishing House, 1956), II, p. 83.
7. Kewal L. Panjabi, *The Indomitable Sardar* (Bombay, Bharatiya Vidya Bhavan, 1962), p. 123.
8. Quoted in *Ibid*, p. 123.
9. Quoted in Michael Brecher, *Nehru ; A Political Biography* (London, Oxford University Press, 1959) p. 345.

10. Pyarelal, II, p 335.
11. *Speeches and Documents on the Indian Constitution, 1921-1947*, ed. by Sir Maurice Gwyer and A. Appadorai (2 vols. London, Oxford University Press 1957), II, pp. 669-70.
12. Quoted in V.P. Menon, *The Transfer of Power in India* (Calcutta Orient Longmans, 1956) p. 384.

٦ - مؤنٹ بیٹن کا مِشَن

1. The full text of this letter is given in John Connell, *Auchinleck* (London, Cassell, 1959), pp 864-65.
2. Nicholas Mansergh. *Survey of British Commonwealth Affairs* (London, Oxford University Press, 1958), p. 211.
3. Alan Campbell-Johnson, *Mission with Mountbatten* (London, Robert Hale, 1953), p. 55.
4. Quoted in Pyarelal, *Mahatma Gandhi: The Last Phase* (2 vols., Ahmedabad, Navajivan Publishing House, 1956), II, p. 7 .
5. E.W.R Lumby, *The Transfer of Power in India. 1945-1947.* (London, George Allen and Unwin, 1954), p. 156.
6. Jawaharlal Nehru, *The Discovery of India* (Bombay, Asia Publishing House, 1961), pp. 569-70.
7. Sir Francis Tuker, *While Memory Serves* (London, Cassell, 1950), p. 257.
8. Quoted in Kewal L. Panjabi, *The Indomitable Sardar* (Bombay, Bharatiya Vidya Bhavan, 1962), p. 114.
9. Campbell-Johnson, p. 85
10. Michael Brecher, *Nehru : A Political Biography* (London, Oxford University Press, 1959), pp. 410-12.
11. Campbell-Johnson, p. 56.
12. Quoted in Pyarelal, II, p. 65.
13. See *ibid.*, The second page of illustrations between pages 128 and 129.
14. Campbell-Joh son p. 55.
15. *Ibid.*, p. 57.
16. *Ibid.*
17. *Ibid.*, p. 76.
18. Quoted in Lord Ismay, *Memoirs* (London, Heinemann, 1960), p. 420.
19. Campbell-Johnson, p. 69.
20. *Ibid.*, p. 71

۷ - منصوبہ تقسیم کی تشکیل

1. Lord Ismay, *Memoirs* (London, Heinemann, 1960), p. 420.
2. Alan Campbell-Johnson, *Mission with Mountbattan* (London, Robert Hale, 1953), p. 66.
3. *Ibid.*, p. 65.
4. Pyarelal, *Mahatma Gandhi : The Last Phase* (2 vols., Ahmedabad, Navajivan Publishing House, 1956), II, p. 262.
5. Campbell-Johnson, p. 58.
6. Quoted in John Connell, *Auchinleck* (London, Cassell, 1959), pp. 874-75.
7. Quoted in *Ibid.*, pp. 878-80.
8. Campbell-Johnson, p. 72.
9. Ismay *Memoirs*, p. 420.
10. Quoted in Pyarelal, II, pp. 158-59.
11. Campbell-Johnson, p. 50.
12. *Ibid.*, p. 72.
13. *Ibid.*, p. 81.
14. *Ibid.*
15. Pyarelal, II, p. 154.
16. *Ibid*, p. 166.
17. Reproduced in Leonard Mosley, *The Last Days of the British Raj* (London, Weidenfeld and Nicolson, 1961), p. 127. Italics are mine.
18. Quoted in Campbell-Johnson, p. 86.
19. Quoted in *ibid.*, p. 88.
20. V. P. Menon, *The Transfer of Power in India* (Calcutta, Orient Longmans, 1957). p. 360.
21. Quoted in Campbell-Johnson, p. 87.
22. *Ibid.*
23. Ismay, pp. 417-18.
24. Menon, p. 363.
25. Campbell-Johnson, p. 89.
26. *Ibid.*
27. *Ibid*, p. 90.
28. *Ibid.*, p. 76.
29. Menon, p. 365.
03. Campbell-Johnson, p. 94.

31. *Ibid*, pp. 85-86.
32. Quoted in Kewal L. Panjabi, *The Indomitable Sardar* (Bombay, Bharatiya Vidya Bhavan, 1962), p. 126.
33. Quoted in John W. Wheeler-Bennett, *King George VI* (London, Macmillan, 1959), p. 708.
34. Menon, pp. 366-67.
35. Campbell-Johnson, p. 93.
36. Quoted in Pyarelal, II, p. 170.
37. Quoted in *ibid*, p. 171.
38. *Ibid.*, p. 18 .
39. *Ibid*, p. 185. *Italics are mine.*
40. *Ibid.*, pp. 184-85.
41. *Ibid.*, p. 185.
42. Quoted in *ibid*, p. 84.
43. *Ibid.*, p. 188.
44. Campbell-Johnson, p. 90.
45. Quoted in E.W.R. Lumby, *The Transfer of Power in India, 1945-1947* (London, George Allen & Unwin, 1954). p. 161.

۸ - تقسیم کا منصوبہ

1. *Speeches and Documents on the Indian Constitution, 1921-1947*, ed. by Sir Maurice Gwyer and A. Appadorai (2 vols. London, Oxford University Press, 1957), II, 670-75.
2. Alan Campbell-Johnson, *Mission with Mountbatten* (London, Robert Hale, 1953), pp. 99-100.
3. Abul Kalam Azad, *India Wins Freedom* (Calcutta, Orient Longmans, 1959), p. 193.
4. V.P. Menon, *The Transfer of Power in India* (Calcutta, Orient Longmans, 1956), p. 376.
5. Pyarelal, *Mahatma Gandhi : The Last Phase* (2 vols., Ahmedabad, Navajivan Publishing House, 1956), II, p. 277.
6. Government of India Records, quoted in Leonard Mosley, *The Last Days of the British Raj* (London, Weidenfeld and Nicolson, 1961), p. 132.
7. Menon, p. 376.
8. Government of India Records, quoted in Mosley, p. 133.
9. Lord Ismay, *Memoirs* (London, Heineman, 1960), p-424.
10. *Keesing's Contemporary Archives* (Bristol, Keesing's Publications, 1946-1948), VI, 8632-33.

11. Lord Mountbatten, *Time Only to Look Forward* (London, N. Kaye, 1949), pp. 10-12.
12. *Speeches and Documents on the Indian Constitution, II*, p. 681-84.
13. Quoted in the Delhi daily *Dawn*, June 5, 1947.
14. Lord Mountbatten, pp. 19-48.
15. Quoted in Menon, p. 382.
16. Azad, pp. 186-87.
17. Michael Brecher, *Nehru : A Political Biography* (London, Oxford University Press, 1959), p. 349.
18. Quoted in Menon, p. 384.
19. Quoted in *ibid.*, p. 382.
20. Azad, p. 198.
21. Menon, p. 386.

۹ - تقسیم کے مسائل

1. Abul Kalam Azad, *India Wins Freedom* (Calcutta, Orient Longmans, 1959), pp. 193-94.
2. Government of India Records, quoted in Leonard Mosley, *The Last Days of the British Raj* (London, Weidenfeid and Nicolson, 1961), p. 132.
3. *Ibid.*
4. Pyarelal, *Mahatma Gandhi : The Last Phase* (2 vols., Ahmedabad, Navajivan Publishing House, 1956), II, pp. 286-70.
5. Quoted in *ibid.*, pp. 267-68.
6. *Ibid.*, p. 273.
7. *Ibid.*, 275.
8. V.P. Menon, *The Transfer of Power in India* (Calcutta, Orient Longmans, 1957), p. 389.
9. Quoted in Pyarelal, II, p. 277.
10. *Ibid.*, p. 279.
11. *Ibid*, p 278.
12. Government of India Records, quoted in Mosley, p. 151.
13. Lord Ismay, *Memoirs* (London, Heinemann, 1960), p. 429.
14. Government of India Records quoted in Mosley, p. 155.
15. Ian Stephens, *Pakistan* (London, Ernest Benn, 1963), p. 176.
16. Ismay, pp. 429-30.
17. D.G. Tendulkar, *Mahatma* (8 vols., New Delhi, Government of India, Publication Division, 1960-63), VIII, p. 252.

18. *Ibid.*, p. 260.
19. *Ibid*, p. 252.
20. Kewal L. Panjabi. *The Indomitable Sardar* (Bombay, Bharatiya Vidya Bhavan, 1962), p. 139.
21. Ismay, p. 428.
22. Quoted in John Connell, *Auchinleck* (London, Cassell, 1959), p. 915-18.
23. *Ibid.*, pp. 920-22.
24. *Notes on the Sikh Plan* (Lahore, West Punjab Government. 1948). p. 7.
25. *Ibid.*, p 25.
26. Government of India Records, quoted in Mosley, pp. 205-6.
27. Ismay, p. 431.
28. Government of India Records, quoted in Mosley, p. 205.
29. *Ibid.*, p. 207.
30. Quoted in Azad, p. 190.
31. Alan Campbell-Johnson, *Mission with Mountbatten* (London, Robert Hale, 1953), pp. 174-75.
32. E.W.R. Lumby, *The Transfer of Power in India*, 1945-47 (London, George Allen and Unwin, 1954), p. 265.
33. Campbell-Johnson, pp. 148-49.
34. *Ibid.*, p. 152.
35. *Ibid.*, p. 156.

۱۰ ۔ ریڈ کلف کا ایوارڈ

1. Alan Campbell-Johnson, *Mission with Mountbatten* (London, Robert Hale, 1953), p. 124.
2. *Ibid.*, p. 100.
3. *Ibid.*, pp. 71-72.
4. Quoted in the Madras daily *Hindu*, January 16, 1950.
5. Lord Ismay, *Memoirs* (London, Heinemann, 1960), p. 420.
6. Ian Stephens, *Pakistan* (London, Ernest Benn, 1963), p. 180.
7. Lord Mountbatten, *Time Only to Look Forward* (London, N. Kaye, 1949), p. 33.
8. Government of India Records, quoted in Leonard Mosley, *The Last Days of the British Raj* (London, Weidenfeld and Nicolson, 1961), p. 206.
9. *Ibid.*, p. 212.
10. Mountbatten, p. 30.

11. V.P. Menon, *The Story of the Integration of the Indian States* (Calcutta, Orient Longmans, 1956), p. 394.
12. Lord Birdwood, *Two Nations and Kashmir* (London, Robert Hale, 1956), p. 74.
13. *Speeches and Documents on Indian Constitution 1921-1947*, ed. by Sir Maurice Gwyer and A. Appadorai (2 vols., London, Oxford University Press, 1957), II, p. 679.
14. Campbell-Johnson, pp. 151-152.
15. Penderal Moon, *Divide and Quit* (London, Chatto & Windus, 1961), p. 96.
16. Stephens, p. 180.
17. Campbell-Johnson, p. 152.
18. Quaid-i-Azam Muhammad Ali Jinnah, *Speeches as Governor-General* (Karachi, Pakistan Publications, 1963, pp. 32-33.

١١ - ریاستوں کا الحاق

1. *Speeches and Documents on the Indian Constitution, 1921-1947*, ed. by Sir Maurice Gwyer and A. Appadorai (2 vols., London, Oxford University Press, 1957), II, pp. 767-69.
2. V.P. Menon, *The Story of the Integration of the Indian States* (Calcutta, Orient, Longmans, 1956), p. 22.
3. B. Pattabhai Sitaramayya, *The History of Indian National Congress* (2 vols., Bombay, Padma Publications, 1946), II, pp. 79-80.
4. Quoted in R. Coupland, *The Constitutional Problem in India* (3 parts, Madras, Oxford University Press, 1945), Part II, p. 173.
5. Quoted in Menon, p. 78.
6. Speeches and Documents on the Indian Constitution, II, pp. 767-69.
7. Lord Mountbatten, *Time Only to Look Forward* (London, N. Kaye, 1949), pp. 39-42.
8. Quoted in E.W.R. Lumby, *The Transfer of Power in India, 1945-1947*, (London, George Allen and Unwin, 1954), p. 233.
9. Quoted in the Delhi daily *Dawn*, August 1, 1947.
10. *Speeches and Documents on the Indian Constitution*, II, pp. 770-72.
11. Alan Campbell-Johnson, *Mission with Mountbatten* (London, Robert Hale, 1953), pp. 140-141.
12. Mountbatten, pp. 51-56.
13. Menon, p. 116.

14. *Ibid.*, p. 113.
15. *Ibid.*, p. 117.
16. Sir Francis Tuker, *While Memory Serves* (London, Cassell, 1950), p. 39).
17. Penderel Moon, *Divide and Quit*, London, Chatto, and Windus, 196'), p. 157. Penderel Moon was Revenue Minister of Bahawalpur State at the time of partition.

۱۲ - پاکستان منصۂ شہود پر

1. Quoted in the Karachi daily *Dawn*, August 16, 1947.
2. *Ibid.*
3. Quaid-i-Azam Muhammad Ali Jinnah, *Speeches as Governor-General* (Karachi, Pakistan Publications, 1963), p. 17.
4. *Ibid.*, pp. 7-9.
5. *Ibid.*, p. 7.
6. *Ibid.*, p. 54.

۱۳ - قتلِ عام اور بحالیٔ مہاجرین

1. Khalid Bin Sayeed, *Pakistan : The Formative Phase* (Karachi, Pakistan Publishing House, 1960), p. 181.
2. Sir Francis Tuker, *While Memory Serves* (London Cassell, 1950), pp. 445-49.
3. *Ibid.*, pp. 329-449.
4. Quoted in Ian Stephens, *Pakistan* (London, Earnest Benn, 1963), p. 183.
5. John Connell, *Auchinleck* (London, Cassell, 1959), p. 906.
6. *Ibid.*, p. 911.
7. Abul Kalam Azad, *India Wins Freedom* (Calcutta, Orient Longmans , 1959), pp. 213-14.
8. Lord Ismay, *Memoirs* (London, Heinemann, 1960), p. 438.
9. *Ibid.*, p. 439.
10. Quoted in Tuker, p. 489.
11. *Ibid.*, p. 455.
12. Quoted in Connell, p. 924.
13. Quoted in Michael Brecher, *Nehru : A Political Biography* (London, Oxford University Press, 1959), p. 378.
14. Quoted in the Karachi daily *Dawn*, November 5, 1948.
15. Kewal L Punjabi, *The Indomitable Sardar* (Bombay, Bharatiya Vidya Bhavan, 1962), p. 190.

۳۱ - جونا گڑھ ، حیدر آباد اور کشمیر

1. V.P. Menon, *The Story of the Integration of the Indian States* (Calcutta, Orient Longmans, 1956), p. 130.
2. Quoted in *ibid* , p. 319.
3. Mir Laik Ali, *The Tragedy of Hyderabad* (Karachi, Pakistan Co-operative Book Society, 1962), pp. 89-90.
4. Menon, p. 335.
5. Quoted in K. M. Munshi, *The End of an Era* (Bombay, Bharatiya Vidya Bhavan, 1957), pp. 150-51.
6. Menon, p. 322.
7. Laik Ali, pp. 207-12.
8. K. Sarwar Hasan, *Pakistan and the United Nations* (New York, Manhattan Publisbing Company, 1960), p. 87.
9. D.G. Tendulkar, *Mahatma* (8 vols., New Delhi, Governorment of India, Publication Division, 1960-63), VIII, 69.
10. Quoted in *Chronology of Pakistan, 1947-1957* (Karachi, Kamel Publications, 1957), p. 20.
11. Pyarelal, *Mahatma Gandhi : The Last Phase* (2 vols., Ahmedabad, Navajivan Publishing House, 1956), II p. 352.
12. Alan Campbell-Johnson, *Mission with Mountbatten* (London, Robert Hale, 1953), p. 120.
13. Menon, p. 394.
14. Campbell-Johnson, p. 224.
15. Quoted in Pyarelal, II, pp. 357-58.
16. Ian Stephens, *Pakistan* (London, Ernest Benn, 1963), p. 200.
17. Richard Symonds in the *Statesman* of Calcutta, February 4, 1948.
18. Quoted in Sarwar Hasan, p. 96.
19. Campbell-Johnson, pp. 212-13.
20. *Ibid.*, pp. 224-25.
21. *Ibid* , p. 223.
22. Ian Stephens, *Horned Moon* (London, Chatto and Windus, 1953), pp. 109-10.
23. Lord Birdwood, *Two Nations and Kashmir* (London, Robert Hale, 1956), p. 64.
24. Josef Korbel, *Danger in Kashmir* (Princeton, N.J., Princeton University Press, 1954), pp. 79-80.
25. John Connell, *Auchinleck* (London, Cassell, 1959), pp. 931-32.

26. Quoted in Sarwar Hasan, p. 104.
27. Quoted in *ibid.*, p. 115.
28. Security Council Official Records, quoted in Sarwar Hasan, p. 128.
29. Quoted in Sarwar Hasan, p. 125.
30. Campbell-Johnson, p. 287.
31. *Ibid*, p. 291.
32. Korbel, p. 144.

۱۵ - نئی مملکت کے اقتصادی اور مالی مسائل

1. Beverley Nichols, *Verdict on India* (London, Jonathan Cape, 1944), pp. 189-91.
2. Quoted in Pyarelal, *Mahatma Gandhi : The Last Phase* (2 vols., Ahmedabad, Navajivan Publishing House, 1956), II p.83.
3. Quaid-i-Azam Muhammad Ali Jinnah, *Speeches as Governor-General*, (Karachi, Pakistan Publications, 1963), p. 106.
4. *Ibid.*, pp. 153-54.
5. J. Russell Andrus and Azizali F. Mohammad, *The Economy of Pakistan* (London, Oxford University Press, 1958), p. 376.

۱۶ - نئی مملکت کے انتظامی اور سیاسی مسائل

1. Quaid-i-Azam Muhammad Ali Jinnah, *Speeches as Governor-General*, (Karachi, Pakistan Publications, 1963), p. 58.
2. *Ibid.*, p. 84.
3. *Ibid.*, p. 90.
4. *Ibid.*, p. 104.
5. Quoted in the Karachi daily *Dawn*, April 21, 1948.
6. Michael Brecher, *Nehru : A Political Biography* (London, Oxford University Press, 1959), p. 377.
7. Jinnah, p. 65.
8. Liaquat Ali Khan, *Pakistan : The Heart of Asia* (Cambridge, Mass., Harvard University Press, 1950), p. 33.
9. Ishtiaq Hussain Qureshi, *The Muslim Community of the Indo-Pakistan Sub-Continent* (The Hague, Mouton, 1962), p. 255.
10. Liaquat Ali Khan, p. 82.
11. Jinnah, p. 159.
12. *Ibid.*, p. 65.